"ترکشِ ما را خدنگِ آخرین!"

محمد علیؒ

جلد اول اور دوم مکمل

ذاتی ڈائری کے چند ورق

حصۂ اوّل

از

عبدالماجد دریابادی

صاحب تفسیر القرآن، مؤلف "حکیم الامت"، مدیر "صدق جدید" (لکھنؤ)

باہتمام

مولانا مسعود علی ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

سنہ ۱۳۶۳ھ

قیمت: [illegible]

فہرست مضامین

محمد علیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ ماضی قریب میں (یہ "قریب" و "بعید" اضافی ہی مفہوم رکھتے ہیں) مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ مجھے ان سے شرفِ نیاز وسط ۱۹۱۲ء سے ان کی آخری عمر یعنی ختم ۱۹۳۰ء تک، کہنا چاہیے کہ ۱۸ سال کی مدت تک حاصل رہا۔ آیندہ صفحات میں میں نے اپنے اتنے دن کے تاثرات و مشاہدات کو یکجا اور قلمبند کر دینے کی کوشش کی ہے ——— ان کی مستقل سیرت یا سوانح عمری ایک بالکل الگ چیز ہے۔ کوئی صاحب اس "ذاتی ڈائری" کو اس کا بدل یا قائم مقام نہ خیال فرمالیں۔

سردارِ ملت کی عمر کے آخری ۵، ۶ سال ملت ہی کے بعض طبقات سے شدید اختلافات میں گزرے۔ جنگ و مقابلہ آج اِس طبقہ سے ہے کل اُس طبقہ سے۔ اور اخیر زمانہ میں تو ان کے خلاف بغاوت بہت عام ہو گئی تھی۔ یہ ساری داستان یقیناً بڑی تلخ ہے۔ اور بہت سے اکابر معاصرین کے عقیدتمندوں کے جذبات کو اس حصہ سے ضرور ٹھیس لگے گی۔ لیکن اگر اس جزو کو سرے سے نظرانداز کر دیا جاتا تو پھر کتاب کے لیے رہ ہی کیا جاتا۔ اپنی والی پوری کوشش اس کی البتہ رہی ہے کہ ان تلخیوں کو زیادہ سے زیادہ نرم اور ہلکے پیرایہ میں پیش کیا جائے۔ ——— بعض پڑھنے والوں

کی دل شکنی اور ناگواری کسی نہ کسی حصہ سے ناگزیر ہے۔ یہ اگر جرم ہے تو اللہ اسے معاف فرمائے، اور پڑھنے والے بندے بھی آگے بڑھنے سے قبل عفو و درگزر کی نیت اپنے دل میں پختہ فرمالیں۔

واقعات کے پیش آنے اور ان کے قلمبند ہونے کے زمانہ کی درمیانی مدت برسوں کی ہوگئی حافظ نے ضرور کہیں کہیں دھوکا دیا ہوگا، اور متعدد واقعات عجب نہیں جو غلط ملط ہو کر رہ گئے ہوں۔ بس اس لازمۂ بشریت کے سوا، کوئی ارادی غلطی یا غلط بیانی ان شاء اللہ ان اوراق میں نہ ملے گی۔ مگر ان حدود کے اندر بھی اپنے نفس کے تبریہ کا دعویٰ کرنا انسان کے لیے بے حد دشوار ہی۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ۔

ڈائری کا جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، بارہا ایک ہی واقعہ کو مختلف سیاقوں میں لایا گیا، اور مختلف زاویوں سے اسے دیکھا گیا ہے، اس کے بعد تکرار بیان کا عیب جا بجا پیدا ہو جانا لازمی سا ہو گیا ہے ــــــ خدا ان اوراق کے ناظرین کو ایسی چشم عیب پوش عطا فرمائے کہ یہ عیب (اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے، سارے ہی عیب) انھیں نظر آتے بھی نظر نہ آئیں، اور جب وہ کتاب بند کریں تو ان کی زبان سے ڈائری نویس کے حق میں دعائے خیر ہی نکلے!

عبدالماجد
دریاباد ۔ بارہ بنکی
فروری ۱۹۵۲ء
جمادی الاولیٰ ۱۳۷۱ھ

باب (۱)

سنہ ۱۹۱۲ء

(چون بہ توافتدم نظر)

زمانہ سنہ ۱۹۱۲ء کی برسات کا ہے، اگست کے مہینہ کی کوئی تاریخ "مسلم یونیورسٹی" ابھی قائم ہو چکی کہاں ہے، قائم ہو رہی ہے، اس کے قیام کے غلغلہ سے ساری فضا گونجی ہوئی، ہر زبان پر اس کا تذکرہ، ہر مجلس میں اسی کا چرچا، سنہ ۱۹۱۰ء سے گویا یہی شغل پڑھے لکھے اور بے پڑھے ہندی مسلمان کا رہ گیا ہے، ہز ہائینیس سر آغا خان کا طوفانی دورہ، زرخیز اور "چندہ انگیز" ملک کے طول و عرض میں ختم ہو چکا ہے۔ اور اب دور دورہ راجہ صاحب محمود آباد کا ہے (مہاراجہ بہت بعد کو ہوئے، اس وقت صرف راجہ تھے) وہی اس کشتی کے ناخدا، وہی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے صدر، کانسٹیٹیوشن کمیٹی (مجلس وضع آئین و ضوابط) اپنا کام شروع کر چکی ہے، اور قوم کی نگاہیں اب اسی کی طرف لگی ہوئی ہیں ــــــ ہائے، سنہ ۱۹۴۳ء[1] میں کوئی سنہ ۱۹۱۲ء کی فضا کو کیسے واپس کھینچ بلائے* ــــــ چوٹی کے افراد، قوم و ملت کے چنے ہوئے کمیٹی کے ممبر ہیں، کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں طلب ہوا ہے، اور راجہ صاحب کی صدارت میں انھیں کے قصر قیصر باغ میں ہو رہا ہے ــــــ وہ قصر محمود آباد جو مہمانوں کی دعوتوں

---

[1] اس کتاب کے مسودۂ اول کا سنہ تحریر

اُور عنیا فتون کے لیے وقف تھا۔ اور جس کا ڈائیننگ روم قابون اور پلیٹون اور چمچون کی جھنکار سے ہر وقت جیسے گونجا ہی رہتا تھا!

کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے۔ اور ملت کے دل و دماغ کا عطر جیسے کھینچ کر یہیں آگیا ہے۔ سر راجہ صاحب (نام جس سے کم ہی لوگ واقف و مانوس تھے، علی محمد خان) وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما۔ سامنے ایک بڑی لمبی میز، دو رویہ کرسیون کی قطار۔ میز کے ایک سمت مین ایک جوان رعنا، تندرست و تنومند، کوئی ۳۳، ۳۴ سال کی عمر کا، اعلیٰ درجے کے انگریزی سوٹ مین ملبوس بیٹھا ہوا۔ داڑھی تازی منڈی ہوئی، مونچھین ذرا گھنی اور نوکیلی۔ ذہانت بشرہ سے ٹپکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی۔ ممبرون مین ایک سے ایک قابل و فاضل اس کے بڑے اور مخدوم بھی۔ لیکن نظرین بار بار وہی کی طرف اُٹھ رہی ہین، اور کان اُسی کی آواز پر لگے ہوئے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، مگر متوجہ سب ہی ہو گئے ——— یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق اڈیٹر محمد علی، رامپور کا باشندہ اور علی گڈھ اور آکسفرڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشا پردازی کا سکہ اس وقت بھی دلوں پر بیٹھ چکا تھا، حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے، ابھی سال ہی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود بھی نہ تھا۔

مین نے لکھنؤ کیننگ کالج سے بی، اے کی ڈگری ابھی ابھی لی تھی۔ سن ۲۰ سال کا، لکھنؤ مین رہتے کئی سال گذر چکے تھے، پھر بھی قصباتی ہونے کی خو بو باقی تھی۔ اور فطری شرمیلا پن اس پر مستزاد۔ لوگون سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے مین شرم اور جھجک غالب۔ اپنے بعض بڑے

بھائیون کے ساتھ بڑی ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہان پہنچا تھا، اور تماشائیون کی مختصر سی صحبت مین ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا کہ مین سب کو دیکھون اور کوئی مجھے نہ دیکھے۔ محمد علی کا نام ۸-۱۰ سال سے کان مین پڑ رہا تھا۔ علی گڈھ میگزین مین ان کی طالب علمی کے زمانہ کی شوخ تحریرین کے علاوہ ان کے بعض انگریزی مضامین (مندرجہ ٹائمس آف انڈیا بمبئی) کا مجموعہ Thought on The Present Discontent کے نام سے وہی ایک سال ہوئے، پڑھنے مین آیا تھا۔ اور کامریڈ کا مطالعہ ہر ہفتہ، انگریزی ادب کی چاٹ مین تو گویا فرض ہی ہوگیا تھا۔ شوق دیدار آج پہلی بار پورا ہوا ——— سنہ ۱۲ء کو آج سنہ ۴۸ء مین ۳۶ سال ہوچکے، لیکن لوح حافظہ پر یہ نقش اتنا گہرا کہ جیسے ابھی کل کی بات ہے!

یہ سرگذشت دوپہر کی تھی۔ اسی شام کو بعد مغرب، باہر سے آئے ہوئے لیڈرون کے خیر مقدم مین مسلم کلب لکھنؤ کے بالاخانہ پر ایک مختصر سی صحبت مرتب ہوئی۔ سنہ ۱۳ء کا مسلم کلب لکھنؤ کچھ چیز ہی اور تھا۔ آج اسے کس چیز سے مثال دے کر سمجھایا جائے۔ امین آباد پارک مین واقع تھا، جنوبی قطار کی تعمیرات کے مشرقی گوشہ مین۔ وہین کہین جہان آج صدیق بک ڈپو اور انوار بک ڈپو ہین۔ پارک خود اس زمانہ مین نیا نیا تیار ہوا تھا اور ایک نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ (سڑک اس پار مقابل کے امین الدولہ پارک کا ابھی وجود بھی نہ تھا) کلب کے خوب رو اور خوش صفات سکریٹری سید میر جان مستعدی اخلاص و قوت عمل کے ایک پیکر مجسم تھے۔ کلب کے دو منزلہ کی کھلی ہوئی پُرفضا چھت پر برف اور شربت اور سوڈا اور لمونیڈ اور پان اور سگریٹ کے دور چل رہے ہین۔ اور لیڈرون کی جھلک دیکھنے کو مشتاقان دید کا ایک خاصہ گروہ موجود ——— یاد کر لیجئے کہ یہ ذکر دور "جمہوریت" سے قبل کا ہو رہا ہے

سنہ ۱۲ء کا لیڈر، سنہ ۴۲ء کا لیڈر نہ تھا۔ اس وقت اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ہی کسے نصیب ہوتا تھا، بجز چند خوش نصیبوں کے؟

دن کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام۔ اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر عوام کے درمیان ایک جگہ مجتمع، آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں۔ لیکن بارات کا دولہا اس وقت بھی کامریڈ کا ایڈیٹر ہی۔ سج دھج صبح سے اس وقت بالکل مختلف۔ بجائے ہیٹ اور انگریزی سوٹ کے، سر پر ترچھی رامپوری پگڑی، جسم پر باریک نفیس انگرکھا، چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ، دلی کا جوتا ——

محمد علی اپنی زندگی کے اس دور میں بھی صاحبیت میں یکسر غرق نہیں ہوئے تھے، معاشرت میں فی الجملہ مشرقیت و اسلامیت اس وقت بھی ملحوظ رکھتے تھے —— ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت تو کیا ہوتی، دل اسی سے نہال ہوا جا رہا تھا کہ اتنے قریب سے دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع تو مل گیا، کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، کالج کے ہندو لڑکے بھی متاثر تھے۔ ان کے سامنے محمد علی کا نام لیکر فخر کرنے کے لیے یہ کچھ کم تھا ع

اُن کے اِک جان نثار ہم بھی ہیں!

سنہ ۱۲ء ختم ہو رہا تھا کہ سرکار انگریزی نے دار الحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کا اعلان کیا، اور کچھ روز بعد اس پر عملدرآمد بھی ہو گیا۔ "مسٹر" محمد علی اور ان کا کامریڈ ان دونوں کو بھی اب دہلی آنا پڑا۔ کامریڈ ستمبر سنہ ۱۲ء میں کلکتہ سے ہٹا، اور ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۲ء کو دہلی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ ہمدرد نکلا تو نہیں، لیکن نکلنے کا اعلان اس کے بھی ہو گیا۔ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد نقیب ہمدرد کے نام سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے

بھی لگا۔ ہمدرد کی ادارت کے ساز و سامان جس پیمانہ پر شروع ہوئے، وہ اُس زمانہ میں اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی۔ بی۔ اے (علیگ) کسی زمانہ میں محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک و مدیر "ہمدرد" کے مشیر خاص تھے۔ اُنہی کے مشورہ سے ایڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سے (جواب "بابائے اردو" کے لقب سے مشہور ہیں، اور اس وقت حیدرآباد دکن میں انسپکٹر آف اسکولز تھے) مراسلت رہی۔ لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدہ پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبدالحلیم شررؔ کا ہوا۔ چنانچہ ستمبر میں شررؔ مرحوم دہلی روانہ ہوگئے اور وہاں سے از راہ قدر افزائی مجھ طالب علم سے بھی پرچہ کے لیے علمی مضامین طلب فرمائے۔

میں نے اسی سال لکھنؤ سے بی۔ اے فلسفہ لیکر کیا تھا۔ مغربی منطق و فلسفہ کے بری طرح پیچھے پڑا ہوا تھا۔ لکھنا برسوں کی مشق سے بھی کچھ آگیا تھا، اس لیے شہرت تھوڑی بہت اسی زمانہ سے علمی اور فلسفیانہ مضامین کی ہوگئی تھی۔ الناظر (لکھنؤ)، ادیب (الہ آباد) وغیرہ وقت کے معزز و مقبول ماہناموں میں بہ کثرت مضامین نکل چکے تھے۔ شررؔ صاحب کو حسن ظن اسی بنا پر قائم ہوا تھا۔ ۱۴ اکتوبر کو والا نامہ انھوں نے حسب ذیل تحریر فرمایا:۔

"محلہ چھیلی والاں۔ نمبر 9/۲۲۲۰ دہلی۔

کرمی۔ تسلیم۔

میں آپ سے رخصت ہو کے آیا۔ لیکن ہمدرد کی اشاعت میں اس لیے تعویق ہوئی اور ہو رہی ہے کہ ابھی تک اردو کا ٹائپ نہیں آیا۔ اب آگیا ہے مگر پھر بھی کمپازیٹروں کی کمی کی وجہ سے ایسی ایسی دشواریاں پیش ہیں کہ اگرچہ یکم نومبر تک پرچہ شائع کر دینے کا قطعی ارادہ کر لیا گیا ہے مگر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کامیابی ہو سکے گی یا نہیں، کیونکہ جب تک ٹائپ آنے

کے بعد بھی ایک ہفتہ تک "رہبر سل" نہ کر لیا جائے جرأت اشاعت نہیں ہوسکتی۔
مجھے ہمدرد کے لیے قابل لکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ کیا براہ کرم آپ میری مدد کے لیے آمادہ ہوسکیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہفتہ میں کوئی نہ کوئی آپ کا مضمون چھاپنے کے لیے ضرور مل جایا کرے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایک مضمون تو ضرور ارسال فرمائیے۔ اور اگر آپ مسلسل بھیجنے کا وعدہ فرمائیں تو روزانہ پرچہ بھی آپ کے نام جاری کر دیا جائے۔ پہلا مضمون جلد سے جلد مرحمت ہو۔

خاکسار
محمد عبد الحلیم شرر"

باب (۲)

۱۳-۱۹۱۲ء

(ہمدرد مولانا شرر)

محمد علی کا معیار پرچہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لیے اعلیٰ نہ تھا بلکہ کاغذ، چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ہمدرد کو اپنے انگریزی کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ہمدرد کے لیے طے پائی، اور خوشنما، نئے ٹائپ کے لیے آرڈر بیروت (شام) اور مصر کو بھیجے گئے قدرۃً وہاں سے آنے میں مہینوں کی مدت لگی ——— میں اس درمیان میں فلسفہ میں ایم۔اے کرکے علیگڈھ چلا گیا تھا (لکھنؤ میں اس کا کوئی انتظام اُس وقت تک نہ تھا) مل اور اسپنسر کے قسم کے فرنگی فلسفی اس زمانہ میں ہر وقت سر پر سوار رہتے تھے۔ شرر صاحب کی فرمایش پر مل کی کتاب "لبرٹی" (آزادی) کے کچھ حصہ کا ترجمہ کرکے ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ ترجمہ والی ترکیب محمد علی کو کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ خود اُس وقت انگریزیت مآب ہونے کے باوجود بہرحال فرنگیوں اور فرنگیت کے جامد مقلد نہ تھے۔ اُن کی چیزیں لینا چاہتے بھی تو انہیں اپنا کر۔ شرر صاحب کا دوسرا والا نامہ ۲۷ اکتوبر کا لکھا ہوا حسب ذیل

موصول ہوا :۔

"مکرمی ۔ تسلیم ۔

آپ کے علیگڈھ آنے کا حال سنکر مجھے خوشی ہوئی۔ آپنے مِل کی کتاب "لبرٹی" کا جو پہلا جزو بھیجا، اُسے دیکھکے نہایت شکر گذار ہوا۔ مین نے محمد علی صاحب کو بھی اُسے دکھایا۔ ان کی یہ رائے ہے کہ کتاب کا ترجمہ مسلسل نکالنا تو مناسب نہین۔ لیکن آپ اسی کو اپنے طور پر اور اس سے اخذ کر کے اگر مختلف مضامین کے عنوان سے تحریر فرمائین تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اور مین سمجھتا ہون کہ شاید آپ بھی اسے پسند فرمائین گے"۔

ٹائپ اور پریس کے جھگڑے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔ نقیب ہمدرد توجوں توں نکلتا رہا؛ ۹فل روز نامہ ۸ صفحہ کی ضخامت والا، ملتوی ہی ہوتا چلا گیا، اور ۱۳ء مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آگئے ——— لکھنؤ والوں کا دل ذرا باہر لگنا مشکل ہی ہوتا ہے، چاہے وہ "باہر" دلّی ہی ہو! اور پھر یہ کچھ ضروری بھی نہین کہ جو کامیاب ناول نویس اور ادیب ہو وہ روز نامہ کا ایڈیٹر بھی بہت اچھا ہو ——— نہ ہر اچھے باورچی کے لیے رکابدار ہونا لازمی، اور نہ ہر رکابدار کے لیے اچھا باورچی ہونا!

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغہ کے لیے قاضی عبد الغفار بی۔ اے۔ مرادآبادی اور سید جالب دہلوی مل گئے، اور کچھ روز بعد محمد فاروق ایم۔ اے دیوانہ گورکھپوری بھی ہاتھ آگئے ——— مئی ۱۳ء مین ایک خط خود محمد علی کی طرف سے چھپا ہوا وصول ہوا :۔

مکرمی ۔ السلام علیکم

ہمدرد چار صفحہ کا نکلتا ہے ۔ اور یکم جون سے انشاء اللہ آٹھ صفحہ کا نکلنا شروع ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ مین آپسے قلمی امداد کے لیے عرض کرون۔ اس سے غالباً آپ کو بھی عذر نہ ہوگا کہ ہمدرد آپ کی امداد کا حاجتمند بھی ہے اور مستحق بھی۔ میں چاہتا ہون کہ اصل ہمدرد کے ابتدائی پرچوں سے آپکے مضامین نکلنے شروع ہوجائین، اس لیے اگر بہ واپسی ڈاک مضامین عنایت کرین گے تو اور بھی زیادہ میری مشکوری کا باعث ہوگا۔ والسّلام

نیاز مند۔ محمد علی"

گشتی خط تھا۔ یقیناً بہتسے اور لوگون کے نام بھی گیا ہوگا۔ میرے نام کا الگ ذاتی خط نہ تھا۔

جون ۱۳ء سے خدا خدا کرکے ہمدرد نکلنے لگا۔ اور اردو صحافت کی تاریخ مین ظاہری' معنوی دونون حیثیتون سے گویا ایک نیا باب کھل گیا۔ مین نے اپنے عریضہ مین لکھ دیا تھا (جیسا کہ اس کے کئی مہینہ قبل شرر صاحب کو بھی لکھ چکا تھا) کہ لیل کی "لبرٹی" کے ترجمہ کے اجزاء قسط وار اشاعت کے لیے حاضر کرسکتا ہون ۔ ۴ ہر جون کا لکھا ہوا خط قاضی عبدالغفار مرادآبادی سب ایڈیٹر کے قلم سے، حسب ذیل موصول ہوا:۔

" جناب بندہ ۔ تسلیم ۔ عنایت نامہ وصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ جس مضمون (ترجمہ) کا جناب حوالہ دیتے ہین، وہ ضرور عنایت فرمائیے، اور بلاتاخیر عنایت فرمائیے۔ ہمدرد کا نصب العین یہی ہے کہ بھرتی کے مضامین سے پاک رہے، اور علمی مضامین کا انبار لگائے جس سے پبلک کے معلومات مین اضافہ ہو۔ یہ آپ کی عنایت ہے اور مین اس کا شکر گزار ہون کہ آپ ہمدرد کو اپنے مضامین کے قابل سمجھتے ہین۔ مین جانتا ہون کہ ہمدرد میں ابھی اصلاح

اور ترقی کے لیے بہت گنجایش ہے۔ مگر مجھے قوی امید ہے کہ اگر قابل اہل قلم میسر آجائیں تو جہانتک ترتیب اخبار کا تعلق ہے، انشاء اللہ ہمدرد قابل اعتراض نہ ہوگا۔ لغو گوئی کا جو ایک خاص انداز اردو اخبارات نے پیدا کر دیا ہے اُس کی بیخ کنی ہمدرد کے فرائض مین داخل ہے۔ محمد علی صاحب کو آپکے مضامین کا نہایت اشتیاق ہے۔ اور انھون نے مجھے تاکید کی ہے کہ ان کی جانب سے مین آپ سے عرض کرون کہ اگر فرصت ہو تو دو چار دن کے لیے دہلی تشریف لائیے۔ محمد علی صاحب کے مہمان عزیز ہو جیئے تاکہ آپ سے تفصیلی گفتگو کا موقع ملے، اور ہمدرد کے مستقبل کے متعلق بہت سے معاملات کا تصفیہ ہو سکے۔ اگر جناب اس دعوت کو قبول کرین تو مجھے یہ بتا دینا چاہیے کہ محمد علی صاحب ہنوز جولائی تک دہلی ہون گے اور اس کے بعد باہر چلے جائین گے۔ ڈاکٹر انصاری کی واپسی پر[1] وہ پھر دہلی مین ہون گے، اور اپنے دوران قیام دہلی مین جب آپ تشریف لانا پسند کرین، وہ بڑی خوشی سے آپ کو اپنا مہمان بنانا چاہتے ہین۔ امید کہ جواب سے جلد یاد فرمایا جاؤن۔ مہربانی فرما کر مضمون بہ واپسی عنایت فرمائیے۔

نیازمند۔ بی۔ ایم۔ اے۔ غفار

سب ایڈیٹر ہمدرد۔ (بہ خط انگریزی)

ہمدرد کی داستان کا تسلسل ڈائری نویس کو بہت دور نکال لایا۔ "ذاتی" ڈائری مین ذاتی نقوش و تاثرات کے لیے اب پھر دو ایک سال قبل کی طرف واپس چلیے۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب اس وقت محمد علی ہی کی تحریک پر اپنا مشہور طبی وفد لیکر جنگ بلقان کے زخمیون کی تیمارداری اور علاج کے لیے ترکی گئے ہوئے ہین۔

باب (۳)

۱۹۱۳-۱۴ء

اے در لبِ لعل تو اعجازِ مسیحائی!

(جلسہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی۔ پہلی رسائی)

دسمبر ۱۳ء کی آخری تاریخیں ہیں۔ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں کانفرنس کا بڑے معرکہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ "کانفرنس" سے مراد اس زمانہ کی بڑی اہم مجلس "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" ہے۔ لیکن کانفرنس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہنگامہ خیز و ہنگامہ پرور جلسہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا ہو رہا ہے۔ کلکتہ کے "الہلال"، لکھنؤ کے مسلم گزٹ، کلکتہ اور دہلی کے کامریڈ کے مسلسل پُرجوش مقالات نے مسلمانوں کے عام طبقہ میں پہلی بار بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اب تک عوام اور حاضرین کا کام جلسوں میں صرف "سمع وطاعت" تھا۔ یعنی تقریروں کا سننا، فصاحت بیان کی داد دینا، اور زیادہ سے زیادہ ووٹ کے لیے ہاتھ اٹھا دینا۔ تجویزوں کی تحریک وتائید اور فیصلہ صادر کرنا صرف لیڈروں کے لیے مخصوص تھا۔ آج مسلم پبلک (عامۃ الناس) نے غلط یا صحیح بہرحال پہلی بار طے یہ کیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے مسائل کو وہ خود ہی طے کریں گے۔ ایک طرف "تجربہ" تھا دوسری طرف "جوش"، اور آج کی یہ پہلی معرکۃ الآرا جنگ قابل دید تھی۔ ایک طرف پرانے کارکنوں کا یہ اصرار کہ گورنمنٹ

جن شرائط پر بھی یونیورسٹی کا چارٹر دے رہی ہو، قبول کر لیا جائے۔ دوسری طرف "آزاد خیالوں" کا یہ نعرہ کہ لیں گے تو یونیورسٹی اپنے شرائط پر لیں گے ورنہ نہ لیں گے۔ "علی گڈھ پارٹی" کے دوسرے بزرگوں کے لیے تو اسٹیج پر آنا اور زبان کا کھولنا ہی دشوار تھا۔ ادھر وہ نمودار ہوئے نہیں، کہ اُدھر جلسہ نے ان کے خلاف طرح طرح کے آوازے کسنے اور نعرے لگانے شروع کیے نہیں! صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم اس جماعت میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والے خوش بیان مقرر تھے۔ ان کی متین، مدلل و فصیح تقریر بھی جلسہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی۔ قوم نے یہی بہت کیا کہ انکی تقریر کو صبر و سکون کے ساتھ سن لیا! ایک جوش و تلاطم ہر سو برپا تھا، اور وقت کا ہر لمحہ "باغیوں" کے سردار، مولانا ابو الکلام آزاد (صاحب "الہلال") کی فتحمندیوں کو نمایاں سے نمایاں تر کرتا جا رہا تھا۔ اور محمد علی کا شمار بھی اسی جماعت میں تھا ——— اجلاس اس منزل پر پہنچ کر دوسرے دن کے لیے ملتوی ہو رہا۔

رات فریقین نے خدا جانے کن کن امیدوں اور آرزوؤں، کن کن اندیشوں، اور راندیشیوں کے ساتھ، اور کہیں کہیں پردہ کارروائیوں میں گزاری۔ اجلاس شروع ہوا تو آج قیادت کا علَم بجائے الہلال کے کامریڈ کے ہاتھ میں تھا۔ محمد علی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو سارا جلسہ پیکر اشتیاق و انتظار تھا۔ محمد علی کی انگریزی انشاء و تحریر کا لوہا سارا ہندوستان مانے ہوا تھا، لیکن تقریر کی ابتک کوئی خاص شہرت نہ تھی۔ اڈیٹر کی حیثیت سے اتنے ہی دنوں میں محمد علی کا سکہ ملک بھر پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن لیڈر کی حیثیت سے محمد علی کا شمار ابھی صفِ اول میں نہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو بھی ابھی ان ہی نے ترکی

بلقان روانہ کیا تھا۔ اس جلسہ مین جب تقریر کو کھڑے ہوئے تو وہی طبی وفد والی خاکی وردی زیب تن تھی۔ عمر کی طرح صحت بھی شباب پر تھی۔ اور آواز اتنی بلند کہ عمارت (قیصر باغ بارہ دری) کے ہر گوشہ مین صاف اور بے تکلف پہنچ جائے ــــــ محمد علی کی لیڈری (قیادت) کا یہ پہلا امتحان تھا۔

تقریر شروع ہوئی۔ اس مین نہ مولانا ابو الکلام کا جوشِ خطابت اور الفاظ کی طلسم بندی تھی، اور نہ آفتاب احمد خان مرحوم کی متانت استدلال۔ بلکہ شروع سے آخر تک اپنی ذاتی ذمہ داری اور ضمانت کی تحریک تھی۔ محمد علی نے نہ دلائل منطقی سے کام لیا، نہ خطابت کا حربہ چلایا۔ بس اپنے کو صداقت و اخلاص کے ساتھ قوم کے آگے پیش کر دیا۔ خلاصۂ تقریر یہ تھا کہ "بحثا بحثی بہت ہو چکی، آپ لوگ بیشک یونیورسٹی بار بار آنکھ بند کرکے نہ قبول کرلین، یقیناً اپنے ہی شرائط پر لین، لیکن شرائط کی تفصیل و تعین کے لئے تو یہ بڑا جلسہ موزون نہیں۔ یہ کام ایک چھوٹے سے وفد کے سپرد کیجئے، وہ آپ کا نمائندہ ہو کر گورنمنٹ سے نپٹ لیگا۔ اس وفد مین مجھکو رکھیے، اور مجھ پر اور میرے رفیقون پر اعتماد رکھیے۔ آپ سے "سادہ چک" مانگنے کھڑا ہوا ہون، آپ میری ساکھ پر سادہ چک دیجئے۔ رقم کی خانہ پری میرے اوپر چھوڑ دیجئے" تقریر جس حد تک موثر و کامیاب رہی، اس کی توقع شاید خود مقرر کو بھی نہ رہی ہو۔ مخالفانہ نعرے اور آوازے رکے، پیشانیون کے بل مٹے اور تجویز تالیوں کی گونج اور مسرت کے جوش مین پاس ہو گئی ــــــ محمد علی پہلے امتحان مین کامیاب ہوئے۔ اور بگڑے ہوئے جلسون کے سنبھالنے کا جہان تک تعلق ہے کامریڈ کے ایڈیٹر کا نام بھی مسلمان لیڈرون کی صفِ اول مین آنے لگا۔

مین یہی زمانہ تھا کہ والد مرحوم کی خبر وفات عین حج کے بعد مکہ معظمہ سے موصول ہوئی۔

ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ——— ہائے، کیا چیز تازہ یتیمی بھی ہوتی ہے! ——
سوال یہ یک بیک نظر کے سامنے آگیا کہ اب روزمرہ کا خرچ کیسے چلے گا، اور آیندہ تعلیم
جاری رکھنے کی کیا صورت ہوگی؟ آگے چل کر تو اس سوال کو اللہ نے راجہ صاحب
محمود آباد مرحوم کے ہاتھوں ایک بڑی حد تک حل کرا دیا، لیکن معاً اس وقت نظر ہمدرد ہی
پر پڑی کہ اسی سے علمی مضامین کے لیے کوئی مستقل باضابطہ معاوضہ کر لیا جائے۔ تلاش
ہمدرد کے مالک کی ہوئی، گرو ان بھا سے زبانی معاملت کر لی جائے۔ جلسہ گاہ کے اندر محمد علی
شاگردوں، معتقدوں، ہمراہوں کے جھرمٹ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اجنبی ہونے
کے باوجود بڑھ کر قریب پہنچا اور عرض کی کہ "کچھ وقت دیجئے۔ الگ کچھ عرض کرنا ہے۔" نرمی
اور ہمدردی کے لہجہ میں بولے "الگ وقت کہاں سے لا سکتا ہوں، یوں ہی چلتے پھرتے
جہاں چاہیے پکڑ لیجئے، اور جو کچھ کہنا ہو فرما ڈالیے۔" ——— محمد علی کی مانگ اب
ہر طرف بڑی رہنے لگی تھی، اس کا اندازہ اسی وقت ہوا۔

بی۔ اے۔ لکھنؤ سے وسط ۱۹۱۲ء میں کر لیا تھا، ایم۔ اے (فلسفہ) کی تحصیل ناکام
پہلے علی گڑھ اور پھر چند روز کے لیے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں کی۔ اور اب شروع ۱۹۱۳ء
میں تلاش معاش شروع ہوئی۔ مدتوں خبط یہ رہا کہ کسی کالج (اور کسی کیوں، اپنے ہی
پرانے کیننگ کالج) میں فلسفہ پڑھانے کی جگہ حاصل کر لیجئے۔ کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔
محکمۂ ریلوے میں ایک نیا نیا ذرا اونچا عہدہ اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے نام سے
کھلا تھا، نیت اس طرف گئی۔ اونچی ملازمتوں کے لیے ذرا اونچی سفارشیں اس وقت
بھی لازمی تھیں۔ تقرر ریلوے بورڈ کے ممبروں اور صدر کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں تک اپنی

رسائی کہاں۔ ہمارے بارہ بنکی کے ایک وکیل اور علی گڑھ کے نامور گریجویٹ شیخ ولایت علی مولوی مرحوم، محمد علیؒ کے خاص الخاص دوستوں، رفیقوں معتقدوں میں تھے۔ "بمبوق"[1] کے عجیب اور فرضی نام سے ان کے ظریفانہ مضمون کامریڈ کے کالموں میں انگریزی کی بہترین انشا پردازی کے ساتھ نکلتے رہتے تھے۔ اردو میں بھی کبھی کبھی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے صلاح دی کہ "دلی چلے جاؤ۔ محمد علی کے نام تعارف نامہ لکھے دیتا ہوں۔ اُن سے دلی کے اعلیٰ حکام سے تعلقات ہیں۔ ریلوے بورڈ والوں سے بھی ضرور ہوں گے۔ وہ ان لوگوں سے ملا دیں گے۔"

سنہ ۲۴ء میں برسات کا موسم تھا، اور رمضان کا مہینہ جب یہ اپنی خالص ذاتی غرض لیکر دلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا، دفتر ہمدرد، کوچۂ چیلان کے لیے تانگہ کیا۔ فاروقی صاحب دیوانہ گورکھپوری اب عرصہ ہوا ہمدرد میں آچکے تھے، اور تجاہل عامیانہ میں لگے رہتے تھے۔ اُن سے پرانی شناسائی علیگڈھ کے زمانہ کی تھی۔ یہ ریاضیات میں ایم اے ہوچکے تھے جب میں ایم اے کرنے علی گڈھ پہنچا تھا۔ انھیں کھوج لگا کر ساتھ لیا۔ وہیں دفتر کے متصل ہی رہتے تھے۔ اور انھیں ہمراہ لے ڈرتے ڈرتے محمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ——— باقاعدہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ وقت کی ایک مشہور شخصیت کے سامنے جاتے ہوئے، وہ بھی تمام تر اپنی ایک غرض لیکر، حجاب اور خوف دامنگیر ہونا ایک حد تک طبعی تھا، اور پھر مجھ جیسے شرمیلے اور ملاقات چور نوجوان کے لیے

[1] یہ ہمدرد کے ایک مستقل ظریفانہ کالم کا عنوان تھا۔ اکثر فاروقی صاحب ہی اسے لکھتے تھے۔

باب (۴)

۱۶ - ۱۹۱۴ء

(نظر بندی، ملاقات، مراسلت)

صبح سویرے کا وقت تھا، اور رمضان کا مہینہ۔ میں فرنگی الحاد میں غرق، مجھے اُس زمانہ میں رمضان سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ ہمدرد و کامریڈ کے دفتر کوچۂ چیلان میں ایک خاصی عالیشان عمارت میں تھے۔ ٹھیک اس کے مقابل، سڑک کے اس پار، ایک مکان اوسط درجہ کی حیثیت کا اور تھا۔ محمد علی صاحب اس میں رہتے تھے، اور وہیں میری حاضری ہوئی۔ کمرہ معمولی سا، اور بجز ایک مختصر سیتل پاٹی کے ہر قسم کے فرنیچر سے مُعرّا۔ نہ میز نہ کرسی نہ کوچ نہ صوفے۔ اس جانماز نما سیتل پاٹی پر ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کا کرتا پاجامہ پہنے ہوئے کامریڈ کا اڈیٹر بیٹھا ہوا! اور چند سخت مذہبی قسم کے مسلمانوں سے جامع مسجد کے انتظامات فرش و شامیانہ سے متعلق بحث و گفتگو میں سرگرم! ——— میں دور سے کامریڈ پڑھنے والا اور محمد علی کی آکسفورڈ کی ڈگری سے مرعوب، اس سادگی اور اس اسلامیت اور مشرقیت کے منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی انگریزیت پر قیاس کرکے سمجھ رہا تھا کہ مکان اور مکین دونوں صاحبیت اور فرنگیت کا مکمل نمونہ ہوں گے! وہ لوگ رخصت ہوئے اور اب میری پیشی ہوئی۔ محبت اور تپاک کا برتاؤ پہلے

شروع ہوگیا۔ بیبو قی مرحوم کا خط لیکر پڑھا، اور زیادہ ملتفت ہوگئے۔ ذرا دیر کے بعد اٹھے، اور سڑک پار کرکے، بالاخانہ پر اپنے دفتر کے کمرہ مین لائے۔ یہان کی شان دوسری تھی، ڈرائنگ روم، کچھ انگریزی اور کچھ ترکی وضع کے بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ۔ کوچ اور کرسیان، گدے اور قالین۔ اور دیوار تصویرون سے مرصع ۔ ۱۹۱۲ء کا محمد علی اب ۱۹۱۳ء کا محمد علی تھا۔ بڑھی ہوئی سیاسی آزاد خیالی اور ترکون سے (جن کے کاندھون پر اس وقت تک خلافت اسلامیہ کا بھی بار تھا) روزافزون ہمدردی دیکھکر انگریز کھٹک گئے تھے۔ اور اب محمد علی کی وہ پوچھ گچھ، وہ قدر، ومنزلت اعلیٰ حکام مین باقی نہین رہی تھی۔ دیر تک تفصیل کے ساتھ اپنی مندوریان بیان کرتے رہے۔ گویا میرا کام زنجال سکنے پر شرمندہ ومحجوب تھے۔ اور اور باتین بھی ادھر ادھر کی خوب کین۔ سیاسیات ادبیات، لطائف وظرائف سبھی کچھ۔ اچھی انگریزی لکھنے والے ہندوستانیون کا ذکر آیا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی، عبداللہ یوسف علی، اور آر۔سی۔ دت کے نام اب بھی یاد پڑرہے ہین۔ اس پہلی ہی ملاقات مین محمد علی نے ان ہندوستانیون سے اپنی پوری بیزاری کا اظہار کر دیا، جو انگریزیت کے شوق مین خود بھی انگریز یا نیم انگریز بن گئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ اور باوجود خود روزہ دار ہونے کے مجھ سے کھانے کے لیے صرف کہا ہی نہیں، بلکہ اصرار دیر تک جاری رکھا۔ پہلی ہی ملاقات مین ایسے گھل مل گئے، کہ جیسے برسوں کی پرانی شناسائی ہے۔ میری واپسی شام کی گاڑی سے ہوئی۔ اس سے بہ اصرار روکتے رہے۔ اور یہ مشرقی مہمان نوازی کی ایک دیرینہ سنت ہے ——— ہمارے لیڈرون کے اخلاق پبلک کے سامنے جیسے بھی کچھ ہون، نجی زندگی مین اس سادگی، اس اخلاص، اس بےتعصبی کی مثالیں اس سے قبل تو کیا

دیکھنے میں آتیں، اس کے بعد بھی کم تر ہی ہیں۔

کامریڈ کی دھوم تو مچی ہوئی تھی ہی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ۔ لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا، اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا، تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چل گئیں۔ بڑا ہنگامہ برپا ہوا، اور اسکے لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے، خود صوبہ کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خوب خبر لے ڈالی۔ حکام اس وقت یوں بھی مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے۔ اور پھر یہ سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے۔ قدرتاً بہت بگڑے۔ ادھر جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش۔ اور اب چہرہ پر داڑھی بھی! —— یہ سب تو تھا ہی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم میں ترکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آ گیا۔ اور کامریڈ نے اپنے ایک بڑے لمبے اور بڑے زور دار مقالہ میں جو Choice of The Turks کے زیر عنوان ٹائمس (لندن) کے ایک مقالہ کے جواب میں تھا، ترکوں کو اپنے اس انتخاب میں معذور ٹھہرایا۔ یہ شرارہ غضب کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کب تک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند، اور محمد علی فوراً نظر بند ہوئے —— وہی محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظور نظر بنے ہوئے تھے!

یہ نظربندی پہلے تو دہلی کے قریب مہرولی (درگاہ قطب صاحبؒ) ہی مین رہی۔ اس کے بعد دونون بھائی (آہ، وہ شوکت علی و محمد علی کا ضرب المثل اتحاد! اُس وقت تک یکجان و دوقالب کا صحیح نمونہ!) نجیب آباد کے آگے لینسڈون کے پہاڑی مقام پر منتقل کر دیے گئے۔ اور یہاں سے نومبر ۱۵ء میں چھندواڑہ (سی۔ پی) بھیجے گئے۔ راستہ لکھنؤ ہوکر تھا۔ ادھر سے صبح کی گاڑی سے گذرے۔ اُس وقت سرکار کے ان "باغیون" سے ملنا بھی جرم کی سی اہمیت رکھتا تھا۔ اس پر بھی اسٹیشن پر خاصہ مجمع مشتاقان دید کا ہو گیا۔ اور انھی میں یہ خاکسار بھی تھا۔ دونون بھائی ایک ایک سے لپٹ لپٹ کر ملتے تھے، اور ہر کس و ناکس کے آگے گویا بچھے جاتے تھے۔ شوکت صاحب کی نظر تو مین بچا گیا، کچھ تو اپنے اُس شرمیلے پن اور جھجھک کی بنا پر کہ وہ میرے لیے اجنبی ہیں، ان سے کیا ملوں، اور کچھ اپنے اُس وقت کے اس ملحدانہ "پندار تفوق" کی بنا پر بھی، کہ شوکت علی کا علمی پایہ میرے برابر کا نہیں، اُن سے ملنے مین اپنی کسرشان ہے! ـــــ آج اپنی ان حماقتون پر جتنی بھی نفرین کر لوں، اس وقت اپنی ۲۲، ۲۳ سال کی عمر میں ان ہی کو مین سرمایہ دانش و خودداری سمجھ رہا تھا! ـــــ محمد علی سے ملاقات رہی۔ کوئی خاص بات اس وقت لوحِ حافظہ پر محفوظ نہیں۔

۱۵ء ختم ہو رہا تھا کہ نفسیات اجتماعی کے ایک مبحث پر اپنی ایک کتاب انگریزی میں "سایکالوجی آف لیڈرشپ" کے عنوان سے لندن مین، اُس وقت کے ایک نامور پبلشر ٹی، فشر اُنون (T. Fisher, Unwin) کے اہتمام سے نکلی۔ اور دل نے اس پر بڑا ہی فخر محسوس کیا۔ ۱۶ء میں کچھ کاپیاں ہندوستان پہنچیں۔ اخبارات نے برطانیہ اور ہندوستان دونون مین خوب خوب ریویو کیے۔ بعض نے بڑے ہی اعانہ اکرشرنے مین

اور دو ایک نے مخالفانہ۔ مین نے بعض اقتباسات اشتہار مین چھپوا کر کچھ لوگون کے پاس بھجوا دیے۔ اور ان مین ایک امتیازی نام چھندواڑہ کے نظربند محمد علی کا بھی تھا۔ دل نے کہا کہ "داد اگر ان سے نہ ملی، تو کچھ نہ ہوا۔ اشتہار دیکھ کر کتاب یقیناً منگائین گے، اور داد بھی دل کھول کر یقیناً دین گے۔" اشتہار گیا، اور چند ہفتوں بعد اس کا اثر اس عنایت نامہ کی شکل مین ظاہر ہوا۔ خط انگریزی مین تھا، اور ہونا ہی چاہیے تھا۔ ذیل مین اُس کا ترجمہ پیش ہو رہا ہے

"چھندواڑہ۔ سی۔ پی ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء

کرم۔

کوئی مہینہ بھر ہوتا ہے کہ انگریزی کتاب "سایکالوجی آف لیڈر شپ" (مطبوعہ فشر ان لندن) کا ایک اشتہار موصول ہوا تھا۔ لفافہ کے اندر سوا اس اشتہار کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشتہار آپ کے ایما سے یا کم از کم آپ کے علم مین میرے پاس روانہ کیا گیا تھا۔ اگر کتاب آپ ہی کی تصنیف ہے تو یقیناً دلآویز ہو گی۔ متعدد ولایتی اور ہندوستانی اخبارات کی رحیم رائین اس اشتہار مین پڑھ ہی چکا تھا کہ ایک مفصل ریویو مسز بسنٹ کے روزنامہ "نیو انڈیا" (مدراس) مین نظر سے گزرا، جو بہت ہی مداحانہ تھا۔

— اچھا۔ تو مین اب بجائے مشتہر صاحب کے براہ راست آپ ہی کو لکھتا ہون کہ کتاب کی ایک کاپی میرے نام وی۔ پی بھجوا دیجیے۔ اس وی پی کی فرمایش کو کتاب کا نسخہ مفت ہاتھ آنے کے لیے حسن طلب نہ سمجھیے گا۔ مجھے یہ دل سے ناپسند ہے کہ مصنف کے احباب اس سے کتاب وصول کرنے کی گھات مین رہین۔ اب وہ زمانہ تو ہے نہین کہ مصنفین غریب کو شاہانہ سرپرستیان حاصل ہون۔ کتابین اگر فروخت نہ ہون تو آخر طبع و اشاعت کے مصارف

کہاں سے نکلیں گے۔ اور اس میں اگر دوست احباب ہی بخل کرنے لگیں تو پھر امید کس لئے رکھی جائے؟

تھوڑا بہت وقت مجھے اس جبریہ تعطیل کے زمانہ میں مل جاتا ہے۔ اور سائیکالوجی آف لیڈرشپ (نفسیاتِ قیادت) سے بڑھ کر موزون موضوع مطالعہ کے لیے ہوگا بھی کیا بخصوصاً اس لیے کہ آج ہندوستان میں کوئی قابل ذکر لیڈر رہے ہی نہیں۔[1] خدا معلوم آپ نے ہمارے پیغمبر (روحی فداہا) کی سیرت کا مطالعہ قائد اعظم کی حیثیت سے کیا ہے یا نہیں۔ مکہ کو فتح کرنا جاننا دشمنوں کے حق میں "لاتثریب علیکم الیوم" کے مشہور فرمان کے ساتھ، اور انصار مدینہ سے آئی بغیر کشت و خون والی اور بغیر مال غنیمت والی فتح کو قبول کرالینا، یہ قیادت کے عظیم الشان کارنامے ہیں۔[2] لیکن یہ سب میں قبل از وقت لکھنے لگا، پہلے کتاب تو دیکھ لوں، پھر رائے قائم کر دوں۔

جملہ احباب کی خدمت میں سلام

مخلص محمد علی"

مراسلت کی باقاعدہ بنیاد اسی خط سے پڑتی ہے۔

---

[1] خیال رہے کہ یہ زمانہ گاندھی جی کے دَور سے بہت پہلے کا ہے۔

[2] میں اس وقت دَورِ الحاد سے گزر رہا تھا، اور رسولِ خدا کی عظمت کیا معنی سرے ہی سے خدا ہی کی عظمت سے دل خالی تھا! محمد علی میرے اس مرض سے ایک تو کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھے، اور پھر جس حد تک واقف تھے بھی، دینی تبلیغ کے جوش اور دھن میں اس کی پروا ہی کب کرتے تھے۔

باب (۵)

۱۹۱۶ء (۱)

(نظر بندی - مراسلات)

چھند واڑہ "سی۔پی" کا "شہر" جغرافی حیثیت سے ہو تو ہو، اُس وقت ملک میں کسی گاؤں یا دیہات ہی کی طرح گمنام تھا۔ لوگوں کے کان میں پہلی بار اس کا نام جبھی پڑا جب علی برادران وہاں نظر بند کیے گئے ــــــ یوسف علیہ السلام نہ ہوتے تو آج کنعان کی یہ شہرت شعر و ادب کی دنیا میں کہاں سے ہوگئی ہوتی؟ ــــــ اب چھند واڑہ کا نام ایک ایک کی زبان پر تھا۔ اور عوام تو نہیں، لیکن پڑھے لکھوں اور خواص میں جسے دیکھیے علی برادران کی زیارت کے لیے کھنچا ہوا چھند واڑہ پہنچ رہا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ بھی نہیں دل کی عقیدت و اخلاص کے نذرانہ کے ساتھ ساتھ، مادی اعتبار سے بھی کوئی پھلوں کی ٹوکری ساتھ لیے اور کوئی مٹھائی کی ہانڈی۔ کوئی ٹوپی یا چھڑی پیش کر رہا ہے، اور کوئی پاتا بہ اور جوتا۔ چھند واڑہ کیا ہوا، گویا ویرانہ میں کسی بزرگ کی درگاہ، خلقت کے لیے زیارتگاہ، اور محمد علی اور ان کے بھائی زندہ پیر! محمد علی کا خاص مشغلہ اس وقت تلاوت قرآن مجید تھا۔ حافظہ ماشاءاللہ یوں بھی بہت قوی تھا، پھر قرآن کو جو بار بار پڑھا، اور جھوم جھوم کر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا، تو قرآن مجید ایک بڑی حد تک انھیں حفظ ہی ہوگیا، اور محمد علی کہنا چاہیے کہ نیم حافظ تو

ہو ہی گئے۔ یعنی جس طرح بندش کو حافظ کرنے کے دوران میں قرآن کچا کچا یاد رہتا ہے، انھیں بھی برزبان ہی سا ہو گیا تھا۔ اور اس دورِ زندانی کی یہ برکت اخیر عمر تک قائم رہی۔

تلاوت قرآن اور حدیث و سیرت نبوی وغیرہ کے مطالعہ سے جو وقت بچتا، وہ زائروں اور مہمانوں کی خاطرداری میں صرف ہوتا۔ محمد علی غضب کے مہمان نواز اور دوست پرست تھے۔ اچھا کھانے کے بڑے شوقین لیکن اس سے بھی زیادہ دوسروں کو اچھا کھلانے کے حریص۔ قرض لیں یا کسی سے مانگ کر لائیں، بہرحال دوستوں کو کھلانا اور خوب ہی کھلانا فرض۔ جو ان کے مہمان نہ بھی ہوتے، انھیں بھی پکڑ پکڑ لاتے، اور ٹھونس ٹھونس کر انھیں کھلاتے ضرور۔ بذلہ سنج ایسے کہ روتے ہوؤں کو بے ہنسائے نہ رہیں۔ رقیق القلب اتنے کہ بات بات پر، بلکہ بلا بات کے بھی، آنسوؤں کے دریا بہا دیں۔ شخصیت ایسی جامع و ہمہ گیر کہ دینی، تاریخی، ادبی، سیاسی، شعری ہر موضوع سے یکساں دلچسپی، اور سب پر یکساں تیار۔ طبیعت ہر وقت حاضر۔ کوئی تذکرہ کسی قسم کا چھڑ جائے، تو بس اب ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ان محفل طرازیوں سے بھی جب فرصت ملتی، تو دور افتادہ دوستوں، عزیزوں کی یاد آتی، اور ان کے آئے ہوئے خطوں کے جواب کی طرف توجہ ہوتی۔ اور وہی زندہ شخصیت خطوط میں جھلکتی رہی۔ ہر خط ایک بند نامہ لیکن خشک ذرہ بھر بھی نہیں، بلکہ حد کمال تک دلکش و شگفتہ۔

خط لکھنے کے زیادہ عادی نہ تھے، اور پابندی کے ساتھ لکھنے پر تو آخر عمر تک بھی قادر نہ ہو سکے۔ اوقات کے نظم و پابندی سے طبیعت فطرۃً بیگانہ تھی۔ اور اس کا خمیازہ ان لوگوں کو اٹھانا پڑتا، جو اپنے خطوط کے جوابات کے بہ پابندیٔ وقت منتظر رہتے کئی کئی دن

کیا مہینے کئی کئی ہفتے گزر جاتے کہ اچھے ضروری خط تک جواب کی نیت و ارادہ کے باوجود جیب کے اندر یا میز کی دراز میں پڑے کے پڑے رہ جاتے۔ اور جب دیکھتے کہ دیر بہت ہی زائد ہو چکی، تو بجائے خط لکھنے کے تار دیتے! نیت ہمیشہ، زبانی گفتگو کی طرح خطوط کے بھی خوب مفصل لکھنے کی رکھتے۔ ہجوم مشاغل کے درمیان اتنی فرصت قدرۃً شاذ و نادر ہی ہاتھ آتی۔ لیکن خط جب کبھی بھی لکھتے، حتی الامکان پچھلی انتظار کشی کا پورا کفارہ کر دیتے۔

محمد علی سے مراسلت رکھنا ایک نعمت تھی۔ جن کے پاس ان کے خطوط آتے وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتے، اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اس کا ذکر دوسروں سے کرتے رہتے۔ مجھ سے ذاتی مراسلت ۱۶ء سے شروع ہوئی۔ پہلے دو ایک خط انگریزی میں آئے گو ان کی انگریزی انشا پردازی تو خیر مسلّم تھی ہی، میں بھی اس زمانہ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھ لینے کی مشق رکھتا تھا۔ دو ہی ایک خطوں کے بعد میں نے زبان بجائے انگریزی کے اردو کر دی اور میری ہی درخواست پر محمد علی نے بھی۔ لطیف نکتہ یہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں کرتے، اردو میں بھی کرنے لگے۔ وہ اس وقت تک مذہب میں غرق ہو چکے تھے، میں سرے سے مذہب سے بیگانہ اور (معاذ اللہ) اسلام کا دشمن۔ ان کی ذات سے اپنی عقیدت و محبت جو کچھ تھی، وہ محض اُن کی ذہانت، ذکاوت، زورِ قلم اور انگریزی حسنِ انشا کی بنیاد پر۔ ۱۴ء میں ایک بار اپنے نزدیک بڑی ہوا خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انھیں یہ لکھا کہ آپ تو تاریخ کے جیّد عالم ہیں، یہ جبریہ فرصت کا زمانہ آپ خالی کیوں جانے دیتے ہیں۔ کیوں نہ کوئی کتاب تاریخ پر لکھ ڈالیے۔ جواب آیا (مراسلت کی زبان ابھی انگریزی ہی تھی) اور کتنا سچا آیا کہ —— "یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں، تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار تاریخ بنا رہے ہیں،

اور آپ مجھے تاریخ لکھنے کی صلاح دے رہے ہیں۔ عالم اسلامی کی بربادیون نے دل ودماغ مین وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے جو مین تصنیف وتالیف پر توجہ کر سکون"

اپنی زندگی کے اس دور مین اس جواب کی گہری سچائی کی کیا قدر کرتا۔ اس وقت اسے محض ایک ادبی لطیفہ سمجھ کر داد دی۔ اس کا احساس تو کئی سال بعد ہوا کہ عالم اسلامی خصوصاً خلافت ترکی کی بربادیون نے بیشک اس مسلم ہندی کا دل خون کر رکھا تھا۔ اور وہ جو کوئی شاعر محض اپنی شاعرانہ رو مین کہہ گیا ہے کہ

سارے جہان کا درد ہمارے جگر مین ہے

یہ محمد علی کے ہان شاعری نہین، بلکہ عالم اسلامی کے حدود کی حد تک واقعہ تھی۔ دنیا کے کسی گوشہ مین پھانس کسی مسلمان کے جسم مین لگتی، اور اس کی چبھن محمد علی کے دل میں ہونے

جون سنہ ۱۱ شروع ہی ہوا تھا کہ میرا عقد، خاندان مین ایک لڑکی کے ساتھ دستور خاندان کے خلاف میری خاص پسند اور شوق سے ہوا۔ اور عین اسی زمانہ مین علیگڈھ کے مشہور ومعروف کارکن، صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے از راہ محبت و قدر افزائی مجھے علی گڈھ بلایا، اور کانفرنس آفس مین لٹریری اسسٹنٹ (مشیر علمی) کے عہدہ پر مامور کر دیا۔ اور محمد علی سے مراسلت کا سلسلہ دراصل یہیں آکر شروع ہوا۔ دفتر مین منشی انوار احمد ہیڈ کلرک اور منشی محمود احمد عباسی امروہوی رہتے تھے۔ یہ دونون بھی کانفرنس آفس مین منسلک تھے، اور محمد علی کے بڑے معتقد۔ (اور اس زمانہ مین کون پڑھا لکھا مسلمان انکا معتقد نہ تھا؟) جس روز ڈاک مین محمد علی کا کوئی مکتوب ہوتا، وہ گویا یوم عید ہوتا۔ خط سلطان جہان منزل (دفتر کانفرنس) کے ہال مین بہ آواز بلند پڑھا جاتا، اور یہ دونون صاحب اپنا کام

چھپ چھپا ذرا اس طرف متوجہ ہو جاتے ——— محمد علی کو دنیا اس وقت تک صرف انگریزی کا ادیب جانتی تھی۔ جوہر کی اردو شاعری کے جوہر سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ یہ امر میرے فخر کے لیے کافی ہے کہ ان کے اس جوہر کا انکشاف سب سے پہلے میرے ہی نام کے ایک عنایت نامہ میں ہوا، اور پھر میں نے ہی اسے خوب پھیلایا۔ جس روز ان کے خط میں کوئی غزل مد آتا، ایک ایک شعر پر واہ واہ کی دھوم مچتی، اور دفتر کا خشک کاروبار کچھ دیر کے لیے بزم مشاعرہ کی چہل پہل میں تبدیل ہو جاتا۔ پورے پورے مکتوب تو انشاء اللہ آئندہ ملاحظہ میں آئیں گے۔ دو چار پھڑکتے ہوئے شعر ابھی اور اسی منٹ سن لیجئے ——— حالی کی غزل 'وفا کے بعد' 'سزا کے بعد' پر غزل کہی، اور کیا خوب کہی۔ مطلع لاثانی تھا ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو میں گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اور اس شعر نے تو خدا معلوم کتنے کشتگانِ یاس کو بارانِ رحمت کے چھینٹوں سے زندہ کر دیا ؎

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

عاشقانہ رنگ میں یہ چوٹ بھی کیا برابر کی کر ڈالی ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

غالب کی مشہور غزل "تم خدا وند ہی کہلاؤ خدا اور سہی" پر یہ غزل کہنا بھی جوہر ہی کا کام تھا ؎

گر چہ جور تھوڑی سی جفا اور سہی اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

ربِ عزت کیلئے ابھی کوئی ہنر و خطاب — تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم وفاکیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت — شمعِ محفل جو وہ کہلا فرد رہا اور سہی

گفتگو پرلطف سہی لیکن بہرحال بے ترتیب شروع ہو گئی۔ ذکر تو ابھی کچھ قبل یہ ہوا تھا کہ ۲۳ مئی سنہ ۲۵ء کے خط میں محمد علی نے میری کتاب "سایکالوجی آف لیڈرشپ" طلب فرمائی تھی۔ سوال قدرۃً یہ ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اس فرمایش کا حشر کیا ہوا؟ حشر یہ ہوا کہ کتاب پہلی ڈاک سے ہدیۃً ان کی خدمت میں بھجوا دی گئی۔ اور جب جون کا مہینہ بھی گزر گیا اور کتاب پر کوئی رائے نہ موصول ہوئی، تو دل میں ایک تجسس سی رہنے لگی، کیا کتاب نہیں پہونچی؟ پہونچی مگر اتنی ناپسند ہوئی کہ اس پر اظہار رائے سے گریز کیا گیا؟ یا اور کوئی بات ہوئی؟ غرض طرح طرح کے وسوسے دل میں آنے لگے، اور آخر شروع جولائی میں ایک تقاضا کا خط لکھا جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ "آپ ملک کے ان گنے چنے چند افراد میں ہیں جن کی رائے اور تبصرہ کی میں وقعت کرتا ہوں" جواب آیا، اور اتنا مفصل کہ مکتوب کے بجائے رسالہ بن گیا۔ اگلے باب میں تمام و کمال اسی کو ملاحظہ کیجئے۔ یہ یاد رہے کہ مراسلت ابھی اردو میں نہیں شروع ہوئی تھی۔ کتاب انگریزی میں، میرا خط انگریزی میں، جواب بھی قدرۃً انگریزی میں۔ آگے ظاہر ہے کہ خط بجنسہٖ نہیں بلکہ اس کا ترجمہ نقل ہو رہا ہے۔

باب (۲)

سنہ ۱۹۱۲ء (۲)

(نقادی۔ نظربندی۔ شاعری)

(دستخط سنسر) یکم اگست ۱۹۱۲ء چھندواڑہ... ۲۸ جولائی ۱۹۱۲ء

مکرمی۔ جی ہاں جیسا کہ آپ نے یاد دلایا ہے، آپ کی "سایکالوجی آف لیڈرشپ" میرے پاس میری ہی فرمایش پر آئی ہے۔ اور آپ کے اس فقرہ کو میں اپنے لیے باعث عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ میں ان گنے چنے چند لوگوں میں سے ہوں جن کے تبصرہ کی آپ کوئی پرواہ اور وقعت رکھتے ہیں۔ کتاب اگر ہدیتہً موصول ہوئی ہوتی، جب بھی اغلب یہ ہے کہ میں اس کے موضوع پر ضرور آپ کو کچھ لکھتا۔ لیکن اخبارات میں میں نے پڑھا کہ آپ کی شادی ہوئی اور آپ معاً بعد موٹر میں کہیں باہر جشن عروسی منانے روانہ ہو گئے[۱]۔ اور میں نے خیال کیا کہ کم از کم "ماہ جشن" بھر تو "فلسفۂ محبت" کے آگے "فلسفۂ قیادت" کا تذکرہ بہت ہی بے محل و نامناسب ہوگا، اس لیے اب تک خاموش رہا۔ امید ہے کہ یہ عذر مقبول ٹھہرے گا۔

خیر اب سہی۔ کتاب مصنف کی جس غور و فکر، وسعت مطالعہ اور ذریعہ وسعت

---

[۱] عقد لکھنؤ میں ۲ر جون کو ہوا تھا، اور اس کے دوسرے ہی دن ہم میاں بیوی دریاباد کیلئے روانہ ہو گئے تھے۔ رخصتی کی سادہ اور ہندوستانی تقریب انگریزی اخباروں میں "ہنی مون" بن گئی، مرزا نے اس خبر کو پڑھا تھا۔

قوتِ مشاہدہ کی شہادت دے رہی ہے۔ اس کے لحاظ سے مین داد دیتا ہون۔ ہمارے پڑھے لکھوں سے غور وفکر کی طرح ذوقِ مطالعہ بھی عنقا ہوگیا ہے اور اتنا بھی مادہ باقی نہین رہا ہے کہ دوسرون ہی کے خیالات سمجھ کر پڑھ لیے جائین۔ لیکن آپنے اپنی مختلف واقعاتِ نفسیاتی کی جو مثالین درج کی ہین اُن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں صرف دوسرون کے خیالات پر کتفا نہین کیا گیا ہے۔ مین داد وستایش کی زبان مین اور بہت کچھ لکھ سکتا ہون۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو مقصود میری "تقریظ" نہیں بلکہ "تنقید" ہے۔ آپسے ملاقات ہوتی تو زبانی مین بہت تفصیل سے اپنے خیالات ناقص عرض کرتا۔ ایک خط کے حدود کے اندر ایک فلسفہ کی کتاب پر تفصیلی ریویو کیونکر آسکتا ہے۔ آپ کو صرف مختصر اشارات پر قناعت کرنا ہوگی، یہ محض خاکہ کے طور پر ہوئین گے۔ اور آپ غالباً ان سے یہ سمجھین کہ کتاب کا مطالعہ محض سرسری اور متفرق مقامات سے کیا گیا ہے۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ میں عموماً مطالعہ بہت آہستہ آہستہ کرتا ہون اور آپ کی کتاب کا منثور مطالعہ تو میں نے کئی دن مین کیا، بہرحال میرے منتشر نوٹ حسب ذیل ہین:۔

۱۔ عبارت

موجودہ فلسفیانہ زبان پر آپ کو جو قدرت بلکہ عبور حاصل ہے، اس پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہون۔ بیان ہر جگہ صاف ہے اور جو شخص نفسیاتِ جدیدہ سے واقف ہوا سے آپکے مفہوم کے سمجھنے مین کہین بھی دقت نہین ہوسکتی۔ لیکن اس ضرورت کو تو آپ بھی نظرانداز نہیں کرسکتے کہ پڑھنے والون کی ایک تعداد اہل "اجتماع" کی بھی ہوگی اور آپ ان "عوام" کی داد وتحسین سے خواہ کتنے ہی بے نیاز ہون لیکن ان کی ضرورتون سے تو آپ قطع نظر

نہیں کرسکتے۔ اور ان کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ زبان میں مصطلحات زیر قلم استعمال کی جائیں یا یوں کہیے کہ نفسیاتی زبان کے ساتھ ساتھ توضیحات اور مثالوں کا حصہ زیادہ ہو۔ ممکن ہے کہ میں کچھ زیادتی کر رہا ہوں، اس لیے کہ مجھے خود طوالت کی لت پڑی ہوئی ہے، اور محض اپنا خیال، پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دینے پر بس نہیں کرتا، بلکہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح زبردستی اس کے دل کے اندر بھی اتار دوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بغیر طوالت کے عیب کے بھی آپ اپنی کتاب کو اس کی موجودہ ضخامت سے دوگنا تو کر ہی سکتے ہیں۔

۲۔ مغز

مغز کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اجتماع سے تو آپ نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، لیکن "قائدین" (لیڈروں) میں اسی قدر اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ بالکل درست ہوتا کہ آپ اجتماع کی نفسیت پر بحث کر کے لیڈروں کے متعلق ایک منفیانہ پہلو اختیار کرتے یہ کہہ کر کہ اجتماع میں جن اوصاف کی کمی ہوتی ہے، وہ اس کے افراد میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ جس عمومی حیثیت سے آپ اجتماعات پر بحث کر سکتے ہیں، وہ اس کے لیڈروں کے لیے کافی نہیں کر سکتے۔ کتاب کی نظر ثانی کے وقت، میں آپ سے بزور سفارش کرتا ہوں کہ لیڈروں کے متعلق اپنے اس تناسب کو بدل دیجئے۔ کتاب کا یہ حصہ زیادہ تفصیل کا مستحق ہے۔ اور اس حصہ میں مزید شرح و بسط کی گنجائش ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔

۳۔ اجتماع

اجتماعات سے متعلق آپ کے نظریات سے اجمالاً متفق ہوں، لیکن یہاں بھی مزید تفصیل

وتنظیم کی ضرورت تھی۔ نظم وضبط کی اہمیت کو تو آپ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اور ماناہے کہ اجتماع
جب اس وصف سے متصف ہو جاتے ہیں تو ان کی قوت زبردست بھی ہو جاتی ہے اور مفید بھی
لیکن اجتماع کا مفہوم آپکے ذہن مین بس ان بڑے بڑے جلسوں اور مظاہرون کے مترادف معلوم
ہوتا ہے، جو ہندوستان مین ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں نہ کہ ان "مجلسون" اور "کانفرنس" کا جہاں
وامرھم شوریٰ بینھم کے ارشاد ربانی کی تعمیل ہوتی رہتی ہے اور جہاں آزادانہ بحث
ومباحثہ نظر وفکر کے بعد "اجتماع" کے فیصلے اکثر افراد کے فیصلون سے زیادہ معقول اور
"اجتماع" کا عمل بھی افراد کے عمل سے زیادہ منظم ہو جاتا ہے۔ آپکے فحوائے تحریر سے
ظاہر ہے کہ "اجتماع" (بھیڑ) کی حقارت آپکے ذہن مین بیٹھی ہوئی ہے (خود یہ لفظ ہی
تحقیر آمیز ہے۔ عربی لفظ "جمعیۃ" اس سے کہیں بہتر ہے) کیا میرا یہ خیال صحیح ہے کہ
آپ "اجتماع" کی تحقیر کر رہے ہین یا یہ ہے آپ اپنے خیالات پوری طرح واضح نہیں کر سکے
یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے اس طرف (بلکہ یوں کہیے کہ آج سے ۱۵ مہینہ قبل نظربندی
کے وقت تک) جمہوریت سے خوب خوب سا لیتے رہے اور ممکن ہے کہ آپ مجھے بھی ان عوام
پسند زعیمون مین شمار کر رہے ہوں، جو زبان سے تو عامۃ الناس کی بڑی تعریف کرتے
رہتے ہین، مگر دل ہی دل مین ان عوام کو کالانعام اور چوپایہ سمجھتے رہتے ہین لیکن حقیقۃً
مین جہاں تک اپنے جذبات اور خیالات کا اندازہ لگا سکا ہوں، میرے خیال میں نسبتہ
سب سے بہتر بلکہ اکثر تو بہترین فیصلے جماعات ہی کے ہوئے ہین نہ کہ افراد کے، گو سرعت عمل
کے لیے افراد ہی کی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خیر یہ تو ایک الگ بحث ہے
مین کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے توقع یہ تھی کہ آپ مختلف اجتماعات کی مختلف نفسیتون پر
نظر رکھیں گے۔ مومنین کی وہ آزاد جماعت جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سال

مدت نبوت اور خلافت راشدہ کے ۳۰ سالہ زمانہ میں موجود رہی، ایک ایسے ہی اجتماع کی مثال ہے جو اپنے قائدین کی سلیم ترین طبع ثابت ہوئی گیا عمر[1] کے متبعین میں کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ نکتہ چین نہ رہے ہوں۔ اور پھر آج کل کے بھی کسی ایسے "اجتماع" کی بابت جیسا کہ برٹش ایسوسی ایشن[2] جو ہر سال برطانیہ اور اسکے علاقوں میں اپنے اجلاس کرتی رہتی ہے، آپ کیا رائے دیں گے؟ (بہ طور جملۂ معترضہ مجھے اس سے مسرت ہو رہی ہے کہ اب آپ کو اس کا موقع حاصل ہے کہ جس "اجتماع" کو ہمارے قدیم دوست آفتاب[3] بارہ چودہ سال سے برابر ہانکتے چلے آتے ہیں اب اسے صحیح معنی میں کانفرنس بنانے میں مدد دے سکیں[4]) لیکن آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ آپ "اجتماع" پر اعتماد کریں اور احتیاط سے بھی کام لیتے رہیں۔ نہ یہ کہ کسی طرح اس سے بے اعتمادی قائم رکھیں اور اس سے خوف کھاتے رہیں۔

۴۔ قیادت

آپ کے فحوائے کلام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قیادت جس کا نام ہے وہ محض ایک تسلسل ہے چالبازیوں اور فریب کاریوں کا، احمق عوام الناس کے احمق بنائے جاتے رہتے کا، میکیلین اور گگ کی طرح شعبدہ بازیوں کا محض ایک طلسم ہے ـــــ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے یہ لفظوں میں کھل کر نہیں کہا ہے بلکہ کہیں کہیں تو آپ نے قیادت صادقہ و قیادت کاذبہ کا امتیاز بھی قائم کیا ہے۔ لیکن نفسیات کے اندر صدق و کذب کا فرق ہے بھی؟ نفسیات کے نقطۂ نظر سے تو

---

[1] اب تبلیغ دین کھلم کھلا ہو رہی ہے [2] برطانیہ میں سائنس کی ممتاز ترین علمی مجلس [3] یعنی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مولانا کے اور انکے مسلک میں بڑا اختلاف تھا اور برابر چشمک چلی جاتی تھی۔
[4] صاحبزادہ صاحب نے مجھے بطور لٹریری اسسٹنٹ کے رکھا ہے میں اس وقت اتفاق سے کانفرنس کے دفتر ہی میں تھا

جو کچھ بھی ہے حقیقت ہی ہے۔ لیکن محرکاتِ عمل ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اور اخلاقی حیثیت سے بعض قابلِ ستایش ٹھہریں گے اور بعض قابلِ مذمت۔ مجھے توقع تھی کہ آپ مختلف انواع کے قائدین کے اعمال، خیالات و جذبات پر تفصیلی بحث کریں گے اور فرق دکھائینگے کہ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو عمداً دوسروں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے جو غیرارادی فریب دہی سے قبل خود فریب کا شکار ہو چکتے ہیں۔ اور پھر کچھ ایسے بھی جو پہلے تو ارادۃً دوسروں کو فریب دیتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ خود فریب نفس میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کتاب کا یہ حصّہ بہت ہی سرسری ہے اور اتنا مجمل ہے کہ مطالعۂ نفسیات میں اس سے مدد نہیں مل سکتی۔

۵۔ نظائر

مثالیں اور نظیریں، جیسا میں پہلے کہہ آیا ہوں میری رائے ناقص ہیں کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ اسکے علاوہ انکی تقسیم بھی نامساوی و نامناسب ہے شبلی مرحوم کا ندوہ والا واقعہ اور کلکتہ کے بدمعاشوں کے ہاتھ سے دو عیسائی مبلغوں کا پٹنا، یہ چیزیں اس قابل نہ تھیں کہ انھیں ایسی کتاب میں بطور مثال درج کیا جائے جس میں آپنے کثرت سے اہم تاریخی واقعات بیان کئے ہیں جو ناظرین کے لئے عموماً مشہور و معلوم ہیں۔

۶۔ پیغمبر خدا کا ذکر

میری تنقید کا آخری عنوان آپکے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپنے پیغمبر خدا اور قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بناء پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپنے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر

ہلکے پن سے کیا ہے۔ کیا "آورد" اور "تصنع" نے "ناطرفداری" اور "خالص علمی تحقیق" کے اظہار کے لئے مجبور کیا؟ یہ سوال میں ایک نقادِ نفسیات کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں، جو ایک مسلمان مصنف سے کتاب اللہ اور رسول اللہؐ کے تذکرہ کے وقت ادب و احترام کی توقع رکھتا ہے۔ میں اس سے بے شبہہ خوش ہوا کہ آپ نے محض دنیوی قائدین کی مثالیں دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ہمارے اولوالعزم نبی محترم کی شخصیت سے بھی قیادت اور نفسیاتِ قیادت کی مثال میں کام لیا لیکن آپ کے لب ولہجہ میں تو صاف عیسائی مشنریون کی بو آرہی ہے، جو یہ دکھانا چاہتے ہیں یا کم از کم پڑھنے والے کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتے ہیں کہ محمدؐ (جن کے دین پر میں اور میرا سارا کنبہ قربان ہو) نعوذ باللہ ایک پیغمبر کاذب یا محض لسان تھے۔ بلکہ آپ تو یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ قریشؐ اور یہود جو رسول اللہ کے گرد محض اُن کی اہانت و تحقیر کی غرض سے جمع ہوتے تھے اور ان کی بدتمیزیوں پر قرآن مجید میں احکام صادر ہوئے ہیں آپ نے ان احکام پر نقد شروع کر دیا ہے۔ گر آپ کوئی سی بھی سیرۃ اٹھاکر دیکھ لیتے تو آپ کو رسولؐ اللہ کے حضور میں ادب سے گفتگو کرنے کی آیات کی شانِ نزول مل جاتی۔ اسی طرح سعد بن عبادہؓ کا بھی وہ واقعہ کہ تقسیم غنیمت کے سلسلہ میں جب انصار کو مہاجرین سے شکایت پیدا ہوئی اور سعدؓ نے رسول اللہؐ کے سامنے انصار کے جذبات کی ترجمانی کی اور رسول اللہؐ نے اس وقت تقریر فرمائی۔ آپ نے اس واقعہ کو بھی توڑ مروڑ ڈالا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں رسول اللہ کی یہ تقریر محض لفاظی و شعبدہ بازی تھی؟ مجھے امید نہیں کہ آپ کا ایسا خیال ہو لیکن آپ کا لہجۂ تحریر یقیناً اسی خیال کا اظہار کر رہا ہے۔ آپ کی بحث قیادت پر مجموعی حیثیت سے مجھے یہ کہنا ہے کہ بہتر ہوتا اگر آپ نے قیادت کے اصلاحی پہلو کو صفاتِ قیادت سے الگ رکھا ہوتا۔ پبلک زندگی میں کم و بیش ہم سب کچھ نہ کچھ

تصنع سے کام لیتے ہیں۔ بناوٹ ہم سب میں ہے۔ اسی لئے ہمارے خدمتگار، اور اُن سے بڑھ کر ہماری بیویاں ہمارے دھوکے میں نہیں آتیں۔ لیکن ہمارے پیغمبرؐ نے اپنی عمر کے پورے چالیسؓ سال مکّہ والوں کے درمیان ایک عام انسان کی حیثیت سے گزارے۔ اور اس طویل مدّت میں انھیں اُنکی صداقت کے جانچنے کے ہر طرح کے موقعے حاصل رہے۔ جب چالیسؓ برس کے بعد انھیں "امین" کا لقب حاصل ہوگیا اور وہ اپنے مقدس فرض کی ادائگی کے لئے تیار ہوچکے جب جاکر اُن پر اللہ کی وحی نازل ہوئی اور جب بھی انھوں نے اُسے قبول کیونکر کیا؟ تجھکے ساتھ ڈرتے ہوئے۔ جھجکتے ہوئے اور سب سے پہلے ایمان ان پر کون لایا؟ سب سے پہلے انکی چہیتی بیوی، پھر کمسن چچا زاد بھائی، پھر اُن کا عزیز ترین وقدیم ترین دوست۔ فریب باہر والوں کو دیا جاسکتا ہے اور تصنع اور ابن الوقتی سے اُنکے سامنے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ حال تھا کہ تصدیق کرنے والے اور تسلّی دینے والے وہی تھے جو خلوت کے محرمانِ راز تھے۔ کم از کم یہ ہستی تو چالبازیوں سے بالاتر تھی[1]۔ یہی صحیح ہے کہ خدا نے اس کے سامنے سب کو خاموش رہنے یا مؤدّبانہ گفتگو کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن یہ اس رُعب وسطوت وجاہ کے قیام کے لئے نہ تھا، جس کی دھن میں مٹھی بھر پردیسی لاکھوں کروڑوں پر حکومت کرنے کے گئے لگے رہتے ہیں جو اس جاہ واقتدار کے بھوکے ہیں وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کبھی اعتراف نہیں کرتے لیکن قرآن تو ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں پیغمبر کو کہیں تو تنبیہ ہے کہ دیکھو فلاں غلطی نہ کرنا جس کے بہت قریب پہونچ گئے ہو۔ اور کہیں یہ فہمایش ہے کہ فلاں بات جو کر چکے ہو، خبردار آیندہ نہ ہونے پائے۔ ہر مفسّر اور تفسیر داں آپ کو بتا سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے

[1] مولانا کی تنقید کا یہ حصہ تمام تر واقعیت پر مبنی تھا۔ میں اپنی زندگی کے اس ملعون دور میں فرنگی محققین ہی کا ہم عقیدہ وہم زبان، بلکہ ان کا گراموفون بنا ہوا تھا،

جن بعض افعال سے قرآن میں اپنی جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اسکے لئے خاص اصطلاح ہے۔ یا پھر جب پیغمبرؐ کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا ہے اور سورج میں گرہن اسی وقت پڑا ہو اور عرب کے لوگ گرہن کو اسی سانحہ ہی کا نتیجہ قرار دینے لگے تو اس موقع پر کوئی جاہ پسند شخص ہوتا تو اس حسنِ اتفاق سے کیا کچھ فائدہ اٹھاتا۔ لیکن قرآن جو وہم پرستیوں کا خاتمہ کرنے آیا تھا اس نے اس موقع پر بھی اپنا فریضہ خاص طور پر ادا کیا۔ ایک طرف زرادیشت کے مدعی تقدس آدین گگندودرس کا یہ دعویٰ ملحوظِ خاطر رہے کہ میری پیدائش کے وقت آسمان گرجا اور دوسری طرف قرآن کو دیکھئے کہ اس قسم کے اوہام کو کس کس طرح مٹاتا ہے۔ آدین گگندودرس کو یا لاخر یورپ ہی میں جواب یہ ملا تھا کہ یہ موسمی کڑاک اور گرج اس موسم میں تو اس وقت بھی ہوتی ہے جب کوئی بلی بچہ جنتی ہوتی اور وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن ادہر دیکھئے، اللہ نے خود پیغمبرؐ کی زبان سے اس خیال باطل کو جو طبعاً شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا تھا، یوں دور کردیا کہ آفتاب اور ماہتاب میں گرہن اپنی اپنی طبعی میعاد پر پڑا کرتے ہیں؛ انھیں انسانوں کی شادی غمی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ صحابہؓ کے خیال میں یہ جما ہوا تھا کہ آنحضرتؐ کی وفات کے ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عقیدہ پر وہ مضطر و مجبور تھے اور جب آپکی وفات کا واقعہ پیش آیا تو جن کا ایمان سب سے زیادہ قوی اور مستحکم تھا، وہ فرطِ صدمہ سے دنگ و ششدر رہ گئے۔ انھیں خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کوئی زمانہ ایسا بھی آئیگا، جب پیغمبر خدا اس دنیا میں موجود نہ ہونگے۔ جن کا ایمان اس درجہ کا نہ تھا یا جن کی عقلوں پر عقیدت مندی غالب تھی، انکا تو ایمان ہی متزلزل ہو چلا۔ عمرؓ خود اس درجہ متاثر ہوئے کہ جہاں ایک سردارِ اعظم اور عملی انسان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ان لوگوں کی روک تھام کی فوری ضرورت محسوس کی، وہاں کوئی علمی تدبیر

سوا اس تخویف کے ان کے ذہن میں نہ آئی کہ "خبردار، اگر کسی نے پیغمبر خدا کو متوفی کہا تو اس کا سر اڑا دوں گا"۔ عین اس وقت وہ شخص جسے بجا طور پر صدیقؓ کا لقب ملا تھا، اٹھا اور اس نے تسلی دلاسا دے کر لوگوں کو مطمئن کیا۔ لیکن یہ کیونکر؟ محض ان آیات قرآنی کو سنا کر جنھیں خود حضرت محمدؐ (میری ماں اور باپ اور اولاد سب اُن پر قربان) نے دنیا تک پہونچایا تھا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (اور محمد کیا ہیں بجز ایک رسول کے اُن سے قبل اور بھی رسول ہو گزرے ہیں، اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر (کفر کی طرف) واپس چلے جاؤگے؟) حضرت ابوبکرؓ نے بالکل صحیح طور پر حضرت عمرؓ کو ٹوکا۔ محمدؐ کی وفات ہو چکی تھی۔ لیکن ربِ محمدؐ کی وفات نہیں ہوئی تھی اور وہ حی و قیوم زندہ تھا۔ یہ تھا اس انسان کی ساری زندگی کا حاصلِ وعظ جس نے کبھی اپنی عبدیت کے باب میں شک و شبہ بھی نہیں پیدا ہونے دیا۔ "جاہ و سطوت" کا جو مفہوم آج شائع ہے وہ تو یہ ہے کہ نہ صرف فرمانروا معصوم ہے بلکہ حکام بھی اس معصومیت کے حصہ دار ہیں۔ نہ صرف "قانون" مادرائے تنقید اور معصوم ہے (قانوناً تو قانون معصوم ہی ہے اسلئے کہ بادشاہ کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ قانوناً بادشاہ سے برتر کوئی قوت نہیں، اسلئے بادشاہ کا جرم پیش کس کی عدالت میں ہو؟) بلکہ اس قانون کے نافذ کرنے والے بھی امکانِ خطا سے ماورا ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے اس عقیدہ کو شرک قرار دیا جس سے دنیا کو نجات دلانے وہ مبعوث ہوئے تھے۔ وہ خود معصوم بے شبہ تھے مگر اس حیثیت سے کہ پیغمبر الٰہی تھے، اور پیغامبر بھی اگر معاصی کا شکار ہو سکتا تو خود پیام کی صحت مشتبہ ہو جاتی لیکن آپ نے اس کی صاف تشریح کر دی ہے کہ جس وقت میں اپنے منصب رسالت سے الگ ہوں اس وقت میری تمہاری حیثیت یکساں ہے۔ "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ"۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو آپ نے بہ حیثیت ایک تجارت پیشہ مکی کے مدینہ کی زراعت پیشہ آبادی سے اسوقت فرمائے

جب اُن لوگوں نے ایک فصل میں آپ کے مشورہ کے بموجب اور اپنے دیرینہ معمول کے خلاف اشجارِ خرمہ میں قلم نہیں لگائے تھے۔ لیجیے یہ خط بہت زیادہ طویل ہوگیا ہے اور اسلیے ہوا ہے کہ مجھے خواہ غلط ہی سہی، یہ شبہہ ہوگیا ہے کہ آپ نے دنیا کے مخلص ترین قائد اعظم کی جانب چالاکی کا انتساب کیا ہے۔ اگر میرا یہ شبہہ بجا ہے تو آپ اس طوالتِ بیان کو معاف کریں اور عبارات متعلقہ پر ایک بار پھر غور کر لیں۔ جب کتاب کی طبع ثانی کی نوبت آنے لگے، اور طبع ثانی کی نوبت جلد ہی آنی چاہیے، اُس وقت تک کے لیے میرا شکریہ قبول ہو کہ آپنے ایسا تحفہ مجھے دیا جس کے باعث مجھے بھی بہت کچھ غور کا موقع مل گیا۔ زیادہ آداب و تسلیمات۔

آپ کا مخلص ۔ محمد علی

مکرر۔ آپ نے مجھے رائے دی کہ میں اس جبریہ تعطیل کے زمانہ میں کوئی کتاب لکھنا شروع کر دوں[1] اور مجھ سے اس کی توقع بھی کی جا رہی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے مجھ سے اس کی توقع قائم کی ہے، وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ اولاً تو مجھ میں وہ صبر و تحمل اور استقلال ہی نہیں ہے جو ایک عالم محقق میں ہونا چاہیے۔ دوسرے جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں، اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں۔ رہی یہ جبریہ فرصت سو مجھے یہ فرصت ملنے ہی کیوں پاتی۔ اگر میرے جذبات اس قدر ضعیف ہوتے کہ جس وقت اغیار تاریخ سازی میں مصروف ہیں، میں تاریخ نویسی میں لگا رہتا۔ نہیں میرے عزیز دوست نہیں۔ میرا دماغ، میرا دل، دونوں اس وقت جس عالم میں ہیں، وہاں تصنیف و تالیف جیسی "تفریحات" کی گنجائش کہاں؟ البتہ کبھی کبھی دل کے ابھار سے

[1] میں نے عرض کیا تھا کہ اس جبریہ فرصت کے زمانہ میں تاریخ پر کچھ لکھ ڈالیے۔

دماغ دو چار شعر موزون کر لیتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا ذوق ہو تو میں ایک آدھ غزل آپ کو بھیج سکتا ہون۔ یہ وہ غزلیں ہیں جو ۱۵ مہینے کے زمانۂ فرصت مین مہلت کے لمحے نکال نکال کر ضبط تحریر میں لا سکا ہون۔ یہاں کے ایک حاکم صاحب نے وہی رائے دی جو آپ نے پیش فرمائی یعنی تصنیف و تالیف۔ میں نے جواب دیا کہ اس وقت تو میرا موضوع تصنیف دو ہی چیزیں بن سکتی ہیں، ایک "کربلا" دوسرے "قتل ہجرت"۔ اپنے چند شعر اسی وقت پیش کیے دیتا ہوں۔ میری ترجمانی کسی قدر ان ہی سے ہو سکے گی۔ (انگریزی سے ترجمہ ختم ہوا)

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسینؓ اصل مین مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس طرح سے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

اللہ کے بانکون کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخیِ خونِ شہدا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

آ سال نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

باب (۷)

سنہ ۱۹۱۶ (۳)

(مزید مراسلت۔ اسلام سے شیفتگی)

کتاب پر تبصرے بہتوں نے کیے تھے، اچھے اچھے پیشہ ور تبصرہ نگاروں نے بھی۔ محمد علی کا تبصرہ سب سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ کوئی دوسرا ریویو نہ اتنا جامع تھا نہ اتنا مفصل، نہ اتنا گہرا نہ اتنا مبصرانہ، نہ اتنا پرمغز نہ اتنا مخلصانہ۔ نہ بیجا مداحی نہ خواہ مخواہ کی تنقیص۔ اور فنی پہلوؤں سے قطع نظر کیجیے، تو تبلیغ کا انجکشن شروع سے آخر تک جا بجا موجود!—
خاکسار مؤلف کا اپنے دورِ الحاد و بے دینی میں سابقہ، اور گہرا سابقہ، بہت سے مسلمان دوستوں اور صاحبِ علم و فضل مسلمانوں کے ساتھ رہا کیا۔ ان میں سے تقریباً سب کو افراط یا تفریط ہی میں مبتلا پایا۔ اکثر تو ایسے ملے، جو دوستی اور مروت کے غلو میں میرے ہر عیب کو ہنر ہی بنا کر پیش کرتے بلکہ شاید خود بھی یہی سمجھتے رہے۔ اور میری صریح بیہودگیوں پر پردہ ہی ڈالتے رہے۔ اور کچھ ایسے بھی نکلے۔ جو اس کے برعکس سرتاپا شعلہ و شرر رہتے۔ حمیت دین کی زیادتی اور حرارت مذہبی کی افراط انھیں میرے ساتھ انصاف میں مانع ہوتی رہی۔ تنہا ان میں کہنا چاہیے کہ ایک محمد علی ہی ایسے تھے، جو ایک طرف میرے الحاد و بے دینی پر برابر مجھے ٹوکتے رہے، اور دوسری طرف دوسری حیثیتوں سے میری حوصلہ افزائی اور دلجوئی میں بھی لگے رہے۔

قدرۃً اس تنقید نامہ کی بڑی قدر ہوئی۔ دو ایک روز تو یہ عنایت نامہ خود گشت میں رہا۔ ، راگست کو اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ خط کا مضمون تو اب ۴۲ سال بعد ذہن میں کیا رہ سکتا ہے، ہاں بہ طور خلاصہ کے یہ خیال پڑتا ہے کہ پہلے تو اتنے مفصل انتقاد کا شکریہ تھا، پھر کچھ اپنی حمایت میں یہ چھوٹی آڈیل تھی کہ کتاب کا مقصود پیمبری سے انکار نہیں، بلکہ "ناطرفدارانہ" ان شخصیتوں کو محض بشری حیثیت سے پیش کرنا تھا۔ اپنی نئی اردو کتاب "فلسفۂ اجتماع" کا ذکر تھا، جو حقیقۃً اور معنیً اسی انگریزی کتاب کا ایک مفصل و مشرح ایڈیشن تھا۔ یہ بھی ذکر تھا کہ اب انگریزی میں "نفسیات قرآنی" (سایکالوجی آف دی قرآن) پر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور آخر میں کلام جوہر کی دل کھول کر داد دینے کے بعد یہ سوالات تھے کہ یہ تو آپ بڑے چھپے رستم نکلے۔ شاعری کب سے شروع کی کس سے سیکھی؟ کتنا کلام ہو گیا ہے؟ وغیرہ۔ اور اسی میں ایک چبھتا ہوا فقرہ اس قسم کا بھی تھا کہ آپ کی "امت" آپکے کلام سے لذت اور تسکین دونوں پائے گی ــــــــ جواب محمد علی نے خلافِ عادت و خلافِ معمول بہت جلد یعنی ۱۶ر ہی اگست کو لکھ ڈالا۔ خط نہیں بلکہ ایک بھی رسالہ اور پہلے رسالہ سے ضخیم تر! ــــــــ مراسلت کی زبان اب بجائے انگریزی کے اردو ہو چکی تھی۔ میں نے اردو میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے جواب بھی اردو ہی میں آیا۔ کچھ ابھی اور فوراً ملاحظہ کیجئے، اور کچھ کئی صفحوں کے بعد اگلے باب میں۔

"۱۶ر اگست ۱۶ء چھندواڑہ۔

مکرمی۔ السلام علیکم۔

عنایت نامہ مورخہ ، راگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ

میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائیں۔ مگر نیت بخیر تھی، اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ افساد۔ اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و توصیف سے زیادہ پسند ہو گی۔ عریضہ ہی مفصل تھا۔ مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کر سکتا۔ اس زمانہ میں استبداد اور استعباد نے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لیے ہیں Destructive, Constructive۔ (یا تعمیری و تخریبی)۔ اور اس میں سے موخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اس عنقا صفت تنقید کے لیے سینت کر رکھ لیا ہے جو نہ آج تک آنکھوں نے دیکھی اور نہ کبھی کانوں نے سنی، اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی جا گزین ہوئی۔ حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا اولین فرض یہ ہوتا ہے کہ اس قصر سر بفلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور میں ہوتا ہے (کہیں کہیں شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آ جاتا ہے)۔ زمین کو صاف کرنے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات، بدنما جھونپڑے، اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیاں وہاں سے دور کر دے۔ بہر حال تعمیر سے پہلے تخریب تھوڑی بہت کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر ارباب ادب کے عام اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تنقید تخریب کی غرض سے نہ ہو، بلکہ تعمیر کا پیش خیمہ ہو۔ سو میں نے جو کچھ بھی لکھا، اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری اور مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں۔

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے ہیں، اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں، جتنا کہ کوئی اور پیشوا ہو گزرا

جس کی نظیر کتاب میں ہے۔ ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہان تبولین وغیرہ کا موازنہ کیا جاتا وہان ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے۔ آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصطلاح میں آپ کا "غیر طرفدار" رہنا بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر مذہب و ملت والا پڑھے قرین مصلحت تھا۔ میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے، اگر اعتراض ہے تو محض طرز عمل (Execution.) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہوگیا کہ آپ وہی چاہتے ہیں جو میں سمجھتا تھا کہ آپ چاہتے ہوں گے، اس لیے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہوگئی، اور وہ ابھی باقی ہے یعنی ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کی اور نیز اُن موقعوں کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور اثر پڑتا ہے کہ وہ بار بار غور کرنے کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مارگولیتھ (میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Research.) کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کیے گئے تھے، اس کے علاوہ بیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ نہ آپ کا مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لیے میری توقع بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دیکر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالت کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے، تاکہ وہ عظمت، جو ایک وحی پانے والے رسول کی اس کے دل میں ہو، دور ہو جائے، اور اس طرح دور ہو کر خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلی خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اسی لیے بطور ایک نعم البدل کے خلعت نبوت اتار کر لیڈری کی گون (Gown.) پہنا دی۔ یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس طرح حساب میں بچے اپنے سوالات کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دیکر دیکھتے ہیں

اور تفریق کا ہے توجع کرکے۔ اسی طرح ایک پڑھنے والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو
اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ، ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثر کو الٹ دیا جائے
اور تنقید جو ایک نقاد پیش کرتا ہو، اس کو صحیح تسلیم کرکے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل
پر بہ قول اس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اسے قبول کرکے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ
جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر نقش ہو گئے تھے ، باقی رہتے ہیں یا مٹتے جاتے ہیں ۔ یہ بھی یاد
رہے کہ جب گھڑی ساز گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو سنبھالنا چاہتا ہے تو خوردبینی شیشہ
لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ اس غرض سے کہ باریک سے
باریک نقص بھی صاف نظر آئے اور اصلاح کی جا سکے ۔ اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اس
غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اسے لطیف و باریک بین
بننا پڑتا ہے، چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ فساد ، اس لیے یہ بال کی کھال نکالنا اس کیلیے
جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اصرار کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے مین نے بھی اس
تنقید مین مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام
لین ۔ جوہری جب نگین تراشی مین مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراش
و خراش مین صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسی باریک اصلاح مین جس کا
نظر آنا تقریباً ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت مین تراشتا ہے وہ نہایت باریک
خاک کے چند ذرے ہوتے ہین ، جن کو تراشتے تراشتے ہی ہوا لے اڑتی ہے ۔ مصنف
کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں ، اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اس کی تصنیف
کا اور کوئی نہ ہونا چاہیے ۔

[1] میری دوسری کتاب کا نام ہی، انگریزی لیڈرشپ ہی کا گویا اردو ایڈیشن تھا۔ زیادہ تفصیل در معلوم۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

"فلسفۂ اجتماع" کب تیار ہوئی[1] ؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے

شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی۔ اسے چاہیے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم دو سو پچاس اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے، اخبار والے اس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے۔ میں نے خود بمد، دین یہی کیا تھا۔ مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے۔ آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور (Psychology of The Advertiser) پر عبدالحق صاحب کو ضرور لکھیے۔[1]

نفسیات القرآن پر آپ نے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس کے متعلق کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کام کا نقشہ، اور تخمینہ' باصلاح تعمیرات کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے، اگر میں عرض کروں کہ بقول حالی ع

یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے[2]

جو کچھ بھی لکھا جائے، وہ یہ سمجھ کر کہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہے مگر اس کی تمام Psychology خلاق زمین و آسمان کی ہے۔ غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist. بھی انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ اس طرح واقف ہو سکتا ہے نہ ان کے اظہار کے لیے الفاظ اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہے۔ جس طرح خود اس ذات پاک نے

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب (بعد کو ڈاکٹر عبدالحق اور بابائے اردو) اس وقت بھی انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری تھے [2] اس وقت انگریزی میں سائیکالوجی آف دی قرآن' پر لکھنے کا ارادہ تھا، اسی تمدانہ رنگ میں۔ بحمد اللہ کہ یہ ارادہ اس وقت محض ارادہ ہی کی حد تک رہا۔ محمد علی اس وقت بظاہر بالکل انگریزیت میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن دل و دماغ کے ریشے ریشے میں اللہ اکبر کس درجہ اسلامیت رچی ہوئی ہے۔

قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا ہے، جو عالم الغیب والشہادۃ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔
اگر آپ کا یہ خیال ہے، تو میدان نہایت وسیع ہے مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا
پڑتا ہے۔ میں ہرگز ان لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں جو کلام ربانی سے اس درجہ خائف
ہو جائیں کہ اسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں گچھیں۔
کلام پاک ریشم کے جزدانوں اور الماری کے بالاترین حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لیے
آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے
مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں، بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور
انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے
والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے۔ نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مجھ
اُن لوگوں سے ہمدردی ضرور ہے جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں
گو برس دو برس میں ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو۔ یہ ام الکتاب ہے اور اس کا ادب باقی
رکھنا اس لیے لازم ہے کہ اگر اتنی احتیاط نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہے۔ اور باقی
تمام صحف ماقبل اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ اور سخت و نخراش ثبوت
ہیں۔ اس لیے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلامتن میرے پاس ریویو کے لیے
بھیجا تو میں نے انھیں اطلاع دیدی کہ مجھے ایندھن کی آج ضرورت نہیں ہے۔ کیا مسلمانوں
کے لیے یہ بات باعث ناز نہیں ہے کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے
اس ام الکتاب کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک لفظ یا حرف تو کجا زیر و زبر
کا بھی فرق نہیں ہونے پایا۔ اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلی کرتے ہیں۔ قرآن پاک تو
قرآن پاک دوسرے صحائف۔ ہمارے کتب حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت

سا بھی مقابلہ نہین کر سکتے۔ قصہ مختصر مجھے امید ہے کہ جو کچھ بھی آپ لکھین گے، آدابِ قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھین گے۔ مگر لکھیے ضرور۔ اس سے ہرگز نہ خائف ہو جیئے، یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب غیر ذی عوج ہے کہ عرب کے گنوار مدینہ منورہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سنتے اور ہم سے کہین زیادہ سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے بالون والے خیمون اور ریگستان اور اپنے گھرون مین واپس آجاتے۔ مفسرین کا جہان شکریہ ادا کرنا ہے، وہان یہ شکایت بھی باقی ہے کہ باوجود سچی محبت و احترام کے انھون نے بھی ایک حد تک ادبِ قرآن پاک قائم نہ رکھا، جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا تمام کمال اس صحیفۂ اکرم پر صرف کر دین۔ مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہین حاشیہ متن کو اپنے توجہ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے۔ یہی حال شیکسپیر کے جرمن مشرحین کا ہے۔ اُن کا ساری دنیا پر احسان فرض ہے کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہم وطنون کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہے۔ خدا مسلمانون کو قرآن پاک کے متعلق اس شر سے بچائے۔ آمین!

باب (۸)

سنہ ۱۹۱۶ء (۴)

شاعری کی کہانی شاعر کی زبانی

خط کا ایک حصہ نقل ہو چکا۔ دوسرا جزو جو شاعری کے متعلق تھا، وہ اب نقل ہو رہا ہے اور آج سے پیشتر بھی خدا معلوم کتنی بار کن کن پرچون" رسالون اور کتابون مین نقل ہو چکا ہے:

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہین۔ بچپن مین تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ مین اُس وقت زلف و ابرو کی تعریف مین خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور مین اُس زمانہ مین پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان مین بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے، جن مین ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خان صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خان اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خان صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خان صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض" کار بے کاران" کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب مین تھا،

اس لیے روزانہ ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں، جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) ؎

آیا دلی سے ایک مشکی خر　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل ؛ دیکھیے ؎

آج رخصت جہان سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے، جنھیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے۔ بس کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں، بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں، اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں، غرض کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو و فضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے، اور اچھا ہوا کہ وہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری Official Biography. یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری امت کی طرف سے لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا، اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتش دان کی نذر کیا جائے یا سیرت پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد[1] کے سنسر نے

[1] ہمدرد [illegible] میں سنسر بھی [illegible] تھا کوئی [illegible] بغیر سنسر کی [illegible] کے نہیں چھپ سکتا تھا۔

دلہن کو چند ماہ کے بعد ہی یکایک انتقال ہوگیا) تو ہمدردوں میں سے ایک بار چڑے چڑیا کی
کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ
تنہائی ہے تو چڑیا چڑے ہی کی کہانی، مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدردوں
سے ڈر ہی لگتا ہے اور دوٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں کچھ زہر بھر دیا ہو اور جوابدہی
ہمارے سر آ پڑے۔" آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار
یا جدید نقاد سخت ہونے کے محض لطف پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم
کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے
بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہوکر دنیا کو نئی نئی معلومات اور
عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں؟ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو
اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ
میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے۔ گیارہ
برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی
مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظ کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھی تھی، اٹھا کر
پڑھنے لگا اور میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا
مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان
کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا
جب اس میں پاس ہوگئے تو ایک مصرع طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے
از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا
وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے لکھی اور مولانا

انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا، مگر ہماری نجر گوئی کا بھی خاصا شہرہ ہوا۔
اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔
مگر جب عمر زرا زیادہ ہوئی تو امتحان نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر[1] کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم میں شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خان صاحب (تربیت الدجاج اور "یونین جیک" والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا، ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب تازہ آنریبل آنمو سابق سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر"[2]۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گزر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعد حسرت[3] نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا، چودھویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا "لان" جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھویں کو بارش ہوگئی تو سہ دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر یونین ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا۔

فرش زمردین نہیں وہ چاندنی نہیں   لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو بس اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزۂ خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت چلا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق

[1] رئیس و ادبی اپنے زمانہ میں نشاہیر علی گڈھ میں تھے۔ [2] سید اصغر حسین صاحب بی۔اے (علیگ) نے سشن جج سے پنشن پائی۔ سید وزیر حسن نے اودھ چیف کورٹ کی چیف ججی تک ترقی پائی۔ اب سر وزیر حسن ہیں (۱۹۳۲ء) [3] یعنی مشہور شاعر حسرت موہانی۔ (۱۹۳۲ء)

نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تقویٰ کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا، دو برس کسی اور کے خیال نے۔ مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کبڑے بھاٹے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی یال بچون کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہین تو غافل ضرور کر دیا۔ گزشتہ چند سالون مین اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ، مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس مین عشق حقیقی رنگ لایا ہے، اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آئی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلون کے اس فرصت کے زمانہ مین بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں، نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلین لکھ کر بھیجو، اس لیے یہ لکھ بھیجتا ہوں (Anything but my own. Touchstone کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہین

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ بیگم صاحبہ کی خدمت مین آداب۔ عزیزی مسعود[1] کے رشتہ سے بھی میرا حق پہنچتا ہے۔ والسّلام

محمد علی

کر دیا کہ مجھے سخت تعجب ہوگا، اگر آپ صاحبزادہ[2] صاحب کے ساتھ نباہ کر سکے۔" ہمارا تجربہ مدتوں کا ہے۔ گو اوروں کے لیے اپنا تجربہ اکثر بے سود ہوتا ہے۔

---

[1] باندا کے خان بہادر حاجی مسعود الزمان بیرسٹرایٹ لا اور ممبر یو۔پی کونسل۔ میرا عقد انہی کی چھوٹی ہمشیرہ سے ہوا تھا

[2] مراد وہی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سکریٹری کانفرنس علی گڈھ ہین۔ محمد علی کی ان سے پرانی چشمک تھی۔

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی (غالب)

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو
سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

ربِّ عزت کے لیے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

عہدِ اول کو بھی اچھا ہو جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
مالک الملک پہ ایمان کی سزا اور سہی

جس نے ہنگامہ عدالت کا تری دیکھا ہو
اس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

بندگی میں تری سہتے ہی ہیں لوگ لیکن
چند دن کے لیے دوزخ کی ہوا اور سہی

دل تو جا ہی چکا گر جان بھی جاتی ہے تو جائے
ترکشِ کفر میں اک تیرِ قضا اور سہی

ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

مار اور یارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور (غالب)

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

گر بوئے گل نہیں، نہ سہی، یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

پاداشِ جرمِ عشق سے ہے کب تلک مفر
مانا کہ تم رہا کیے دار و رسن سے دور

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

تقویٰ کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور

مستِ مئے الست کہاں اور ہوس کہاں
طرزِ وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

واعظ کا ارتداد نہ میرا ہی ترکِ کفر
کچھ بھی نہیں ہے ساقیِ توبہ شکن سے دور

ہے بُعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی — اور چاہتے یہ ہیں کہ رہیں تن کو دور
اللہ رے نورِ چشمِ محبت کی جستجو — نکلا اسیرِ مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور
آسان تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا — تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
مسلم اجل سے دور نہیں روزِ کربلا — رہتا نہیں برات میں دولھا دلہن سے دور
منقارِ عندلیب کو صیاد سی چکا — مانا کہ گوشِ گل ہے لبِ نالہ زن سے دور
یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں — مارو جو یارِ غیر ہیں ہم کو وطن سے دور
مفتی منفعت خوار کو سب کچھ حلال ہے — بوئے شرابِ شرک ہے پھر کیوں دہن سے دور
دستِ دراز کو ترے اے رندِ باصفا — رکھے خدا عمامۂ شیخِ زمن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور
ہیں اتنے لافِ شوق پہ مرعوبِ حسن بھی — یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور
تم ہو تو نذرِ عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ — یہ بات ہے مروتِ اہلِ سخن سے دور
تاویل پڑھکر اقرب للکفر ہو گئی — کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم و فن سے دور
تم سے بعید تھا کہ بھلا دو اگرچہ ہم — اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر — ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد
اک شہرآرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل — ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

غیروں کے ساتھ ہم سے الگ جیتے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذر حیا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

کیا زندگی جو دل میں کوئی آرزو نہ ہو
رہتی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرت جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

سمجھا بھی ہے کچھ تو کہ یہ ہے کس سے تمرد
اللہ کو مان، اپنی حقیقت کو ذرا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ

ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا
اس سادگی پہ شوخیِ خونِ شہدا دیکھ

خو تیری دو روزہ مرا پیماں ہے ازل کا
پابند جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

ہم کہہ نہیں سکتے وہ کریں چارہ گری بھی
حالِ دلِ بیمار طبیبوں کو سنا دیکھ

تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بےچارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو
بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ

عقبیٰ تو کہاں، واں نہیں دنیا بھی کچھ ٹھیک
اس کافرِ بےفیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہ رسا دیکھ

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہوں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے — چشم یہ خوں نابہ بار دیکھیے کب تک رہے
عشق، سو وہ بھی ترا، صبر طلب ہے بہت — صبر ہمارا شعار دیکھیے کب تک رہے
سب کو یہاں ہے فنا ایک تجھے ہو بقا — یہ ستم روزگار دیکھیے کب تک رہے
یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں — جور و جفا کی بہار دیکھیے کب تک رہے
زور کا پہلے ہی دن نشہ ہرن ہوگیا — زعم کا باقی خمار دیکھیے کب تک رہے
پہلے رہا درد دل مونس جان مدتوں — درد مگر اب کی بار دیکھیے کب تک رہے
ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں — پھر بھی ترا انتظار دیکھیے کب تک رہے
حق کی کمک ایک دن آہی رہیگی ولے — گرد میں پنہاں سوار دیکھیے کب تک رہے
ماتم شبیر ہے آمد مہدی تلک — قوم ابھی سوگوار دیکھیے کب تک رہے
رونق دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی — یوں ہی یہ اجڑا دیار دیکھیے کب تک رہے
طاعت، آزادگی یوں تو نہ ضدین تھو — جبر کا یہ اعتبار[1] دیکھیے کب تک رہے
دین پہ دنیا فدا کرتے رہے مدتوں — کفر پہ ایمان نثار دیکھیے کب تک رہے

یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے بقول آپکے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہوجاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی وست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔

آپ کا نیازمند محمد علی

انوار احمد صاحب کو اور نیز عباسی صاحب کو سلام شوق دونوں کی طرف سے[2]۔

---

[1] عجب نہیں جو یہ لفظ "اختیار" ہو۔ مطبوعہ کلام جو ہر سے یہ شعر خارج ہے۔

[2] دونوں صاحبان کانفرنس میں ایلکار دونوں کی طرف سے" یعنی مولانا شوکت علی صاحب کیطرف سے بھی کہ وہ بھی نظر بندی میں ساتھ تھے۔

باب (۹)

۱۹۱۲ء (۵)

اسلام کا دیوانہ نظربند

خط کیا آیا، یہ کہیے کہ بزم مشاعرہ مین شمع گردش مین آئی۔ ابھی اس کے ہاتھ مین ہے، ابھی اس کے۔ خدا جانے کتنوں نے پڑھا، کتنون نے دوسروں کو پڑھتے ہوئے سنا۔ کتنون نے ان اوراق کو   آنکھون سے لگایا۔ کتنے پڑھ کر جھوم جھوم گئے، لوٹ لوٹ گئے۔ کلام خود دلکش، اور پھر سب سے بڑھکر وقت کی فضا، جتنا حصہ سیاسیات اور ایمانیات کا تھا، وہ قال نہیں، سرتا سر حال تھا۔ لوگ کیسے نہ وجد میں آ جاتے ———— جواب مین ایک خط جلد ہی لکھ ڈالا۔ اور جب اس کا جواب نہ آیا، تو انتظار کرکے دوسرا خط ۵ ستمبر کو، اور مزید انتظار کرکے تیسرا خط ۱۱ اکتوبر کو ڈاک کے سپرد کیا۔ گھر کا ایک لڑکا کام کاج میں رہتا تھا اور خط ڈاکخانہ اکثر اسی کے ہاتھ جاتا تھا، بدگمانی یہ ہوئی کہ کہیں اسی نے ٹکٹ کے لالچ میں آکر ٹکٹ تو نہیں اکھاڑ لیے، اور خط پھاڑ کر پھینک دیے۔ اس درمیان میں یعنی ختم اگست پر علیگڈھ سے تعلق قطع کرکے میں لکھنؤ واپس آگیا تھا اور قیام زیادہ تر لکھنؤ یا کبھی اپنی سسرال باندے میں رہتا تھا ———— شادی کے ابھی تین ہی چار مہینے تو ہوئے تھے،

علی گڈھ سے واپس آجانا تمامتر اپنا ہی فعل خود اختیاری تھا۔ وطن سے باہر جی نہ لگا،

طبیعت نے بجائے علی گڑھ کی آب و ہوا کی خرابی کو بنایا، بدنامی تھوڑی بہت بیچارہ صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے حصہ میں آئی کہ انھوں نے چھٹنے نہ دیا۔ حالانکہ ان مرحوم کا اس میں قصور ذرہ بھر بھی نہ تھا، وہ غریب تو مجھے دل سے روکنا چاہتے تھے،

میرے ان تینوں خطوں میں تھا کیا؟ کچھ تھوڑی سی نوک جھونک محمد علی کی سخت مذہبیت پر تھی کہ آپ میری زیر نظر نفسیات القرآن (سایکالوجی آف دی قرآن) میں مجھ سے کسی مولویت یا اسلامیت کی توقع کیوں رکھتے ہیں، میں تو قرآن کے فلسفہ پر (نعوذ باللہ) اسی طرح لکھوں گا جس طرح یونان اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی ارسطو یا کانٹ پر لکھا جاتا ہے۔ یہ بھی مسرت کے ساتھ ذکر تھا کہ مشہور برطانوی صحافی سر ولنٹائن شیرول (Chirol) نے سایکالوجی آف لیڈرشپ پر اچھی رائے لکھ کر بھیجی ہے۔ لکھنؤ سے ہمدم نیا نیا یکم اکتوبر سے، سید جالب دہلوی (سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر ہمدرد) کی ایڈیٹری میں نکلا تھا، کچھ اس کا ذکر خیر تھا۔ اور ایک چوٹ یہ بھی تھی کہ آپ کا اپنے اس جوش دینی اور تقشف مذہبی کے ساتھ، علی گڑھ کے ظریف محمد اکرم ایم۔ اے۔ سے (جو دہریت و الحاد کے مبلغ تھے) دوستی کا نباہ کیونکر ہوا؟ ______ جواب وسط نومبر کے قریب آیا، اور اتنا مفصل و دلچسپ کہ سارے پچھلے انتظار کی تلافی ہو گئی۔ آج آپ کو کسی انتظار کی بھی ضرورت نہیں۔ معاً پڑھنا شروع کر دیجئے۔

چھندواڑہ

۱۱ نومبر ۱۹۲۶ء

مکرمی۔ تسلیم

یہ سچ ہے کہ آپ کے ملازم صاحب نے ایک خط آپ کا ضرور تلف کر دیا۔ مگر

اس کے بعد کے دونوں خط مورخہ ۵ ستمبر و ۱۱ اکتوبر مجھے ملے۔ میری اس خاموشی سے آپ ضرور متردد اور غالباً مجھ سے ناخوش بھی ہوں گے۔ مگر میرے عذرات سن کر ضرور مجھ سے ہمدردی بھی فرمائیں گے۔ آپ کا پہلا عنایت نامہ مجھے ۲۰ ستمبر کو ملا۔ اکتوبر کو مسٹر معظم علی[1] میرے سالے بانکی پور سے مع اپنی بیگم صاحبہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے تشریف لائے۔ چونکہ والدہ رامپور تھیں، اور میری اہلیہ کو کامل صحت نہ ہونے پائی تھی، اس لیے خانہ داری کا تھوڑا بہت کام میرے بھی متعلق تھا۔ یہی کچھ کم نہ تھا کہ مجھے تیمارداری بھی کرنا پڑی، اور وہ بھی ایک نرس کی طرح۔ میرا منجھلا سالا بانکی پور سے ہی بخار ساتھ لایا۔ یہاں دو روز بعد ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ تشخیص کیا اور یہ بھی جتلا دیا کہ اس عمر میں یہ مرض سخت ترین عوارض سے ہوتا ہے اور علاج سوائے نرسنگ کے کچھ نہیں۔ شوکت صاحب تو ہمیشہ کے میرے تیمار رہتے۔ اب کی بار بالکل بیکار ہو گئے۔ ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر نے کچھ پھوڑا یا ہیں نشتر لگا دیا۔ معدہ خراب پہلے ہی سے تھا، تپیا میں مبتلا ہو گئے اور سخت تکلیف میں رہے دس بارہ دن برابر مسہل ہوئے، تب جا کر چلنا پھرنا نصیب ہوا۔ میں اپنی چھوٹی لڑکی کی تیمارداری ٹائیفائیڈ میں حال ہی میں کر چکا تھا۔ میری اہلیہ سخت علیل رہیں تو ان کی تیمارداری بھی مجھی کو کرنا پڑی۔ ان امراض پیہم نے مجھے چند دن کی اچھی خاصی مس فلارنس نائٹ انگیل[2] بنا دیا تھا۔ یہ تو امر مسلم ہے کہ "ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف" اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہو گیا اور ایسا منہمک ہونا پڑا کہ آپ کو ایک

[1] معظم علی خاں مرحوم بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ علی برادران کے زمانہ اسیری (۲۳-۱۹۲۱ء) میں مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ اس وقت (۱۹۱۱ء میں) بانکی پور میں بیرسٹری کرتے تھے۔ آخر عمر میں رامپور میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔

[2] ایک انگریز خاتون، میدان جنگ میں تیمارداری کے کام کے لیے مشہور۔

کا۔ وہ بھی اطلاعاً نہ لکھ سکا کہ دونوں عنایت نامے مل گئے۔ میرے متعلقین کو اس کورہ مین پڑے پڑے ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر تنہا چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ صرف ڈھائی سو روپیہ کے وظیفہ پر معاش تھی۔ اب جیتک اس Subsistence[1] allowance پر ایک Separation allowance[2] کا اضافہ نہ ہوا، ان لوگون کو علیحدہ رکھنے کی نظربندہ بحث مین گنجایش بھی نہ تھی۔ ایک ہنڈیا مشکل سے چڑھنے پاتی تھی۔ دو ہنڈیون کا چڑھنا معلوم۔ مگر یہ بھی سوچتا تھا کہ ہم تو پھر بھی شہر مین چل پھر لیتے ہین رہتے رہتے بہت لوگون سے واقفیت ہوگئی ہے۔ دوسرے اپنے افکار و اشغال کا کام کرتے ہین۔ ان بیچارون کے لیے تو یہ بھی موجود نہین۔ سوائے ایک دو گھرون کے کہیں آنا جانا نہیں "ملا کی دوڑ مسجد تک" اگر ہوا خوری کے لیے کہیں باہر گئیں بھی تو سول لائنس مین دو ایک جگہ۔ حدود میونسپلٹی سے باہر نکلنے پر نظربندون کے پر جلتے تھے۔ پھر گھر مین پیہم بیماریوں کا ہونا۔ اور خصوصاً موتی جھرا کے دو واقعات پے در پے اس لیے گورنمنٹ کو لکھا کر جس زمانہ مین یہ الاؤنس مقرر ہوئی تھی صرف میرا بار اس پر تھا اور مین نے دراصل اصولاً اس پر زور دیا تھا اور بجائی Haily[3] سے "دوستانہ" خط و کتابت عرصہ تک صرف اصول کے لیے جاری رکھی تھی۔ مگر ہمدرد کے بند ہو جانے کے بعد صرف یہی ایک ذریعہ معاش کا میرے اور میرے متعلقین کے لیے رہ گیا تھا۔ میرے ہی لیے کافی نہ تھا مگر ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ کے اصول پر جس طرح بن پڑا، ابتک کام چلایا مگر اس الاؤنس کے دو ٹکڑے کرنا اور چھ چھ برس کے دو ملازم نوکر رکھنا برابر ہے۔

[1] گزارہ/معاش [2] گزارہ/افتراق [3] سر میلکم ہیلی چیف کمشنر دہلی۔

سفرخرچ کی بھی گنجایش نہیں ہے۔ سفرخرچ دیا جائے اور الاونس مین اضافہ کیا جائے۔ یہ تحریر اب گورنمنٹ کے زیر غور ہے۔ نہ معلوم خزانہ عامرہ کی کیا کیفیت ہے۔ تہی سا نرخا ہے یا لبریزی۔ بہرحال متعلقین کا زیادہ رکھنا مناسب نہ تھا۔ ان کو یکم نومبر کو براہ بانکی پور روانہ کر دیا ہے۔ ڈھائی تین ماہ بعد پھر آجائین گے۔ والدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم تنہا رہ گئے تو بیچاری فوراً رخت سفر باندھ چل دین اور وہ کو یہان آگئین۔ آپ اندازہ کر سکتے ہین کہ اب تک مجھے کس قدر کم فرصت ملتی ہوگی۔ ۸ ار تک تو عزیزی مسعود کو حرارت رہی اس کے بعد جا کر ٹوٹی اور بفضلہ تعالیٰ صحت کامل حاصل ہوگئی۔ مگر ۱۲ ار تک سخت تردد تھا۔

اس قدر لمبی چوڑی معذرت کے بعد آپکے عنایت نامون کا جواب دیتا ہون۔ بھائی علوی[1] بھی مجھ سے کچھ خفا ہین کہ اب تک فلسفۂ اجتماع کی جلد روانہ نہ کی۔ مجھے پہلے بھی خوف تھا اور اب تو آپ کے لکھنے سے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی کہ آپ کو اجتماع سے نفرت ہے۔ مگر تعجب ہے کہ صاحبزادہ .... صاحب کو بھی اس اجتماع سے نفرت ہے اور آپ کو بھی اور پھر دونون مین نہ نبھ سکی۔ نہ معلوم نفسیات القرآن مین آپ وامرھم شوریٰ بینھم اور وشاورھم فی الامر کی شان مین کیا فرمائین۔ بہرحال فلسفۂ اجتماع کے دیکھنے کا مشتاق ہون۔ ظفر الملک صاحب سے کہہ کر جلد روانہ کرا دیجئے۔ سائیکالوجی آف لیڈرشپ پہنچین تو اپنی راے دے چکا ہون۔ سر ویلنٹائن شیرول[2] ایک

---

[1] یعنی مولوی ظفر الملک علوی (الناظر بک ایجنسی)، [2] اب ہیں کانفرنس سے واپس چلا آیا تھا۔
(Chirol)
[2] برطانوی صحافت کا ایک نامور رکن ٹائمس (لندن) کے شعبۂ خارجہ کا مدیر اعلیٰ، ہندوستان و مشرق کا سیاح
اس زمانہ مین ہندوستان آیا ہوا تھا۔ مین نے اپنی کتاب لیڈرشپ اسکی خدمت مین تحفۃً پیش کی تھی۔ اس نے اس کی ایک خط مین بہت داد دی تھی۔ ولیسوں کی داد کو مین اس وقت معراج کمال سمجھتا تھا۔

خبیث د بد باطن شخص ہے، نہ معلوم اس کی تعریف کی آپ نے کس طرح وقعت کی۔ وہ ہمارے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی ہی کو پسند کرتا ہے۔ ابھی حال میں تہذین میرے ایک چند صفت دوست جگن. رنگا صاحب نے ان کے لکچر میں صدارتی تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ ۲۰ برس سے انھیں مشرق بلا رہا تھا۔ ان کی مشرق کے حال پر بڑی ہی نوازش ہوئی کہ تشریف لائے۔ "خانہ خانۂ تست" کا مضمون ہے۔ مگر کاش ان کو ہم ہی سا لے مغرب بھی پکارتا[1] اور وہ اس کے حال پر بھی رحم فرماتے اور وطن مالوف کی طرف مراجعت فرماتے۔ مگر ان لوگوں کی صرف یہی سزا ہے کہ قانونِ قدرت ان کی خاطر نہیں بدل سکتا۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ غلامی کو دوسرے کے لیے پسند کرنا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے اپنی غلامی کا۔ اگر اجتماع ہمارے لیے برا سمجھا جاتا ہے تو کل کو خود ایسا کہنے والوں کے لیے برا سمجھا جائے گا۔ ربا کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ تاریخ اسلام خود اس کی شاہد ہے۔ جس طرح آپ مجھے لکھ رہے ہیں، اس سے تو نفسیات القرآن کے متعلق بھی میرا خوف روبہ ترقی ہے۔ "ناطرفدارانہ طرز ادا" مخالفین کے رام کرنے کے لیے شوق سے استعمال کیجیے لیکن اگر آپ کا قلب "ناطرفدار" ہے اور وہ حصہ جسم بھی جس میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے، محض ایک سادہ لوح ہے، جس پر آپ کی "عقلیت" کی بدولت کچھ نقوش منقش ہو گئے تو ایک مسلم اور مومن سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ آپ کو مسلم اور مومن بھی سمجھے۔ جب ایک بار قلب نے اعتراف و اقبال کر لیا کہ آمنا و صدقنا تو پھر تو یہی صادق آنا چاہیے کہ "مجھے تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے" گو روئے سخن خدا اور رسول

[1] یعنی کاش اپنے ہی ہاں کی جنگ عظیم کو روک سکتے۔

کی طرف ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہر گیسو دراز و ریش دراز کی طرف۔ مین اجتہاد پر ایمان رکھتا ہون اور اس کو بہت ضروری بلکہ لابدی سمجھتا ہون۔ کورانہ تقلید میرا ہرگز مذہب نہین۔ اگر آپ اس طرح لکھیں کہ اپنا ایمان مقدمہ کتاب مین واضح ہو جائے اور محض اس Rationalism کی تشریح اصل کتاب مین جس سے خود آپکے قلب کی لوح سادہ پر بتدریج ایمان و عقیدہ منقش ہو گیا۔ تاکہ ناطرفدار تو ناطرفدار خود مخالفین کے دلوں پر کے کفر و شرک کے نقوش دھندلے پڑتے جائین اور بتدریج مٹ جائین۔ اور پھر اس ورق سادہ پر آپ کی کتاب کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جلی حروف مین لکھ دے تو مین واقعی آپ کی نفسیات کی قدر کرون گا۔ برادرم ایمان ہر شئے پر مقدم ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جب مسلمانون نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۂ اول بنایا تو دراصل اس امر کا اعتراف کیا کہ ایمان ابوبکرؓ، عدل عمرؓ، غنا و حیاء عثمانؓ اور فقر و شجاعت علیؓ سے بھی زیادہ قابل قدر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آفتاب محمدی بہ تقاضاے بشری ۲۳ سال کی نبوت کے بعد غروب ہو گیا اور سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا تو جو لوگ ہر امر مین اس شمع ہدایت کی روشنی کے عادی ہو گئے تھے، خدا کی دی ہوئی آنکھین بھی گویا کھو بیٹھے اور بعض مؤلفۃ القلوب کے ارتداد اور زندیق ہو جانے سے [illegible] کے ایمان بھی تھوڑی دیر کے لیے معرض خطر مین آ گئے۔ یہانتک کہ حضرت عمرؓ کو سوائے اس کے کچھ نہ سوجھا کہ تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور چلانے لگے کہ اگر کسی نے کہا کہ محمد (روحی فداہ) قضا کر گئے تو اس کی قضا اسی وقت اسی تلوار کے ذریعہ اس تک پہنچ جائے گی۔ ایسے وقت مین وہ آمنا و صدقنا کہنے والا آیا اور اس نے ایک بدیہی امر ان سراسیمہ اور پریشان لوگون کو جتلایا۔ آفتاب محمدی غروب ہو گیا تھا'

مگر خدا کا شمار ثانی اثنین میں نہ تھا۔ آفتاب اسلام اسی طرح درخشان تھا، بھائی یہ سب ایمان کے کرشمے تھے۔ یہ فطرت صدیقی تھی، اگر کچھ کمی تھی تو اس امین اعظمؐ کے ایمان نے پوری کر دی تھی۔ جب غار ثور میں ابوبکرؓ کو بتایا گیا تھا کہ وہاں سیکڑوں دشمنوں سے خائف اور مارے ڈر کے غار میں چھپے ہوئے صرف بندگانِ خدا ہی نہ تھے بلکہ ایک تیسرا اور بھی وہاں موجود تھا، جو ان دونوں کا نگران و نگہبان تھا۔ اِنَّ اللہَ مَعَنَا کی تعلیم کے بعد ایمانِ ابوبکرؓ پختہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ امینؐ کی خلافت صدیقؓ کو ملی۔ اگر آپ فلسفہ اور استدلال سے مدد لیتے ہیں تو لیجیے مگر صرف اسی طرح اطمینان قلب کے لیے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے مردہ زندہ کرنے کے لیے اطمینان قلب چاہا تھا۔ مخالف کے لیے دلیل اور ثبوت کے ہتھیار تیار کیجیے۔ استدلال و تحقیقات کی تہ میں اپنے کارخانۂ اسلحہ سازی میں ڈھالیے، یہ تو ایک مومن کے لیے ضروری ہیں۔ تاکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر جاری رہے جس کے لیے ہم کو خیر امۃ کا لقب عطا ہوا ہے۔ مگر کیا یُومِنُونَ بِاللہِ قرآن سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو صرف اس پر کہ کہیں خود قلب و دماغ ناطرفدار نہ ثابت ہوں۔ اسلوب بیان تمام تر ارسطو اور کانٹ کی کتابوں پر تنقید کا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ ہم ان دونوں کو مرکب من الخطا مانتے ہیں۔ اور ان کی تقلید ہر امر میں فرض نہیں جانتے مگر قرآن حرف بحرف فرمودۂ خدا ہے[۱]۔ اور خدا خاطی نہیں ہو سکتا۔ آپ شوق سے اُسے فرمودہ خدا ثابت کیجیے مگر خود آپ کے قلب کو مستغنی عن الحجۃ ہونا چاہیے۔ بھائی

[۱] میں نے اپنی ملحدانہ شوخ چشمی کے ماتحت لکھ بھیجا تھا کہ نفسیات القرآن بالکل اسی آہنگ کی لکھی جائے گی، جس پر نفسیاتِ ارسطو یا نفسیاتِ کانٹ لکھی جاتی۔

جتنی شاعری چاہو باہر کی عورت پر صرف کرو اور اُسے لبھاؤ اور رام کرو۔ مگر گھر کی بیوی تمھاری ہے نہ دوسرے پر نظر ڈال سکتی ہے۔ نہ اس کو تمھاری گریہ وزاری اور التماس و گزارش کی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ بقول میرے ؎

نہ تبسم کی ضرورت نہ نگہ کی حاجت نہیں جز دل کی ضرورت کوئی دل آنے میں

غزالی کا فلسفہ مجھ سے زیادہ آپنے پڑھا ہوگا۔ ان کی احیاء العلوم کا اگر ترجمہ فرانسیسی زبان مین ہوگیا ہوتا تو ڈیکاوٹ کو دنیا چور سمجھتی۔ مگر ان کی خود تصنیف کردہ سیرۃ بلکہ سوانح قلبی ودماغی کو ملاحظہ فرمایئے، آخر مین اسی کا اعتراف ہے کہ اصل وہی مشاہدہ ہے جو حیات ظاہرہ سے مستغنی اور استدلال وحجت سے بے نیاز ہے۔

خدانے ہم پر بڑا رحم فرمایا جو مسلمان کے گھر پیدا کیا۔ Heredity[1] کا رجحان اسلام وتوحید کی طرف، تربیت اسلام اور توحید کے دائرہ مین۔ اگر اس پر ہمارے فلسفہ نے ہماری امداد کی ہے تو سونے پر سہاگا ہے۔ اسلام اور ایمان کو اور بھی تقویت ہوگئی اور عقل ونقل دونوں کی زد سے باہر ہوگئے۔ اب نہ ارسطو کا جادو چل سکتا ہے نہ کانٹ کا۔ لیکن اگر صرف استدلال ہی پر بھروسہ ہے اور خود اپنی عقل پر اس قدر زعم ہے کہ جو اس مین نہ سمائے وہ خدا نہین اور جو اس میں نہ آئے وہ ایمان نہین۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ "پائے استدلالیان چوبین بود" اور باوجود اس کے کہ میرے اور شاید آپ کے بھی استاد (شبلیؒ) آخر مین اسی ہیئت سے چلتے تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ "پائے چوبیں سخت بے تمکین بود"۔ خواہ کسی طرح تفسیر کیجئے، مگر قرآن خود صاف صاف کہہ چکا ہے کہ علم انسانی بہت ہی کم ہے۔ میں اس کا ضرور قائل ہوں کہ خواہ کسی قدر کم

[1] یعنی وراثت۔

کیوں نہ ہو وہ خدا کی دین ہے اور ایمان کے بعد اُس کی بہترین دین، بلکہ اس کے بغیر ایمان کمزور وضعیف رہتا ہے۔ اس لیے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیے۔ اور ایمان کے لیے علم کا پشتہ ایمان کو مستحکم کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ سے ایمان کا استحکام کرنا چاہیے۔ مگر زعم علم سے پرہیز ضروری ہے۔ خدا کی رحمت ہو اقبال پر خوب تعلیم مولانا روم کا اتمام کر رہا ہے[1]۔

پر زن و از جذب خاک آزاد باش — ہمچو طائر ایمن از افتاد باش

تو اگر طائر نۂ اے ہوشمند — بر سرِ غار آشیانِ خود مبند

اے کہ باشی درپے کسب علوم — با تو می گویم پیام پیر رومؒ

"علم را برتن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود"

آگہنہ از قصۂ اخوند رومؒ — آں کہ داد اندر حلب درسِ علوم

پائے در زنجیر توجیہاتِ عقل — کشتیش طوفانی ظلماتِ عقل

موسیِ بیگانۂ سینائے عشق — بے خبر از عشق و از سودائے عشق

از تشکک گفت و از اشراق گفت — وز حکم صد گوہر تابندہ سفت

عقدۂ ہائے قولِ مشائین کشود — نور فکرش ہر خفی را وا نمود

گرد و پیشش بود انبار کتب — بر لبِ او شرح اسرار کتب

پیر تبریزیؒ ز ارشاد کمال — جست راہِ مکتب ملا جلال

گفت این غوغا و قیل و قال چیست — این قیاس و وہم و استدلال چیست

پائے خویش از مکتبم بیرون گذار — قیل و قال ست این ترا با وے چہ کار

[1] اقبال کی اس وقت تک صرف دو ابتدائی مثنویاں اسرار خودی اور رموز بیخودی شائع ہوئی تھیں۔ (ن)

قالِ ما از فہمِ تو بالاتر است — شیشۂ ادراک را روشن‌گر است

حرفِ ملا شمس را حدت فزود — آتشے از جانِ تبریزی کشود

بر زمین برقِ نگاہِ او فتاد — خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

التہابِ دل خسِ ادراک سوخت — دفترِ آن فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق — ناشناسِ نغمہ ہاے سازِ عشق

گفت این آتش چسان افروختی — دفترِ اربابِ حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلمِ زنار دار — ذوق و حال است این ترا با وے چہ کار

حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است — شعلۂ ما کیمیاے احمر است

ساختی از برفِ حکمت ساز و برگ — از سحابِ فکرِ تو بارد تگرگ

آتشے افروز از خاشاکِ خویش — شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

علمِ مسلم کاملِ از سوزِ دل است — معنیِ اسلام ترکِ آفل است

چون ز بندِ آفل ابراہیم رست — درمیانِ شعلہ ہا نیکو نشست

علمِ حق را در قفا انداختی — بہرِ نانے نقدِ دین در باختی

گرم رو در جستجوے سرمۂ — واقف از چشمِ سیاہِ خود نۂ

آبِ حیوان از دمِ خنجر طلب — از دہانِ اژدہا کوثر طلب

سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ — ق — نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے — کیفِ حق از جامِ این کافر مجوے

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — رازدانِ دانشِ نو بودہ ام

باغبانان امتحانم کردہ اند — محرمِ این گلستانم کردہ اند

گلستانے لالہ زار عبرتے — چون گل کاغذ سراب نکہتے
تا ز بند این گلستان رستہ ام — آشیان بر شاخ طوبیٰ بستہ ام
دانش حاضر حجاب اکبر است — بت پرست و بت فروش و بت گر است
پا بہ زندان مظاہر بستۂ — از حدود حس برون ناجستۂ
در صراط زندگی از پا فتاد — بر گلوے خویشتن خنجر نہاد
آتشے دارد مثال لالہ سرد — شعلۂ ہاے او مثال ژالہ سرد
فطرتش از سوز عشق آزاد ماند — در جہان جستجو ناشاد ماند
عشق افلاطون علت ہاے عقل — بہ شود از نشترش سوداے عقل
جملہ عالم ساجد و مسجود عشق — سومنات عقل را محمود عشق

این مے دیرینہ در میناش نیست
شور "یارب" قسمت شبہاش نیست

لکھنے بیٹھا تھا خط، مگر لکھ گیا اقبال کی مثنوی شریف۔ مگر چونکہ بہ حیثیت ادب کے اس کا پایہ میری نثر سے اتنا ہی اونچا ہے، جتنا کہ زمین سے آسمان کا، اور آپ باوجود فلسفی ہونے کے ادب کو استدلال پر مرجح سمجھتے ہیں، اس لیے اسرار خودی کا یہ حصہ نقل کر دیا گیا۔ امید ہے کہ تشفی ہو گئی ہوگی۔

رہا ظریف مرحوم[1] کا معاملہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مجھے مرحوم سے بے حد محبت تھی۔

[1] ظریف محمد۔ ایم۔ اے (علیگ)۔ ان کی کتاب "اسلام اور عقلیت" دہریت و الحاد سے لبریز تھی۔ بڑے توانا و تندرست تھے۔ عین عالم شباب میں دفعۃً انتقال ہو گیا۔ میں نے محمد علی سے پوچھا تھا کہ آپکے اس دینی جوش اور زہد تقشف کے ساتھ آپ اور ظریف سے دوستی کیونکر تھی؟ سنا ہے کہ ظریف غالباً ۱۹۱۵ء میں موت سے پہلے تائب اور راسخ مسلمان ہو چکے تھے۔

میں ان کی قابلیت اور اُس سے زیادہ ان کی محبت کا قدر دان تھا۔ مگر ان کی لطیفانہ گفتگو کو میں ہمیشہ ہذیان سرائی سمجھا اور وہ مجھے اس کا قدر دان نہ پا کر محض اپنی اَز ظرافت اور محبت سے محظوظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مصرع غالب کا تضمین کیا

"دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز"

مطلب یہ تھا کہ دعا وغیرہ سب کچھ لغو ہے۔ جس کے پاس توپ گولا نہیں وہ ضرور ہلاک ہوگا نہ دنیا کا کوئی خدا ہے نہ اس کا کوئی بندہ نہ وہ بندہ نواز۔ بن گی بیکا رہے۔ انکی عقلیات صرف یہیں تک راستہ روشن کرتی تھی۔ مگر ۲۱ رجون ۱۹۱۳ء کو ایڈریانوپل پھر غازی انور پاشا دام اللہ فیضہٗ کے قبضہ میں آگیا اور دائرہ حکومت اسلام میں از سرِ نو داخل ہوا۔ اور شبلی مرحوم کا شعر جو انصاری صاحب کے مشن کی دہلی والی نظم میں تھا۔ صادق آیا۔

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے ‌ ‌ ‌ کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھا ہے[1]

اس کو عقلیات کہیے یا نقلیات، بہرحال شبلی مرحوم کا شعر، ظریف دجال کی "ظرافت" سے صحیح تر تو اسی وقت ثابت ہو چکا تھا۔ بحمد اللہ اب خونِ شہیدان ملکہ عالیہ نے بھی اسے تغیر نے صحیح ترین ثابت کر دیا۔ میں مرحوم سے اوائل ۱۹۱۳ء میں کلکتہ میں ملا۔ ہم دونوں تفریح کے لیے چندر نگر گئے تھے اور شب کو میں دریائے ہگلی کی سیر سے لطف اٹھا رہا تھا۔ مسلم قومیت کا دریا بھی موجزن تھا۔ وہ تو یہی کہتے تھے اسلام اور ایمان نہیں ہے۔ مگر ایمان چھپائے سے نہیں چھپتا۔ قرآن کریم کے بے مثل ادب کے قائل تھے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ

---

[1] مصرعہ حضرت اکبر الہ آبادی کی ایک مشہور نظم کا ہے۔

الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ، سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ. هُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ کے ادب پر وجد کرتے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد مین رامپور گیا اور نظر بند ہوا، وہان نصیر حسین خان خیال[1] کا خط آیا کہ مرحوم تفریحاً ایام رخصت مین وزیگاپٹم گئے تھے۔ وہان سے تار آیا ہے کہ اُن کا یکایک انتقال ہو گیا۔ ان کے پسماندگان کو اطلاع دیدو کہ مال اسباب لے جائین۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مرحوم پر آج ہم سے کہیں زیادہ اسرارِ ہستی آشکارا ہو گئے ہون گے۔ امید ہے کہ خاتمہ اسلام اور ایمان پر نہ کہ عقلیات پر ہوا ہو۔ دل سے مرحوم کے لیے وہ دعا نکلتی ہے جس کے قبول ہونے کا انھین اقبال بھی نہ تھا، آپ کو تو بفضلہٖ تعالیٰ خدا اور رسول کا انکار نہین ہے۔ برائے خدا و رسول اپنی عقل و تمیز، علم و تحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لیے وقف کر دیجئے۔ اور اس دانشِ حاضر کے حجابِ اکبر مین مستور و محجوب نہ رہیے۔

آپ نے مارگولیتھ کا ذکر فرمایا ہے۔ مین وہ بدنصیب ہون کہ اس مردود و خبیث و لعین سے آکسفورڈ مین عربی پڑھی ہے۔ عربی اس کی مادری زبان ہے[2]۔ قابلیت علمی بیشک بہت رکھتا تھا۔ مگر دشمن اسلام اور سب سے زیادہ زہر آلود کتاب سیرۃ النبی پر اسی لعین کی تصنیف کردہ ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ہمارے لٹریری نوجوان اُس کے پھندے مین آکر نبی امی (روحی فداک یا رسول اللہ) کو عرب کا بطل اعظم نہ سمجھنے لگیں، اور

[1] اب یہ بھی مرحوم ہو چکے ہین۔ پٹنہ کے ایک ادب نواز شیعہ رئیس تھے۔ ان ہی کی روایت ہے کہ ظریف آخر عمر مین تائب ہو گئے تھے۔ خدا کرے صحیح ہو۔ [2] مارگولیتھ کی ماں ایک شامی عورت تھی۔

رحمۃ للعالمین کے خدائی لقب سے محروم نہ کر دیں۔ سر ولیم میور کی سیرۃ میں سید احمد خان مرحوم
نے یہی سب سے بڑا عیب اور پوشیدہ مطالب ڈھونڈ نکالا تھا، اور خطبات احمدیہ اسی غرض
سے لکھ کر بہ صرف کثیر انگریزی میں ترجمہ کرا کے طبع کرائی تھی۔[1]

ہمدم سے میں قطعی خوش نہیں۔ نہ اس سے زیادہ کی اس سے توقع بھی تھی۔ اس
جنگ کے خاتمہ پر ایک جنگ اور چھڑے گی اور وہ بجائی جالب میری ہوگی وہ Caus
a b e ll e y (بنائے مخاصمت) وہ دو چشمی "ھ" ہوگی جو ان کے "ہمدم" کے نیچے لگی ہے
خدا کی مار ہو "ہمدرد" کو اگر اس نے "ہمدم" کے قالب میں جنم لیا ہے۔ اور خدا مجھے
میر اکبر حسین ابن الوقت معروف بہ "لسان العصر" سے جنھوں نے "ہمدرد" کی سرخی
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کو "ہمدم" کے لیے یوں بدلا ہے۔ میری غزلوں کی
تعریف وہ فرمائیں یا آپ یا آپ کے احباب۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل
نہیں ہیں، محض میرے درد کی آواز ہیں۔ "دیکھیے کب تک رہے" والی زمین شگفتہ
کیونکر ہو سکتی ہے، گو چشم انتظار وا ہونے سے شگفتہ چیزوں میں شمار ہو سکے تو
اور بات ہے۔ حال میں چند اشعار لکھے ہیں اور لکھ کر غزل پوری کروں گا۔ غالب
کا ایک شعر مانع اظہار وحشت ہو رہا ہے اور ورد زبان ہے۔ اس کی ردیف
کو محدود کر کے غزل لکھ رہا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے

چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

اسی پر چند اشعار لکھے ہیں۔

صبر پہلی شرط غمخواری کی ہے — ضبط کا یارا دل میں پارا چاہیے

[1] مارگولیتھ کے مقابلہ میں میور ہزار درجہ غنیمت ہے۔ مارگولیتھ کی زہر افشانی کی کوئی حد نہیں۔

تجھ سے کہتا ہوں جنون کیا تجا   خاک اڑانا آشکارا چاہیے

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ   دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

(حافظ تو تلطف کی صلاح دیتے تھے، مگر آج کل این ہم غنیمت است)

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے   ایک فقط تیرا سہارا چاہیے

نہ معلوم کیوں ان ایام حج بیت اللہ میں بار بار یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

تم تو کعبہ کے خدا تھے پھر نکالے کیوں گئے   اے بتو! کیسے خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

اس پہ ایک شعر خود بھی لکھ دیا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ بے اختیار زبان پر آگیا۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا   کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دیکھئے یہ دو تین غزلیں کب پوری ہوں۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ میری "مذہبی نقادی" بار خاطر نہ ثابت ہوگی۔

خوب یاد دلایا المعارف[1] میرے پاس نہیں آتا۔ شکر خدا کہ بھائی ظفر الملک نے الناظر تو بھیجنا شروع کر دیا۔ ہاشمی[2] جوہر و حسرت کی نے مین کچھ لکھ گئے مگر سنا ہے کہ جوہر پہ پہلے بھی کچھ لکھا تھا، دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ میں تو پہلے ہی سے اسکا قائل ہوں کہ

تم ہو تو نذر عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ   یہ بات ہے مروتِ اہل سخن سے دور

آپ کا خیر طلب محمد علی۔

---

[1] مراد معارف (اعظم گڈھ)، "المعارف" ایک اور رسالہ تھا، جو مدتوں قبل علی گڈھ سے نکلا تھا، اور اب مدت ہوئی بند ہو چکا تھا۔ [2] سید ہاشمی فریدآبادی۔

باب (۱۰)

۱۹-۱۹۱۶ء

(اسٹیشن کا ایک پراثر سفر، راس مسعود، مولانا سید سلیمان ندوی)

محمد علی کے ایک رفیق خاص الخاص راجہ[1] غلام حسین پنجابی تھے، علی گڈھ کے نامور ولڈ بوائے انگریزی لکھنے مین محمد علی کے شاگرد رشید۔ کامریڈ مین مدتون سب ایڈیٹر رہے۔ جب کامریڈ اپنے ایڈیٹر کی نظربندی پر بند ہوگیا، تو یہ لکھنؤ چلے آئے۔ یہان اس وقت ایک انگریزی روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف نکلتا تھا۔ اس مین منسلک ہوگئے۔ پھر کچھ روز بعد غالباً راجہ صاحب محمود آباد کی مالی امداد سے آخر ۱۹۱۶ء یا شروع ۱۹۱۷ء سے اپنا ایک مستقل انگریزی ہفتہ وار نیوایرا (New Era) کے نام سے نکالا۔ اور اس کی بھی خوب دھوم دھام رہی۔ محمد علی خود تو چھندواڑہ میں تھے: ان کے نائب اول لکھنؤ میں۔ ان کے گرد "محمدیوں" کا ایک پورا حلقہ قائم۔ چودھری خلیق الزماں شعیب قریشی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹرایٹ لا، ڈاکٹر نعیم انصاری، عبدالولی لکھنوی اور بارہ بنکی کے شیخ ولایت علی "بمبوق"، عبدالعزیز انصاری وغیرہم، ایک ایک فرد جوش ملی سے لبریز۔ اور ان سب کے علاوہ فرنگی محل ———— ایسا مجمع اب

[1] راجہ، پنجابی مسلمانوں کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی رئیس یا نواب تھے۔

کبھی کبھی دیکھنے میں آنے لگا! ——— نیوایرا ایک خاصی حد تک کامریڈ کا قائم مقام ہو چلا تھا۔ پرچہ ابھی چند ہی مہینہ نکلا تھا، کہ غلام حسین بیچارہ کا بلاوا عالم بالا سے آگیا۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے جوان، سرشام سڑک پر ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے نے پیچھے سے آکر زور سے ٹکر دی، اور یہ غریب اسپتال میں پہنچ کر راہی ملک بقا ہوگئے۔ محمد علی ظاہر ہے کہ اس ساری مدت میں سیکڑوں میل دور نظر بند تھے، لیکن ان کے ذکر خیر سے لکھنؤ کی محفلیں ہر وقت گرم رہتیں، اور اٹھتے بیٹھتے خدا معلوم کتنے موقعوں اور کتنے مختلف طریقوں سے ان کا نام زبانوں پر آتا رہتا۔ بلکہ نیوایرا نے سنسر کی آنکھ بچا کر واللہ اعلم کیونکر ان کے ایک آدھ مضمون بھی حاصل کر لیے اور انھیں گمنام چھاپ بھی دیا تھا۔

شروع ستمبر میں میرا جانا حیدرآباد (دکن) ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، اور کلاسوں کے کھلنے سے ایک سال قبل ایک مستقل "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" درسی کتابوں کی تیاری کے لیے قائم ہوگیا تھا، اور میں اسی کے شعبۂ فلسفہ کے لیے ناظم تعلیمات سید راس مسعود صاحب (جو بعد کو نواب مسعود یار جنگ ہوئے) اور ناظم سررشتہ مولوی (ڈاکٹر) عبدالحق صاحب کی تحریک پر طلب ہوا تھا۔ سال بھر وہاں رہنا ہوا۔ محمد علی سے مراسلت یہاں سے بھی کبھی کبھار رہی۔ جواب میں کم از کم دو خط تو ادھر بھی آنے یاد ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ دونوں محفوظ نہ رہے۔ ایک خط کا صرف اتنا ٹکڑا یاد ہے کہ میں نے راس مسعود صاحب کی کچھ شکایتیں لکھ کر بھیجی تھیں ——— سابقہ رہنے کے بعد اچھے اچھے دوستوں کے بھی آپس میں رنجش پڑ جانے کے واقعات دنیا

میں ان کے نہیں ـــــــــ میرے خیال کی اُدھر سے تائید ہو کر آئی۔ محمد علی کو پُرانی شکایتیں، صحیح یا غلط، صاحبزادہ آفتاب احمد خان سے اُن کے استبداد اور خشک مناظرہ پرستی کی تھیں۔ وہی شکایتیں اب انھیں ان کے داماد (راس مسعود صاحب) سے بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا فقرہ غالباً یہ تھا:۔

"راس مسعود صاحب اس وقت وہاں سر سید کے پوتے بنکر ان کی گدّی پر نہیں، بلکہ داماد مسعود پاشا کی حیثیت سے اپنے خسر کی کرسی پر بیٹھے ہیں"

۱۹۱۸ء کی آخری سہ ماہی میں واپس آ گیا اور اب پھر قیام لکھنؤ میں رہنے لگا۔

شروع ۱۹۱۹ء کا زمانہ تھا، غالباً جنوری کی کوئی تاریخ کہ نظربند علی برادران کو کسی اہم خانگی ضرورت کی بنا پر چند روز کے لیے چھندواڑہ سے وطن یعنی رامپور جانے کی اجازت ملی، پولیس کی چوکی پہرہ میں نظر بندی کا سلسلہ ابھی ختم کہاں ہوا تھا، چل ہی رہا تھا۔ راستہ وہی لکھنؤ ہو کر تھا۔ سہ پہر کا وقت۔ پنجاب میل لکھنؤ اسٹیشن پر ۲۰، ۲۵ منٹ ٹھہرتا تھا۔ آج دونوں بھائیوں کے پیر و مرشد اور وقت کے مشہور عالم اور لیڈر مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی رُکی، اور معاً دونوں بھائی مولانا کی طرف قدمبوسی کے لیے لپکے۔ اُدھر سے خود مولانا بھی اسی تیزی کے ساتھ ان دونوں کے قدم لینے کو بڑھے۔ اور منظرِ عام پر ایک خاصی کشمکش باہم شروع ہو گئی۔ ان کو ان کے قدموں پر جھکنے پر اصرار، اُن کو اُن کے! ضابطہ سے ظاہر ہے کہ مولانا مرشد تھے، اور علی برادران مرید۔ لیکن اس باہمی برتاؤ کو دیکھ، دیکھنے والے اس حیص بیص میں پڑ گئے کہ مرشد کسے ٹھہرائیں اور مرید کس کو قرار دیں! ـــــــــ شمس تبریزی اور مولانائے رومی

کے باہمی عشق ومحبت کے قصے بھی توکچھ اسی طرح کے مشہور ہیں !

محمد علی حسب عادت حاضرین میں سے بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔ آج کے زائرین میں ایک بڑی تعداد دارالعلوم ندوہ کے طلبہ کی تھی۔ محمد علی نے فرمائش کی کہ آپ لوگوں میں سے کوئی خوش لحن ضرور ہوگا۔ سورۂ یوسف کا پندرہواں رکوع ذرا سنایئے۔ ——— محمد علی کو قرآن مجید کی بعض اور آیتوں کی طرح ان دو آیتوں سے بھی عشق خصوصی تھا :-

یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ	اے جیل کے دونوں رفیقو، یہ بتاؤ کہ
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ	الگ الگ معبود اچھے یا اکیلا اللہ سب پر
الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ	غالب؟ دیکھیے غضب کی بات ہے، تم اسے
دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَا	چھوڑ کر صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو، جنھیں
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ	تم نے اور تمھارے بڑوں نے گڑھ رکھا ہے،
بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ	اللہ نے تو کوئی دلیل انکی اتاری نہیں حکومت
اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ	تو بجز اللہ کے اور کسی کی نہیں، حکم ہے کہ بجز اس کے
اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ	کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے، پر
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ	(افسوس ہے کہ) اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

محمد علی کیلیے یہ کلام قال نہیں، رہا تھا، حال بن چکا تھا۔ اسے سنکر وجد میں آجاتے، روتے، ہاتھ پر پٹختے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ پنجاب میل کی سی اہم گاڑی، اور لکھنؤ اسٹیشن کا پہلے نمبر کا پلیٹ فارم نمبر ایک۔ مسافروں کی بھیڑ اور پھر مشتاقان دید کا بھی خاصہ ہجوم۔ سب اردگرد حلقہ باندھے

کھڑے، اور درمیان میں محمد علی۔ کلام پاک کے بول خوش الحان قاری کے منہ سے نکل رہے ہیں اور محمد علی کی آنکھوں سے آنسو جاری۔ اتنی دیر پلیٹ فارم پر نہ غل غپاڑہ، نہ شور و ہنگامہ۔ سب کے سب خاموشی کے ساتھ صورتِ تصویر۔ زمانہ یاد کر لیجئے کہ سنہ ۱۹۱۹ء کا تھا۔ سردی کا موسم۔ فرسٹ اور سکنڈ کے مسافر کثرت سے انگریز۔ یہ سب اور انگریز حکام دونوں دور کھڑے یہ منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں! ریل چھوٹنے پر ہوئی گھنٹی بجی، اور قرأت موقوف ——— محمد علی کوئی بہتر سے بہتر تقریر کر ڈالتے، جب بھی شاید یہ سمان اتنا مؤثر نہ بندھ سکتا!

گاڑی چلی، اور میں سندیلہ اسٹیشن تک کے لیے ساتھ ہو لیا۔ میں پہلے سے کبھی رکھا تھا شوکت علی غریب نے دو ایک بار اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا، میری اس وقت کی خود بینی ان بیچارہ کو کب خاطر میں لاتی تھی۔ اب جب خیال آ جاتا ہے تو اپنے اوپر نفرین کرنے لگتا ہوں بہرحال بحث و مباحثہ جو کچھ بھی رہا، محمد علی ہی سے رہا۔ میں نے اپنے کسی خط میں بڑا گستاخانہ اور گندہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا ——— آگے بڑھنے اور فقرہ پڑھنے سے پہلے پھر ایک دفعہ اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ اس فقرہ کا لکھنے والا، وہ نام نہاد "مولانا" نہیں جو ۵۵ ۵۶ سال کی عمر میں یہ ڈائری مرتب کر رہا ہے۔ بلکہ ۲۶، ۲۷ سال کی عمر کا ایک "عقلیت پرست" (ریشنلسٹ) ملحد تھا ——— کہ "سنا ہے آپ اس فرصتِ نظربندی میں، قرآن رٹ رہے ہیں، لیکن قوم میں بہت سے حافظ نبی بخش اور حافظ غلام رسول پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ضرورت تو اس وقت کامریڈ کے ایڈیٹر کی ہے"۔ بس اسی فقرہ پر لے دے سے شروع ہوئی، اور گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا، کہ "کیوں صاحب، اب حافظ نبی بخش بیچارہ حقارت کے لیے ضرب المثل ہو گئے ہیں"۔ اور پھر خط میں لکھا ہوا تو شاید ایک ہی آدھ جواب آتا،

زبانی تقریر مسلسل جوابات ہی کی نذر رہی ———— کامریڈ کا ایڈیٹر، اور شیکسپیر کے ڈراموں کا ناقد و شارح، اور اولڈ بوائز کے جلسہ میں رقص کرنے والا، اب دین کا مبلغ و داعی بن چکا تھا۔ اُسے دھن تھی، تو اسی کی۔ اور ریلوے کمپارٹمنٹ اور مسجد کا منبر دونوں اب اس کی نظر میں ایک تھے۔

دار المصنفین (اعظم گڈھ) سے میری وابستگی اور نیازمندی اُن کے علم میں تھی۔ معارف اور اہلِ معارف کا ذکر خیر رہا۔ مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق ایک فقرہ اب بھی کان میں گونج رہا ہے: "ابکی باہر نکلنے پر سید سلیمان سے کام لینا ہے"۔ "کام" سے مراد وہی دعوت و تبلیغ تھی۔

باب (۱۱)

۲۰ - ۱۹۱۹ء

(رہائی ۔ لیڈری ، خلافت و ترک موالات)

رامپور سے واپسی چند روز بعد ہوئی ۔ لکھنؤ اسٹیشن پر ایکی بھی میں نے حاضری دی اور ایکی بھی اسٹیشن کی حاضری کو ناکافی سمجھ ، پنجاب میل کے رکنے والے پہلے اسٹیشن راے بریلی تک ساتھ گیا ۔ درجہ اتفاق سے خالی تھا ، اور راے بریلی تک وقت بھی اچھا خاصہ لگتا ہے ۔ باتوں کا موقع خوب مل گیا ۔ ٹائمس (لندن) کے لٹریری سپلیمنٹ کا تازہ پرچہ میرے ہاتھ میں تھا ۔ محمد علی اس میدان کے مرد تھے ہی ، لیکن دو ہی چار منٹ بعد علمی و ادبی موضوع چھوڑ ، اپنے اسی محبوب موضوع ، دعوت و تبلیغ پر آگئے ۔ آواز بڑی ہوئی ، گلا بیٹھا ہوا تھا ۔ خدا معلوم میری طرح اور کتنے بکواس کرنے والے انھیں پہلے مل چکے تھے ۔ آواز کھولنے والی ڈاکٹری گولیاں ساتھ تھیں ۔ اُن کے سہارے مجھ ملحد کو قائل معقول کرنے پر آمادہ ہوگئے ـــــــ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ ہر ہر فرد کو تبلیغ کرنا اب اپنا فرض سمجھ لیا تھا ـــــــ اور اپنی آواز گاڑی کی شدید گھڑگھڑاہٹ پر غالب رکھی !

خبر اس زمانہ میں گرم تھی کہ نظر بندی سے رہائی عنقریب ملنے والی ہے ۔ اس کا احاد

ذکر میں نے عرض کیا کہ "آپکے باہر آنے پر کامریڈ اور ہمدرد تو یقیناً نکلیں گے، اور جلد سے جلد نکلیں گے، تقریباً کب تک"؟ بولے کہ "نہیں، اخبارات کا خیال تو فوراً نہیں۔ باہر آکر تو سب سے پہلے دورہ کرنا ہے، اور بجائے قلم کے زبان سے تبلیغ کرنا ہے، ہندوستان کے طول وعرض میں بھی اور یورپ جا کر بھی"——— دنیا کے ہوش وفرزانگی پر اب دین کی مستی، اور دیوانگی غالب آچکی تھی!

اسٹیشن قریب آنے لگا، تو موضوع شعر وسخن کا چھڑا، اور گاڑی جب پلیٹ فارم پر رکی، تو اپنی تازہ نظم شہدائے کلکتہ پر سنائی۔ ۱۹۱۸ء میں ایک انگریزی اخبار کے جرم توہین رسولؐ سے مشتعل ہوکر مسلمانوں نے بلوہ کر دیا تھا۔ اور بہت سے مسلمان پولیس کی گولیوں سے شہید ہوگئے تھے۔ کامریڈ ابتداءً کلکتہ ہی سے نکلا تھا، اور محمد علی کو بعض دوسرے مقامات کی طرح کلکتہ سے بھی خاص دلچسپی تھا۔ تین شعر اس شہادت نامہ کے ملاحظہ ہوں:۔

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ	روح رسولؐ آج ہے مہمان کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہائے شہیدان سرخ پوش	ہے آج گل بہار بیابان کلکتہ
ہے امتحان منافق ومومن کا دوستو	میزان حشر بن گئی میزان کلکتہ

رہائی اُس وقت تو نہ ہوئی۔ بلکہ چھندواڑہ کی نظربندی کے بعد کچھ دن بیتول جیل کے اندر بھی کاٹنے پڑے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء ختم ہو رہا تھا، جب رہائی کا حکم ملا، یعنی اُس وقت جب انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس دور دراز شہر امرتسر میں ہو رہا تھا۔ دونوں بھائی بجائے وطن جانے کے اور کچھ دن بیوی بچوں میں گزارنے کے، سی پی سے ہزار بارہ سو میل

شوق کے پروں سے اڑکر (ہوائی جہاز اس وقت تک کہاں نکلے تھے) امرتسر پہنچے۔ اور ان بھائیوں کی شرکت گویا ساری مسلم قوم کی شرکت تھی ـــــــ مسلمان بحیثیت قوم اب تک کانگرس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ بلکہ چند سال اُدھر تو اسے ہوّا سمجھ اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام اور ایڈیٹر مجیب الرحمٰن اور بیرسٹر عبدالرسول، اور پٹنہ میں بیرسٹر مظہرالحق اور بمبئی کے بیرسٹر جناح جیسے دس بیس سو پچاس انٹلکچوئل قسم کے مسلمان اگر جیوٹ کو کے شریک ہوئے بھی تو کیا، شرکت ان ہی خال خال افراد تک محدود رہی۔ عام مسلمانوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ کانگرس کی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ جب چہرہ پر داڑھیاں رکھائے ہوئے، ٹوپیوں پر نشان ہلال لگائے ہوئے، اور زبانوں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں نے کانگرس کے پنڈال میں قدم رکھا، تو ساتھ میں ایک لاؤ لشکر بھی تھا، اور ـــــــ "علی" برادران کا نام ذہن میں رہے ـــــــ "یا علی" کے نعروں سے ملک کا ملک گونج اٹھا!

امرتسر سے واپسی میں لکھنؤ بھی اپنے پیرومرشد سے ملنے آئے۔ سلسلۂ بیعت میں اسی نظربندی کے زمانہ میں داخل ہوگئے تھے، یا کر لیے گئے تھے۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور کی ذات بھی عجب جامع صفات تھی۔ فیاضی، سیر چشمی، مہمان نوازی، خلق و مروت میں اپنی نظیر آپ۔ دسترخوان کی وسعت، دوست و دشمن و موافق و مخالف کی تفریق سے ناآشنا۔ محمد علی ہی کی طرح، مولانا بھی اُن چند لوگوں میں تھے جو دوسرے کو کھلاکر خوش ہوتے، اور بجائے اُس پر احسان رکھنے کے اُلٹے اس کے شکرگزار ہوتے۔ فرنگی محل میں اُن کی وسیع حویلی محل سرا کے پرانے نام سے مشہور تھی۔ مرحوم کی زندگی میں

اس کا نام بجائے محل سرا کے مہمان سرا ہوتا تو زیادہ صحیح رہتا! بہر حال علی برادران کا استقبال شہر میں خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اس تزک و احتشام کے ساتھ انکا داخلہ لکھنؤ میں پہلی ہی بار ہوا۔ جلوس اسٹیشن سے شہر کا گشت کرتا کراتا کہیں سہ پہر کو فرنگی محل پہنچا۔ جلسہ محل سرا میں منعقد ہوا۔ چائے، ناشتہ، ایڈریس، تقریریں، جلسہ کے سارے لوازمے موجود۔ خلقت کا ہجوم بھیڑ یا دھسان۔ جلسہ کی حیثیت بالکل خانگی تھی۔ صرف مخصوصین مدعو تھے۔ لیکن عقیدتمندی کے سیلاب کو کون روکتا؟ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ عوام اپنے کو آخر خواص سے پیچھے کیوں رکھنے لگے تھے۔

وسیع صحن کا گوشہ گوشہ ہجوم سے پٹ گیا۔ دبکا دبکایا میں بھی ایک صف میں کرسی نشین تھا۔ اور دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ محمد علی کی نظر نہ پڑے تو اچھا ہے۔ اس مجمع عام میں سب کے سامنے ملتے ہوئے جھیپ رہا تھا یہ کہاں ممکن ہوا! ابھی دعا پڑھا ہی جا رہا تھا کہ نظر سے نظر مل گئی، اور وہاں اب تاب کب تھی۔ نہ مجمع کا لحاظ نہ اپنے مرتبہ کا پاس، جھٹ وسط جلسہ سے صدارت کی کرسی چھوڑ ادھر بڑھے۔ میں لپک کر فوراً پہنچ گیا۔ کرسی سے اٹھ ہی چکے تھے، بھینچ بھینچ کر گلے لگایا، اور ترکی اظہار التفات وگرمجوشی کے طریقہ پر پیشانی اور کنپٹی کے بوسے لینے بھی شروع کر دیے!۔

عرض یہ کرنا ہے کہ محمد علی میں تصنع و تکلف کہیں چھو نہیں گیا تھا۔ خودداری یا اپنے کو لیے دیے رہنے کا۔ جو مفہوم عرف عام میں لیا جاتا ہے، اس کے تو وہ قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے۔ قبول خلائق اور مرجعیت کے اس بلند مرتبہ پر پہنچ کر بھی اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نیازمند سے، خلوت ہو یا جلوت، اسی بے تکلفی کے ساتھ ملتے اور خود ہی بڑھ کر ملتے۔

لکھنؤ کا غالباً یہی سفر تھا، جب دونوں بھائیوں کو "مولانا" کی باقاعدہ آنریری ڈگری فرنگی محل (یا اس کے مدرسۂ نظامیہ) سے عطا ہوئی۔ اور جہاں تک محمد علی کا تعلق ہے، انھوں نے تو اس لقب کی لاج رکھ لی۔ اور دینی مطالعہ کرکے خاصی حد تک "مولانا" اپنے کو بنا ہی لیا۔ باقی ان کی تقلید میں ہر کس و ناکس قومی کارکن کو "مولانا" کہنے کی جو بدعت سیئہ چل گئی، اس کی سند جواز کسی درجہ میں نہ اس وقت موجود تھی، نہ آج ہے۔

وفد خلافت جس کے رئیس وفد محمد علی تھے، یورپ کے لیے فروری سنہ ۲۰ء میں غالباً لکھنؤ ہی سے روانہ ہوا تھا۔ ارکان وفد میں ایک مولانا سید سلیمان ندوی تھے، اور ایک مسٹر سید حسین (جو اس وقت بمبئی کرانیکل میں تھے، اور اب وقت ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر سید حسین کے نام سے مصر میں سفیر ہند ہیں[1])۔ وفد کے سکریٹری علیگڈھ کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات قرار پائے۔ جو کسی زمانہ میں پنجابی تھے اور اب تو ایک عمر سے بھوپالی ہیں[2]۔

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (سنہ ۱۹۵۱ء) [2] اب غالباً پاکستانی۔ (سنہ ۱۹۵۱ء)

باب (۱۲)

۱۹۲۰ء

(لیڈری - گاندھی جی)

اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ وفد خلافت یورپ سے واپس آگیا - اور اب گاندھی جی اور شوکت علی کی معیت میں مولانا محمد علی ——— اس وقت سے مولانا گویا ان کے نام کا جزو بنتا ہے ——— کا طوفانی دورہ ملک بھر کا شروع ہوا - اب وہ "مولانا" خاص و عام سب کی زبان پر تھے - تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کا یہ عہد شباب تھا - اور ملک کا چپہ چپہ" مہاتما گاندھی کی جے" کے ساتھ ساتھ "محمد علی شوکت علی کی جے" سے گونج رہا تھا - "اللہ اکبر کے نعرے ہند، وؤن تک کی زبانون پر چڑھے ہوئے - یہ فضا تھی کہ ایک روز گاندھی جی علی برادران کو ساتھ لیے ہوئے، صبح کے وقت دن نکلے ہوئے لکھنؤ اسٹیشن پر وارد ہو گئے - آج کے ہجوم کا کیا پوچھنا! آدمی پر آدمی ٹوٹا پڑتا تھا - اسٹیشن کے اندر بھی اور باہر بھی انسانون کا ایک جنگل ——— گاندھی جی نے صاف کہدیا کہ "جب تک یہ ریلا ایک باقاعدہ مجمع کی شکل نہ اختیار کرے گا، اور راستہ نہ دینے لگیگا مین گاڑی سے نہ اترون گا"۔

دیکھنے کے قابل اب یہ منظر تھا - مولانا خلقت کی نظر مین بہ حیثیت لیڈر کے اب اگر گاندھی جی کے ہم پلہ نہین، تو اُن سے بس کچھ کم ہی تھے - فرق وہی ۱۸، ۲۰ کا -

لیکن یقین کیجیے کہ اس وقت راستہ صاف کرنے کے لیے جو اترا وہ کوئی اور نہین ،
مولانا ہی تھے! وہ چارون طرف چیخ چیخ کر اور دوڑ دوڑ کر اس طرح کام کر رہے تھے،
کہ جیسے وہ کامریڈ کے ایڈیٹر، اور دربار کے لیڈر نہین، بلکہ کوئی معمولی والنٹیر یا رضاکار ہین!
ایک کا ہاتھ پکڑا، دوسرے کو گھسیٹا۔ اس کو ڈانٹا، اس کو چمکارا۔ کام دو منٹ کا نہ تھا
وقت پچیس منٹ سے کیا کم لگا ہوگا۔ مجمع سا مجمع تھا! مولانا کے چہرہ بشرہ کسی چیز
سے بھی ظاہر نہین ہوتا تھا کہ یہ بھی اپنے کو کسی درجہ کا لیڈر یا مخدوم سمجھتے ہین بس محض ایک
خادمانہ حیثیت! اور پھر پلیٹ فارم سے باہر جب نکل آئے تو دوسرا منظر اس پہلے سے
بھی کچھ بڑھ چڑھ کر۔ جوڑی گاڑی جو لینے آئی تھی، اس کے لیے مولانا کا اصرار کہ مین اندر
گاندھی جی کے برابر نہین، بلکہ باہر کوچوان کے پاس کوچ بکس ہی پر بیٹھونگا!——
مین نے تو اپنے تجربہ مین کسی ایک لیڈر کو بھی اپنی شخصیت دوسرے لیڈر مین اس طرح
فنا کرتے ہوئے نہین دیکھا، نہ اس کے قبل نہ اس کے بعد۔ اور مسلمان لیڈرون میں تو کیا
ہندو لیڈرون مین بھی نہین۔ آپ کے مشاہدہ مین کوئی ایسی مثال آئی ہو تو آپ ہی فرمائین۔

مولانا اب خالی ایک ایڈیٹر یا انشا پرداز نہ تھے۔ آل انڈیا لیڈر تھے، گاندھی جی
کے تقریباً ہم پلہ و ہم دوش۔ گورنر یوپی، سر جیمس مسٹن کی دوستی، اور گورنمنٹ آف انڈیا کے
فنانس ممبر سر گے فلیٹ ووڈ ولسن کی یاری ختم ہوئے، مدتین ہو چکی تھین۔ اب وہ نہ صرف
دشمن حکومت کے تھے، اور حکومت شدید دشمن ان کی۔ خلقت اُن کے اوپر پروانہ وار
گر رہی تھی، اور دن رات مین مشکل سے کوئی وقت ایسا نکلتا جسے وہ اپنا کہہ سکتے۔
عوام و خواص سب ہی کی باگ ان کے ہاتھ مین تھی۔ عوام دل سے فریفتہ اور خواص مصلحت

کے تقاضہ سے گرویدہ۔ راجہ صاحب محمود آباد (جواب شاید "مہاراجہ" ہو چکے تھے) بھی بڑے ذی حوصلہ، سیر چشم، فیاض اور مہمان نواز رئیس تھے لیکن بہرحال رئیس تھے، راجہ تھے۔ یا انگریزی اصطلاح میں "اریسٹاکریٹ" تھے۔ ایسے عوامی لیڈر کے لیے جگہ ان کے ہاں نکلنی ذرا دشوار ہی تھی۔ محمود آباد ہاؤس کی شاہانہ مدارات اور ضیافتوں سے لطف اٹھانے کے لیے ہزہائینس سر آغا خان، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، اور مسٹر جناح کیا کم تھے۔ گاندھی اور علی برادران کے لیے وہی فرنگی محل کی محل سرا کافی ہوئی۔ محل سرا خاصی وسیع تھی۔ محل سرا کے مالک کا قلب اس سے بھی وسیع تر۔ مولانا عبدالباری مرحوم کے ہاں "فقیری" میں بھی ایک شاہی شان۔ صبح سے شام اور شام سے آدھی رات تک ایک میلہ سا لگا ہوا۔ گاندھی جی کے لیے تو پھر بھی تنہائی کا اہتمام، حاجب و دربان کا انتظام۔ لیکن علی برادران کا سارا وقت وقف عام۔ جب دیکھئے لوگوں سے گھرے ہوئے۔ ابھی اس سے بحث و مباحثہ، ابھی اس سے قیل و قال۔ خدا معلوم غسل و طہارت، آرام و استراحت کے لیے وقت کون سا اور کب نکال پاتے تھے!

یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی سے شخصی نیاز، گو بہت ہی سرسری، حاصل ہوا۔ اس وقت کلکتہ کے متعدد رسالہ ماڈرن ریویو میں انگریزی مضامین لکھا رہتا تھا، میں اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ستیا گرہ اور اسلام" کے عنوان سے نکلا تھا ——— یاد رکھیے کہ اس وقت گاندھی جی کے چلائے ہوئے الفاظ "ستیا گرہ" اور "شانتی" نئے ہونے کے باوجود بچہ بچہ کی زبان پر تھے ——— آیات قرآنی کی مدد سے مقالہ میں دکھایا یہ گیا تھا کہ "ستیا گرہ" کی تعلیم اسلام کے لیے کوئی نئی اور انوکھی تعلیم نہیں، یہ تو صاف

قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ زمانہ پھر یاد کر لیجئے، اب اکتوبر سنہ ۲۰ء کا تھا۔ اب میں نہ ملحد رہا تھا، نہ معاند اسلام۔ مادیت سے نامتر روحانیت کی طرف منتقل ہو آیا تھا (اور اس انتقال فکری میں خود گاندھی جی کی تعلیمات کا بھی ایک حد تک دخل تھا) اور پختہ مسلمان اگر نہیں تو نیم مسلمان سے زاید تو اس وقت تک ضرور ہو چکا تھا۔ اور قرآن مجید کو اگر لفظاً وحرفاً نہیں، تو کم از کم معنیً ومفہوماً تو کلام الٰہی بہرحال ماننے لگا تھا۔

غالب نے "تقریب بہر ملاقات" کے لیے "مصوری" سیکھنی شروع کی تھی[۱]، یہاں تقریب کے لیے اس تازہ مضمون کو کام میں لایا گیا۔ لیڈروں کی پارٹی دوسرے دن سہ پہر کو پنجاب میل سے شاہ جہان پور، بریلی کی طرف روانہ ہوئی۔ حسب معمول میں اسٹیشن آیا۔ اور سندیلہ تک ہم سفر ہو لیا۔ اتفاق سے مولانا ابوالکلام بھی اسی ٹرین میں کلکتہ سے چلے آرہے تھے۔ اور گاندھی جی اور مولانا محمد علی کو جگہ ان ہی کے سکنڈ کلاس میں ملی۔ (شوکت صاحب کہیں دور بیٹھے۔ شاید کہ حکیم اجمل خان مرحوم بھی اسی ٹرین میں کہیں اور تھے، اور شوکت صاحب وہیں گئے)۔ گاندھی جی تھک کر چور ہو چکے تھے، اور گاڑی چلتے ہی ناوقت ہونے کے باوجود ایک برتھ پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ نیچے کے برتھ پر گاڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے مولانا ابوالکلام۔ وسط میں مولانا محمد علی اور کنارہ پر یہ خاکسار۔ ماڈرن ریویو کا پرچہ ہاتھ میں۔

اصل مقصود تو اُسے گاندھی جی کی خدمت میں پیش کرنا اور اُن سے اس مضمون کی داد لینا تھا۔ سو یہ غرض تو پوری طرح حاصل نہ ہوئی، گاندھی جی خود ہی نیند کے ماتے ہوئے تھے۔ البتہ وہ پرچہ مولانا نے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مضمون کی چند ہی سطر پڑھ، اُس کے اصل منشا

---

[۱] سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری ‖ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

یعنی قرآنی عقیدۂ صبر اور گاندھوی عقیدۂ ستیاگرہ کے اتحاد کو پاکر پرچہ تو بند کر دیا، اور اسکے اصل موضوع پر بحث شروع فرمادی ــــــــ مولانا اپنی ذات و شخصیت کو گاندھی جی میں فنا کیے ہوئے تھے لیکن میں اس خوش عقیدگی اور یہ قول مخالفین کے، "گاندھی پرستی" کے زمانہ میں بھی اپنے عقائدِ اسلامی پر بالکل پختہ اور گاندھوی فلسفہ سے غیر متاثر تھے۔ ان سے کہیں زیادہ متاثرِ گاندھویت سے تو میں خود تھا! گاندھی جی کو اصلاً ایک معلّمِ اخلاق و پیکرِ روحانیت سمجھ رہا تھا، اور وہ صرف ایک بلند پایہ سیاسی لیڈر!

بہرحال میں یہ عرض کرتا رہا کہ قرآن کا اصلی وعدہ اپنے پیرودں سے روحانی حکومت یا مسیحیوں کی اصطلاح میں آسمانی بادشاہت کا ہے۔ اور وہ فرما رہے تھے کہ نہیں، اسلام اس مادی دنیا میں بھی پوری طرح حکمراں اور غالب رہنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام بھی پوری طرح، ان ہی کے ہمنوا تھے۔ اور میرے اوپر گولہ باری اس دُہرے مورچہ سے ہو رہی تھی ــــــــ میں نے ایک بار عرض کیا کہ اچھا یہ بتایئے کہ ایک طرف ملک روم کی سلطنت ہو، اور دوسری طرف مولانائے روم کی شخصیت، اور آپ کو حقِ انتخاب حاصل ہو تو آپ انتخاب کس کا کریں گے؟ میں تو سلطنت پر لات ماردوں گا، اور مولانا کو لے لوں گا۔ مولانا ابوالکلام نے فرمایا "ہرگز نہیں، ہم ملک و سلطنت کو لیں گے" مولانا محمد علی نے معاً، ایک منٹ کا انتظار کیے بغیر فرمایا "بیشک۔ اور یہ اس لیے کہ جب سلطنت اسلامی ہوگئی، تو وہ خود ہی مولانا کی سی شخصیتیں پیدا کرتی رہے گی" ــــــــ ابوالکلام اور محمد علی کے درمیان اس وقت بھی نقطۂ نظر کا جو فرق تھا، اس کی پوری جھلک ان جوابوں میں نظر آ رہی ہے۔ محمد علی کے ہاں مادی غلبہ، روحانی غلبہ سے الگ اور کوئی مستقل وجود رکھتا ہی نہ تھا، اس کا ضمیمہ اور لازمی نتیجہ تھا۔

میں اپنی بات پر اڑا رہا، اور یہی کہے گیا کہ "آپ نے ترتیب الٹ دی۔ شخصیتین سلطنتین پیدا کر دیتی ہین۔ سلطنتین شخصیتین نہین پیدا کر سکتین"۔ گاندھی جی کچھ سوتے، کچھ جاگتے، یہ بحث آدھی تہائی کچھ سنتے رہے، اور جا بجا مسکراتے بھی گئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ مین یہ پر لطف صحبت ختم ہو گئی۔ میرا اسٹیشن آگیا، اور گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ عقیدتمندون اور "درشن" کے طالبون کا ریلا اس چھوٹے سے اسٹیشن پر بھی آیا۔ اور مولانا کی پوری کوشش یہی کہ کوئی زحمت مہاتما جی کو نہ ہونے پائے اور ان کے آرام مین خلل نہ پڑنے پائے۔ خود ہر زحمت برداشت کر لینے اور اپنے اوپر لے لینے کو موجود ———— گاندھی جی کا ایثار اس مین شک نہین کہ بہت بڑھا ہوا تھا اور ضرب المثل کی شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اپنی آنکھون کی اس شہادت کو کیا کرون کہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی ہر وقت کی پیش آنے والی باتون مین مولانا محمد علی اپنے کو جس جس طرح ان کے سامنے دبایا، مٹایا اور گرایا، اس کی نظیر بھی ملنی آسان نہین۔

باب (۱۳)

۲۱-۱۹۲۰ء

(خلافت ۔ جامعہ ملیہ)

اسی دور کا ذکر ہے کہ ایک بار پھر علی برادران کا پھیرا لکھنؤ کا ہوا (وقت کی تفصیل اب یاد نہیں) قیام حسب معمول فرنگی محل میں۔ شب کو دعوت بھی حسب معمول فرنگی محل میں۔ وقت مقرر پر ہم سب لوگ منتظر، اور محمد علی کا پتہ نہیں۔ انتظار اور مزید انتظار۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن سے سیدھے، یا اور کہیں ہوتے ہوئے، غلام حسین مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان عیش باغ کو چلے گئے ہیں۔ "فاتحہ" محمد علی کے ہاں کوئی رسمی چیز نہ تھی۔ قبر پر رو رو کر ایصال ثواب کرنے، اور رحمت و مغفرت کی دعائیں خشوع و خضوع، گریہ و زاری کے ساتھ کرنے میں جتنی دیر بھی لگ گئی ہو، اس وقت کے گزرنے کا احساس ہی محمد علی کو کب ہوا ہوگا؟ ——— جو شخص ہر اجنبی مسلمان کی مصیبت اور موت سن کر آبدیدہ ہو آئے، اور اس کی چوٹ کو اپنی چوٹ سمجھنے لگے، تو پھر یہاں تو معاملہ اپنے ایک گھر کے مخلص اور عزیز ترین رفیق، اسسٹنٹ ایڈیٹر کا مرید اور ایڈیٹر نواز کا تھا۔ آدھی رات بھی اگر بالین تربت پر گزر جاتی تو زر العجب نہ ہوتا۔ بہر حال محمد علی اچھی خاصی دیر کر کے واپس آئے، جب لوگ خوب بھوک سے بیتاب ہو چکے تھے۔

کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہے تھے کہ میں نے قریب جا کر باتین شروع کر دیں۔ ٹیگور کا انگریزی مضمون (Penalties of Being Known) "شہرت کا جرمانہ" اسی زمانہ مین نکلا تھا۔ اس کا حوالہ دے کر میں نے عرض کیا کہ "اب تو آپ سے بات کرنے کا موقع نکلنا دشوار ہو گیا ہی، ہر وقت اور ہر جگہ لوگ گھیرے رہتے ہین۔ اور آپ کی بھی زبان رکتی نہین اپنے فرطِ اخلاق سے باتین کیے ہی جاتے ہین" بولے کہ "ہاں بولتے بولتے گلا پڑ جاتا ہے، لیکن اس کا کوئی علاج بھی نہین۔ اب یہ گلا تو جب اس مین پھانسی کا پھندا پڑے گا، جب ہی خاموش ہوگا، یون تو ماننے کا نہیں" —— قید سے ابھی چھوٹ کر آئے تھے، لیکن قید و بند، بلکہ دار و رسن کے لیے بھی ہر وقت اب بھی تیار ہی رہتے تھے۔

سنہ ۲۰ء کی آخری سہ ماہی تھی، جب علی برادران کا حملہ اس وقت کے علی گڑھ پر ہوا، محمد علی کو اپنے علی گڑھ سے محبت نہین، عشق تھا۔ خدا معلوم دل پر کیا گزر رہی ہوگی، جب اس بتکدہ کو توڑ رہے تھے۔ ایک اسلام کے نام کے آگے سب کچھ بھلائے ہوئے تھے۔ یہان تک کہ علی گڑھ کو بھی: —— فرنسز کی ایک تقریر میں خود زار و قطار رو رو کر اور دوسرون کو رلا رلا کر کہہ بھی تو چکے تھے کہ

کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فرض ہے۔ اس کے بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانین قربان کرنا ہین۔ جب اس پر حملہ کی تیاریان ہو رہی ہین، اور ہمارا قبلہ ہی خطرہ مین پڑ رہا ہے، تو ہم سب یہان سے ہجرت کر کے گرتے پڑتے اس کی حفاظت کو جا پہنچین گے۔ اپنے گھرون کو ویران کر دین گے، تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ یہان کی مسجدون مین قفل ڈال جائین گے کہ وہ بڑی مسجد آباد رہے۔ یہان کی عبادتگاہین سونی کر جائنگے

اُس معبدِ اعظم کی رونق اور بہار میں نہ فرق پڑنے پائے۔"

بہرحال مسلم علی گڈھ کے معاً بعد محمد علی ایک سرکاری اثر سے آزاد "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی طرح ڈالنے میں لگ گئے۔ خود ہی بڑی محنت سے اُس کا نصاب بنایا، اُس پر مضامین لکھے، اُن کی نشر و اشاعت کی، کلاس قائم کیے، اور خود ہی پڑھائی بھی شروع کر دی ——— جامعہ ملیہ آج بھی ماشاء اللہ قائم ہی نہیں، بلکہ بڑی اچھی حالت میں ہے۔ لیکن یہ یاد دلاتے رہنے کی ضرورت آج بھی باقی ہے کہ اُس کے اصل بانی محمد علی ہی تھے۔ جیسے علی گڈھ کے اصل بانی سرسید۔ رفیقوں، شریکوں کی رفاقت و شرکت سے اصل بانی کی شخصیت مشتبہ نہ ہو جانی چاہیئے۔

سال کی یہ آخری سہ ماہی محمد علی کے لیے بڑی آزمائش کی سہ ماہی تھی۔ علی گڑھ کی تخریب اور جامعہ کی تعمیر، دونوں کے کام ساتھ ساتھ۔ فرصت بالکل عنقا۔ خدا جانے کھانے اور سونے کے اوقات کہاں سے نکال لیتے تھے۔ بہرحال جنوری ۲۱ء میں جب ذرا دم میں دم آیا تو ۳ جنوری کو مجھے جامعہ آنے کی دعوت دی۔ مراسلت اب عرصہ دراز سے بند تھی۔ یہ مکتوب پاکر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ اصل خط ملاحظہ ہو:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۳ جنوری ۱۹۲۱ء

برادرم۔ السلام علیکم

اپنی عدیم الفرصتی کا اب کیا دکھڑا روؤں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اسی باعث مفصل خط لکھنے سے معذور ہوں۔ اور مجملاً لکھنے کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ آپ میرے مفہوم کو

نہ سمجھ سکیں گے۔ بہرحال یا قسمت یا نصیب کہہ کر لکھتا ہوں۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو یہاں دیکھوں اگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے۔ اور ایک مسلمان کے مذہب کے متعلق اگر قومی مسلم یونیورسٹی میں بھی شک و شبہ کیا جائے گا تو ہم کیونکر سچا نہیں چھوٹا سکتے کہ ہر شخص کا مذہب اُس کا ذاتی معاملہ ہے جس سے اس دار العلوم کو کوئی تعلق نہیں۔ ابتک عمداً میں نے فلسفہ کے سینیر پروفیسر کی جگہ کے متعلق کوئی سفارش نہیں کی ہے۔ چونکہ اردو میں تعلیم دلانا منظور ہے، اس لیے اور بھی آپ کی ضرورت ہے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ایک دو دن کے لیے میرے مہمان بن کر یہاں کی دال روٹی کھائیے اور تمام معاملات کا تصفیہ کیجئے۔ اگر ہم دونوں ایک ہی بات پر راضی ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ دار العلوم کو آپ سے بیش قیمت مدد مل سکے گی۔ ممکن ہے کہ آپ شروع ہی سے یہاں آنے سے انکار کرتے ہوں، اور مذہب کے متعلق میرے اسقدر لکھنے کو بھی خواہ مخواہ کا دخل در معقولات تصور کریں۔ لیکن مجھے تو پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اس لیے تبلیغ ہی کا موقع دیجئے اور آجائیے۔ بہرحال آپ سے نصاب و نظام تعلیمات کے متعلق مشورہ کرنا ہے۔ اسی کے لیے آجائیے۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام۔ آپ کا قدیم نیازمند

محمد علی"

اس ارشاد کی تعمیل تو میں کیا کرتا۔ اور اپنا لکھنؤ کا گوشۂ عافیت (خاتون منزل) چھوڑ، سرکاری یا قومی کسی قسم کی بھی قید ملازمت میں اب کیا پڑتا۔ بلکہ اب تو اس منزل میں تھا کہ خود لکھنؤ کی سکونت بار معلوم ہو رہی تھی، اور سالہا سال کے قیام کے بعد،

اور گوناگون دلچسپیوں کے باوجود اسے ترک کرکے اپنے وطن قدیم، دریاباد کو از سر نو آباد کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس لیے جواب میں تو غالباً محض معذرت لکھ بھیجی۔ لیکن یہاں ذکر میرے جواب کا نہیں، ذکر مولانا کے اصل مکتوب کا ہے ـــــــ عبارت مکرر ملاحظہ کر لی جائے۔

اللہ اللہ! محمد علی کو مجھ سے جس درجہ محبت و شفقت تھی، اوپر کے صفحات سے ظاہر ہو چکی ہے۔ حسن ظن بھی مجھ سے (میری کتاب پڑھکر) اتنا رکھتے ہیں کہ جامعہ میں فلسفہ اردو میں پڑھانے کا بہترین معلم میں ہی ثابت ہو سکتا ہوں۔ اس ذاتی تعلق اور اتنی خوش ظنی، دونوں کے باوجود لکھتے ہیں، تو یہ کہ "مگر علم سے زیادہ مذہب عزیز ہے!" ـــــــ محمد علی کے سوا کوئی دوسرا ہوتا، تو بھلا اس موقع پہ یہ فقرہ لکھتا، یا اور کوئی شرط اس قسم کی لگاتا؟

میں بحمد اللہ اس وقت تک الحاد و دہریت کے چکر سے پوری طرح نجات پا چکا تھا، اور پختہ مسلم ہو چکا تھا۔ مولانا کو ان تفصیلات کی اطلاع نہ تھی۔ وہ اپنی پرانی واقفیت کی بنا پر اب تک میرے عقائد کو ناقابل اطمینان سمجھ رہے تھے۔ اسلام اور اللہ کے دین کا یہ گھر اور دان ہی سے دل میں تھا کہ مجھے بلا بھی رہے ہیں، میرا ہونا وہاں دل سے بھی چاہ رہے ہیں، اور اس کو جامعہ کے حق میں مفید بھی پا رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود اس کے ذرا بھی روادار نہیں کہ ایک قی درسگاہ میں الحاد و دہریت کے جراثیم لیے ہوئے میں قدم رکھوں ـــــــ محمد علی کی سیرت کا سارا نچوڑ اس ایک مختصر سے خط، بلکہ اس کے ایک فقرہ کے اندر آگیا۔ دین کے لیے اتنی صلابت اچھے اچھے علما میں بھی اس دور میں کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ نہیں کہ محمد علی کو اپنے دوستوں، عزیزوں، رفیقوں سے

محبت نہ ہو۔ محبت مین کمی کیسی، اور زیادتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اللہ اور اس کے دین کی محبت ان سب محبتون پر حاکم اور غالب۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ کی عملی تفسیر۔

کہتے ہین کہ علی برادران کی ان ہی والہانہ خداپرستیون کو دیکھ ایک بار ان کے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ نے فرمایا تھا کہ "یہ دونون بھائی اگر عہد نبویؐ مین ہوتے تو انکی مسلسل فداکاریان تو ایسی ہین کہ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس مخصوص صحابیون کے نام ایک صحبت مین لے لے کر انھین جنت کی بشارت دیدی تھی، ایسے ہی ان دونون کے لیے بھی کیا عجب ہے کہ نام لیکر ارشاد ہو جاتا کہ محمد علی فی الجنۃ، شوکت علی فی الجنۃ"—— اور کون کہہ سکتا ہے کہ مرشد کا یہ قول حقیقت سے خالی اور نری تخئیل پر مبنی تھا؟

باب (۱۴)

۱۹۲۰ء

"مستحق دار کو حکمِ نظر بندی ملا"

سنہ ۲۰ء علی برادران کے شباب شہرت کا سنہ تھا۔ گاندھی جی کے ہمراہ ان دونوں نے ملک ہندوستان (غیر منقسم ہندوستان یعنی موجودہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے مجموعہ) کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ آج کلکتہ میں ہیں تو کل بمبئی میں۔ صبح دہلی میں کی تو شام لاہور میں۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ پہنچے۔ اور جہاں کہیں پہنچے، نام کی شہرت استقبال کے لیے پیشتر ہی سے موجود ہوتی۔ خلافت کمیٹیاں گاؤں گاؤں تک میں قائم۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا صدر دفتر بمبئی میں، جس کے سکریٹری مولانا شوکت علی ——— خلافت کمیٹی جب ابتداءً سنہ ۱۹ء میں قائم ہوئی، جب تو علی برادران بیتول جیل میں نظر بند تھے۔ لیکن جب سے باہر نکلے خلافت کمیٹی پر ایسا چھا گئے کہ لوگ اس کے بانیوں کو بھول ہی گئے۔ اور زبانوں پر صرف محمد علی شوکت علی کے نام رہ گئے، یہ خلافت کمیٹی کے مرادف، اور خلافت کمیٹی انکے مرادف!

فروری سنہ ۲۱ء کا اخیر تھا، جب لکھنؤ میں صوبہ خلافت کانفرنس کا جلسہ رفاہ عام[1] میں

[1] اس وقت تک بڑے بڑے پبلک جلسے وہیں ہوا کرتے تھے۔ سٹی اسٹیشن کے قریب رفاہ عام کلب اور جلسہ تھنڈ کی جو عظیم الشان عمارت ہے، جلسے کبھی اس کے اندر ہال میں ہوتے اور کبھی باہر احاطے کے میدان میں۔

کے احاطہ میں دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ خلافت کا معمولی سا معمولی جلسہ بھی اس وقت انتہائی گرمجوشی کے ساتھ ہوتا تھا، اور پھر اس کی صدارت کے لیے تو مولانا محمد علی آرہے تھے۔ اس نام کی کشش نے اور چار چاند لگا دیے۔ یہ عین وہ زمانہ تھا کہ میں لکھنؤ کے ہمہ وقتی ہنگاموں سے اکتا کر اور تنگ آکر لکھنؤ سے ۴۰۔ ۴۲ میل دور اپنے وطن آبائی قصبہ دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کو منتقل ہو آیا تھا۔ اور سیاسی جلسوں سے بالکل الگ اور گوشہ گیر تھا۔ لیکن محمد علی کا نام سن کر کیسے نہ آتا ——— بہ قول شخصے سر کے بل آیا۔

محمد علی اب اپنے وقت کے مالک کسی درجہ میں بھی نہیں رہے تھے۔ ہر وقت مصروف ہی رہتے۔ ابھی ایک کام اٹھایا ہی تھا کہ اسے ادھورا چھوڑ دوسری طرف مڑ جانا پڑا۔ ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ دوسری بات چھڑ گئی۔ معاصرین میں اچھے اچھے نامور اور مشاہیر پوری بات کرنے کو ترس جاتے۔ خطبۂ صدارت لکھنے لکھانے کی فرصت اب کہاں سے لاتے۔ صدارتی تقریر زبانی ارشاد کی، جو شاید کئی گھنٹہ میں ختم ہو پائی۔ ایک نالۂ درد تھا، طویل و مسلسل۔ خود بھی بات بات میں روتے، اور دوسروں کو بھی رلاتے۔ آج ان تقریروں کا کوئی حصہ بھی کاش کہیں محفوظ ہوتا! ——— گراموفون کی ایجاد اس وقت بھی موجود تھی، اور سینکڑوں فاسقانہ گیت اُن میں محفوظ کیے جا رہے تھے۔ اللہ کی حمد و ثنا کی یہ دلکش اور ولولہ وز مناجاتیں بھی اس وقت ریکارڈ کر لی جاتیں!

مجھ ناچیز سے وہی بحث و مباحثہ، قیل و قال، جلسہ گاہ کے باہر بھی اور محلسرائے انگی محل کے اندر بھی۔ جلسہ دو دن رہا۔ کارروائی اردو میں تھی۔ جلسہ میں جو اہم اور مرکزی تجویز منظور ہوئی، اس کے انگریزی ترجمہ کا حکم مجھے ملا۔ خدا معلوم مجھے اپنے اوپر قیاس کر کے انگریزی

زبان کا ماہر کس بنا پر سمجھنے لگے تھے! تخت صدارت کے قریب مجھے بلایا، اور ارشاد فرمایا کہ "یہ تجویز بہت اہم ہے۔ تار پر وزیر اعظم برطانیہ کے پاس جائے گی، اس کا ترجمہ تم ہی کر دو۔" اتنی بڑی ذمہ داری کی اہلیت اس نا اہل میں کب تھی۔ حیلہ حوالہ کرکے کام دوسروں پر ٹال، خود وہاں سے کھسک گیا! ——— شیخ شوکت علی بی۔ اے مرحوم (وکیل لکھنؤ) بہت پیش پیش تھے، عجب نہیں جو ان ہی غریب کو ترجمہ کا کام بھی انجام دینا پڑا ہو۔ قومی و ملی معاملات میں اپنی ذمہ داری کی طرف سے غفلت، اور اپنا کام دوسروں کے سر ڈال دینے کی لت، اس وقت بھی ایسی ہی عام تھی جیسی آج ہے۔

شام کو فرنگی محل میں حسب معمول زور دن کی دعوت ——— اب ہر دفعہ بار بار اس کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔

اب محمد علی سارے ملک میں زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ پورے اور صحیح معنی میں "ہر جائی" تھے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ صبح کہیں شام کہیں۔ ساری فضا میں تین ہی نعرے ایک "اللہ اکبر"۔ دوسرے "مہاتما گاندھی کی جے" تیسرے "محمد علی شوکت علی کی جے"۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملک کی حکومت ان ہی تین بے تاج کے تاجداروں کے ہاتھ میں ہے، اور ساری خلقت کے دلوں پر یہی تثلیث حکمرانی کر رہی ہے۔ ٹھیٹھ گنوار اور دیہاتی، اخبارات کی صورت تک سے بے خبر، لیکن ان ناموں سے وہ بھی خوب واقف۔ کلمہ ان ہی ناموں کا پڑھ رہے ہیں۔ شہرت ایسے ایسے دور افتادہ علاقوں تک پہنچی ہوئی، جہاں اس کے قبل نہ کسی لیڈر کے نام کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی واعظ یا "سیاسی" کی ——— لطیفہ یہ کہ خواص کے علم میں تو محمد علی، شوکت علی گو "یک جان" تھے، لیکن بہرحال "دو قالب" تھے۔

عوام الناس کے ذہن میں دوئی اتنی بھی نہ تھی، جان بھی ایک اور قالب بھی ایک۔ گویا "شوکت علی" کوئی دوسرا نام تھا ہی نہیں۔ بلکہ محمد علی ہی کے پورے نام کا ایک جزو تھا۔ "محمد علی شوکت علی"!

محمد علی اب انسان کاہے کو تھے، محض ایک "خبر" ہو کر رہ گئے تھے جو روزانہ چھپتی رہتی۔ آج اگر تصویر نکلتی، تو کل تقریر چھپتی، اور پرسوں بیان شائع ہوتا۔ محمد علی کو اپنی ماں سے، بیوی سے، چاروں بچیوں سے، سب سے بے انتہا محبت تھی، سب کے عاشق زار تھے۔ آج خدمت ملک و ملت کے پیچھے (جسے وہ خدمت دین اور عبادت سمجھ کر کر رہے تھے) ان سب کو بھولے ہوئے، سب سے چھوٹے ہوئے تھے ——— ذاتی مراسلت و مکاتبت کا موقع بھلا اس درمیان میں کیا ملتا۔ روز روز کی خیریت اخبارات سے ملتی ہی رہتی۔

ستمبر ۱۹۲۱ء کا آغاز تھا کہ محمد علی مدراس جاتے ہوئے راستہ میں والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیے گئے۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی ایک غضبناک تقریر کئی ہفتہ قبل اس خبر کے لیے کانوں کو تیار کر چکی تھی۔ اور گرفتاری کے بعد اپنے مشہور و معروف مقدمہ کیلئے کراچی لائے گئے۔ جرم یہ تھا کہ کچھ روز قبل کراچی خلافت کانفرنس میں بحیثیت صدر کانفرنس ایک باغیانہ تقریر کی تھی، اور ایک باغیانہ ریزولیوشن پاس کرایا تھا، جس سے مسلم سپاہیوں میں سرکار انگریزی کے خلاف، دلی و ناراضگی پھیلتی۔ ساتھ کے اور مجرم پیر غلام مجدد صاحب، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری وغیرہ تھے۔

ہمدم (لکھنؤ) اس وقت زور دں پر نکل رہا تھا۔ اور یوپی اور دہلی میں کہنا چاہیئے کہ وہی ایک روزنامہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مالک آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی مرحوم تعلقہ دار گدیہ تو بالکل دوسرے سیاسی مسلک کے تھے لیکن ایڈیٹر سید جالب مرحوم ایک زمانہ میں خاص رفیق مولانا محمد علی کے رہ چکے تھے، اور ہمدرد میں کام کیے ہوئے تھے۔ یہ علی برادران کے حالات تفصیل کے ساتھ چھاپتے رہتے۔ اور مسلمانوں کا مذاقِ عام اُس وقت مانگ بھی اسی چیز کو رہا تھا۔ جالب مرحوم کو کہیں سے (غالباً فرنگی محل سے) مولانا کا ایک خانگی مکتوب ہاتھ آگیا، حسب معمول خوب مفصل تھا، اور اس میں مولانا کے قلم سے والٹیر سے کراچی تک کا سفرنامہ درج تھا۔ ہمدم نے اسے بجنسہ شائع کر دیا۔ دریاباد میں ڈاک اس وقت صبح کچھ دن چڑھے تقسیم ہوتی تھی۔ پرچہ جب وقت آیا، بیت الخلا جا رہا تھا، پرچہ ہاتھ میں لیے وہیں چلا گیا، اور فرط اشتیاق میں وہیں کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ——— خدا کے لیے کوئی صاحب یہاں پہنچ کر، لاحول ولا قوۃ پڑھ کر، اس عمل کے جواز و عدم جواز کی فقہی بحث نہ چھیڑ دیں۔ بیان نفس واقعہ اور فرط اشتیاق کا ہو رہا ہے نہ کہ کسی مسئلہ کے جواز و عدم جواز کا۔

خط کے اور حصے بھی مؤثر تھے لیکن جب اس مقام پر نظر پہنچی کہ "رات کے طویل گھنٹے دو شریفہ کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے۔ اور آسی غازیپوری کا یہ شعر برابر ورد زبان رہا کہ

وہاں پہنچ کے یہ کہیو صبا سلام کے بعد — تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد"

تو معاً آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہو گیا ——— دنیا بھی کیسی اندھی تھی، اور آج تک اندھی چلی آ رہی ہے۔ محمد علی کو دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح محض

ایک سیاسی لیڈر سمجھا کتنا کھلا ہوا ظلم تھا! جو اپنے آپ کو رسول کی محبت میں فنا کیے ہوئے تھا جس پر عشق اپنے دین کا سوار تھا، اس کے لیے یہ رائے قائم کرنا کہ اس کا منتہائے مقصود اپنے وطن کی آزادی اور ہندوستان کی خود مختاری تھا، یہ کیسی صریح ناانصافی اس کے حق میں تھی ہے اور اپنے حق میں بھی! محمد علی کو تو ہندوستان کی آزادی بھی اس لیے عزیز تھی کہ اس سے حرمین شریفین بھی آزاد ہو سکیں گے! ——— سچ کہا ایک دوسرے عارف اور دیوانہ (مولانا مناظر احسن گیلانی) نے دس سال بعد محمد علی کی موت پر سے

به دینِ مصطفٰے دیوانہ بودی — فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی — وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

باب (۱۵)

۲۲-۱۹۲۱ء

(قیدفرنگ۔ "جان بیتا خلافت پہ دیدو")

کراچی کی عدالتوں میں، پہلے مجسٹریٹ کے اور پھر صوبہ کی سب سے اونچی عدالت جوڈیشل کمشنر کے سامنے محمد علیؔ نے جو جو بیانات دیے، اور جیسے جیسے قانونی نکتے اور ادبی لطیفے دوران مقدمہ میں پیدا کیے، ان کی تفصیلات کو اس "ذاتی ڈائری" کے محدود موضوع اور گنجائش سے کیا تعلق۔ مختصر یہ کہ لفظ لفظ جوش ایمانی اور غیرت دینی کا ترجمان تھا۔ انگریزی اخبارات کے لمبے لمبے کالم مقدمہ کی کارروائیوں اور "سنسنی خیز" سرخیوں سے بھرے رہتے۔ اور ادھر ہر روز تازہ اخبار کا انتظار بےچینی کے ساتھ رہا کرتا۔ صبح ہوئی نہیں، اور اخبار کا انتظار شروع ہوا نہیں۔ اور جب اخبار ہاتھ میں آکر کچھ دیر میں ختم ہو جاتا، دل اسی وقت سے دوسرے دن کے اخبار میں اٹک جاتا! کوئی دو مہینہ حوالات میں عام قیدیوں کی طرح گزارے۔ نومبر میں حکم سنایا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علیؔ کو بھی ہوئی —— محمد علیؔ بہت گھوم پھر چکے تھے، مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے، اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لیے ایک جگہ جم کر بیٹھیں! ان ہی کی زبان میں ؎

دیکھیے اب یہ گردش تقدیر ۔۔۔ کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے[1]

[1] یہ غزل جو ہے وہ بیجاپور جیل میں جنوری ۱۹۲۲ء کی کہی ہوئی ہے۔ پوری غزل پڑھنے کے قابل ہے۔ آپ بیتی کے رنگ میں ہے۔

اللہ اللہ کیا سمان تھا! آکسفرڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر، چوروں اور نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند! اور جس کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹنٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکیٹو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے، آج اس کی عزت جیل کے ادنیٰ پہرہ داروں اور برقنداروں کے رحم وکرم پر تھی! کوچ اور صوفے اور گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھرا فرش، اور غذا وہ مل رہی تھی، جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمت گاروں نے بھی کیوں کھائی ہوگی!

اور یہ سب کچھ دعوئی اسلام کے جرم میں! محبت اسلام کے پاداش میں! فرد جرم جو لگی تھی، اس میں آزادی ہند، سوراج وغیرہ کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا کہ جو احکام قرآنی اور احادیث رسول، قتل مسلم کی وعید میں ہیں، ان کے مسلمان سپاہیوں تک پہنچانے کی کوشش کیوں کی تھی۔ تاریخ ہلکے پیمانہ پر سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی ——— اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج) اور وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ (البروج) اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی تفسیر کا مشاہدہ، لفظ وعبارت کے وساطت کے بغیر ہو رہا تھا۔ ———

اُدھر محمد علی جیل گئے، اور ادھر بچہ بچہ کی زبان پر

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کا ترانہ آگیا! ——— جس پر اپنے بیوی بچوں، عزیزوں، دوستوں سے دو چار دن کی بھی جدائی شاق تھی، اسے حکم ۲۴ مہینوں تک، سب سے الگ، قید فرنگ میں بند رہنے کا ملا ——— اللہ اللہ! کیا شان بے نیازی ہے! اپنے عاشقوں کے امتحان کیسے کیسے

کرلئے جاتے ہیں۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

ستمبر ۱۹۲۱ء سے ستمبر ۱۹۲۳ء تک، گرفتاری کے وقت سے رہائی کی گھڑی تک اس مظلوم پر کیا کیا گزری، اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع نہ یہ بیان بیان مقصود۔ مختصر یہ کہ حوالات کی مادی سختیوں اور جیل کے جسمانی شدائد کے علاوہ، سرکاری و نیم سرکاری ایجنسیوں نے بھی کوئی دقیقہ روحانی اور دماغی تکلیف کا اس مظلوم کو پہنچانے کا اٹھا نہیں رکھا۔ اس وقت کے پانیر، اس زمانہ کے اسٹیٹسمین، اس دور کے لیڈر کی فائلیں آج بھی کہیں سے ان کی گرد جھاڑ پونچھ کر اٹھا دیکھئے۔ ایک ایک صفحہ سب و شتم سے رنگین ملے گا۔ انگریزوں اور غیر کانگریسی ہندوؤں کے علاوہ، خود مسلمان اخبارچی اور کالم نویس خدا جانے کتنے ایسے نکل پڑے تھے۔ جن کی کہنا چاہیے کہ روزی ہی کھل گئی تھی۔ صبح ہو یا شام، جب دیکھئے محمد علی کے حق میں کوئی نہ کوئی الزام تصنیف کر رہے ہیں۔ گویا ہر افترا جائز اور ہر اتہام درست ٹھہر گیا ہے ——— شیر لوہے کی سلاخوں کے اندر بند تھا اور بازار کے اوباش چھوکرے دور سے لمبی لمبی لکڑیوں سے اسے کونچ کونچ کر اپنے ظرف کا ثبوت دے رہے تھے!

مشیت کے بھی عجائب کاروبار ہیں۔ ایک طرف یہ معاملات جاری تھے، اور اسلام کے دیوانہ سے اس کے ذنوب و معاصی گویا رگڑ رگڑ کر دھلائے جا رہے تھے، تو دوسری طرف

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح
الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ	کرتے رہے، عنقریب خدائے رحمٰن ان کے
الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم)	لیے (دلوں میں) محبت پیدا کر دے گا۔

کی تجلیات بھی مستور نہیں رہ سکتی تھیں۔ کراچی کے قیدی کچھ روز بعد سب الگ الگ کر دیئے گئے۔

شوکت علی راجکوٹ بھیجے گئے، محمد علی کے حصہ میں بیجاپور (دکن) کا جیل آیا۔ بیجاپور کے قیدی کی مقبولیت و محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ اگر نا وقت اسے چھینک آجاتی، تو اس کی بھی تاریں دوڑنے لگتیں، اور دم کے دم میں یہ خبر بھی ملک کی فضا میں گونج جاتی۔

نظمیں چھوٹی بڑی، رطب و یابس، خدا جانے کتنی کہہ ڈالی گئیں۔ ایک نظم خود محمد علی ہی کی طرح مقبول ہوئی۔ "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" شہر شہر، گلی گلی، گاؤں گاؤں، کم از کم اودھ اور جوار اودھ میں تو بس یہی ترانہ تھا،

"جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

نظم، محمد علی کی والدہ ماجدہ کی زبان سے ادا کی گئی تھی۔ کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں رکھتی تھی۔ فن کی غلطیاں بھی موجود تھیں۔ شاعر صاحب بھی کوئی مجہول الحال، غیر معروف سے تھے۔ اس پر بھی کچھ فضا کا اثر، کچھ جذبات کا اخلاص، کچھ درد انگیز دھن، ملا کر نظم کو وہ خداداد مقبولیت حاصل ہوئی، جو اچھے جید شاعروں کے لیے بھی باعثِ رشک ہو سکتی تھی۔ شروع کے دو بند آج ۳۰-۳۱ سال کے بعد بھی سن لیجئے ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ساتھ تیرے ہو شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا — جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دیدو
حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی

اس حکومت پہ دعویٰ کرونگی　　　جان بیٹا خلافت پہ دیدو

۱۹۲۲ء کا ایک عام منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد کے چوراہے پر یہی "صدائے خاتون" دو دو پیسہ کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد مین روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے درد انگیز آواز سے گاگا کر پڑھ رہے ہیں، اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کی دھن مین۔ صدہا راہگیر کھڑے سن رہے ہین۔ پولیس کی لاری آئی۔ بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہنچا دیا۔ روز سہ پہر سے لیکر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہوگیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے، اب خود اس کا جیل لے جانا ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے ——— محمد علی جب کانگرس مین آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے۔ محمد علی جب جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہوگئی۔ سیکڑوں نہین ہزاروں مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان و ذی مرتبہ گریجویٹ اور وکیل، بیرسٹر اور ڈاکٹر، عالم و فاضل ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے!

اسی ۲۲ء کے آخری فروری یا شروع مارچ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اجمیری کا سالانہ عرس پڑا (فاتحہ کی اصل تاریخ ۶ رجب ہی، عرس اور میلہ کئی دن قبل ہی شروع ہوجاتا ہے) اب مین زندگی کے جس دور سے گزر رہا تھا، اس مین درگاہون، آستانون پہ حاضری اور عرسون مین شرکت لازمی تھی۔ اجمیر میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ خوش قسمتی سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا ہوگیا۔ مولانا باوجود عالم جید ہونے کے صاحب سماع تھے۔ ان کے قافلہ کے ساتھ اپنی بھی چھوٹی سی پارٹی کوئے اجمیر حاضر ہوگیا

ان ہی کے ساتھ ٹھہرا، اور سفر میں حضر کا سا آرام اور لطف ان ہی کے لطف و کرم سے اٹھایا۔ اپنے قوال دریاباد سے ساتھ لایا تھا۔ ایک روز شام کو درگاہ میں گاندھی جی آئے، اور اصل مزار پر حاضری دینے کے بعد صحن میں قوالی سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے قوالوں کو اشارہ کیا، اور انھوں نے کلام حضرت جوہر ہی کا شروع کر دیا۔ وہ مشہور غزل ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے　　　پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

گاندھی جی سنتے جاتے تھے، اور ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت صوبہ بہار میں وزیر ہیں، اور اس وقت تک غالباً مرکزی خلافت کمیٹی کے ایک سکریٹری تھے) انگریزی میں انھیں مطلب سمجھاتے جاتے تھے ——— کلام جوہر سے اس وقت بڑے بڑے آستانے گونج رہے تھے۔

عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کیے گئے تھے۔ کسی اسٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انھیں جا لیا، اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب میں کہا کہ "تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں، جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے لیے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں"۔ لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا، اتفاق سے اس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی پڑھوا کر سنا۔ انکے ایک رفیق سفر حضر جو اسوقت بھی ہمراہ تھے بول اٹھے کہ "بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی"؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ تو رسول ہی کا نائب ہوا ہی، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں، نام ان ہی کا لینا مناسب تھا"۔

باب (۱۶)

سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء

"تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں"

شعر سننے اور کہنے کا لپکا تو محمد علی کو شروع ہی سے تھا۔ اس "ڈائری" کا ایک پچھلا باب خود ان کے قلم سے ان کے بیان شاعری کے لیے وقف گزر چکا ہے۔ کچھ نہ کچھ شعر لڑکپن ہی سے نکال لینے لگے تھے۔ حضرت داغ کی صحبت سونے پر سہاگہ ہو گئی۔ کالج پہنچتے پہنچتے خاصے شاعر بن چکے تھے۔ قومی، ملی، سیاسی زندگی میں بڑھے۔ تو فرصت عنقا۔ بقول شخصے بات کرنے کی بھی فرصت سے محروم۔ اب شعر گوئی کی مہلت قید یا نظربندی ہی کے زمانہ میں ملتی۔ اور جوہر کی شاعری کے جوہر اسی وقت چمکتے۔ سنہ ۱۶ء کے زمانۂ نظربندی کی شاعری کا نمونہ خاصی تفصیل سے اسی پچھلے باب (۸) میں درج ہو چکا ہے۔ اور سنہ ۱۸ء کے دو ایک شعر شہیدانِ کلکتہ کی شان میں پہلے بھی نقل ہو چکے ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹ء کے اخیر میں تو چھوٹے ہی تھے کہ ستمبر سنہ ۲۱ء میں پھر گرفتار ہو گئے۔ اور اب کی نظربند نہیں، بلکہ باقاعدہ مقدمہ چلنے کے بعد جیل کے قیدی ہوئے۔ پورے دو برس بھی تو باہر نہیں رہنے پائے تھے۔ سنہ ۲۲ء کا غالباً وسط تھا کہ ان کی ایک نعتیہ غزل بیجاپور جیل کی چار دیواری اور پابندیاں توڑتی ہوئی، پاسبانوں اور پہرہ داروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی، کسی طرح

زنگی محل پہونچ گئی، اور وہین سے مجھے ہاتھ لگی ——— ایک مجھی پر موقوف نہین، خدا جانے دست بدست نقل در نقل ہوتے کتنی پھیل گئی، کہاں کہاں پہنچ گئی، کن کن کی زبانون پر چڑھ گئی! ——— آخر دورِ طباعت سے قبل پوری پوری کتابین بھی تو اسی طرح ہاتھون ہاتھ پھیل جایا کرتی تھین!

—————— . ——————

غزل کیا تھی۔ شاعر کے جذبات قلب کی ہو بہو ترجمان۔ شیدائے رسولؐ کے چہرہ کا عکس ایک شفاف آئینہ مین؛ قوالون نے اسے گایا، شاعرون نے اس پر غزلین کہین، رسائل واخبارات اسے مدتون شائع کرتے رہے، عجب نہین، جو آپ بھی سن چکے ہون۔ خیر آج تذکرہ کا لطف سہی۔ شعر پڑھنے سے قبل شاعر کا جیل کے اندر عالم تنہائی مستحضر کر لیجئے ؎

تنہائی کے سب دن ہین تنہائی کی سب راتین | اب ہونے لگین ان سے خلوت مین ملاقاتین
ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے | ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہین مداراتین
کوثر کے تقاضے ہین تسنیم کے وعدے ہین | ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتین
معراج کی سی حاصل سجدون مین ہے کیفیت | اک فاسق و فاجر مین اور ایسی کراماتین
بے مایہ ہین ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجین | بھیجی ہین درودون کی کچھ ہم نے بھی سوغاتین

ایک بار پھر ذرا محمد علی کا سراپا آنکھون کے سامنے لے آیئے۔ علی گڈھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ تمام تر صاحبیت اور نیچریت کی فضا مین پلا ہوا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ بوٹ کا خوگر۔ ہر وقت انگریزی بولنا چالنا لکھنا پڑھنا، انگریزی ہی مین سوچنا۔ "صاحبون" ہی سے سارے تعلقات۔ یکا یک دم سے کایا پلٹ ہوتی ہے۔ اب چہرہ پر پوری داڑھی ہے،

اور کتری ہوئی شرعی وضع کی لبین جسم پر کھدر کا کرتا اور ڈھیلی ڈھالی عبا۔ وضع اور صورت ٹھیٹھ مولویانہ۔ ہفتوں میں نہیں مہینوں سے اخبار کی صورت کو ترسا ہوا۔ آس پاس نہ کہیں ٹائمس (لندن) کا پتہ نہ اسٹیٹسمن (کلکتہ) کا "وجولی" اور "مدارات" ایسے بےبس و مظلوم ہستی کی بھی اگر نہ ہوتی رہتی، تو وہ غریب تو شاید سر پھوڑ کر اپنے کو ہلاک ہی کر ڈالتا!

یہ غزل خوب ہی چھپی۔ گھر گھر گائی گئی، سنائی گئی، گنگنائی گئی۔ دوسری غزلوں کے بھی کوئی کوئی شعر کہنا چاہیے کہ الہامی ہی نکلے۔ یورپ کی جنگ عظیم مدت ہوئی ختم ہو چکی تھی، لیکن ترکوں کی جنگ یونان سے ابھی جاری تھی، اور خلافت کا مقدس ادارہ بہرحال ابھی تک قائم تھا۔ اور اسی کے تحفظ و بقا کے لیے تو ہندوستان بھر میں محمد علی خلافت کمیٹیاں قائم کرا چکے تھے۔ مہینوں کے صبر آزما اور شدید حالات امید و بیم کے بعد بالآخر ترکوں کو یونان پر فتح حاصل ہوئی، اور مصطفےٰ کمال پاشا کی تلوار ولایت سمرنا پر قابض ہو گئی۔ محمد علی، شہر کی آبادی سے دور، بیجاپور جیل کی بلند چاردیواری کے اندر مقید ہیں، اور اخبار کے نام سے تو انھیں کاغذ کا پرزہ بھی دیکھنے کو نصیب نہیں۔ ایک روز دور سے اللہ اکبر کے نعروں کی آواز سنتے ہیں، دل اندر سے گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں کی فتح کی خبر آئی ہے، اور مسلمان خوشی سے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس شہادت قلب پر اعتبار کر کے جوش میں آ، معاً ایک پوری غزل کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر دل میں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں قیاس غلط نہ نکلے۔ فراستِ ایمانی کہیے، یا کشف، بہرحال بات سچ نکلی۔ —— مطلع آپ بھی ملاحظہ کریں ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی ‏ ‏ ‏ سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی

بیشک قیدیٔ گوشہ نشین کی سن لی گئی تھی، اور دعا قبول ہو چکی تھی۔ مطلع کے بعد ہی فرماتے ہیں، اور اپنے متن کی خود ہی شرح و تفسیر کر جاتے ہیں ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا　　تفسیر آج ہو گئی کید متین[1] کی

آگے اور کھلتے جاتے ہیں۔ دل میں تو اصلی تڑپ جزیرۃ العرب کی آزادی و خود مختاری کی تھی۔ سمرنا کی فتح کو اس کا محض مقدمہ یا پیش خیمہ یقین کر کے یوں عرض نیاز کرتے ہیں ؎

یوں جڑ جا رہا ہے محمدؐ کے دین کی　　ہے نام مصطفےؐ کی یہ برکت کہ پھر خدا
اک عرض اور بھی اس کمترین کی　　تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
کب ہو گی لامکاں سو مشیت مکین کی　　اک گھر ترا یہاں بھی تو ہو گو کہ بات ہے
سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی　　اس آستان پاک پہ گھسنا ہے جل کے سر
ترکیب ہو درست یہی ایک زمین کی　　تینوں حرم میں اسکے ہو لاشریک لہٗ

طویل غزل ساری اسی رنگ میں ہے۔

اور اسی کے چند روز بعد یہ ولولہ انگیز غزل بھی ؎

مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی!　　آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی
ہم بیکسوں کی آہ عجب کام کر گئی!　　عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا

اب کی جیل تھا مع اپنی تمام سختیوں کے۔ نظر بندی کی سہولتوں کو ئی بھی نہ تھیں۔ جسم کا وزن گھٹ گیا۔ جسمانی و روحانی شداید کے علاوہ بڑے بھیا شوکت سے جدائی سوہان روح۔ وہ الگ لے جا کر راجکوٹ جیل میں بند کیے گئے تھے — شعر نہیں کہتے، آنسو پی پی کر آپ بیتی سناتے جاتے ہیں ؎

[1] اشارہ ہے آیۂ کریمہ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْن کی جانب۔

گھر چھٹایوں کر چھوڑنے والے — ہم نہ تھے ان کے آستانے کے[1]
ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے — ہوئے برباد آشیانے کے[2]
کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا — ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے[3]
دیکھیے اب بگردشِ تقدیر — کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے[4]
پوچھیے کیا ہو بود و باش کا حال — ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

حسِ ظرافت نے اس غم و حزن، انقباض و افسردگی میں بھی ساتھ نہ چھوڑا، اور شوخ نگاری اب بھی رفیق رہی۔ شیفتہ کی ایک غزل ہے ؎

کم فہم ہیں تو کم ہیں پریشانیوں میں ہم — دانائیوں سے اچھے ہیں نادانیوں میں ہم

اس پر غزل کہتے ہیں، اور قدم قدم پر شوخی و زندہ دلی کی پچکاریوں سے رنگ کھیلتے جاتے ہیں ؎

کیوں شہر چھوڑ جا بسیں دہقانیوں میں ہم — مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

شوکت صاحب ماشاء اللہ بڑے قد آور بحیم و شحیم تھے۔ جو ہر نے کہیں سُن گُن پائی تھی، کہ راجکوٹ جیل میں ان کا وزن بہت گھٹ گیا، اور وہ دبلے ہوگئے ہیں۔ تو انکی زبان سے کہہ ڈالا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں — پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

---

[1] وطن (رام پور) میں قدم رکھنا ممنوع ہو چکا تھا۔ [2] جب کوئی اپنا گھر ہی نہ رہا تھا تو خانہ داری کا سارا ساز و سامان کہاں رکھتے۔ قیمتی سا قیمتی فرنیچر برباد اور تتر بتر ہو چکا تھا۔ [3] اپنے مسلسل دورِ ان کی جانب اشارہ ہے۔ [4] مسلسل نظر بندی اور اسیری کا بیان ہے۔

ضلع علی گڈھ کے رئیسون کا ایک مشہور و شریف خاندان شروانیوں کا ہے۔ اس کے اکابر سے بڑی سیاسی چشمک رہتی تھی لیکن اسی خاندان مین بیرسٹر تصدق احمد خان ان کے ایک بڑے مخلص بھی تھے، ان کا تصور جما کر فرماتے ہین ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہین عقل بھی کبھی شروانیون مین ہم

ترکون کی امداد کے لیے بعض پر جوش مسلمانون کی تجویز تھی کہ ایک جیش بھرتی کر کے انگورہ (انقرہ) روانہ کی جائے۔ اس پر ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے کہا کہ ہم لوگ ایک جیش یونان کی حمایت مین بھرتی کرینگے۔ اس پر وقت کے ایک معلوم و معروف "خان بہادر" کی زبان کو یوں حرکت مین لاتے ہین ؎

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی
گڈنی کے ساتھ جا ملین یونانیوں مین ہم

ظرافت و مطائبہ کے حمام مین جب مخلّی بالطبع ہو کر آتے تو نوبت کبھی کبھی عریانیون کی بھی آجاتی، اور سعدی اور جامی جیسے ثقات کی ہزل گوئی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اسی غزل کے ایک شعر کے پہلے مصرعہ میں علی گڈھ کے مشہور خان بہادر کا نام ہے جو نو مسلم ہیں (اس لیے غیر مختون اور) دوسرے مصرعہ کا خاتمہ ہے "مسلمانون مین ہم"۔ یہ شعر نہ اس وقت چھپ سکتا تھا، اور نہ اب اس کے چھاپنے کی ہمت ہو رہی ہے۔

سردی کے موسم مین جیل مین جو کھانا ملتا، اسے بچا کر رکھ لیتے رات کے وقت لالٹین پر گرم کر کے کھاتے، اور اس کا نام حریرہ رکھتے۔ جیسے ہوئے اور ٹھنڈے حصہ کو "تبریدیہ" کہتے۔ کھانے کی مقدار ہوتی ہی کیا تھی لیکن فیاضی اور سیر چشمی کی شان یہ تھی کہ اس کھانے کو بھی تنہا نہ کھاتے، ساتھ کے قیدیون کو شریک کر کے کھاتے۔

کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ، خوشنما چھوٹی تقطیع پر عرضِ جوہر کے نام سے پہلے ہی ۱۹۲۱ء کے اخیر میں شائع کر چکے تھے۔ اور وہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ نکل بھی گیا تھا۔ اب جو یہ نیا ذخیرہ کلام کا اور اکٹھا ہو گیا تو ۱۹۲۲ء ہی میں مکتبہ جامعہ کو دوسرا اور مکمل ایڈیشن شائع کرنے کی سوجھی۔ اور نیا ایڈیشن، پہلے سے نسبتہً ضخیم، مجموعۂ کلام جوہر کے نام سے ۱۹۲۳ء میں قبل اس کے کہ مولانا جیل سے باہر آئیں، چھپ کر شائع ہو گیا۔ کلام پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش اس قصباتی سے ہوئی۔ بڑے شوق کے ساتھ، لبیک کر پوری کی گئی۔ "جوہر اور ان کی شاعری" کے عنوان سے جو چند صفحات لکھے گئے، وہ ماہنامہ جامعہ میں بھی بہ طور مضمون کے نکلے، اور اور جگہ بھی خوب نقل ہوئے ـــــــ مولانا کی مقبولیت کے طفیل میں کچھ تھوڑی سی مقبولیت ان کے مقدمہ نگار کے نصیب میں بھی آ گئی ع

جان ڈالی ہے ترے نام نے افسانے میں!

باب (۱۷)

۱۹۲۳ء (۱)

(داغ جگر۔ رہائی۔ "انبساط عید دیدن روے تو")

محمد علی کی زندگی ہی آزمایشون کے لیے وقف تھی۔ زندگی بار ایک بڑی ہی کڑی آزمایش سے گزرنا پڑا۔ اولاد میں لڑکا تو کوئی تھا نہیں، لڑکیان چار تھیں۔ چارون بڑی دلاری، بڑی چہیتی۔ اور کیسے نہ ہوتیں۔ جو دوسرون کی اولاد کے لیے بیتاب ہو ہو جاتا تھا، وہ خود اپنے کلیجہ کے ٹکڑون کے پیچھے کیسا کچھ دیوانہ نہ رہتا! منجھلی صاحبزادی آمنہ ہی اور زیادہ عزیز تھین۔ محمد علی کے تازہ امتحان کے لیے انتخاب ان ہی کا ہوا۔ جوان اور تین ہی چار سال کی بیاہی ہوئی تھین۔ ادھر باپ بیجا پور جیل مین بند ہوئے، اُدھر یہ بیمار پڑیں۔ مرض بالآخر دق تجویز ہوا! خبر پہنچی، تو دل مسوس کر، کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ باہر ہوتے تو دوا علاج کی دوڑ دھوپ مین زمین آسمان ایک کر دیتے۔ اس وقت اتنا بس بھی نہین، کہ ایک نظر آکر دیکھ ہی لین۔

ایک نالۂ موزون مین اپنے پروردگار سے فریاد کی۔ پوری نظم اسی زمانہ مین روزنامہ خلافت (اُس زمانہ کے خلافت) مین "پیام محبس" کے عنوان سے نکل بھی گئی تھی۔ مخاطبت براہ راست مرتوق بیٹی سے ہے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں ۔۔۔ تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحان سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا ۔۔۔ جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ساتویں شعر میں کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور ناز وں کی پالی بیٹی کو مخاطب کرتے ہیں لیکن نظریں شاید عرش والے مالک و مولیٰ ہی کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو ۔۔۔ نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

دسویں شعر میں عبدیت پھر مقام تفویض و توکل پر غالب آگئی ہے ــــــ بندہ اپنے مالک کے قدموں پر گرا ہوا، گڑگڑا رہا ہے ؎

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم ۔۔۔ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آگے قصۂ یعقوب و یوسف علیہما السلام کی تلمیحات ہیں اور اس کے بعد چودہویں شعر میں پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں ؎

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملادے یارب ۔۔۔ تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

اگست ۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں جب قید فرنگ سے رہائی ہوئی۔ بیجاپور جیل سے چپ چپاتے جھانسی لائے گئے، اور یہاں اسٹیشن پر چھوڑ دیے گئے۔ قوم کو سُن گُن مل ہی گئی تھی، اور حیات صاحب ــــــ دیہی حسن محمد حیات صاحب (علیگ پنجابی جو مدتوں مولانا کے سکریٹری رہے تھے، اور اس وقت جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے ــــــ پہلے ہی سے جھانسی اسٹیشن جا پہنچے تھے۔ ملک بھر میں ایک جشن مسرت و شادمانی برپا ہوگیا۔ گویا رام چندر جی مدتوں کے بن باس کے بعد اجودھیا پھر واپس آگئے! ملک کی کیسی کایا پلٹ اس دو برس میں ہوگئی تھی۔ اور علی برادران کے بعد

گاندھی جی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر محمود، اور بیسیوں مخلص کارکنوں کی گرفتاری اور اسیری کے بعد فضا میں کیسا سناٹا اس سرے سے اس سرے تک چھا گیا تھا، اس کا اندازہ خود مولانا کے ایک مضمون سے کیجئے، جو کئی سال بعد جنوری ۲۹ء میں ہمدرد میں ان کے قلم سے نکلا تھا:۔

"ہماری قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹیمیٹم دے چکنے کے بعد بار دولی میں وہ روش اختیار کی، جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آنجہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے جس کا یادش بخیر اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکا دیا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔ اور ان کے جواب میں مسلمانانِ پنجاب میں سے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے وہ زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا، اور جب مجھے جیل خانہ ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اس کا اظہار کیا ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے | کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ تھی وہ روداد چمن جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے آکر سنی۔"

سیاسی دنیا مین مولانا کی شہرت کا شباب تھا۔ عین اسی وقت دہلی مین کانگرس کا ایک خصوصی (اسپشل) جلاس منعقد ہوا، مولانا ہی کی صدارت مین۔ ایک نئی زیردست پارٹی بنگال کے سی۔ آر۔ داس اور یوپی کے پنڈت موتی لال نہرو کی رہبری مین سوراج پارٹی کے نام سے وجود مین آچکی تھی، جس کا مقصد کونسلون سے بے تعلقی ختم کرکے کونسلون اسمبلیون وغیرہ پر قبضہ کرلینا تھا۔ اس کے مقابل دوسری جماعت "نوچینجرز" (تبدیلی نہ کرنے والون) کے نام سے موسوم تھی، یہ لوگ راج گوپال آچاریہ (موجودہ گورنر جنرل ہند[1]) وغیرہ کی رہبری مین گاندھی جی کے قدیم مسلک مقاطعۂ کونسل پر قائم تھی۔ محمد علی تھے تو اسی آخری جماعت کے ہم خیال، لیکن بحیثیت صدر، فریقین کے درمیان مصالحت کو اہم ومقدم سمجھے۔ بہرحال جانسی سے سیدھے دلی روانہ ہوگئے۔

دو دن، چار دن نہین، دو برس کی طویل مفارقت کے بعد گھر اور گھر والون سے ملاقات کا موقع نصیب ہو رہا تھا، اور پھر عزیز ومحبوب جوان بیٹی دق کے مرض مہلک مین مبتلا۔ عین فطرت بشری (اور بشر بھی کون؟ محمد علی جیسا مہر ومحبت کا پتلا) کا تقاضا تھا کہ تیر کی طرح سیدھے اس بیمار بچی کے پہلو تک پہنچتے، لیکن رخ بجائے اُدھر کے دہلی کا کر دیا! ——— یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا، لیکن ایسے ایسے مجاہدے تو اب محمد علی کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ دور ملکی وملی خدمات کی دھن نے اب خانگی زندگی کے تقاضون کے پورے ہونے کے لیے جگہ ہی کہان باقی رکھی تھی۔

جانسی دہلی کے اس سفر مین حیات صاحب نے جہان اور بہت سی خبرین سنائین

[1] ۱۹۴۸ء مین۔

وہاں یہ بھی کہدیا کہ کلام جوہر کا نیا اڈیشن اضافہ کے بعد نکلا ہے، اور اسکی مقدمہ عبدالماجد دریابادی سے لکھوایا گیا ہے۔ مولانا کی زبان سے قدرۃً نکلا" مولانا عبدالماجد بدایونیؒ ان ہی کا دیباچہ تو پہلے اڈیشن پر بھی تھا۔" "جی نہیں" حیات صاحب پھر گویا ہوئے "بدایونی نہیں، ان کے ہمنام مولانا دریابادی!——— اچھا ماجد میاں دریابادی" مولانا نے حیرت سے فرمایا، اور حیرت کچھ بیجا تھی بھی نہیں۔

دل ملاقات، زیارت، دست بوسی، قدم بوسی، سب کے لیے بیتاب تھا، مہینوں سے بیتاب ہو رہا تھا۔ محمد علی کی علمی عظمت، ان کی ادبی قابلیت کا اعتراف ان کے دماغی کمالات کا احترام، دل میں ہمیشہ سے تھا۔ ان سے دینی و روحانی عقیدت اب پیدا ہوئی تھی اور جب سے ان کی نعتیہ غزل "تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں" کان میں پڑی تھی، اس وقت سے تو عقیدت کا ایک بے پناہ طوفان سینہ میں جوش مار رہا تھا۔ اور دل بار بار کہہ رہا تھا کہ مرشد بنانے کے قابل کوئی ہے تو یہی، یہ شخص تو اس قابل ہے کہ بیعت اس کے ہاتھ پر کیجائے۔ دوست احباب سے ذکر آیا، تو کچھ نے تو ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن ایک گروہ نے اسے حیرت کے کانوں سے سنا ——— رسمی مشائخ اور پیرزادوں کے ہاں جو لوازم سمجھے جاتے ہیں، وہ محمد علی غریب کے ہاں کہاں تھے، اور کہاں سے ہو سکتے تھے۔ نہ ان کا قیام کسی "درگاہ" کے آستانہ پر، نہ وہ کوئی باضابطہ پیرزادہ، نہ کسی پیر فقیر کے سجادہ نشین، پھر آخر کیسے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جا سکتا تھا؟ ——— برسوں کے بعد جب حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت سے بیعت کی حقیقت اور مرشد کے حقیقی اوصاف سمجھ میں آئے، اور

مرشد کا ترجمہ "مصلح" ذہن نشین ہوا، جب بھی جہاں تک شخصی اخلاص، تدین اور اللہ کے سوا ہر شے سے بیخوفی کا تعلق ہے۔ محمد علی کی شخصیت پر نظر برابر اسی طرح جمی رہی۔

عین اسی اگست میں اپنی خانگی زندگی میں ایک واقعہ سخت قسم کا پیش آگیا۔ اپنے ایک حقیقی چچیرے بھائی اور سگے بہنوئی، جو برتاؤ میں بالکل مثل حقیقی بھائی کے تھے، اور پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، مرض دق میں چند ہفتہ بیمار رہ کر لکھنؤ میں وفات پا گئے۔ گوناگون تعلقات کی بنا پر اس وفات کا صدمہ بہت ہی زاید ہوا۔ میری ناکی کیفیت بھی اس وقت تک ایک خاصی حد تک وہی مرحوم کرتے رہتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی کی رہائی کی خوشخبری ایسی نہ تھی جو دل کو باغ باغ نہ کر دیتی۔ اس مسرت نے اس صدمہ کو بھی ایک حد تک دبا دیا، اور دل بے چین رہنے لگا کہ کس طرح اڑ کر محمد علی تک پہنچوں ــــــــــ روایتیں معتبر اور پیہم پہنچ رہی تھیں کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں۔ سمند شوق کے حق میں یہ تازیانہ تھا۔

لیکن لوگوں نے یہ بھی کہا، اور سچ کہا کہ دہلی میں بھلا محمد علی کو بات کرنے کی بھی فرصت کہاں ہوگی؟ یوں ہی کیا کم مشغول رہتے تھے، اور اب تو گاندھی جی قید میں ہیں، ان کا بار بھی ان ہی پر آپڑا ہے۔ کانگرس کے اجلاس کے ابھی تین چار مہینہ ہیں تو کیا ہوا، نام تو ان ہی کا صدارت کے لیے تجویز ہو رہا ہے۔ اس وقت تو بالکل گھرے ہوئے ہوں گے۔ لڑکی کو دیکھنے بھوالی پہاڑ پر آخر جلدی ہی جائیں گے، اطمینان کی ملاقات پھر اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہیں۔ اس کے قبل اور کہیں اور نہیں رائے معقول تھی، مانتے ہی اور صبر کرتے ہی بنی۔ لیکن مراسلت کو کون روک سکتا تھا۔ جواب آنے کا تو کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اور اس کا انتظار تھا ہی کس کو مقصود تو خط

لکھ کر اپنے ہی دل کو تسکین دے لیتا تھی۔ قیس عامری کو لوگوں نے دیکھا کہ کاغذ، قلم، روشنائی کے بغیر بادیۂ عرب کی ریت پر انگلیوں سے قلم کا کام لے رہا ہے۔ لوگوں نے کہا، یہ کیا؟ دیوانہ نے جواب دیا ؎

گفت مشقِ نامِ لیلیٰ می کنم ۔ خاطرِ خود را تسلی می دہم

ضمیمہ باب (۱۷)

(قوالی)

مولوی حاجی مسعود علی ندوی صاحب (منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ) میرے لڑکپن کے ساتھیون مین ہین۔ تحریک خلافت کے ممتاز کارکنون مین رہ چکے ہین۔ اس وقت تک علی برادران کے مخصوص مخلصین مین تھے۔ ستمبر ۲۳ء مین مولانا کی رہائی پر دہلی ان سے ملنے گئے۔ وہان سے واپسی پر جو خط میرے نام لکھا، وہ اس قابل ہے کہ اس باب کے ضمیمہ کے طور پر تمام وکمال پڑھ لیا جائے :-

اعظم گڈھ - ۲۶ ستمبر ۲۳ء

کرمی - سلام مسنون

افسوس ہے کہ باوجود وعدے کے مین آپ کو دہلی سے خط نہ لکھ سکا۔ دوران قیام مین وقت ایسا نہین ملا جس کو مین اطمینان سے خط لکھنے پر صرف کر سکتا۔ ایک معمولی بات تو یہی تھی کہ کم و بیش ۵۰ مہمان ڈاکٹر صاحب[1] کی کوٹھی مین مقیم تھے، بہر حال مین علی گڈھ سے حضرت جوہر کو دہلی تک پہنچا کر پرسون واپس آیا۔ مفصل کیفیت میرے لیے لکھنا ناممکن ہے جیل سے تپسم نور ہوکر وہ نکلے ہین، بات بات پر خود ہنس دیتے ہین اور بہتون کو رلا

[1] یعنی ڈاکٹر انصاری صاحب۔

دیتے ہین۔ امید سے بہت زیادہ مطمئن ملاقات ہوئی۔ قوال نہ لیجانے کا سخت افسوس ہوا۔ دہلی مین کافی کوشش کی گئی، لیکن کوئی قوال نہ مل سکا۔ حسن نظامی صاحب نے انتظام کیا تھا لیکن عین وقت پر وہ سخت بیمار ہوگئے۔ میان افضل کا مین نے کافی تذکرہ کیا۔ جدید نظمون کا ایک تھیلا ساتھ آیا ہے۔ تین چار مرتبہ زادت کو کھلا اور ایک بڑی تعداد سننے کو ملی، جامعہ مین چھپنے کے لیے دی گئی ہین۔ آپ کا خط دیا، پڑھکر بہت متاثر ہوئے۔ صرف ایک جملہ کہا کہ "ایسے مرید اگر ملے تو پیر بننا پڑیگا"۔ اس کے بعد مختلف اوقات مین مین نے مفصل تذکرہ کیا۔ آپ کا خط برابر جیب مین رہا اور اکثر بوقت تذکرہ اس کا کچھ حصہ جیب سے باہر نکل آتا تھا۔ بھوالی سے مفصل جواب دین گے۔ اطمینان کی ملاقات سوا بھوالی کے اور کسی دوسری جگہ دشوار ہے، وہان البتہ پورا اطمینان وسکون ہے۔ وہ لکھنؤ ابھی نہیں آئین گے۔ بھوالی سے جس وقت آئین گے پھر ہنگامون مین شریک ہوجائین گے۔ یہی کہتے بھی تھے کہ کاش بھوالی آتے تو بہت اطمینان سے ملاقات ہوتی۔

اب نہایت غیر معمولی حالت پیدا ہوگئی ہے، مین نے اس سے پورا لطف حاصل کیا۔ واپسی مین زبردستی علی گڈھ ٹھہرایا۔ اس کے بعد باوجود کوشش کے مجھکو رہائی نہیں ملی اور بریلی کے قریب تک ساتھ جانا پڑا۔ بعض بعض نہایت دلچسپ واقعات پیش آئے۔ مثلاً ایک جگہ مین نے بچھے بستر کھول کر بچھا دیا۔ جب یہ معلوم ہوا اس وقت جس محبت کا اظہار ہوا اسکا لطف ابھی تک مین لے رہا ہون۔ مین تو اب حضرت جوہر کی روحانیت ومحبت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہون، بس اور کیا لکھون۔

لہ اپنی زندگی کے اس دور مین مین سماع کا دلدادہ تھا۔ افضل حسین میری خاص قوال کا نام تھا۔ انھین سے مین نے مولانا کی غزلین یاد کرادی تھین لہ اس وقت دل مین یہی شوق رہی تھی کہ بیعت حضرت جوہر کے ہاتھ پر کرلیجئے۔

(صدر کانگرس۔ میزبانی۔ تیمارداری)

ہوتے ہوتے شروع نومبر کی کوئی تاریخ آگئی جب مین بھوالی روانہ ہو سکا۔ لکھنؤ سے بریلی اور بریلی سے چھوٹی لائن پر کاٹھ گودام۔ یہاں سے بھوالی کے لیے لاری لی۔ وقت کوئی ۱۰، ۱۱ بجے دن کا۔ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹی سی مسجد دکھائی دی۔ جمعہ کی نماز کی تیاریان ہو رہی تھین۔ شریک جماعت ہو لیا۔ بھوالی مولانا کے قیام گاہ پر قریب ۲ بجے کے پہنچا ———— راستہ کے شوق و اشتیاق کا کیا پوچھنا۔ کہنا چاہیے کہ مرید مرشد کی خدمت مین حاضر ہو رہا تھا۔ اس سے قبل کی ساری ملاقاتین "دور جاہلیت" کی تھین۔ پوری طرح پر تجدید اسلام کے بعد نیاز یہ پہلی بار حاصل ہو رہا تھا اور خود محمد علی بھی مجاہدون پر مجاہدے، اختیاری اور اضطراری، دونوں طرح کے کر کر کے، خوب ہی دل دہل چکے، نکھر چکے تھے۔ آمد کی اطلاع پہلے سے دیدی تھی۔

---

۲ بج چکے تھے لیکن مولانا جمعہ پڑھ کر ابتک واپس نہین آئے تھے۔ مسجد فاصلہ پر تھی، پھر پہاڑ کے راستے اور وہ بھی بالکل اجنبی۔ جانے کی ہمت نہ ہوئی، ورنہ جی بے چین تھا

ہو رہا تھا کہ مسجد ہی جا پہنچوں۔ ایک ایک منٹ بھاری گزر رہا تھا۔ مولانا کے اور عزیز موجود تھے۔ وہ بیچارے اپنی والی ہر طرح خاطر مدارات کرتے رہے ——— ہوتے ہوتے ۹ بجنے کو آگئے، جب کہیں مولانا واپس آئے۔ اشتیاق میں دو ایک فرلانگ استقبال کے لیے بڑھ گیا تھا۔ دیکھا کہ تشریف لا رہے ہیں۔ چہرہ کی نورانیت کا اب کیا کہنا، لیکن تنہا نہیں ہیں، مسجد کے امام صاحب بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ اور اُن سے مولانا کسی سرگرم مباحثہ میں منہمک ہیں۔ میری طرف سرے سے دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ مسجد کے سلسلہ میں کوئی انتظام درپیش تھا، اور اسی کے باب میں حسب عادت اتنا جوش و انہاک تھا۔

بھوالی کوئی بڑا شہر نہیں، کوئی مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک دورافتادہ پہاڑی مقام ہے۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کچھ واجبی سی۔ مسلمان نہ صاحب اثر و وجاہت نہ تعداد ہی میں کسی شمار و قطار میں۔ لیکن محمد علی کے اخلاص کو ان چیزوں کی پرواہی کب تھی۔ چھوٹا یا بڑا کوئی سا بھی کام مسلمانوں کا ہو، بس ان کے جوش و انہاک کے لیے یہی کافی تھا کہ کام مسلمانوں کا ہے۔ شہر اور گاؤں سب ان کی نظر میں ایک ———

جتنا میں ان کے ملنے کا مشتاق تھا، اُسی قدر وہ خود بھی میرے مشتاق تھے لیکن بحث کے انہاک میں کیسی دوستی اور کس کی ملاقات۔ دس منٹ، بیس منٹ، خدا جانے کتنی دیر ہوگئی۔ میں منتظر کھڑا ہوں، اور وہ مجھے دیکھ چکنے کے بعد اسی سرگرمی کے ساتھ بحث میں جٹے ہوئے۔ جی بھر کر تقریر و استدلال سے فارغ ہولیے جب جا کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ اُس وقت کے التفات کا نقشہ کیا بیان ہو! معلوم ہوتا تھا کہ محبت و شفقت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے، اور چشمہ ہے کہ ابلا پڑتا ہے!

کئی دن کی یکجائی اور لطف صحبت کا موقع پہلی بار ملا۔ محمد علی اپنی اولاد کے حق میں محض باپ نہ تھے، ماں سے بھی بڑھ کر تھے۔ جان کے برابر عزیز بیٹی کی تیمارداری، وقت پر دوا پلانا، پرہیز، غذا کھلانا، سب کچھ خود ہی کرتے تھے۔ جیل سے باہر آتے ہی قوم کا حکم ملا تھا کہ سب سے بڑا قومی منصب یعنی کانگرس کی صدارت سال آیندہ کے لیے قبول کریں۔ گاندھی جی جیل میں تھے۔ محمد علی اپنی شخصیت کے لحاظ سے یوں بھی اب سب سے بڑے سیاسی لیڈر کہے جا سکتے تھے، اور پھر اس صدارت نے تو انھیں ضابطہ سے بھی ملک کا سب سے بڑا سرور بنا دیا۔ ملنے والوں اور سیاسی کارکنوں کی کمی بھوائی جیسے کورہ دیہہ میں بھی نہ تھی، پھر ڈاک کا انبار، تار برقیوں کا ہجوم۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود میزبانی اور مہمان نوازی کے جوش میں ذرا کمی نہیں ———— اصل کوٹھی بھی خاصی وسیع تھی۔ لیکن مکان کے مکینوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ میرے ٹھہرنے کا انتظام اس سے ذرا الگ ایک دوسری کوٹھی میں کیا گیا۔ لیکن بجز اس کے کہ رات گئے وہاں جا کر سو رہوں، اور سارا وقت یہیں گزرتا، اور مولانا کی زندگی کے سارے شعبے نظر کے سامنے آتے رہتے۔ ————

لاڈلی اور چہیتی جوان لڑکی دق میں مبتلا اور صاحب فراش ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ غمزدہ باپ نے پورے دو برس کے بعد اس کی شکل دیکھی ہے۔ باہر مردانے میں بیٹھے باتیں کرتے کرتے بیقرار ہو کر دوا پلانے یا بیٹی کا دل بہلانے کو اندر اٹھ کر چلے جاتے ہیں، پھر کچھ ہی دیر بعد باہر آ جاتے ہیں، اور ملنے والوں کو، آنے جانے والوں کو، مسلمانوں ہی کو نہیں، اُن میں سے ہندوؤں کو بھی کھانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور زبردستی کھینچ کھینچ کر دسترخوان پر بٹھا رہے ہیں۔ ہندو ملنے والوں میں ایک کانگرسی کارکن بابو شمبھو ناتھ سیتاپوری کا نام خاص طور پر یاد آ رہا ہے۔ وہ خود بھی بالکل عزیزوں کی طرح

بے تکلف تھے، اور ان کے ہاں کی عورتیں بھی۔ اور اودھ و ہند و احباب بھی تھے۔ حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی مسرفانہ مہمان نوازی کے منظر بعد کو تو اور بھی دیکھنے میں آئے، پہلا منظر یہیں دیکھا۔ مولانا اچھے کھانے کے خود بھی شوقین تھے۔ ہر لذیذ کھانا بڑی ہی رغبت سے کھاتے۔ کھانے پر ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ اکثر ہوتی۔

مولانا کے سالے معظم علی صاحب (ڈکسن) بیرسٹر ایٹ لا جنھوں نے برادران کی قید کے زمانہ میں بمبئی میں رہ کر خلافت کمیٹی کے کام کو خوب سنبھالا تھا، اور عرصہ تک اس کے جنرل سکریٹری رہے تھے، اور بعد کو رامپور اور اندور کی ریاستی ہائی کورٹوں کے چیف جج ہو گئے تھے، وہ بھی یہیں مقیم تھے۔ اور مولانا کے دونوں داماد زاہد علی (بڑی لڑکی کے شوہر اور مولانا کے بھتیجے) اور محمود اللہ (اسی منجھلی بیمار لڑکی کے شوہر) بھی۔ کلامِ جوہر کا نیا ایڈیشن جو اسی قید کے زمانہ میں جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ابھی گزر چکا ہے کہ اس پر مقدمہ اسی نیازمند کا تھا۔ اس تقریب سے شعر و شاعری کے چرچے اکثر رہا کرتے۔ کبھی اپنا کلام اپنی زبان سے سناتے۔ اپنے اشعار کی "شانِ نزول" یا پس منظر بتاتے جاتے۔ اور کبھی مجھ سے فرمائش کر دیتے کہ میں اپنی خرافات سناؤں خیر، اس کو تو میں ہمیشہ ٹال لے جاتا، اور الٹا جھگڑا ان ہی سے ان کی "تنہائی کی راتوں میں خلوت کی ملاقاتوں" کا حال پوچھا کرتا۔ مسجد بہت فاصلہ پر تھی۔ نمازیں گھر ہی پر مختصر جماعت کے ساتھ ہوا کرتیں۔ امامت بڑے ردّ و انکار کے بعد مولانا کو اپنے لیے منظور کرنی پڑی تھی۔ نماز کے اوقات میں دیر سویر کے تو کچھ ایسے پابند نہ تھے۔ لیکن جب بھی پڑھتے خوب جی لگا کر پڑھتے۔ بعض وقت دیکھنے والے بھی اس خشوع و خضوع سے متاثر ہو جاتے۔

سیاسی بحثین قدرۃً سب سے زیادہ وقت لیتین۔ وقت کا معرکۃ الآرا مسئلہ داخلۂ کونسل
کا تھا۔ گاندھی جی یہ طے کر چکے تھے کہ اہل ملک کو سرکاری عدالتوں، اسکولوں کالجوں وغیرہ
کی طرح کونسلوں سے بھی بالکل قطع تعلق کر لینا چاہیے (اور اسی لیے تحریک کا نام ہی
ترک موالات' تھا) علی برادران اس فیصلہ کے پرجوش داعی تھے۔ غالباً پانسو علما کا
متفقہ فتوی بھی اسی کی تائید میں تھا۔ لیکن دو تین سال کی زور آزوری کے بعد جب
کارکنوں کے توی تھکنے لگے اور گاندھی جی ابھی جیل کے باہر ہی تھے، صرف علی برادران
جیل مین تھے کہ خود اس مقاطعۂ کونسل کے خلاف ایک سخت رد عمل شروع ہوا۔
اور سوراج پارٹی کے نام سے ایک مستقل پارٹی حمایت داخلۂ کونسل کے حق مین بن گئی
اچھے اچھوں کے پیر اس رو میں اکھڑ گئے، اور بڑے بڑے پختہ ترک موالاتی دھارے
کے رخ پر بہنے لگے۔ علی گڈھ کے تصدق احمد خاں شروانی اور عبدالمجید خواجہ، دونوں
بڑے ہونہار اور کامیاب بیرسٹر علی برادران کے خاص مخلصین مین تھے۔ لیکن اب یہ بھی
سوراج پارٹی کے ہم زبان تھے ــــــ ایک دن ہمین بھوپال مین ایک لمبا
سا تار محمد علی کے نام موصول ہوا کہ "آپ کے بیانات تصدق شروانی کے خلاف بیان
علی گڈھ کلب مین معاندین کے لیے بڑی مسرت کا باعث بن گئے - خدا کے لیے
اس مفاہمت کا لحاظ رکھیے جو ابھی دہلی میں دونوں پارٹیون کے درمیان ہو چکی
ہے،" محمد علی یہ تار پڑھ کر آگ ہو گئے۔ اور معاً جواب لکھا کر

I have not compromised Islam

مطلب یہ تھا کہ مفاہمت احکام شریعت مین نہین ہو سکتی، اور مقاطعۂ کونسل تو ایک
حکم شرعی ہے۔ شام کو جب گفتگو اس موضوع پر (انگریزی مین) ہو رہی تھی تو [illegible]

بولے "خواجہ کو یہ تار پڑھکر مزا آجائے گا۔" محمد علی نے معاً جواب دیا "مزہ ابھی کیا آئے گا، مزہ تو شوکت کے چھوٹتے پر آئے گا۔" مولانا شوکت علی ابھی تک نہین چھوٹے تھے، اور مولانا محمد علی کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اس بارہ مین سخت ہین' ہرگز اپنے رفیقون مین سے کسی کی بغاوت پر صبر و تحمل سے کام نہ لین گے، اور ہر ایک کی پوری پوری خبر لین گے۔

باب (۱۶)

۱۹۲۳ء (۳)

(ہم سفری ۔ پہلے مسلمان اور پہلے ہندوستانی)

محمد علی کو بیسیوں کام پہاڑ سے اتر کر کرنے تھے ۔ جلد ہی واپسی کی ٹھہری ۔ بیمار اور زار و نزار بیٹی کے پاس اس کی ماں اور شوہر کو چھوڑ، خود لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے ۔ ساتھ میں معظم صاحب اور بڑی لڑکی زہرہ اور ان کے شوہر زاہد علی خاں بھی ہیں ۔ یہ سارا قافلہ رامپور جا رہا ہے ۔ بریلی تک ساتھ رہے گا ۔ میں خوش کہ مجھے تو لکھنؤ تک رفاقت کا موقع ملے گا ۔ میں عام طور پر سفر انٹر کلاس میں کرتا تھا ، اس روز معیت کی حرص میں ٹکٹ سکنڈ کلاس کا لیا ، اور جب لے چکا تو مولانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "آپ معمولاً جس درجہ میں سفر کرتے ہوں کیجئے ۔ میری وجہ سے کوئی فرق نہ کیجئے ۔ میں وہیں آجاؤں گا جہاں آپ ہوں گے ۔"

بھوالی سے صبح ناشتہ کے بعد کاٹھ گودام اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے ۔ لاری کرایہ پر صبح سویرے ہی سے آگئی تھی ۔ میں اگلی سیٹ پر محمد علی کے بازو میں بیٹھا تھا ۔ راستہ بھر خوب باتیں رہیں ۔ ایک بار میں نے کہا کہ "آپ کی تو مفصل لائف (سوانح عمری)

مرتب ہونی چاہیے۔ آپ اپنے حالات لکھ کر دیجئے، یا کسی کو بولتے جایئے۔" خوب ہنسے۔ اور بولے کہ "لکھوانے کے لیے وقت کہاں سے نکال سکتا ہوں، بس کوئی صاحب ساتھ لگے رہیں، جو کچھ دیکھیں یا سنیں، نوٹ کرتے جائیں۔" راستہ میں لوگ، یہانتک کہ پولیس کانسٹبل بھی اس سرکاری مجرم اور "باغی" کو عظمت وعقیدت کے ساتھ دیکھتے ہوئے ملے۔

دوپہر کو اسٹیشن پہنچے۔ زمانہ محمد علی کی مقبولیت ومرجعیت کے شباب کا تھا۔ مسلمان تو مسلمان، ہندو عوام بھی گرویدہ وفریفتہ۔ درشن یا زیارت کرنے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا۔ زیادہ تر عوام، جاہل اور ان پڑھ، محض دور سے نظر عقیدت واحترام سے دیکھتے رہنے والے قریب آنے کی جرأت نہ کر سکنے والے۔ اسباب ویٹنگ روم میں رکھ دیا گیا۔ ہم لوگ کبھی اندر، کبھی باہر۔ یہیں اس وقت معلوم ہوا کہ لاری والا جو کرایہ طلب کر رہا ہے، وہ بہت زائد ہے۔ لاری والے سے معاملہ طے زاہد صاحب نے کیا تھا۔ مولانا کو غصہ کہاں تو پہلے لاری والے پر آ رہا تھا، کہاں اب اس کا رخ زاہد صاحب کی طرف پھر گیا۔ اور وہیں دن دوپہر کو بھرے مجمع کے سامنے مولانا نے اپنے اس جوان بھتیجے اور صاحب اولاد داماد کو اس بری طرح اور اس طرح گرج گرج کر ڈانٹنا شروع کیا ہے کہ یہ منظر بجائے خود ایک تماشہ بن گیا۔ اور جو آنکھیں شان جمالی کے شوق واشتیاق میں کھلی ہوئی تھیں، ان کے سامنے یک بیک یہ نظارہ شان جلالی کا آگیا! ——— کوئی اسے عیب سمجھے یا ہنر، میں تو اسے محمد علی کا ہنر ہی سمجھتا ہوں۔ انھیں اگر ذرا سا بھی تصنع ہوتا، تو یقیناً اس مجمع عام کے سامنے یا تو اپنے غصہ کو پی جاتے، یا پھر تنہائی میں جو کچھ چاہتے کہہ سن ڈالتے، لیکن یہاں تو تصنع کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔

زندگی کا ہر گوشہ آئینہ کی طرح واضح، شفاف اور روشن تھا۔ کبھی اس کی فکر ہی نہ کی، کہ معتقدین کیا خیال کریں گے۔ اور بہت سے عقیدتمند ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ جو کچھ دل میں آگئی، بے جھجک کر اٹھے۔ جو کچھ سمجھ میں آگیا، بے دھڑک کر گزرے۔ مخلوق سے ڈرنا اور خلقت کے خیال کی پرواکرنا شاید کبھی جانا ہی نہیں۔

راستہ بھر کھاتے پیتے، اخبار خریدتے، ظہر عصر، مغرب نمازیں پڑھتے پڑھاتے کچھ رات گئے بریلی اسٹیشن پہنچے۔ اور یہیں نماز عشا پڑھی گئی۔ چھوٹی لائن کا سفر ختم ہوا۔ اور یہاں سے بڑی لائن لکھنؤ کے لیے ملی۔ مراد آباد کے قاضی عبدالغفار جو ایک زمانہ میں ہمدرد کے سب ایڈیٹر رہ چکے تھے، اور اس وقت تک ان کا شمار مولانا کے مخلصین میں تھا، یہیں ملنے آگئے تھے، داخلۂ کونسل کے فتنہ میں وہ بھی مبتلا تھے۔ پلیٹ فارم پر مولانا انھیں خوب خوب قائل کرتے رہے۔ مولانا کے سکریٹری حیات صاحب یہیں سے شریک سفر ہوئے۔ کھانے کے لیے پلیٹ فارم پر ایک وسیع دسترخوان بچھا۔ اور مولانا نے میرے ملازم کو بھی نہیں کہ بڑا اصرار کرکے کھانے میں شریک کیا، بلکہ بٹھایا بھی اپنے بالکل قریب ہی ——— میرے لیے یہ منظر نیا بھی تھا اور سبق آموز بھی۔ آقا اور غلام کی مساوات سے متعلق خلفائے راشدینؓ کے کارنامے جو کچھ بھی رہے ہوں، کتابوں میں خادم و مخدوم، خدمتگار، و مالک کے باہمی حقوق کے متعلق جو کچھ بھی پڑھا ہو، ان مادی آنکھوں سے، اس بیسویں صدی میں اس منظر کی توقع کس کو ہو سکتی تھی، اور وہ بھی کسی زاہد خلوت نشین کے ہاں نہیں، وقت کے نامور ترین سیاسی لیڈر کے ہاں!

لکھنؤ میں ایکی دعوتوں، ضیافتوں، ایڈریسوں کا سلسلہ تھا کہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کو مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے "چائے" دی گئی اور ایڈریس پیش ہوا۔ جلسہ کی صدارت، مولانا عبد الباریؒ کی تحریک پر اس نا اہل کے حصہ میں آئی۔ محمد علی کے سامنے بولنے کی ہمت کیا ہوتی۔ اور کہتا بھی تو آخر کیا کہتا۔ صدارت اسی لیے بلا تکلف قبول کرلی، کہ ایک اور موقع محمد علی کے ساتھ انتساب کا ہاتھ آیا جا رہا تھا۔ تقریر صرف مولانا ہی کی ہوئی۔ صدر تو گونگا تھا ہی، حاضرین بھی سب کے سب گم سم بنے رہے۔ معاً بعد شہر کے دوسرے حصہ میں، فرنگی محل سے کئی میل دور میونسپل بورڈ کی طرف سے ایڈریس پیش ہوا ——— محمد علی اب کانگریس کے صدر منتخب تھے، اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے ——— شام کو بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان پبلک جلسہ منعقد ہوا۔[1]

لکھنؤ کے لیڈر، اور لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر، چودھری خلیق الزماں صدر جلسہ ہوئے۔ بی اماں مرحومہ بھی غالباً موجود تھیں۔ جلسہ میں ہندو بھی اچھی بڑی تعداد میں تھے۔ لیکن مسلمان تو اتنی بڑی تعداد میں عرصہ ہی کے بعد جمع ہوئے تھے۔ خلافت و ترک موالات کا جوش و خروش ۲۲ء میں ختم ہو چکا تھا۔ اور اب تو ۲۳ء قریب ختم تھا۔ سارے ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی آگ بھڑک چکی تھی، اور مسلمان ان کے مقابلہ میں تبلیغ و تنظیم کی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ خاص شہر لکھنؤ اور گرد و نواح میں تلخ و ناگوار باہمی تصفیے پیش آ چکے تھے۔ ایک شریر قسم کے ہندو نے ہینڈ بل تقسیم کرنے شروع کر دیے کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں۔ ایسا شخص بھلا کانگریس

[1] اب لکھنؤ میں بڑے اور اہم پبلک جلسے بجائے رفاہ عام وغیرہ کے امین الدولہ پارک میں ہونے لگے تھے۔

کا صدر کیسے مانا جاسکتا ہے؟ ——— اشتہار خاصہ اشتعال انگیز تھا عین جلسہ میں کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کرکے یہی سوال بھی کر دیا۔ مولانا کی پر زور تقریر جاری تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے کوئی بیان داخلۂ کونسل کی حمایت و وکالت میں دیا تھا۔ اسی بیان کی دھجیاں مولانا ایک ایک کرکے اڑا رہے تھے کہ اس شخص نے یہ سوال کر دیا

احباب و مخلصین کچھ پریشان سے ہوگئے۔ بہتوں نے کہا کہ سوال بالکل بے محل ہے۔ خود صدر جلسہ نے سائل کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ لیکن ہزاروں کے اس مجمع میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو سوال سے مطلق نہ گھبرایا، وہ دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا، اور وہ شخص خود محمد علی تھا! ——— صدر نے سائل سے پکار کر کہا "آپ بیٹھ جائیے۔ میں سوال کی اجازت نہیں دیتا۔" معاً محمد علی جھک کر بولے "گر میں اجازت دیتا ہوں، آپ اپنے سوال کا جواب لیجیے!" اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے:-

"علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ۔ گاندھی جی اس وقت آزادی ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں، بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے۔ میں عقیدۃً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں

اور اس لحاظ سے، یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے، میں اکیلے گاندھی جی ہی کو نہیں تمام ہندوؤں، تمام عیسائیوں، تمام سکھوں کے مجموعہ کو ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان اور بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میری بات کوئی انوکھی بات نہیں۔ جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالوی جی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے؟"

یہ الفاظ آج کاغذ پر چھپے ہوئے، وہ بھی اتنی مدت دراز کے بعد، ممکن ہے کہ کچھ زیادہ موثر نہ معلوم ہوں، لیکن جس وقت ہزاروں کے مجمع میں ایک زندہ شخصیت کی زبان سے، پورے جوش وخروش کے ساتھ، آواز کے مناسب حال اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا ہوئے ہیں، تو معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی ہے۔ دشمن سناٹے میں آ گئے۔ دوستوں کے چہرے چمک اٹھے۔ خوب تالیاں بجیں، خوب تائید ومسرت کے نعرے بلند ہوئے ـــــــــ یہ جرأت وہمت اللہ نے بس محمد علی ہی کو دی تھی کہ عین اجلاس کانگرس کے قرب میں، اس کا صدر منتخب ہو چکنے پر ہزارہا کے مجمع عام میں، ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں کے سامنے اپنے اسلام اور اپنی اسلام پرستی کا اعلان اس صفائی، اس دلیری کے ساتھ کر دیا۔ ورنہ یہاں تو ایسے ایسے مسلمان بھی، اور عوام نہیں اچھے اچھے اونچے اور چوٹی کے معززین، بلکہ طبقۂ علماء میں شامل دیکھنے میں آئے ہیں جنھوں نے کانگرس پارٹی میں، کانگرس کے جلسوں میں، اور کانگرسی سرکار میں اپنی بات رکھنے کے لیے اپنی اسلامیت کو ذلیل وخوار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی!

باب (۲۰)

۱۹۲۴ء (۱)

(خطبۂ صدارت - جلا وطنی)

ابھی محمد علی کا قیام لکھنؤ میں کئی دن رہا۔ آئے بھی تو بہت عرصہ کے بعد تھے۔ اپنا مشغلہ اُس وقت سماع کا زوروں پر تھا۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے کہ بحمد اللہ از سر نو مسلمان ہوئے، تو مجھے مدت ہو چکی ہے، لیکن غلبہ دل و دماغ پر ابھی تک اہل حال صوفیہ و مشائخ کا ہے۔ ان ہی کی صحبتیں اور مجلسیں، اور ان ہی کی کتابیں، ملفوظات، وغیرہا۔ آج شرکت اس عرس میں ہو رہی ہے، کل حاضری اُس درگاہ پر ہو رہی ہے۔ محمد علی بھی ان مشغلوں سے محتاط نہ تھے، بلکہ اچھی قوالی کے تو عاشق تھے۔ ایک روز صبح میں نے اپنی قیامگاہ لکھنؤ (خاتون منزل، احاطہ فقیر محمد خان) پر ناشتہ کی دعوت دی، اور اچھے قوالوں کی ایک چوکی بھی بلا دی ـــــــــ مولانا جب تشریف لائے ہیں اور کمرہ میں داخل ہونے کو قدم رکھ رہے ہیں تو نظر میرے اس ملازم پر پڑی جو علی گڑھ یا بریلی اسٹیشن پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلا چکے تھے، پہچان کر بھرے مجمع میں اس سے بغلگیر ہو گیے۔ وہ بیچارہ باغ باغ اور دوسرے لوگ دنگ و حیران۔

مولانا حاضرین میں سے بڑے چھوٹے ایک ایک سے ملے۔ جن کو پہلے سے جانتے پہچانتے تھے اُن سے بھی، اور جو ان کے لیے اجنبی محض تھے، ان سے بھی۔ سب سے یکساں اخلاق اور تپاک۔ مسلمانوں کو محمد علی (اور شوکت علی) ہی کی زندگی دیکھ کر یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ کوئی لیڈر صاحب (اور پھر چوٹی کے لیڈر) عوام سے اتنا بے تکلف ہو سکتے، اتنا خلا ملا رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ ابتک کسی لیڈر کے ہاں رسائی صرف خواص ہی کی ہو سکتی تھی۔ قوم کا کام تو صرف ان کی گاڑیاں کھینچنا، اُن پر پھول برسانا، ان کے لیے جلوس نکالنا تھا۔
خیر قوالی کی محفل کچھ دیر خوب گرم رہی۔ اور محمد علی خوب روتے رلاتے رہے، خاص کر نعتیہ مضامین پر۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ عین سماع شروع ہونے کے وقت میری بڑی بچی جو اُس وقت ۴ سال کی تھی، محمد علی کے قریب سلام کرکے آبیٹھی۔ ان کو تو ہر بچہ بچی سے عشق ٹھہرا، پھر جائیکہ اپنے ایک نیازمند کی بچی سے۔ جھٹ اسے گود میں بٹھا، اُسے کھلانا شروع کر دیا، اسکے گلے سے اس کی دوپٹیا اتار اس کے سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں سخت جز بز کہ عین سماع کے وقت یہ تفریح اور کھیل کیا معنی۔ یہ تو آداب محفل کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اس وقت تو ساری توجہ والتفات ادب و احترام کے ساتھ کلام و نغمہ کی طرف دینی چاہیے۔ میں تو اسی ادھیڑ بن اور انقباض خاطر میں، اُدھر دیکھتا کیا ہوں کہ اُس وقت ساتھ ہی محمد علی سماع کی طرف بھی پوری طرح متوجہ وملتفت، ہمہ تن متاثر بلکہ آنکھوں سے آنسو جاری! ——— دردو گداز کے لیے ہمہ وقت اتنی حاضر طبیعت کمتر ہی دیکھنے میں آئی ہے

دارالعلوم ندوہ کا کتبخانہ اُس وقت تک خاتون منزل کے گویا پڑوس ہی میں تھا۔

میرے عزیز جوانمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم (استاد دارالعلوم) ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے تھے۔ طلبۂ ندوہ کی طرف سے ایک مختصر اور ہلکی دعوت چائے کی انھوں نے بھی کتبخانہ کی عمارت میں مرتب کر دی۔ دیر بہت ہو چکی تھی، دوپہر ہونے کو تھی۔ اور چائے کا اب کوئی وقت رہا نہ تھا۔ پھر بھی میزبانوں کے اصرار سے مولانا کو دعوت قبول کرنی ہی پڑی۔ ادھر چائے نوشی شروع ہوئی، ادھر نگرامی مرحوم نے ایک مختصر تقریر اس مضمون کی کر دی کہ سیاسی تقریریں تو اور بہت سے موقعوں پر ہم سن لیں گے، اس وقت تو ہم طلبۂ ندوہ یہ چاہتے ہیں کہ "تنہائی کی راتوں" میں "خلوت کی ملاقاتیں" جو آپ کے نصیب میں آئی ہیں، ان سے ہمیں بھی مستفید فرمایا جائے۔ نگرامی مرحوم بڑے گہرے دیندار اور صالح نوجوان تھے۔ مولانا اُن کی تقریر سے متاثر بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ لیکن اس فرمایش کے جواب میں فرمایا "میرے عزیز بھائی، تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے۔ شاعر تو اپنی خیالی دنیا میں کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ اس سے اُن چیزوں کا ثبوت عملی دنیا میں طلب کرنا تو بڑی زیادتی ہے" ——— اب اللہ جانے شاعری اس نعتیہ غزل میں زیادہ تھی یا اس نثری جواب میں!

خیر، یہ باتیں تو لطائف کے تحت میں بھی رکھی جا سکتی ہیں، باقی اصل حقیقت مجھ سے راز کے طور پر (اور یہ راز شاید آج پہلی ہی بار ظاہر ہو رہا ہے) میرے اصرار پر ایک بار رومیں مجدالی کے قیام میں یہ ارشاد ہوئی تھی کہ خواب میں زیارتیں تو نصیب ہیں نہ ہوئیں، البتہ ایک بار بیجاپور جیل میں دوپہر کے وقت نیم بیداری کی حالت میں ایک بلکا اور دھندلا سا پرتو جمالِ محمدی کا نظر آیا تھا ——— اللہ اکبر! جس جمال کی زیارت خواب میں بھی، اچھے اچھے خوش نصیب اپنے لیے خوش نصیبی سمجھیں

اس کے دیدار سے نیم بیداری ہی میں مشرف ہو جانا کوئی معمولی درجہ کی خوش بختی اور نصیبہ وری ہے!

قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں، تو سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ اور غریب سا غریب قیدی بھی کوئی نہ کوئی اپنی جھونپڑی کہیں رکھتا ہی ہے۔ محمد علی غریب کا گھر اب تھا کہاں؟ رام پور وطن تھا، وہاں انکی پختہ حویلیاں تھیں، وہاں ان کا بچپن گذرا تھا، لڑکپن گذرا تھا، جوانی کا ایک حصہ گذرا تھا۔ گھر کے صحن میں یہ دوڑتے تھے، کھیلا کودے تھے۔ گھر کے مکتب میں یہ پڑھنے بیٹھے تھے۔ وہیں شادی بیاہ ہوا تھا۔ دعوتیں، ضیافتیں، جلسے سب ان ہی کمروں میں ہوئے تھے۔ رام پور کے چپہ چپہ سے، گلی گلی سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا۔ اب وہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ "اسلامی ریاست" کے فرمان روا ہز ہائینس نواب حامد علی خان بہادر والی رام پور کا فرمان قضا توام یہی تھا! ــــــــ محمد علی ہی کے درد انگیز لفظوں میں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ۔۔۔ ہم تو تھے ان کے آستانے کے

گھر والوں پر کچھ بھی گذر جائے، بیوی، بچیاں، ماں، بہن، کوئی بھی بستر مرض پر کیا معنی بستر مرگ پر بھی ہو، مجال نہ تھی کہ محمد علی اور شوکت علی رام پور اسٹیشن سے آگے شہر کی طرف قدم اٹھاسکیں۔ بیمار ہی کو جس طرح بن پڑتا لاد پھاند کر شہر سے اسٹیشن کے ویٹنگ روم تک لے آتے! ــــــــ اللہ کے گھر کی خدمت کا عزم و حوصلہ رکھنے والے کو سزا اس دنیا میں یہ خوب ملی کہ خود اسی کو بے گھر بے در کر دیا گیا!

بیمار مدقوق لڑکی جب، اسی نومبر کے مہینہ میں بہاڑ سے حالت یاس میں واپس

لائی گئی، تو یہی سوال اپنی مہیب صورت کے ساتھ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے، کھڑا تھا کہ اس وکھیارے قافلہ کو لے کر آخر کہاں جایا جائے ــــــــ ناظرین آگے بڑھنے سے قبل، ذرا اس صورت حال کا تصور، وضاحت کے ساتھ اپنے ذہن کے سامنے لے آئیں کہ خدا نخواستہ اگر اس کا کوئی واقعہ ہم کو پیش آجائے تو کیا گزر کر رہے! اللہ کی شان کہ، کروڑ مسلمانوں کا مقبول ترین اور محبوب ترین لیڈر، اور خود ملک ہندوستان کا بھی نامور لیڈر، اور کانگرس کا صدر، اس پکے اور پر وطن کی سرزمین یوں تنگ۔

خیر جوں توں علی گڑھ پہنچے۔ جامعہ ملیہ ابھی تک علی گڑھ ہی میں تھی، دہلی منتقل نہیں ہوئی تھی۔ اسی کے احاطہ میں ایک بنگلہ لے کر رہنے لگے۔ اس خانہ بدوشی میں یہی ان کا وطن تھا۔ معاش کا سہارا ابھی کہیں سے بھی نہ تھا۔ نور نظر کی مہلک علالت سب پر مستزاد۔ بیچارہ کو قومی وملی مصروفیتوں سے مہلت اتنی بھی نہ ملتی کہ تیمارداری جی بھر کر سکیں۔ کہا کرتے تھے، کہ قومی وملی مصائب نے میرے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کا عصا ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا تھا!

کانگرس کی صدارت سر پر آگئی تھی۔ اور انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ گاندھی جی کی اسیری کے باعث نگاہیں سب کی ان ہی کی طرف لگی ہوئی، دوسرے صدر نشین حضرات کا طریقہ یہ رہا تھا کہ خطبۂ صدارت ہفتوں نہیں، مہینوں پیشتر سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ فرصت واطمینان کے ساتھ لکھتے۔ مسودہ میں بار بار کاٹ چھانٹ کرتے۔ دوستوں رفیقوں سے صلاح ومشورہ کرتے جاتے۔ یہاں ان میں سے کوئی شے نصیب نہ تھی۔ کانگرس کا اجلاس جنوبی ہند کے شہر کوکناڈا میں۔ یہ

خود شمالی ہند کے شہر علی گڈھ مین ۔ یہان سے وہان تک ریل کا راستہ بھی اس زمانہ مین چار دن کا ! ایڈریس کا مسودہ وسط دسمبر تک قطعاً تیار ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ تو اس طویل و عریض ایڈرس کے چھپنے مین لگ جاتے ۔ پھر اس انگریزی تقریر صدارت کا ترجمہ بھی اردو، ہندی، بنگلہ کئی کئی زبانون مین ہونا تھا۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ مین تو یہ خدا خدا کرکے ایڈریس لکھنے بیٹھے۔ ۶ر دسمبر کو صبح مجھے یہ ۵ر دسمبر کا حکم نامہ تار پر ملا کہ

"ایک ہفتہ کے لیے علی گڈھ فوراً آجایئے خطبۂ صدارت کے اردو ترجمہ کے کام کیلئے آپ کی ضرورت ہے۔"

میں باوجود مولانا کی اس عقیدت و احترام کے بہرحال آپنا بھی ایک پروگرام رکھتا تھا، فوراً نقل و حرکت ممکن نہ ہوئی۔ عذر و معذرت لکھ بھیجی، تار سے بھی اور خط سے بھی۔

۱۱ر دسمبر کو دوسرا تار موصول ہوا :-

"۔ کلام جوہر کا بھی جدید ایڈیشن زیر طبع ہے۔ اس کا مقدمہ ضروری ہے۔ مہربانی کر کے فوراً آئیے۔ کوئی حصہ مسموع نہ ہوگا۔ میر محفوظ علی آگئے ہین۔ وہ بھی آپکو بلا رہے ہین۔ محمد علی"۔

میر محفوظ علی بی۔ اے (مرحوم بدایونی) کا نام پہلے کئی بار آچکا ہے۔ مولانا کے خصوصی مخلصین مین تھے، ہمدرد کے دور اول کے منیجر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کے اجراء مین ان کے مشورہ کو بھی بڑا دخل تھا۔ اردو کے ادیب، ظریف، انشا پرداز۔

باب (۲۱)

۱۹۲۳-۲۴ء

(میر محفوظ علی - خاتمۂ خلافت)

۱۴ر دسمبر کو شب میں لکھنؤ سے براہ بریلی علی گڈھ کے لیے روانہ ہوا۔ یہ گاڑی اتنی لیٹ گئی کہ بریلی جنکشن سے علی گڈھ کی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ بہ صد خرابی ۱۹ر کو حسب عشاء کے وقت علی گڈھ پہنچا۔ نورالرحمٰن جامعی اسٹیشن پر پیشوائی کو آگئے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب کے لیے ایک وسیع خیمہ الگ نصب تھا۔ اسی میں جگہ ملی۔ یہ ملائے بدایونی بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ دیکھنے میں ٹھیٹھ دنیا دار، علی گڈھ کے گریجویٹ۔ ادھر پچھلی رات ہوئی کہ آپ چوروں کی طرح اٹھے، دبے پاؤں چلے، اور وسط دسمبر کی شدید سردی میں باہر جا کر وضو کر کے آئے۔ تہجد پڑھ رہے ہیں، اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ۔ چوری پھر بھی کھل ہی گئی۔ میری نیند کھٹکے کی ہے، آنکھ کھل جاتی، اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس جواں ہمت سفید ریش کی اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا ——— خاطرداریوں کی محمد علی کے ہاں کیا کمی۔ زبردستی کی مہمانداریاں حسب ہی بلائے ہوؤں کی ہوا کرتیں، تو میں تو ناخواندہ نہیں، خواندہ تھا۔ چلائے اور ناشتہ

اور کھانے کا ایک چکر تھا کہ صبح سے شروع ہو کر بڑی رات گئے تک جاری رہتا۔

خطبۂ صدارت معلوم ہوا کہ ابھی تک صرف نصف ہو پایا ہے!

صورت حال اتنے فقرہ سے سمجھ میں نہ آئی ہو گی، سمجھ لیجیے: مولانا کو ہر ہر گز ۲۸ پہنچنا لازمی، اور راس کے لیے علی گڈھ سے ۲۰ کو شب میں براہ دہلی روانہ ہو جانا لازمی۔ اور یہاں ۵ ار کی صبح تک تصحیح و نظر ثانی ہونا الگ رہا، مسودہ کی تکمیل تک ابھی ۵۰ فیصدی باقی! طباعت اور پھر ترجموں کے مرحلوں کا ذکر ہی نہیں! ——— کوئی خطبۂ صدارت کانگرس کی ساری تاریخ میں اتنی پریشان خاطری اور ابتری کے عالم میں کیوں لکھا گیا ہو گا۔

"یک سر و ہزار سودا" کی مثل پوری طرح صادق آ رہی تھی، ابھی اندر سے لب مرگ محبوب و عزیز بیٹی کے بستر کے پاس سے اٹھ کر آئے ہیں آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کہ ایڈرس لکھانا شروع کر دیا۔ اور جہاں سے چھوڑ کر گئے تھے، وہیں سے آگے بولنے لگے۔ چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک مہمان صاحب وارد ہو گئے۔ آپ پنجاب کے صوبہ خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہیں۔ ایڈرس رہ گیا، اب ان سے بحث و مباحثہ اہل پنجاب کی خطاکاریوں اور قصور واریوں پر شروع ہو گیا۔ وہ اٹھے ہی تھے کہ کسی شامت کے مارے نے اقبال کی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا، اور آپ ہی مستقل موضوع گفتگو بن گیا۔ اتنے میں اسی محبوب بیٹی کے دوا پلانے کا پھر وقت آ گیا!

نشیب و فراز سے زندگی خالی کس کی ہو سکتی ہے۔ کچھ روز قبل کا ذکر ہے کہ مولانا کے مرشد مولانا فرنگی محلی کی زندگی میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا، جس کا تعلق تمامتر ان کی خانگی زندگی سے تھا اور ان کی سیاسی و قومی زندگی سے تعلق نہ تھا، پھر اس کا

کوئی پہلو خلافِ شریعت بھی نہ تھا۔ البتہ رسم و رواج سے ہٹا ہوا تھا۔ مخالفین کو ایک موضوع ہاتھ آگیا۔ لے اڑے۔ اور مولانا ہی کے ایک عزیز قریب کی (جو فرنگی محلی نہ تھے) روایتوں سے میں خود بھی متاثر ہوگیا تھا۔ بعض منچلوں نے تو کمال ہی کیا۔ لمبے لمبے گمنام خط مولانا فرنگی محلی سے بدظن کرنے کے لیے محمد علی ہی کو نہیں، پنڈت موتی لال نہرو (اور خدا جانے اور کن کن سیاسی لیڈروں) کو لکھ بھیجے۔ پنڈت جی نے ذکر محمد علی سے کیا کہ آپ کے مرشد کی یہ کیا داستانیں لکھ لکھ کر آرہی ہیں۔ مولانا اس پر ان کے سامنے بھی بہت ناخوش ہوئے۔ اور خود میرے سامنے بھی گمنام خطوط نویس کی خوب خبر لیا کیے یاد نہیں پڑتا کہ یہ موضوع چھڑا کیسے۔ میں نے شروع کیا، یا خود مولانا نے۔ بہرحال مولانا کی ناخوشی خوب یاد ہے۔ اور یہ بھی خوب یاد ہے کہ میں نے بھی دبی زبان ان الزامات کی تائید کرنا چاہی تھی، تو خود مجھ پر بھی ڈانٹ پڑی تھی۔ ایسے چلے ہوئے طریقوں سے جو قومی کارکنوں کو خواہ مخواہ بدنام کرنے اور ان پر گندگی اچھالنے کے لیے استعمال ہوتے رہتے ہیں، محمد علی سخت بیزار رہتے تھے۔

بمبئی کی طرف کے ایک زود نویس نوجوان، قوم کے پارسی، مسٹر ماسٹر انگریزی میں ایم۔ اے، اس وقت مولانا کے گویا سکریٹری اور کاتب تھے۔ اصل میں جامعہ پریس کے منیجر تھے۔ اور بعد کو کامریڈ پریس کے بھی منیجر کچھ روز تک رہے۔ مولانا زبانی بولتے جاتے، یہ لکھتے جاتے۔ معاً بعد مسودہ ٹائپ ہوجاتا، اور ہر ٹائپ شدہ صفحہ کی چار چار کا بیان ہو کر مختلف مترجموں کو ترجمہ کے لیے دیدی جاتیں۔ دو ایک دن بعد یہ تجربہ بھی بہت زیادہ وقت لینے والا ثابت ہوا۔ اور مسودہ پہلے لکھ کر ٹائپ کرانے میں بڑی طوالت نکلی۔

اب تسوید کو درمیان سے ہٹا دیا گیا۔ اسٹینو گرافر اپنی مشین لیکر مولانا کے پاس بیٹھ گئے، اور اب الفاظ ادھر مولانا کی زبان سے ادا ہوتے، ادھر براہ راست مشین پر ٹائپ ہوتے جاتے۔ اور ٹائپ شدہ ورق فوراً پریس میں چھپنے کو چلے جاتے۔ پھر چھپے ہوئے ایڈریس کی ضخامت انگریزی میں، ۳۰ × ۲۲ کی تقطیع پر ۱۴۳ صفحہ کی! ـــــــ کتاب کی کتاب اتنی ضخیم بہ طور خطبۂ صدارت کبھی کیوں تیار ہوئی ہوگی! اور وہ بھی اس بھاگ دوڑ کے عالم میں! ـــــــ محمد علی غریب اپنے لیے تقدیر میں کچھ یہی لکھوا کر لائے تھے۔

ہر ہر کام اسی مضطربانہ عجلت کے ساتھ کرنا پڑتا۔ سکون و اطمینان کے ساتھ پہلے مسودہ کریں، پھر اسے کاٹیں چھانٹیں، اس کی نظر ثانی یا اصلاح کریں، احباب خصوصی سے اس کے متعلق مشورہ کریں، یہ باتیں شاید ان کی کسی ایک تحریر کے بھی حصہ میں کبھی نہ آئیں! محمد علی آخر عاشق تھے، عشق کی شوریدگی زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نمایاں!

ادھر مشغولی کا یہ عالم، اور وقت کا ایک ایک منٹ قیمتی، ادھر یہ کیسے ممکن کہ مہمانوں کی خاطر داریوں میں کوئی ذرا سا فرق پڑ جائے۔ اور خیر جو واقعی مہمان ہوں ان تک ہی یہ حوصلۂ میزبانی محدود رہتا، جب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو یہ نظارہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ جامعہ کے استاد جو ماشاء اللہ اپنے اپنے گھر رکھتے ہیں، اپنی مستقل تنخواہیں رکھتے ہیں، وہ کہیں نماز میں یا ادھر ادھر دکھائی دیے اور اب مولانا انھیں پکار پکار کر بلا رہے ہیں اور زبردستی اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا رہے ہیں! ـــــــ خدا جانے دوسروں کو کھلانے پلانے کے لیے اتنی وسعت دل میں کہاں سے آ گئی تھی۔ مہمان نواز اور سیر چشم مولانا شوکت علی بھی تھے۔ لیکن اپنے حدود کے اندر۔ یہ بے تکان مہمان نوازی محمد علی ہی کا حصہ تھا۔

پریس کی مشینیں اب زور و شور سے حرکت میں آئیں۔ اور چھپائی کا کام دن ہی دن نہیں، آدھی آدھی رات تک ہوتا رہا۔ ایڈرس کی لکھائی اور ٹائپ کرائی تو کہیں جا کر ۲۰ ہر کی شام کو ختم ہو پائی۔ اور مولانا اسی شب کو غالباً ایک بجے روانہ ہو گئے۔ ان کے لئے آخری ٹرین یہی تھی۔ ایڈریس چھپ کر اس وقت تک بھی نہ تیار ہو پایا۔ دوسرے دن ایک خاص قاصد کے ہاتھ اس کی کاپیاں روانہ ہوئیں۔ کانگرس کا عام اجلاس یہ غنیمت ہوا کر ۲۸ ہر کو نہیں، ۲۹ ہر سے شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے اتنا موقع بھی مل گیا۔ یہ سرگزشت تو اصل ایڈرس کی ہوئی باقی ترجمہ، ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس برق رفتاری سے کیونکر کر سکتے تھے۔ ترجمہ ویں بھی آسان نہ تھا۔ ایک ایک فقرہ میں خدا معلوم کتنے کنائے، کتنی تلمیحیں ہوتی تھیں۔ اور پھر جابجا مختلف علوم و فنون کی اصطلاحیں یہ عیب ہویا ہنر۔ بہرحال محمد علی کی تحریروں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا تھا بڑا دشوار کام۔ اور پھر وقت کی تنگی نے تو اس وقت سب کے ہاتھ پیر پھلا رکھے اور آئے حواس گم کر رکھے تھے۔ یہ ٹھہری کہ جامعہ ہی کے چند ہونہار اور سینیر طلبہ کے درمیان ایڈرس کے مختلف اجزا تقسیم کر دیے گئے۔ نظر ثانی اور اصلاح کا کام اپنی خاکسار اور میر محفوظ علی کے سر رہا۔ اصل ترجمہ ان ہی بچاروں نے کیا۔ ہم لوگ نظر ثانی تک رہے اور وہ بھی جی کھول کر نہ کر سکے ———— محمد علی نے بلایا ہم دونوں کو کس چاہ کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ ادائے خدمت میں کس قدر قاصر رہے، اس کا رنج دل کو آج تک ہے۔

لڑکی بیچاری کی حالت اس وقت بھلا اس قابل تھی کہ نازبردار اور عاشق زار باپ اسے چھوڑ اتنے دور دراز سفر پر روانہ ہو جائے۔ لیکن قومی فریضہ کی ادائی کے سامنے بہرحال

دل کو مارنا پڑا۔ اور محمد علی کی زندگی تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

سنہ ۲۴ء میں جس طرح محمد علی صدر کانگرس ہو کر سارے ملک کے سردار منتخب ہوئے، اسی طرح یہ سنہ ان کی زندگی میں عام الحزن یا سال غم کی حیثیت بھی رکھتا ہے بڑے سے بڑے صدمہ شاید اسی سال کے لیے اٹھ رہے تھے۔ جوان مدقوق بیٹی نے مارچ میں داغ مفارقت دیا۔ اور رونے والے باپ کے آنسو ابھی رواں ہی تھے کہ خبر آئی، مصطفےٰ کمال نے ادارۂ خلافت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا! محمد علی کے دل و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی جس خلافت کے تحفظ کی خاطر برسوں سے اپنے جان و مال کی بازی لگائے ہوئے تھے جس کی خاطر جیل کی سختیاں اٹھائیں۔ بے زر، بے گھر، بے در ہو کر رہے۔ تارک الوطن ہونا پڑا، جمع پونجی لٹا کر کنگال ہو گئے، دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا، اس کا انجام، دشمنوں اور یورپی قوموں کے ہاتھوں نہیں، ایک ترک اور اپنے کو مسلمان کہلانے والے کی ایک جنبش قلم سے دیکھ، محمد علی پر جو کچھ گزری، اسے بس عالم الغیب ہی جان سکتا ہے۔ دشمنوں، خصوصاً انگریزی اخباروں کے طعنے اور زہر خند اصل صدمہ پر مستزاد! حیرت اسی پر ہے کہ دیوانگی کی نوبت کیوں نہ آگئی۔ اپریل میں محبوب و عزیز بھائی، مولانا شوکت علی دہلی میں علیل اور سخت علیل ہوئے۔ مہینوں صاحب فراش رہے۔ درمیان میں مایوسی ہو ہو گئی۔ گاندھی جی بھی اس اثنا میں جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ (محمد علی ان کی رہائی کے لیے پورا زور لگا چکے تھے) اور صدر کانگرس کا ان سے بمبئی جا کر فوراً ملنا، اور تبادلۂ خیالات کرنا از بس ضروری تھا۔ ادھر محمد علی بجا فکروں میں مبتلا، اتنے ذاتی اور قومی حادثوں کے شکار۔ خلافت کمیٹیوں کا کام بدستور

جاری، اور کانگرس کے بھی سارے ملک کے کاروبار کی نگرانی محمد علی ہی کے ذمہ!
وسط اپریل کا، دہلی سے لکھا ہوا ایک خط محفوظ رہ گیا۔ اس سے ان کی اس وقت کی ذہنی اور دماغی الجھنوں پر کسی قلیل حد تک روشنی پڑے گی۔ آگے وہی ملاحظہ ہو۔

باب (۲۲)

۱۹۲۴ء (۱)

سالِ غم

دہلی ۱۴ اپریل ۲۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولا غالب الا اللہ

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ۔ تعزیت نامہ ۸ شعبان کا اسی زمانے میں ملا تھا، یا یوں کہیے کہ جب ایک ہفتہ بعد کلکتہ کی خلافت کانفرنس سے واپس ہوا تھا۔ آج ۸ رمضان کو شکریہ ادا کرتا ہوں۔ تاخیر کا سبب کیا لکھوں۔ قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔ بقول غالب :-

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۱۱ مارچ کو آمنہ رخصت ہوگئیں۔ ۱۵ مارچ کو مسلم لیگ کے قضیہ نے کھینچ بلایا۔ ۱۹ کو ڈاکٹر شوکت صاحب کو والدہ کو بوجھ باتھ کرنے آئے۔ والدہ تو آمنہ کی رخصتی کے وقت بے ہوش تھیں۔ شوکت صاحب کو حرارت تھی۔ اور اسی شب سے صاحب فراش ہوئے تو آج تک صاحب فراش ہیں۔ مسلم لیگ کے احیاء کا بیڑا اٹھانے والے حضرات

کی ہمدردی کی یہ حالت تھی کہ میں نے چاہا کہ اس کی کونسل کا وہ جلسہ جو ایک روز ماقبل کورم پورا نہ ہونے کے باعث نہ ہو سکا تھا۔ سہ پہر کو منعقد کر دیا جائے نکر دوپہر کو جب حکیم صاحب[1] ڈاکٹر صاحب[2] اور ہم لوگ ان کو لینے اسٹیشن جا رہے تھے اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن ان کو ہمراہ لا رہے تھے۔ مگر یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ مجبور ہو کر سب نے یہی فیصلہ کیا کہ شوکت صاحب کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن ہی پر چھوڑا جائے اور احیائے مسلم لیگ کا مسئلہ حل کیا جائے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہاں سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ شوکت صاحب کی حرارت نارمل ہے۔ ہم سب خوش ہو گئے اور میں نے ٹیلیفون کر دیا کہ اب ان کے حسب فرمائش میں کلکتہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لیے چلا جاؤں گا۔ اور اپنے سکریٹری کو علی گڈھ بھیج دیا کہ میرا اسامان لے کر ڈاک گاڑی میں مجھے مل جائیں لیکن ہوا کیا یا سا چار بجے انصاری صاحب کے ہاں رائے سینا سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ حرارت حسب معمول (normal) تھی کہ نارمل یعنی ۱۰۳ - اب میں نے جانے سے انکار کر دیا مگر شوکت صاحب نے پھر بھی مجبور کیا اور بالآخر کلکتہ گیا۔ وہاں کے لوگوں کے خیالات کی یکسوئی کی۔ خلافت کمیٹی غریب مفلس ہو رہی تھی۔ ساڑھے تو ہزار روپیہ بڑی مشکل سے وصول کیا۔ اگر ایک دن اور رہ جاتا تو شاید ۳-۴ ہزار اور مل جاتے۔ مگر دہلی کی خبروں سے شبہہ ہوا کہ شوکت صاحب کی طبیعت پھر بگڑی، دوڑا ہوا ایک دن کے لیے دہلی آیا، مگر مرض کے پھر عود کرآنے کا شبہہ صحیح نکلا۔ اور ایک ہفتہ دہلی رہنا پڑا طبیعت تو پھر درست ہونے لگی تھی مگر پاسپورٹ نہ ملنے کے باعث تین چار دن خلافت کا کام کرنا پڑا۔ اس طرح ۱۵ مارچ کا نکلا نکلا کہیں ابتدائے اپریل میں پھر "گھر" یعنی علیگڈھ پہنچا۔ عزیزہ آمنہ مرحومہ کی قبر تیار کرائی (یعنی اس قدر پختہ کہ ڈھل نہ جائے) رخت سفر باندھا

[1] حکیم اجمل خان مرحوم [2] ڈاکٹر انصاری مرحوم

اور اس نیت سے ریل میں سوار ہوئے کہ ۵ راپریل کو آیا کہ ۸ ر کی شام کو بمبئی کی طرف چل دوں گا۔ بال بچے ساتھ تھے۔ اگر شوکت صاحب علیل نہ ہو گئے ہوتے تو برہما جانے میں بھی ہمراہ جاتا[1]۔ اپنی اہلیہ کو بمشکل تمام راضی کر لیا تھا کہ ہمارے ساتھ چلی چلیں۔ کام میں ان سے مدد ملتی کیونکہ وہ مستورات میں کامیابی سے کام کرتی ہیں لیکن یہ بھی غرض تھی کہ ان کا غم غلط ہو گا۔ دس مہینہ وہ اور غریب محمود اللہ ہمارا داماد مرحومہ کی تیمارداری کرتے کرتے اب اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان دونوں کا دھیان اس کی طرف سے ہٹانے کی سخت ضرورت تھی۔ خود غرضی بھی اس میں ضرور شامل تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کوئی تنہائی میں میرے پاس بیٹھ کر چپکے چپکے رونے والا مل جائے۔ اب جبکہ برہما کا سفر ناممکن تھا۔ ان دونوں کو اور لڑکیوں کو بھی شوکت صاحب کے ہمراہ ماتھران لے جانے کا ارادہ کیا۔ ان کے Relapse نے مجبور کر دیا تھا کہ معہ اہل وعیال کے پہلے خود ماتھران چلا جاؤں راستے میں جہاں تاجی سے دو تین دن مسلسل تمام امور حاضرہ پر گفتگو کروں۔ جب شوکت صاحب کو افاقہ ہو جائے اور وہ اتنا لمبا سفر کرنے کے قابل ہوں تو ڈاکٹر انصاری صاحب اور زاہد انھیں ماتھران لے آئیں۔ علی گڈھ سے چلنے میں دو روز کی دیر جامعہ کے کاموں کے باعث ہو گئی تھی۔ اس لیے دہلی سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اسٹیشن پر معظم صاحب نے D.T. ٹ۔ خرید کر کھولا تو تار دیکھا کہ پھر شوکت صاحب کو Relapse ہوا ہے نمایاں اگرچہ یہی ارادہ تھا کہ اسٹیشن پر سامان چھوڑ دوں اور دوسرے ہی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں مگر انصاری صاحب کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب کا Relapse سخت تر ہے۔ بخار ۱۰۲ سے بڑھ گیا تھا۔ جاڑا چار

[1] برہما کا سفر خلافت کمیٹی کے لیے تحصیل زر کی غرض سے تھا۔

رہنا پڑا۔ اب تک تو حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ حرارت ۱۰۴ سے متجاوز تھی۔ ہزاروں
خیالات برے سے برے دل میں آتے تھے، مگر میرے پروردگار نے رحم فرمایا۔ دوسرے
ہی دن سے بخار کم ہونا شروع ہو گیا اور آج صبح کو حرارت نارمل تھی۔ یہاں تماجی
میرا انتظار کر رہے ہیں، مگر میری مجبوریوں کے باعث مجھے معذور سمجھتے ہیں، تاہم شوکت
صاحب کا تقاضا ہے کہ جاؤ ذرا ابھی جاؤ۔ چنانچہ کل شب کو روانگی کی نیت ہے۔

یہ میری پریشانیوں کی کتھا ہے مگر "والدنیا ونکہ" نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا۔ سوائے
صبر و شکر کے کیا چارہ ہے، اگرچہ چار و ناچار نہیں۔ طوعاً صبر و شکر کرتا ہوں۔ اِنَّمَا
اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ بالکل صحیح ہے۔ مال تھا ہی نہیں اولاد تھی۔ کبھی
کوئی لڑکا نہیں ہوا، مگر ان لڑکیوں نے زندگی کو اتنا پرلطف کر دیا تھا کہ مشکل ہی
سے کبھی لڑکے کی خواہش دل میں آتی تھی اور اب تو خدا کا شکر ادا کیا کرتا تھا کہ گو
لڑکا نہ دیا، مگر جتنی اولادیں ہوئیں سب کو زندہ رکھا بڑا کرم کیا۔ اس موت
سے صبر نہیں تو شکر میں کمی ہو جانے کا بہت اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے
کہ مرحومہ میں کچھ تو میری شکل کی شباہت تھی اور زیادہ تر میری خصلت کی یہاں
تک کہ میری برائیاں بھی اس میں موجود تھیں، اسی لیے وہ اور بھی عزیز تھی۔ خداوند کریم
نے چاہا بھی تو اسی کو، مگر اس کے مرتے وقت سب روتے تھے اور میں سب کو سمجھاتا
تھا۔ البتہ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم صرف اس دن کے لیے نہ تھا، بلکہ ساری عمر کا
شریک ہو گیا ہے۔ کوئی چیز زندگی کو کھوکھلا کر گئی ہے۔ دعا کیجیے خداوند کریم رحم کرے
والدہ کی علالت سخت نے جو اگر سخت نہ بھی ہو تب بھی اس عمر اور ضعیفی میں خطرناک
ہوتی ہے، پریشان کر دیا تھا۔ شوکت صاحب کی خطرناک علالت اور پھر Relapse نے

ئے اور خاص کر اس پچھلے نہایت خطرناک Relapse گرنے رہے ہیں حواس گم کر دیے تھے لیکن خلافت کے اس قضیہ نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جائے۔ نہیں کہہ سکتا کہ جا کر لیا کرلوں گا۔ مگر پاسپورٹ نہ ملنے سے اپنی بے کسی اور بے بسی اور بھی پریشان کرتی ہے۔ اس قید سے دیکھئے کب خلاصی ملتی ہے۔

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قید بے میعاد کا

اب رخصت ہوتا ہوں، مدتوں کے بعد آج خط لکھنے بیٹھا ہوں، مگر آپ کو دو حرفی خط لکھا نہیں جاتا۔ ابھی درجنوں خط پڑے ہیں، جن کا جواب خود اپنے قلم سے دینا ہے۔

والسلام
آپ کا محب صادق
محمد علی

لہ مراد وہی مصطفیٰ کمال پاشا کی خلافت شکنی ہے۔

باب (۲۳)

۱۹۲۴ء (۲)

(جنگل میں منگل ۔ "ہندو پرستی")

صدمے ہوں یا مصائب، دنیا کے کاروبار بہرحال چلتے ہی رہتے ہیں۔ محمد علی صدر کانگریس کے لیے کیونکر ممکن تھا کہ غم منانے کو کسی گوشہ میں بیٹھ جاتے۔ نقل و حرکت مسلسل دورے، اور انتہائی مشغولی صدر کانگریس کے لیے لازمی ہیں۔ محمد علی اس سے کیسے بچے رہ سکتے تھے۔ اکیلے خط و کتابت ہی کا کام وقت گھیرے رکھنے کے لیے کافی تھا۔ کانگریس کی طرف سے صدر کو سال بھر کے لیے ایک پرائیوٹ سکریٹری مل جانے کا دستور ہے۔ مولانا نے ایک رام پوری نوجوان محمد بشیر نامی کو اس کام پر رکھا تھا۔ پھر بھی ڈاک کا کام اتنا زاید تھا کہ نپٹائے نہ نپٹتا۔ ہندو مسلم فسادات کو ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۱ء میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ۱۹۲۴ء کے شروع میں ان کی وبا پوری طرح پھوٹ چکی تھی اور جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس ہی تھی۔ بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی۔ ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کا زور، دوسری طرف اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم۔ بات شروع ہوئی سیاسیات سے اور پہونچ گئی

دھرم اور ایمان تک۔ اب سب کو گاندھی جی کے چھوٹنے کا انتظار تھا، کہ دیکھیے وہاں تا جی آکر اس زہر کا کیا تریاق پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی مارچ میں بالآخر چھوٹے۔ اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا میں نکلا
محمد علی دورہ پر اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور حسب معمول محلسرا فرنگی محل میں مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں ان کی خدمت میں حاضر۔ دو ایک صاحب اور بھی تھے کہ کہیں سے ینگ انڈیا آیا اور مولانا جس کیلئے ہمہ انتظار و اشتیاق تھے۔ جلدی جلدی اسے سب پڑھ گئے۔ مگر پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ تفصیل تو اب اتنے عرصہ کے بعد ذہن میں نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ گاندھی جی کے بعض ہندو مشیروں اور مقربانِ خاص پر مولانا بہت بگڑے۔ ان لوگوں سے یوں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں رہا کرتے تھے۔ ہندو پبلک لیڈروں میں مولانا دل سے مداح و معترف صرف دو شخصوں کے تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال (نہ کہ ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال) دوسرے مدراسی صدر کانگریس سری نواس آئینگر کے۔ باقی اکثر کو تو وہ کم فہم و کم عقل یا غالی و متشدد سمجھتے تھے۔ اور بعض کو تو کھلم کھلا بد دیانت و غیر مخلص۔

جولائی کا مہینہ تھا کہ علی برادران پھر لکھنؤ آئے۔ اور اب کی لکھنؤ و نواحِ لکھنؤ میں گھومنے پھرنے کے لیے کئی دن رکھ لیے۔ اصلاً یہ دورہ مولانا شوکت علی کا تھا اور اس کا نام انھوں نے "آم کا دورہ" رکھا تھا۔ اور محمد علی کی حیثیت محض ذیلی و تبعی تھی۔ جوار میں قدیم شرفا کا ایک چھوٹا سا قصبہ بڑا گاؤں ہے۔ بارہ بنکی اسٹیشن سے کوئی ۹ میل کے فاصلہ پر۔ اور بانسہ، رسولی اور مسولی تو گویا اس کے بالکل پڑوسی ہی ہیں، زمینداری

قدوائی حضرات کے قصبہ میں۔ اور یہ لوگ بڑے خوش انتظام و خوش مذاق۔ کھانے اور کھلانے دونوں کا سلیقۂ خاص رکھنے والے، اور اپنی میزبانیوں کے لیے مشہور۔ خاندان کا ایک بڑا حصہ مولانا فرنگی محلی کا حلقہ بگوش اور نیازمند خصوصی۔ ایک رئیس زادہ حاجی شیخ الطاف الرحمٰن اس خصوص میں اور سب سے آگے بڑھے ہوے۔ ان ہی نے مولانا شوکت علی کی آم کی دعوت اس موسم مین کر دی تھی۔ علی برادران پہلے لکھنؤ آئے اور وہاں سے موٹر پر بڑے گاؤں۔ میرا ساتھ رہنا دونوں جگہ لازمی ہی تھا۔ بڑی گانوں میں ۲۰، ۲۵ گھنٹہ کا وقت بڑے لطف اور دلچسپیوں کے ساتھ کٹا ——— چھوٹے سے قصبہ میں شہر کی سی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ "جنگل مین منگل" کا نمونہ نظر آگیا۔ بزرگ خاندان خان بہادر حاجی شیخ نثار الرحمٰن مرحوم (شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی[1] کے دادا) زندہ تھے، انھوں نے سیرچشمی اور اولوالعزمی، مہمانداری کا حق ادا کر دیا۔ یہ پرانے زمانے کے آدمی اپنے نوعمر پوتے شفیق کی سیاسی آزادخیالیوں سے سخت ناخوش تھے۔ محمد علی نے صبح چلتے وقت ان سے خاص طور پر سفارش کر کے شفیق کے جرم معاف کرا ئے۔ علی برادران شام کے قریب پہنچ گئے تھے۔ رات کو پر تکلف دعوت اور قوالی رہی۔ صبح کو چائے اور پر تکلف ناشتہ کے بعد روانہ ہوئے۔ اور بجائے سیدھے لکھنؤ جانے کے ہسولی اور بانسہ چلنے کی ٹھہری۔ سڑکیں اس وقت تک کچی تھیں۔ سواری بہلیوں کی تجویز ہوئی۔ اچھے سے اچھے بیل ان مین جتے۔ ہسولی مین محمد علی کے عاشق صادق اور کامریڈ کے مشہور ظریف مضمون نگار، جوانمرگ شیخ ولایت علی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ)[2] معروف بہ بمبوق کا مکان تھا اور یہیں مزار بھی۔ محمد علی کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنے قریب آکر انکی تربت پر

[1] موجودہ وزیر تعلیمات صوبۂ دہلی (سنہ ۱۹۴۳ء) [2] موجودہ حکومت ہند کے وزیر ڈاک و تار شیخ رفیع قدوائی انھیں مرحوم کے حقیقی بھانجے ہیں۔ (سنہ ۱۹۴۹ء)

فاتحہ پڑھنے نہ جاتے۔ وہ لوگ تو ادھر گئے، میں سید صاحب بانسہ چلا آیا، جہاں اپنی قریب کی عزیزداری تھی۔ بانسہ میں سید شاہ عبد الرزاقؒ کی درگاہ بہت مشہور اور مرجع خلائق ہے، حضرات فرنگی محل وہاں کے خاص ارادت مندوں میں ہیں۔ علی برادران مسولی ہو کر وہاں بھی آئے۔ اور صاحب سجادہ ممتاز میاں صاحب مرحوم کی خدمت میں نذر بھی پیش کی ——— "نذر" یہ بیچارے کہاں سے پیش کرسکتے تھے۔ ان کے مرشد مولانا عبد الباریؒ نے یہ سمجھایا کہ درگاہوں کے آداب حاضری میں یہ نذرانہ کی پیشکش بھی داخلِ دستور ہے۔ اور خود ہی نقدی کی ایک ایک معقول رقم دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں دے بھی دی۔

محمد علی اس سال صدر کانگرس تھے۔ لکھنؤ سال میں تین چار بار آئے اور ہر بار پذیرائی بھی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ ایک بار شاید آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ بھی لکھنؤ میں رکھ دیا۔ ہند و لیڈر بکثرت آئے۔ سب کی دعوت اسی محل سرائے فرنگی محل میں مولانائے فرنگی محلی کی طرف سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی ——— میں ہر دفعہ خبر پاکر دریاآباد سے لکھنؤ آتا اور جب تک محمد علی رہتے موجود رہتا، دعوتیں ہوتیں جلسے ہوتے، قوالی کی محفلیں ہوتیں۔ اپنی خلوت پسندی اور اکل کھرے پن کو یہ چیزیں بہت بار معلوم ہوتیں، خاص کر قوالی کے موقع سے تو طبیعت بار بار جھنجلا اٹھتی اور کبھی کبھی اتنا خستہ و بیزار ہو جاتا کہ روٹھ کر ان محفلوں سے اٹھ آتا۔ محمد علی کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور جادو تھا کہ یہ بیزاری کبھی بھی دیر تک نہ قائم رہنے پاتی۔ لیکن دعوتیں ہوں یا جلسے، قوالی ہو یا گوم خوری۔ خلافت اور کانگرس کا کام بھی

ساتھ ساتھ جاری ہی رہتا، اور تفریح محض تفریح نہ رہتی۔ گاندھی جی کا پڑا ذور سوت کاتنے اور چرخہ چلانے پر تھا۔ محمد علی چرخہ برابر ساتھ رکھتے اور سوت ایک مقدار معین میں کاتتے جاتے۔ لوگوں سے باتیں کرتے رہتے اور چرخہ چلتا رہتا ——— کھانے پینے میں، ملنے ملانے میں، بات چیت میں بعض وقت بہت دیر ہوجاتی، اور نماز وقت سے بے وقت ہونے لگتی۔ لیکن نماز چھوٹنے کبھی نہ پاتی۔ عشاء کی نماز بارہا آدھی آدھی رات گزر جانے پر پڑھتے، لیکن بہر حال پڑھ ضرور لیتے۔

ایک مرتبہ رات گئے نشست فرنگی محل ہی میں تھی، اور بالکل تخلیہ تھا۔ ذکر گاندھی جی کا نکلا اور میں نے ان کی روحانیت، تقدس، اور مہاتمائیت سے متعلق اپنی عقیدتمندی کے تاثرات ظاہر کرنے شروع کیے۔ یقین تھا کہ مولانا ضرور اس کی تائید کریں گے۔ برعکس اس کے، اس کی تردید شروع ہوگئی، اور الٹی مجھ پر ڈانٹ پڑنے لگی: "میں گاندھی جی کی نہ روحانیت کا قائل ہوں نہ ان کے کشف و کرامات کا۔ نہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں کرتا ہوں۔ ان کا مذہب الگ میرا مذہب الگ۔ ہاں انہیں اپنا سیاسی سردار تسلیم کرتا ہوں۔ وہ ملک کے اس وقت سب سے بڑے اور مخلص لیڈر ہیں۔ انگریزوں کی محکومی سے ہمیں نجات مل سکتی ہے تو ان ہی کے ذریعہ اور واسطہ سے۔ بس میری رفاقت و اطاعت ان کے ساتھ اسی حد تک محدود ہے۔ یہ آپ کا محض غلو ہے، جو آپ انہیں مرتبۂ ولایت پر رکھ رہے ہیں۔ جس طرح مذہب سے بیزاری میں آپ ایک سرے پر پہنچ گئے تھے اسی طرح بزرگ کے ماننے میں آپ دوسرے سرے پر پہنچے جاتے ہیں۔" ——— اس قسم

کی تلقین، زجر و ملامت کے لہجہ میں کئی منٹ تک جاری رہی۔ اور یہ عین اس زمانہ میں جب کہ ایک اندھی اور بہری دنیا محمد علی کی ہندو نوازی کا ڈھول پیٹ رہی تھی اور محمد علی کی "گاندھی پرستی" کو اچھال رہی تھی! محمد علی مظلوم تو تھے ہی، لیکن ظالم ان کے حق میں سب سے بڑھ کر کوئی غیر نہیں، خود ان ہی کی قوم تھی!

باب (۲۴)

۱۹۲۴ء (۳)

(ہمدرد اور کامریڈ۔ نقش ثانی)

قیام اب تک علی گڑھ میں تھا۔ گویا یہی گھر تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے، اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجرا کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالنے کا قصد اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلہ کے خانہ جنگیون کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا جب دہلی آگئے، اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچۂ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان تھا بہت بڑا اور وسیع۔ نیچے کے حصے میں برقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار۔ کوٹھے پر منیجر، خزانچی، اور عملۂ کتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے لیکن الگ الگ کمرے، اور کامریڈ کے سب ایڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ مختصر صحن، پاخانہ، غسل خانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم۔ اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا بھی راستہ۔ اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دو تین فاضل کمرے، اچھے خاصے وسیع، مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی تنا

ہجوم ہو جاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہو جاتی۔ با ہر ایک اوسط درجہ کا احاطہ ——
مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی، اور جامع مسجد بھی دہلی کے
فاصلوں کے معیار سے قریب ہی۔ اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب
اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشد الخیری صاحب کے مکانات اسی محلہ میں۔

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا۔
لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ سنہ ۱۲ء اور سنہ ۲۴ء میں زمین و آسمان کا فرق
تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں، جنگ یورپ کے اثرات مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی۔

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہو گئی تھی۔ کاغذ
کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ ہر شے کا معیار بلند ہو چکا تھا۔

پھر اس وقت محمد علی پوری طرح جوان تھے اور تندرست و تنومند، اکیلے سارا کام
کر ڈالتے جو کڑی پیش آتی جھیل ڈالتے۔ ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کو آمادہ۔
اب ایک تو سن کھسک آیا تھا۔ اور سن سے بھی کہیں بڑھ کر ضعف ۵، ۶ سال کی
نظربندی اور دو برس کی اسیری، قومی مقاصد میں قدم قدم پر ناکامیاں اور مایوسیاں،
خانگی اور ملی دونوں قسم کے صدمات، ایک سے بڑھ کر ایک۔ سب پر مستزاد ذیابیطس
کا مرض۔ ان سب نے مل ملا کر وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا، کہا کرتے تھے کہ
مردانہ قویٰ کے لحاظ سے ۵۴ سال کی عمر میں ۶۰ سال کا ہو چکا ہوں۔ محمد علی کے خلاف
بغاوت و سرکشی کی ہوا آگے چل کر تو اور اور بہت زیادہ تیز ہوئی۔ لیکن پھیلنا اور بھڑکنا

اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جبکہ سنہ۱۲ء میں اس پر فخر تھا کہ محمد علی نے آج ان سے
چوکی پر لوٹا رکھوایا، اور اپنی اس چاکری کو دوستوں کے مجمع میں فخر سے بیان کرتے تھے،
وہی سنہ۲۴ء میں اب مد مقابل کی حیثیت سے سامنے خم ٹھونک کر آ رہے
تھے۔ اور گستاخیوں، دریدہ دہنیوں اور دلآزاریوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔
کامریڈ کے سب اڈیٹر راجہ غلام حسین اور کامریڈ کے صفحات کی رونق "بمبوق" دونوں
مدت ہوئی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کامریڈ کے سابق منیجر بلکہ عقلِ کل،
عبد الرحمن صدیقی، روٹھ کر کلکتہ جا چکے اور اپنا الگ کاروبار جما چکے تھے۔ ہمدرد کے
سابق منیجر میر محفوظ علی بدایونی گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ہمدرد کے سب اڈیٹر قاضی
عبد الغفار مراد آبادی کی زندگی ایک نیا قالب بدل چکی تھی۔ اور دوسرے سب اڈیٹر
سید جالب، دہلوی ہونے کے باوجود اب لکھنوی ہو چکے تھے اور ہمدم چھوڑ کر اب ہمدرد
سے دوبارہ رشتہ جوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ ان سب اسباب نے مل جل کر ایک عجیب
خلا کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

اور ان سب سے بھی بڑھ کر خود محمد علی کی لیڈرانہ عدیم الفرصتی۔ اور ہر کمی کی تلافی
تو کچھ نہ کچھ ممکن تھی، لیکن اس کمی کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ لیڈری اور اڈیٹری
دونوں کا ساتھ نبھنا بے دشوار رہی ـــــــــ سنہ۱۳ء میں محمد علی محض اڈیٹر تھے،
لیڈری حاصل کر لی۔ سنہ۲۴ء میں لیڈر محمد علی نے اڈیٹری کی کرسی پر از سر نو جمنا
چاہا۔ ناکامی مقدر ہو چکی تھی۔

غرض جہاں تک ظاہری مصلحت سنجیوں کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار

نکالنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اس جوش و اخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحتوں کا ہوش و حواس تھے ہی کب؟ وہاں تو ہر شئے "مشنری اسپرٹ" (تبلیغی روح) کے ساتھ اور عبادت کے رنگ میں بنی۔ ایک ایک نقل و حرکت میں رنگ عبادت کا ہوتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ کوشش اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہوتی تھی جس کو حکم یہ ملا تھا، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ غرض نفع و نقصان، سود و زیان سے بالکل قطع نظر کر کے اخبارات کی اسکیم طے پا گئی ——— دوسرے مالکان اخبارات اتنے غیر کاروباری منصوبہ کو سمجھ ہی مشکل سے سکیں گے ——— اور مجھے حکم ملا کہ ستمبر میں دہلی پہنچ جاؤں اور ہمدرد کا پہلا پرچہ اپنے سامنے نکلوانے کے بعد وطن واپس ہوں۔

اب پہلی بار سوال سرمایہ کا پیدا ہوا۔ ناکرپریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں اور کچھ اب منگالی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ، آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ ——— اکبرالہ آبادی کا مشہور شعر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا ؎

کھلا دیوان میرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا　　　مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

اور اسی شعر سے قریبی رشتہ رکھنے والا ایک اور شعر بھی تو اسی حکیم شاعر کا ہے ؎

اٹھا تو تھا ولولہ دل میں کہ حضرت یاد فرمائیں گے　　　مگر یہ خیال آیا کہ نہ روٹی تو کیا کریں گے

اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں مخلصوں سے، کن کن طریقوں سے، جوڑ بٹور کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ کراچی کے سیٹھ اسمٰعیل حاجی عبد اللہ ہارون کا نام اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت یہ مولانا کے خاص مخلصوں میں تھے۔ رقم آج ۱۹۴۳ء کے معیار سے تو کچھ بڑی

رقی۔ ہزار ہی دو ہزار کی تھی۔ لیکن اس وقت اچھی خاصی تھی۔ کچھ دھندلا سا خیال بمبئی کے جوانمرگ سیٹھ عمر ثوبانی کے نام کا بھی آرہا ہے۔ بڑی توقعات والی محمود آباد سے (جو راجہ سے اب مہاراجہ ہوچکے تھے) تھیں، پوری نہ ہوئیں۔ علی برادران کے پیرو مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اکثر کاموں میں مالی امداد دیتے رہتے تھے۔ خیال نہیں آتا کہ اس میں بھی شریک ہوئے یا نہیں۔

میرے پاس حکم نامے شروع ستمبر ہی سے پہنچنے شروع ہوگئے تھے کہ دہلی آکر پہنچوں اور اسٹاف وغیرہ کے انتخاب میں مدد دوں۔ اپنے حسن ظن کی بنا پر محمد علی کامریڈ تک میں میرے مشورہ کو ضروری سمجھ رہے تھے، اور ہمدرد کے اسٹاف کا تقرر تو گویا موقوف ہی میرے مشورہ پر تھا ——— ادھر سے بھی دونوں اخباروں کے لیے خریداروں کی چھوٹی موٹی فہرستیں ستمبر بلکہ شاید اگست ہی سے روانہ ہونی شروع ہوگئی تھیں۔

بشیر صاحب رامپوری (صدر کانگرس مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری) کا مکتوب مورخہ ۹ ستمبر سنہ ۲۴ء مضمون ذیل لیکر موصول ہوا:-

"السلام علیکم۔ آپ کا پوسٹ کارڈ کل مولانا صاحب کے نام موصول ہوا۔ ہر دو اصحاب کے نام ہمدرد و کامریڈ کی خریداری کے لیے درج کرلیے گئے ہیں۔ شکریہ۔ اس سے قبل کے ناموں کا بھی اندراج کیا جاچکا ہے

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ آپ یہ تو پوچھ رہے ہیں کہ پرچوں کا اجرا کب ہوگا مگر خود تشریف نہیں لاتے۔ آپ جس قدر جلد یہاں تشریف لے آئیں اسی قدر جلد پرچے بھی نکلنے شروع ہوجائیں گے۔ آپ کی موجودگی کی یہاں دو خاص ضرورتیں ہیں۔ اولاً

مولانا صاحب نے ابتک ہر دو اخبارون کے عملون کے تقرر کی نسبت قطعی فیصلہ نہین کیا ہے۔ گو درخواستون کا ایک دفتر ہے جو روزانہ چلا آتا ہے۔ مولانا صاحب آخری تقرر سے پیشتر آپ سے اس کے متعلق صلاح ومشورہ کرنا چاہتے ہین۔ دوئم یہ کہ ابتک مولانا صاحب کو ہر دو اخبارون کے لیے کوئی بھی ایسا آدمی نہیں مل سکا ہے جو ان کی قلمی امداد کر سکے۔ بالکل تن تنہا ہین۔ اخبار چونکہ عنقریب نکلنے والے ہین اس لیے مولانا صاحب کی خواہش ہی کہ آپ سے گفتگو کرکے کوئی دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے۔ آپ مولانا صاحب سے وعدہ فرما چکے ہین اور یہ ان کے ہاتھ بٹانے کا خاص وقت ہی۔ اس کام کے لیے ممکن ہو تو میر محفوظ علی صاحب کو بھی ساتھ لیتے آیئے۔

احمد آباد سے نو کل مشینین آگئی ہین۔ کلکتہ سے لیتھو کی مشینین بھی روانہ ہو چکی ہین، ایک دو دن مین وہ بھی یہان پہنچ جائین گی۔ صرف مشینون کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتہ مین نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر مین اخبار کے نکلنے مین کوئی شبہہ ہی نہیں۔"

باب (۲۵)

۱۹۲۴ء (۴)

(گاندھی جی کی مہمانی)

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایہ کے مسئلہ سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب پر بار جتنا بھی پڑ جائے، اسٹاف بہر حال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو۔ لیکن آہ کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی بڑی حد تک ہی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ کامریڈ کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں بیسیوں کی آئیں، وہ مولانا کی نظر میں نہ جچتے۔ اور مولانا جنھیں لینا چاہتے وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے آ نہ سکتے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبد القیوم بیرسٹر ایٹ لا پر تھی، جو لندن سے "مسلم آؤٹ لک" نکال چکے تھے۔ مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے لیکن ان کی امداد کبھی اس سے آگے نہ بڑھی کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ برار کے مجیب الرحمن بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانیکل میں پڑھے اور انھیں بہت پسند کیا۔ مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا۔ بالآخر نہ آئے، اور اپنے صوبہ کی کونسل کے ممبر ہو گئے۔ سب سے زیادہ

انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں ۲ سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا) علی گڈھ کے ایم۔ اے۔ ال۔ ال بی تھے لندن مین بیرسٹری پڑھتے ہوئے۔ بڑے مخلص اور پرجوش۔ نیو ایرا (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے۔ پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ کامریڈ کی سب اڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے۔ ان کے لیے سب کوششیں ہوئین۔ ان کا دل نہ پسیجنا تھا نہ پسیجا۔[1]

بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیازمندانہ اور معتقدانہ لب و لہجہ مین (اس سلسلہ کی ہر مراسلت اور درخواست میری نظر سے گزرنا لازمی تھی) مولانا نے ان ہی کو غنیمت سمجھا، بہت خوشی سے تو نہین لیکن بہرحال انھین بلالیا۔ کچھ روز تو انھون نے بھی اپنی درخواست کے انداز تحریر کو خوب نباہا۔ اس کے بعد کامریڈ ہی سے علٰحدہ نہیں ہوئے، بلکہ مولانا کے بھی شدید ترین دشمن ہوگئے۔ اور انھین اذیت پہنچانے مین کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا۔ اللہ انھین معاف فرمائے۔ مولانا کے انتقال کے چند ہی روز بعد یہ بھی عالم آخرت مین پہنچ گئے۔

ہمدرد کے لیے امیدوارون کی کمی نہ تھی۔ مگر وہی دقت یہان بھی تھی۔ جنھین ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے۔ اور جو خود آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی مین ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکین، ساری ذمہ داری اسی نیازمند کے سر تھی۔ جالب صاحب سے مین نے زبانی گفتگو کی۔ وہ حضرت اب لکھنو

---

[1] بعد کو بھوپال میں وزیر ہوگئے۔ اس وقت (۱۹۴۸ء مین) پاکستان کی طرف سے روس میں سفیر ہین۔ اور مین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت (مارچ ۱۹۵۰ء میں) میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ہائی کمشنر بن کر آرہے ہیں

کے قطب بن چکے تھے۔ وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آمادہ نہ کرسکی۔ زمیندار (لاہور) کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ۔ آخری قرعۂ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا :-

(۱) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری، ایم اے (علیگ) ہمدرد کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے۔ (بعد کے مشہور مسلم لیگی ایم۔ ایل۔ اے)

(۲) احتشام الدین صاحب دہلوی۔ ایم۔ اے (علیگ) بعد کے ممتاز لغت نویس[1]

(۳) عارف ہسوی صاحب۔ پرانے نیشنلسٹ اور کانگرسی پرچوں میں کام کیے ہوئے[2]

(۴) قاری عباس حسین صاحب دہلوی[3]، ہمدم (لکھنؤ) میں کام کیے ہوئے۔ ایک ماہنامہ تمدن بھی نکال چکے تھے)

(۵) محمد جعفری صاحب جامی مچھلی شہری۔ جامعہ کے ہونہار نوجوان۔ ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے۔ بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا)

(۶) حسن ریاض صاحب بلند شہری۔ (اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکے تھے۔ مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دلی سے لیگی روزنامہ منشور نکالا[4])۔

ان میں سے دو صاحبوں کا تقرر مولانا نے بالکل اپنی پسند سے فرمایا تھا ——— اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی، اور نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا۔ غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔

یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات میں ہمدرد کے "وقائع نگار خصوصی" مقرر ہوں،

[1] اور اب مرحوم (۱۹۵۱ء) [2] مدت ہوئی انتقال کرچکے (۱۹۵۱ء) [3][4] اب دونوں صاحب پاکستان میں ہیں (۱۹۵۱ء)

چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڈھ وغیرہ مین وقائع نگارون کا تقرر ہوا۔ اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ وفاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہین ــــــــ یہ ساری خدمات مولانا کی نیابت مین ان کا یہ نیازمند ہی انجام دیتا رہا۔

آہ انسانی دماغ کی خام خیالیان، اور بشری آرزوئن اور تمناؤن کی خام کاریان کیا کیا امنگیں اور حوصلے اس وقت تھے! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہندوستان خصوصاً اسلامی ہندوستان اپنی مٹھی میں آیا جا رہا ہے۔ نیشنلزم اور اسلامیت کے جس رخ گھمانا چاہین گے گھما دین گے، جو بولی بلوانا چاہین گے بلوا دین گے!

حاضری کا حکم مجھے ۵ستمبر کیلئے ملا تھا۔ پہنچا گاڑی اسٹیشن پر بعد مغرب پہنچتی۔ گھر پہنچتے کچھ اور دیر لگی تو دیکھتا کیا ہون کہ دروازہ پر کانگریسی والنٹیرون کا پہرہ! زینہ پر چڑھنا چاہا تو فوراً مجھ سے پوچھ گچھ، سوال وجواب شروع ہو گئے! آپ کون ہین؟ کس کے پاس آئے ہین؟ کیا کام ہے؟ ــــــــ یا اللہ! یہ کیا! معلوم ہوا کہ گاندھی جی آئے ہوئے ہین اور اب کی مولانا ہی کے مہمان ہین۔ گاندھی جی باوجود اپنی مشہور عالم سادگی کے سفر مع حشم وخدم کے کرتے تھے۔ ساتھ میں پرائیویٹ سکریٹری (اس وقت مہادیو ڈیسائی تھے) اور فلاں فلاں، پھر مہمانی کے بھی خاص خاص شرائط۔ اتنے بڑے قافلہ کا ٹھہرانا آسان نہ تھا۔ پھر مولانا کے مکان اور دفتر مین اتنی گنجائش ہی کہاں تھی۔ لیکن مولانا تو جہانتک کسی کی بھی میزبانی اور مہمانداری کا تعلق ہو، ایثار اور بے نفسی کے پتلے تھے، چہ جائے کہ گاندھی جی کے لیے! وہ دہرا بڑا کمرا جہان کا آفس بھی تھا اور

ڈرائنگ روم بھی۔ اس میں انھوں نے گاندھی جی کو جگہ دے دی۔ اور ان کے اسٹاف والوں کے لیے اپنا مہمانوں کا وسیع کمرہ بالکل خالی کر دیا۔ ڈرائنگ روم کی عمارت اب بھی وہی تھی جسے دس سال قبل ۱۹۲۴ء میں دیکھ گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس وقت کمرہ مخملی کوچ، صوفے وغیرہ "صاحبانہ" فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اب اس سب کے بجائے فرش زمین پر صرف ایک سبز رنگ کی دبیز دری کا فرش تھا۔ اسی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ آفس کے حصہ میں ایک بڑی سی میز، چند کرسیاں اور کتابوں کی دو تین الماریاں۔ غرض جس طرح بھی بن پڑا مولانا نے ان سب معزز مہمانوں کے لیے گنجایش نکالی۔ اب میں جو پہنچا، تو مولانا مجھے اپنے ذاتی کمرے میں لے گئے۔ اور وہیں سلایا ——— ہجوم کی یوں بھی کب کمی تھی، اور اب تو گاندھی جی کی ذات ہے، ایک میلا سا لگا ہوا۔ مولانا ہر وقت مہمانداری میں مصروف، کام زیادہ اور ہمدرد کے لیے بات کرنے کی فرصت ہی اب کسے! جس غرض کے لیے میری طلبی ہوئی تھی، وہ مقصد ہی فوت! خیر دنیا بہ امید قائم۔ آس یہ بندھی کہ دو چار دن میں یہ ریل پیل ختم ہو جائے گی، اور جب مولانا سے باطمینان گفتگو کا موقع نکل سکے گا۔

مولانا کھانا عام طور سے وہی کھاتے تھے جو خوشحال شریف مسلمان گھرانوں میں کھایا جاتا تھا۔ قورمہ، اور کبھی قلیہ کبھی کباب، کبھی دو پیازہ۔ غرض گوشت کے کھانے دو ایک قسم کے تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ گوشت کی ہر قسم کیسر غائب! ہندو سبزی خور مہمانوں کی خاطر دسترخوان پر صرف سبزی ہی سبزی! گاندھی جی کے معمولات تو سب سے الگ اور نرالے ہی تھے، ان کے ساتھ کھانے کی شرکت کسی کو کیو

نصیب ہونے لگی تھی لیکن ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی وغیرہ مولانا کے دسترخوان پر ہم لوگوں کے ساتھ
ہی ہوتے۔ انہی کی رعایت سے مولانا نے خود بھی اتنے دنوں کے لیے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدھ
وقت تو خیر نبھ گیا، لیکن اس کے بعد تو مسلمان مہمانوں کی (اور ان میں مولانا کے اعزہ معظم صاحب وغیرہ سب شامل
تھے) بری حالت ہوگئی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی طبیعتوں پر جھنجھلاہٹ غالب آجاتی اور عجب نہیں جو
دل ہی دل میں گاندھی جی پر کوسنے بھی پڑ جاتے ہوں! ـــــ محمد علی کھانے اور اچھے کھانے
کے بڑے ہی شوقین تھے۔ ان کے لیے یہ قورمہ اور قلیہ اور پلاؤ اور کباب سے پرہیز ایک شدید مجاہدہ
کم نہ تھا لیکن بہر حال وہ مجاہدوں کے خوگر ہو گئے تھے اور اس طعامی مجاہدہ کو ہنسی خوشی برداشت کر رہے تھے
دو دن گزرے، اور تین دن گزرے، گاندھی جی کو اتنا قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اور کبھی کیوں نا
نصیب ہوا۔ اس وقت مولانا کے طفیلیوں میں مفت [illegible] ل لیا تھا لیکن مولانا سے کا مرید اور ہمدرد ہیں
گفتگو کا موقع نہ آج ملتا ہے نہ کل۔ نہ صبح کو نہ شام کو۔ مولانا وقت کے نظم و انضباط پر کبھی بھی قادر نہ تھے۔ اور
اس باب میں گاندھی جی کے بالکل برعکس واقع ہوئے تھے۔ وہاں تو جیسے ایک ایک منٹ نپا تلا ہوا رہتا تھا
کھانے پینے، سونے جاگنے، غسل، ہواخوری، ملاقات ہر ہر چیز کے وقت بندھے ہوئے تھے۔ ویسے ہی یہاں
ہر چیز میں بدنظمی تھی۔ کھانا نکل کر آ گیا، دسترخوان پر لگ گیا، پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مولانا ہیں کہ کسی
ملاقاتی سے گرما گرم مباحثہ میں مشغول ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ساتھیوں کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی
ہیں۔ راتوں کو بلا ضرورت شدید گیارہ گیارہ، بارہ بارہ بجے تک جاگ رہے ہیں۔ کام کرنے پر جٹ گئے تو
اب کھانا اور سونا سب غائب۔ روزمرہ یہی رہتا۔ اور اصل مشغولیت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل
رہتی ـــــ دن ٹلتے چلے گئے اور مفصل گفتگو کا موقع نہ نکلنا تھا نہ نکلا۔

تو اب کھانا اور سونا سب غائب۔ روزمرہ یہی رہتا۔ اور اصل مشغولت کے ساتھ یہ بدنظمی بھی ہر کام میں شامل رہتی

باب (۲۶)

۱۹۲۴ء (۵)

(۲۱ روزہ "برت" - بی اماّں کی وفات)

فرقہ وارانہ کشمکش زوروں پر تھی۔ ہر روز ملک کے مختلف حصوں سے خبریں ہندو مسلم فسادات اور خونریز بلووں کی آرہی تھیں (حالانکہ اُس وقت کی خوں ریزیوں کو کوئی نسبت نہ رہی۔ اُن ہولناک سفاکیوں سے جو ۱۹۴۷ء میں اسی سرزمین ہند پر اسی کے فرزندوں کے ہاتھوں واقع ہوئیں)۔ کوہاٹ (صوبۂ سرحد) کا بلوہ خصوصیت کے ساتھ کشت و خون میں بڑھا ہوا رہا ــــــــــــ ۱۸ ستمبر دوشنبہ کے سہ پہر کو حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر جامعہ ملیہ کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں تھا۔ ہم سب لوگ وہیں تھے اور بعد مغرب وہاں سے چل ہی رہے تھے کہ ہمدرد پریس کے منیجر عبدالعلی خان رامپوری بھاگے ہوئے وہاں پہنچے۔ اور چپکے سے مولانا کے کان میں خبر پہنچائی کہ "گاندھی جی نے یک بیک ۲۱ دن کے برت رکھنے (فاقہ کرنے) کا عزم کرلیا ہے" دوشنبہ ان کی ہفتہ وار خاموشی کا دن تھا، اس لیے اپنا یہ عزم ایک پرچہ پر لکھ کر انھوں نے دے دیا تھا۔ خبر سنتے ہی سب سناٹے میں آگئے۔ اور مولانا پر تو جیسے بجلی سی گر پڑی۔ جلدی جلدی ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اور حکیم صاحب بھی ساتھ۔ کمرہ

مدیر کا مرثیہ وہمدرد کے فرانسنگ روم) کا منظر اب دیکھنے کے قابل تھا۔ گاندھی جی کے بابد کے برتوں نے تو بعد کو اس ۲۱ روزہ برت کی کوئی خاص اہمیت باقی نہ رکھی لیکن اس وقت تک یہی برت سب سے زیادہ عجیب وغریب تھا، اور اقدام خودکشی کے مرادف۔ دوشنبہ کا دن تو اب ختم ہو چکا تھا۔ لیکن گاندھی جی کی خاموشی کے بعد ۲۴ گھنٹوں کے ختم ہونے میں ابھی کوئی گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقت باقی تھا۔ گاندھی جی نے چار مختصر تحریریں انگریزی میں الگ لکھ رکھی تھیں۔ ایک اپنی بیوی کے نام، دوسری انگریزوں کے نام، تیسری ہندو مسلمانوں کے نام، اور چوتھی اپنے میزبان کے نام۔ اور وہ تحریریں ایک ایک کے ہاتھ میں گشت کر رہی تھیں۔

کمرہ کے صدر میں دیوار سے تکیہ لگائے، گاندھی جی بت بنے چپ چاپ بیٹھے ہوئے ان کے داہنے پہ حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری۔ بائیں پر بابا لیکر (ایڈیٹر ہندوستان ٹائمس دہلی) جارج جوزف[1] (ایڈیٹر "انڈیپنڈنٹ" الہ آباد) سی، اس راجگوپال آچاریہ (ایم ایل اے) اور سامنے حسرت موہانی، آصف علی بیرسٹر[3]، اور خود مولانا، اور اور لوگ مغموم ومتاثر ہر شخص شاید بجز مولانا حسرت موہانی کے۔ حکیم صاحب تو بڑے سنجیدہ آدمی، ٹھنڈے دماغ کے تھے۔ دوسرے کمرے میں لے جا کر مجھ سے اور آصف علی صاحب سے گاندھی جی کے بیانات کا اردو ترجمہ سنا، اور سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ پھر وہیں واپس آ کر انھوں نے اور ڈاکٹر صاحب نے اور آصف علی صاحب سب ہی نے تو اپنی دلی

---

[1] اس وقت ہندوستان کے سفیر چین میں ہیں (سنہ ۱۹۵۱ء) [2] مدراسی عیسائی۔ عیسائیوں میں بڑے زبردست لیڈر تھے۔ اب مدت ہوئی انجہانی ہو چکے ہیں۔ ان کے بھائی پوتھن جوزف انگریزی کے بڑے نامور صحافی ہیں [3] مدراسی الاصل لیکن مدت سے لکھنؤ اور دہلی کے ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے انگریزی سہ روزہ "ایڈوکیٹ" کے ایڈیٹر مدت تک رہے۔ اب آنجہانی۔ [4] سنہ ۱۹۵۰ء میں مرحوم ہو چکے [5] موجودہ گورنر صوبۂ اڑیسہ (سنہ ۱۹۵۱ء)

کوشش گاندھی جی کو اس رائے و عزم سے پھیرنے کی کی۔ وہاں تبدیلی کی گنجائش کہاں
——— سب سے زیادہ مضطرب اور پریشان، حیران اور صدمہ زدہ خود مولانا تھے
پہلے روئے، پھر بگڑے۔ گاندھی جی سے اس طرح لڑتے اور ڈانٹتے ہوئے انھیں اس کے
قبل ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ جس شخص کا وہ انتہائی ادب
و احترام کرتے تھے، اس پر وہ یوں گرج اور برس بھی سکتے ہیں! بار بار کہہ رہے تھے کہ
"بغیر ہم سے صلاح و مشورہ کیے اتنا اہم قدم آپ نے اٹھایا کیسے؟ دنیا کے سامنے تو یہ مشہور
کر علی برادران کے مشورہ کے بغیر شاید سانس بھی نہیں لیتے۔ پھر ہم لوگوں سے بالکل راز رکھ کر
اتنی سخت کارروائی کر گزرنا یہ ہمارے ساتھ بدعہدی اور دغا بازی ہوئی یا نہیں؟ یہ تو
دھوکا دینا ہوا، ہمیں بدنام کرنا ہوا، پھر اگر اتنا سخت مجاہدہ آپ نہ جھیل سکے، اور آپ کی
جان چلی گئی، تو ساری ہندو قوم کا غصہ مسلمانوں ہی پر اترے گا کہ ایک مسلمان میزبان
نے اپنے مہمان کو مر جانے دیا۔ اور اس طرح ہندو مسلم منافرت کی آگ بجھنے کے بجائے
اور بھڑک گی۔" گاندھی جی کی خاموشی کا وقت اس درمیان میں ختم ہو چکا تھا، اور اب
وہ مسکرا مسکرا کر ٹھنڈے اور مختصر جوابات دے رہے تھے۔ بولے کہ "بہرحال اب تو خدا
کے سامنے عہد کر چکا ہوں۔" مولانا نے تڑپ کر جواب دیا کہ "جو عہد ہمارے مشورہ کے
بغیر کیا جائے وہ عہد ہی کب ہے؟ قسمیں تک جو ایسی جلد بازی میں اور بے سوچے سمجھے
کھالی جاتی ہیں، قرآن نے جسے آپ بھی سچا اور خدائی کلام سمجھتے ہیں، ان کو "لغو" یعنی
قرار دیا ہے۔ اور ان کی پابندی لازمی نہیں رکھی ہے۔" یہ کہہ کر قرآن مجید کی آیت سنائی
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ الخ۔ گاندھی جی اس پر بھی مسکرا دیے جب
دیکھا کہ یہ نشانہ بھی خالی گیا، تو بی اماں جو اس وقت تک زندہ تھیں، مگر آخری علالت میں

بسترِ مرض پر پڑی ہوئی تھیں، ان کے پاس سے گاندھی جی کو پیام بھجوایا کہ "تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو، اور اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمھارے پاس کوٹھے پر آتی" گاندھی جی نے جواب کہلوایا "اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس باب میں کرسکتا تو آپ کی بات بھی ضرور مان لیتا"

مولانا سے گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس کا ایک آخری اور پرزور ٹکڑا۔ "کم از کم شوکت علی کا انتظار تو آپ کو کرہی لینا تھا۔ آپ پبلک میں تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی کام آپ بغیر ان کے مشورہ کے نہیں کرتے، اور عمل یہ ہے"! گاندھی جی اپنی اسی متین مسکراہٹ کے ساتھ: "لیکن شوکت علی یقیناً میری رائے کی تائید کریں گے۔ وہ سپاہی آدمی ہیں" مولانا کے ترکش کا آخری تیر: "سپاہی!! یہ کیسے کہ آپ ان کو اپنا غلام سمجھ رہے ہیں"۔

ایک بجے شب کو میں تو پڑ کر سو رہا۔ سنا مولانا ۲ ½ پر سوئے! اور یہ ان کیلئے کوئی نئی بات تھی ہی نہیں۔ مولانا کی مصروفیت گاندھی جی کے آجانے سے یوں ہی کیا کم تھی، اب اس تازہ واقعہ سے تو کہیں زاید بڑھ گئی۔ دن رات گاندھی جی ہی کی دیکھ بھال اور ان کے لیے ہر قسم کے انتظامات۔ ٹرنک کال کر کے مولانا شوکت علی کو ٹیلیفون پر اطلاع بمبئی راتوں رات پہنچا دی گئی، اور دوسرے تیسرے دن وہ بھی آگئے۔ میرا قیام اب بیکار تھا۔ اخباری انگیٹھیں کچھ روز کے لیے اب بالکل غت ربود۔ مولانا کو اب کسی وقت بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ دو چار روز اور راستہ دیکھ کر میں نے تو وطن کا راستہ لیا۔ معظم صاحب اور اور لوگ بہت کچھ روکتے رہے کہ مہاتما کی برت شکنی کا منظر بھی دیکھ کر جاتا۔ یہاں اتنی

فرصت کہان تھی۔ دریا باد آگیا، اور یہین سے جو خدمت ہمدرد کی بن پڑی، کرتا رہا چلتے وقت مولانا نے پوچھا کہ اب کب آؤگے؟ یہان تو طبیعت جلی ہوئی تھی۔ جواب مین عرض کیا کہ "اب درمیان مین ہرگز نہین آنے کا، آپکے ہان تو روز ایک نہ ایک مشغلہ نکلتا ہی رہتا ہے اب جب آپکے پرچے نکل لینگے، اور انھین وہان پڑھ لونگا، جب ہی ادھر کا رخ کرونگا"

۱۳ اکتوبر کو خدا خدا کر کے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آٹھ دن کے بعد ۸ نومبر کی شام کو ۹ کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ ۱۲ سو پرچے خاص دہلی مین نکل گئے۔ اور مانگ برابر جاری رہی۔ محمد علی کے نام کا سکہ اب دلون پر بیٹھا ہوا تھا۔

عین اسی زمانہ مین بی امان بیچاری کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ محمد علی غریب سے تو نہ جی بھر کر تیمارداری ہی بن پڑتی اور نہ اطمینان و یکسوئی سے اخبارات ہی پر توجہ ہوسکتی۔ ہمدرد تو خیر اسٹاف والوں کے بھروسہ پر جون تون نکلے جاتا، اصلی مصیبت کامریڈ کی تھی۔ اس مین کوئی بھی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا۔ وسط نومبر مین شب جمعہ کو بی امان رخصت ہوگئیں، اور دنیا ایک ایسی متقی خاتون کے وجود سے محروم ہوگئی، جس کی نماز فجر، سفرون کی کثرت اور علالت کی تقریرون، اور جلسون کے باوجود، کہا جاتا ہے کہ پچاس سال کی مدت مین کبھی قضا نہیں ہوئی تھی: یہ وہی بیوہ تھی، جس نے اپنی جوانی کے زمانہ مین حج کے موقع پر غلاف کعبہ پکڑ کر اپنی اولاد کے حق مین یہ دعا نہیں کی تھی، کہ اسے بڑی بڑی دنیوی عزتین اور مرتبے حاصل ہون، بلکہ رب کعبہ سے عرض کیا تھا کہ "اے پروردگار میری اولاد کو دین کا سچا خادم اور پختہ مومن بنا دے"

جنازہ، ابھی گھر مین رکھا ہوا تھا، اور چہیتا اور مان کا دلدادہ بیٹا کامریڈ کے لیے مضمون ہی لکھنے مین نہین، بلکہ پروف درست کرنے مین بھی مشغول تھا!

باب (۲۶)

سنہ ۱۹۲۴ء (۶)

(صدر خلافت" ہورہے ہین جو رہفت افلاک کے"

پرچے نکلنے شروع ہوگئے۔ اور مجھے متواتر حکم نامے دہلی فوراً پہنچنے کے ملنے لگے۔ ایک خط تو اسٹاف کے کسی صاحب کا (جنکے دستخط آج پڑھے نہین جا سکے) لکھا ہوا ۱۱ اکتوبر ہی کو چلا تھا:۔

"حسب ہدایت مولانا محمد علی صاحب ۸ اکتوبر کے والانامہ کی رسید عرض ہے۔ سید ہاشمی صاحب اور صدیق الزمان صاحب کا پتہ نوٹ کرلیا گیا۔ نمونہ کا پرچہ بھیجا جائے گا، اور کامریڈ کا دی پی ارسال ہوگا۔

انتظامات روزانہ مکمل ہوتے جاتے ہین۔ مشینری تمام لگ گئی ہے۔ مشینون کا درست ہوکر روان ہو نا باقی ہے۔ مولانا فرماتے ہین کہ براہ کرم چند مضامین ابتدائی اشاعتون کے لیے جس قدر جلد ممکن ہو تیار کردین۔ پہلا پرچہ مشینری کے عنقریب روان ہوتے ہی شائع ہوگا۔ انشاءاللہ تعالیٰ"

کام کی تو اپنے دل سے لگی ہوئی تھی۔ خریدار بنانے مضمون لکھنے اور دوسرون سے لکھوانے، حیدرآباد وغیرہ مین مقامی نامہ نگار مقرر کرانے مین برابر خط و کتابت میں لگا ہوا تھا۔

اوپر کے خط میں سید ہاشمی کا ذکر ہے، یہ ہاشمی فرید آبادی ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور جامعہ عثمانیہ دونوں کے لیے تاریخ و سیرت وغیرہ کے عنوانات پر بہت کچھ لکھ ڈالنے والے، اس وقت حیدر آباد میں کسی عہدہ پر تھے[1]۔

جب نومبر بھی آگیا اور میں نہ پہنچا، بلکہ بجائے اپنے صرف خطوط بھیجتا رہا۔ تو ۱۱ر نومبر کو ذیل کا مکتوب محمد جعفری صاحب کے قلم سے ملا۔ یہ جعفری جامعی نئے بھرتی ہو کر آئے تو تھے ہمدرد کے اسٹاف میں ایک جونیر ممبر کی حیثیت سے، ترجمہ وغیرہ کے کام کے لیے، لیکن اس وقت کام مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری کا کر رہے تھے:۔

"آپ کا مرسلہ لفافہ مولانا صاحب نے پڑھا، مجھے ہدایت فرمائی ہے کہ میں جناب کی خدمت میں اس کا جواب لکھ دوں۔

مولانا آج کل بے انتہا مشغول ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا دو دن کا آیا ہوا خط آج انھوں نے پڑھا۔ کارنیڈ کا سارا کام خود کرتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک رات تو لازمی جاگتے ہیں۔.......... اور کم سے کم ڈیڑھ دن برابر لکھتے رہتے ہیں۔ الحمد للہ ہمدرد جاری ہو گیا۔ آپ کی خدمت میں بھی پہنچا ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "اب آپ براہ عنایت فوراً تشریف لائیے۔ آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ چند دن ہمدرد میں کام کرنے والوں کو راہ پر لگا کر کامریڈ کا کام دیکھئے گا۔ اور پھر سارے "بزنس"[2] (ان ہی کا لفظ ہے) کے آپ مالک و ذمہ وار ہوں گے۔" ہمدرد کے علاوہ ۴، ۵ اسسٹنٹوں کے فاروقی صاحب بھی گورکھپور سے آگئے ہیں۔ وہ بھی آپ کے بلانے پر اصرار

---

[1] اس وقت (۱۹۵۲ء میں) کراچی میں کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے روح رواں ہیں۔

[2] Business یعنی کارخانہ یا کاروبار۔

کر رہے ہیں۔ مولانا صاحب تو تار آپ کے یہاں بلانے کیلئے بھیجنے کو لکھا چکے تھے۔ مگر فاروقی صاحب نے منع کیا۔ اور آخر میں پھر مجھے ہدایت کی گئی کہ ذریعہ تحریر آپکے بلانے کو لکھوں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر آپ اب چلے آویں گے تو آپ کے خطوط کے جواب دینے کے لیے کسی کو متعین کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی[1]۔ آپ ایک دفعہ آجایئے اور تمام ولایتی ڈاک کو دیکھ لیجئے۔ جو جرائد ورسائل آپ کو پسند ہوں گے، ان کی فہرست دے دیجئے گا۔ اس کے بعد ہمیشہ آپ کی خدمت میں بھیجے جایا کریں گے۔"

میں نے اپنے خط میں عرض کیا تھا کہ ولایتی اخبارات اور رسالوں کا منگانا ازبس ضروری ہے۔ کامریڈ کے لیے تو وہ بہر حال آئیں گے۔ میرے پاس چلے آیا کریں، تو میں ہمدرد میں بھی ان سے کام لوں۔ بعض مضامین ترجمہ کے قابل ہوں گے بعض تلخیص کے اور بعض نقد وتبصرہ کے قابل۔

چیف سب اڈیٹر فاروقی صاحب قرار پائے، اور صحیح قرار پائے۔ ہمدرد کا دور اول دیکھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں بھی خط لکھا۔ اور اپنے متعدد مضامین بھی اشاعت کے لیے روانہ کردیئے۔ کچھ اپنے نام سے کچھ فرضی ناموں سے (اس وقت تک فرضی ناموں سے لکھنے کا مذاق طبیعت میں قائم تھا) مضامین میں مذہبی رنگ غالب تھا، اور اس میں نہ صرف اپنے بلکہ مولانا کے بھی مذاق طبیعت کی رعایت تھی۔ فاروقی صاحب ابھی تک علی گڑھیت" اور "نیچریت" کے اثر سے بالکل آزاد نہیں ہوئے تھے۔ بہر حال ان کا خط ۲۰ نومبر کو حسب ذیل ملا۔

[1] میں نے مولانا کو لکھا تھا کہ آپ کو خود اتنی کہاں فرصت، آپ میرے خطوط کے جواب کے لیے اسٹاف کے کسی صاحب کی ڈیوٹی لگا دیجئے!

"برادر محترم، سلام علیک۔

خط ملا۔ آمد کی خوشخبری جانفزا ہے۔ خود میں جن حالات کے ہوتے ہوئے یہاں چلا آیا، انھیں سنکر غالباً آپ بھی تھوڑا بار اپنے اوپر اٹھانا گوارا کریں گے۔ ہمدرد کی ادارت ذمہ داریوں کو خیال کرکے گھبرا اٹھتا ہوں۔ یہاں جو لوگ میرے ساتھ شریک ادارت ہیں۔ وہ اگرچہ عام صحافت کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ مولانا محمد علی کے ادبی معیار اور ہمدرد کے گزشتہ روایات سے بیشتر بےخبر ہیں۔ آپ کا عارضی طور پر آنا کم سے کم میرے لیے تو بے انتہا باعث تسکین ہوگا۔

آپ کی تحریروں میں آیندہ ان شاءاللہ حسب ہدایت احتیاط کیجائے گی۔[1]

ایک عرض گستاخانہ بھی سن لیجئے۔ برائے خدا مقبولیت میں اتنا بھی غلو نہ فرمائیں کہ ہمدرد کے صفحے صرف مدرسوں اور خانقاہوں کی درسیات میں شامل ہونے کے لائق رہ جائیں۔ یہی شکایت مجھے مولانا محمد علی صاحب سے بھی ہے۔ یہ نہ خیال فرمائیے گا کہ آپ لوگوں کے مولانا ہو جانے اور اپنے صرف حاجی رہ جانے پر رشک ہے۔ "خدا کے لیے آیئے اور جلد آیئے" یہ مولانا محمد علی صاحب کے الفاظ ہیں۔ جن کا اعادہ کر رہا ہوں۔

محمد فاروق"

"صرف حاجی رہ جانے" میں تلمیح یہ ہے کہ ہمدرد میں ایک مستقل ظریفانہ کالم ملفوظات حاجی بغلول کے عنوان سے ہوتا تھا۔ اور یہ کالم عموماً فاروق صاحب ہی کے قلم سے نکلتا رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے ہم لوگوں میں خود ان ہی کا نام "حاجی صاحب" پڑ گیا تھا۔

[1] اب بالکل خیال نہیں آتا کہ یہ احتیاط کس چیز کے متعلق تھی (۱۹۵۲ء)

عادت جنسوی کے بھی ایک آدھ خط مولانا کی طرف سے اسی درمیان مین آتے رہے۔ ہوتے ہوتے دسمبر کی شروع کی تاریخین آگئین، جب مین دہلی پہنچ پایا، کئی دن کے قیام کے ارادہ سے۔

وسط دسمبر کا زمانہ ہے۔ تاریخ غالباً ۱۵۔ سردی اور پھر دہلی کی سردی۔ کامریڈ کو ۱۹ کو نکلنا ہے۔ اور محمد علی کو بیلگام (علاقہ بمبئی) دیر سے دیر کر کے ۲۰ کو روانہ ہو جانا ہے اپنی صدارتِ کانگرس کا چارج گاندھی جی کو دینے، اور خود خلافت کانفرنس کا چارج لینے۔ ہوائی جہاز اس وقت کہاں تھے؟ تیز سے تیز ممکن سواری میل ٹرین تھی۔ کامریڈ کے لیے ایک سطر بھی ابھی تیار نہین! ——— یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔ مدیر کامریڈ کی مصروفیتوں کا روزانہ یہی نقشہ رہتا تھا ——— لیجیے ۱۵ کا دن بھی تمام ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کمپوزیٹر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہین اور پریس کے منیجر صاحب اور ہیڈ پروف ریڈر، دونون بھنائے ہوئے ہین کہ پرچہ وقت پر آخر کیسے نکل سکے گا۔ کمپوزیٹرون کو اجرت مفت کی مل رہی ہے، اور آخر وقت مین جب راتون رات ان سے کام لیا جائے گا، تو Over Time یا زائد اجرت خواہ مخواہ ہی دینی پڑے گی ——— یہ قصے بھی روز ہی رہتے تھے ——— شام ہوئی۔ رات کے ۹ بج گئے، ½۹ ہو گئے۔ دسمبر کی رات، معلوم ہوتا تھا آدھی رات ہو گئی۔ مین تو ادھر آرام سے سونے لیٹا، ادھر دیکھا کہ ذیابیطس کے مریض اور کمزور محمد علی خوب گرم اونی جسٹر پہن پہنا دفتر کے کمرہ مین آ بیٹھے۔ اور سکریٹری کی پکار ہوئی کہ نائب ٹیسٹ لے کر حاضر ہوں۔ اب محمد علی تھے، اور اس غریب رامپوری ٹائپسٹ سکریٹری کی جان!

مضامین زبانی بولنے شروع کیے۔ دس بجے، گیارہ بج گئے، بارہ ہوگئے۔ شب بیدار
اڈیٹر پر آمد مضامین کی ہو رہی تھی، اور غریب سکریٹری پر نیند کی۔ بیچارہ کب تک جاگتا کہیں
اونگھ گیا۔ بس پھر کیا تھا، لگی غضب کی ڈانٹ پڑنے کہ "شرم نہیں آتی۔ مجھے دیکھو کر بیمار ہوں،
سن میں تم سے دوگنا ہوں، اتنی محنت کر رہا ہوں، تم تندرست ہو، جوان ہو، چند گھنٹے بھی
نہیں جاگ سکتے، چلو ہٹو، میں خود اپنے ہاتھ سے کرلوں گا، تمھاری مدد کا محتاج نہیں ہوں"۔
غرض وہ صاحب بیچارہ نکالے گئے۔ اسٹاف کے ایک دوسرے صاحب جو اتفاق سے دفتر
ہی کے ایک حصہ میں سو رہے تھے یہ آواز سنکر جاگ پڑے تھے، وہ ازراہ انسانیت خود اٹھ کر
آئے، اور انھوں نے کام پورا کیا۔ صبح ۵۔ ½ ۵ بجے میری آنکھ کھلی۔ نماز فجر میں ابھی دیر تھی۔ آسمان
پر بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ اڈیٹر کامریڈ کا کمرہ بجلی کے قمقمہ سے روشن، اور وہیں اسی وقت
مولانا آفس کے کمرہ سے اٹھ کر اپنی خوابگاہ کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ راستہ میرے ہی کمرہ میں ہوکر
تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ "خیریت؟ ایسے ناوقت آفس کی طرف سے کہاں؟" معلوم ہوا کہ
ساری رات کام کرکے اب یہ اللہ کا بندہ اٹھا ہے! ——— یہ شب بیداریاں، یہ پرہیزیاں،
بے اعتدالیاں، اچھے تندرست جوانوں کی صحت غارت کردینے کو کافی تھیں، چہ جائے کہ ادھیڑ سن
کا آدمی، فکروں، پریشانیوں سے دبا ہوا، صدموں سے کچلا ہوا، بیماریوں سے لدا ہوا!
واقعہ کوئی استثنائی نہیں۔ مثال محض نمونہ کے طور پر بیان ہوئی ——— اسلامی ہند
کا یہ محبوب لیڈر آہستہ آہستہ لیکن قطعی طور پر خودکشی کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا!

باب (۲۸)

۱۹۲۵ء (۱)

"امتحان ہیں ایک مشتِ خاک کے"

دسمبر کی سولھویں رات تو یوں گزری ہی تھی، سترہویں رات اور پھر اٹھارہویں رات بھی کچھ اسی طرح محمد علی کے حق میں دن بن کر گزری۔ انیسویں رات تھی، جب اول شب میں محمد علی بلگام کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ آخری پروف خود دیکھا کرتے تھے۔ موٹر اپنے پاس کہاں تھا، کسی کے ہاں سے منگوا لیا تھا۔ ریل کا وقت آگیا، اور پروف ریڈری ختم نہ ہو پائی! موٹر پر بیٹھے، تو اسٹیشن تک دیکھتے گئے۔ ریل پر بیٹھے ہیں، جب بھی اس میں مصروف! لیجیے سیٹی ہوگئی۔ اور گاڑی چلی! اب چلتی ہوئی گاڑی سے مولانا کاغذات پھینک رہے ہیں، اور ان کے دفتر والے ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے انھیں لے رہے ہیں! ——— یہ تھی کامریڈ کے کام کی نوعیت، اور یہ ایڈیٹر کامریڈ کے طریق کار کا ایک نمونہ!

کامریڈ کا کام تھا اتنا کہ ایک اچھے قابل اور جید استعداد کے نائب ایڈیٹر کا پورا وقت مانگ رہا تھا۔ ملک بھر کی لیڈری، کانگرسوں میں شرکت، کانفرنسوں کی صدارت، جلسوں میں تقریریں، کمیٹیوں میں مباحثے، یہ چیزیں تو خیر پھر بہت زاید اور بالکل الگ تھیں ہی۔ ہمدرد کی چیف اڈیٹری تک، جو اس سے ملتی جلتی ہی چیز تھی، وہ بھی کامریڈ کی

ایڈیٹری کے ساتھ ڈل کر چلنا دشوار تھی۔ جتنی ولایتی ڈاک آتی خصوصاً اسلامی ممالک اور اسلامی مسائل سے متعلق ہر ہفتہ ولایت سے حسب تعداد میں تراشے ہی مختلف ولایتی اخبار اور رسالوں کے آتے رہتے تھے، ان ہی کو پڑھنا، ان میں چھانٹ کر کامریڈ میں نقل یا نقد کیلیے انتخاب کرنا بھی ایک کام ایسا تھا، جو ہفتہ میں پورے دو دن کا وقت لے لیتا۔ پھر نوٹ لکھنا، مقالہ تیار کرنا، مراسلوں کی دیکھ بھال رکھنا، مراسلہ نگاروں سے مراسلت کرنا، پرچے کے آخری پروف دیکھنا، یہ سارا کام اتنے پھیلاوے کا تھا کہ ایک کیا معنی، اگر دو اچھے قابل مددگار ہوتے، جب جاکر انجام پاسکتا تھا ——— مسلمانوں کی قسمت میں یہ کہاں تھا!

محنت کا نمونہ آپ دیکھ چکے۔ اب ایک سرسری اندازہ مصارف کا لگاتے چلیے۔ ۱۹ ر کا پرچہ تو جوں توں نکل گیا۔ اب ۲۶ ر کے پرچہ کے لیے کیا ہو؟ اس کے لیے منقولات و اقتباسات کا ذخیرہ تو خیر چھوڑ گئے تھے، کچھ جگہ "مکتوب لندن" سے بھر دی گئی، اور کچھ گاندھی جی کے خطبۂ صدارت سے۔ لیکن ایڈیٹوریل کے نام سے ایک آدھ کالم کیا معنی، ایک سطر بھی موجود نہیں! محمد علی کو بلگام پہنچ کر کانگرس اور خلافت دونوں کی سبجکٹس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، اُس کمیٹی، اس کمیٹی سے مہلت بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ اب آپ ان کی کرامت کہیے یا اعجاز کہ ۲۴ر دسمبر کو خدا معلوم کہاں بیٹھ کر اور دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کون وقت نکال کر عین ہنگاموں کے شباب میں، ایک زبردست مقالہ سوا سات، ساڑھے سات کالم کا لکھ ڈالا ——— لیکن اب اسے بھیجیں تو کیسے بھیجیں؟ کہاں بلگام کہاں دہلی! حیرت کے کانوں سے سنیے اور ماننے کا دل چاہے یا نہ چاہے، بہرحال یقین بھی فرما لیجیے کہ کامریڈ کے اسی مفلس و قلاش ایڈیٹر نے دجو قوم "بہا

کے بقول قومی چندہ کھاتا رہتا اور ہضم کرتا رہتا تھا!) اتنا طویل و عریض مضمون سارے کا سارا تار پر اپنے پرچہ کے لیے روانہ کیا! ——— ستم پر ستم یہ کہ ۲، ½ ۲ کالم کے قریب مضمون ۲۴ کو روانگی سے رہ گیا، وہ ۲۵ کو روانہ ہوا۔ ۲۵ دسمبر کو بڑے دن (کرسمس) کی تعطیل تار گھر، ڈاکخانہ، سب ہی کہین ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ کو ان دو ڈھائی کالمون کے مضمون کی فیس اکسپرس تار کی شرح سے دوگنی دینی پڑی!

ان شاہ خرچیون کی ہمت اچھے اچھے سرمایہ دار اور روپیہ والے اخبار بھی مشکل ہی سے کر پاتے۔ لیکن اس دیوانۂ ملت کو، جوش و اخلاص کے پتلے کو، کام کی دھن مین خدمتِ ملی کے جنون مین جس طرح نہ اپنی صحت کی پروا تھی نہ اپنے آرام کی نہ اپنے وقت کی، اسی طرح اپنے پیسہ کی پروا بھی کب تھی ——— اس کی قوم کا کام تو صرف اعتراض کرنا، دل خراش، دل آزار، دل شکن نکتہ چینی کرنا، طنز و تعریض کرنا تھا۔ بجز آس پاس رہنے والوں کے اور کسی کو کیا علم کہ یہ مخلص خادم قوم و ملت کے لیے روزانہ کس کس طرح اپنا جگر خون کرتا رہتا!

یہی زمانہ یعنی شروع جنوری سنہ ۲۵ء کا تھا، جب لکھنؤ مین بعض قدیم دوستون کی صلاح و مشورہ سے ایک اپنا مستقل ہفتہ وار نکالنے کی ٹھہری۔ نام عام فہم سچ قرار پایا۔ ایڈیٹری پر نام تین آدمیون کے رہے۔ مولوی ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر (جو سچ کے منیجر اور گویا "مالک" بھی تھے) اور مولانا عبد الرحمٰن ندوی نگرامی اور تیسرا یہ خاکسار۔ شروع شروع مولوی عبد الرزاق خان نذی ملیح آبادی بھی (جو بعد کو کلکتہ جا کر کچھ سے کچھ ہو گئے) ہر مشورہ مین شریک بلکہ پیش پیش رہے۔

مولوی ظفر الملک تو چھ مہینہ کے بعد ایڈیٹری سے الگ ہو کر صرف منیجر رہ گئے، اور محمد علی مرحوم کوئی ۱۳ مہینہ کے بعد عین جوانمری میں رحلت فرما گئے۔ اور پرچہ کی باگ تمام تر میرے ہی ہاتھ میں آگئی۔ بہرحال شروع میں یہی پرچہ بڑی حد تک میرا تھا۔ سچ اس وقت گاندھی جی اور علی برادران کے مسلک کی تقلید میں ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور برطانیہ کے خلاف ہر قسم کی ترکِ موالات کا نقیب تھا۔ مضامین کا بڑا حصہ ہمیشہ مذہبی رنگ کا ہوتا تھا۔ اخلاقی اور دینی اصلاح اس کے خاص مقاصد میں داخل تھی اور طرزِ تحریر میں شروع شروع ایک عرصہ تک کوشش اس کی رہی کہ گاندھی جی کے ینگ انڈیا کی تحریروں کی سادگی و سلاست کا نقشِ ثانی اردو میں پیش ہوتا رہے ـــــــ "اردوئے معلی" کی مشق کچھ روز تک اس "اردوئے مہند" (کانگریسی اردو یا ہندیائی ہوئی اردو) کے آگے ملتوی رہی!

اپنا وقت جتنا سچ کے لیے صرف کرتا، اس سے کچھ زیادہ ہی ہمدرد کے لیے بھی نکالتا۔ اور دریاباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے جتنی بھی خدمت ممکن ہوتی، اپنی بساط کے لائق دونوں کی کرتا رہتا۔ ہمدرد کے لیے مستقل مضامین الگ لکھکر بھیجتا رہتا، ہر پرچہ کے لیے قرآن مجید کی ایک آیت مع تشریحی ترجمہ کے دیتا۔ اور سچ کے متعدد مضامین ہمدرد خود بھی اپنے ہاں نقل کرتا رہتا۔ فاروقی صاحب عرصے تک جمنے والے نہ تھے۔ ایک طویل مدت کے لیے وطن جا چکے تھے، اور اب ہمدرد کے شعبۂ ادارت میں سب سے سینیر اور با اختیار عارف ہنسوی تھے۔ انہی کے خط کبھی اپنی طرف سے اور کبھی مولانا کی طرف سے بکثرت موصول ہوتے رہتے۔ ہفتہ وار تو بہرحال اور کبھی اس سے بھی جلد جلد ـــــــ دو ایک خط ان کے ملاحظہ ہوں۔ ان سے ہمدرد اور "ہمدردیات" پر اچھی خاصی روشنی پڑے گی۔

۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کا مکتوب:

"مضامین پہنچے۔ فاروق صاحب پھر آج کل گورکھپور گئے ہیں۔ جوش[1] صاحب کا مضمون ان ہی نے دیکھ کر دیا تھا اور انھیں افسوس ہے کہ ایک ایسا فقرہ رہ گیا جو نامناسب تھا۔ آیندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

سچ سے ہندو مسلم اتحاد والا مضمون آج نقل ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آج کل کام بہت کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ صرف[2] چار آدمی ہیں"۔

افغانستان سے عین اسی زمانہ میں خبر آئی کہ دو "احمدی" (قادیانی) بہ الزام ارتداد سنگسار کر دیے گئے۔ ہندوستان کے بیشتر بلکہ تقریباً سب ہی علماء نے اس کی بزور موافقت کی، اور حکومت افغانی کے اس طرز عمل کی تحسین و تصویب اردو کا سارا مسلم پریس گویا گونج اٹھا۔ مولانا محمد علی وجوب قتل مرتد کے قائل نہ تھے۔ اور ان کے دونوں اخبارات نے سب سے ہٹ کر کابل گورنمنٹ پر نکتہ چینی کی روش اختیار کی۔ اور مذہبی دلائل بھی قتل مرتد کے خلاف دینے شروع کیے ——— میں خود اس وقت اس مسئلہ میں مترددو مذبذب تھا اور کوئی قطعی بات اپنے قلم سے لکھنا نہیں چاہتا تھا، اصلی سوال اس وقت نہیں، بہت بعد کو خیال آیا کہ نفس قتل مرتد کے بجائے یہ رکھنا تھا کہ قادیانی اسی معنی میں مرتد ہیں بھی جس معنی میں مرتد واجب القتل ٹھہر جاتا ہے۔ بہر حال اس وقت تو ۲ر فروری کو

---

[1] مراد جوش ملیح آبادی نہیں بلکہ سلطان حید ر جوش (علیگ) بدایونی ہیں، جو اس زمانہ میں مجھ سے ناخوش تھے۔

[2] یہ "صرف" کا لفظ غالب صاحب کی زیادتی تھی، عام معمول اس زمانہ میں ان دو روزناموں میں صرف تین شخصوں کا تھا، ایک اڈیٹر، ایک مددگار، ایک مترجم یا ایک اڈیٹر اور دو مترجم، بہر رو میں تو اس حال میں بھی علاوہ مولانا کے چار آدمی تھے

عارف صاحب نے یہ لکھا:-

مکتوب گرامی موصول ہوا۔ مضامین کی رسید عرض ہے، فاروق صاحب ابتک نہین آئے اور نہ آخر مارچ تک آئین گے۔ آج کل صرف چار آدمی ہین۔ فاروق صاحب کی عدم موجودگی تکلیف دہ ہے۔

کابل مین پھر دو احمدی سنگسار کر دیے گئے۔ قتل مرتد کے وجوب یا عدم وجوب کے متعلق ایک مدلل مضمون کی ضرورت ہے۔ اور آپ ہی سے درخواست کی جا سکتی ہے۔ ہمدرد اس کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ خدا معلوم آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ قتل مرتد کے قائل اور احمدیوں کو مرتد اور واجب القتل سمجھتے ہین یا نہین۔ اگر آپ کتاب وسنت کی بصیرت سے قتل مرتد کے خلاف نتیجہ پر پہنچین، اور قادیانیوں کو بھی مرتد نہ تصور کرتے ہون تو ضرور ایک مدلل مضمون ارقام فرمایئے۔ ہمدرد تو اس کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔ باقی حالات بدستور۔ اشاعت نہین بڑھ رہی ہے"۔

یہ سب سے آخر کا ذرا سا فقرہ بہت پر معنی تھا۔ "چٹپٹے" مضامین ہمدرد مین بھلا کہان جن کی ہر طرف مانگ تھی نہ "دلپسند" خبریں، نہ بھڑکا دینے والی سرخیان، نہ گرما گرم نوٹ۔ خود یہ قتل مرتد کے مسئلہ مین مخالفانہ پہلو لینا مسلمانون مین کب مقبول ہو سکتا تھا۔ یہی غنیمت ہے کہ اس کی سزا مین ہمدرد کا بائیکاٹ (مقاطعہ) ہی فوراً شروع نہین ہو گیا۔

دوسرا خط اسی سے متصل، ۱۹ فروری کا لکھا ہوا:-

" جن صاحب کا خط آپ نے بھیجا تھا، ان کی نسبت مولانا فرماتے ہین کہ وہ کام دے سکین گے اور سکھا نا میرے لیے سخت دشوار ہے۔ اس وقت بھی دو ایسے آدمی ہین جن سے بجائے مدد ملنے کے وقت ضائع ہوتا ہے۔

ارتداد کے متعلق مضامین[1] آپ نے دیکھے ہون گے۔ یہ میرے لکھے ہوئے ہین۔ ظاہر ہے کہ مین ٹھیک طور پر نہین لکھ سکتا۔ ادھر ادھر سے لیکر کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ مولانا عبد الحی صاحب[2] کو مین بھی لکھ رہا ہون۔ متعصب مولویون کی پروا اس معاملہ مین نہین کی جا سکتی۔

"اخبار نویسی" والا لیڈنگ آرٹیکل میرا ہی تھا۔ اور قریب قریب تمام ایڈیٹوریل میرا ہی ہوتا ہے۔ غلطیان بہت رہ جاتی ہین۔ اس کا سخت افسوس ہے۔ خطبہ والا مضمون لیڈر بنا دیا گیا[3]۔ غالباً کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔"

---

[1] مراد وہی قتل مرتد کے سلسلہ کے مضامین ہین۔ [2] مراد مولوی خواجہ عبد الحی صاحب فاضل دیوبند، استاد جامعہ ملیہ ہین، ان سے توقع کی تھی کہ مسلک جمہور کے خلاف قتل مرتد کے مسئلہ مین ہمدرد کے ہمنوا ہو جاتے۔
[3] سچ مین "خطبۂ جمعہ کی زبان" پر میرا مقالہ نکلا تھا۔ اسی کو ہمدرد کا بھی لیڈر بنا دیا گیا ہے۔

باب (۲۹)

سنہ ۱۹۲۵ء (۴)

("دریا بادکی دریا دلی")

اب بڑی آسانی تھی۔ بڑے ہندوؤں یا انگریزوں کے لیے جو کچھ لکھوانا چاہتا، محمد علی کو ایک کارڈ میں لکھ دیتا یا جب دہلی جاتا تو زبانی کہہ آتا، اور کامریڈ میں بہترین انداز کے ساتھ، اس پر نکل جاتا۔ دہلی اب جلد جلد آنا جانا رہتا ہی تھا، کوئی ہر تیسرے چوتھے مہینے۔ اور مولانا سے ان وقفوں کے درمیان لکھنؤ میں جو ملاقاتیں ہو جاتیں وہ ان کے علاوہ۔ سچ اور مدیر سچ دونوں کا ہمدرد سے گہرا تعلق بدستور قائم تھا، بلکہ تعلق روزافزوں۔ عارف صاحب شروع مارچ کے خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ کا کارڈ مولانا کو دیدیا گیا۔ وہ کامریڈ میں اس کے متعلق لکھیں گے۔ اس کے بعد ہمدرد میں اس کو دیکھ کر لکھا جائے گا۔ غالباً گاندھی جی کو غلط فہمی ہوئی۔ وہ قرآن کے متعلق جو سمجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ رسول اللہ کی تصنیف ہے، اور اس میں غلطی کا امکان نہیں؟ یا قرآن کا حرف حرف واجب التعمیل نہیں۔ خیر اس کے متعلق لکھا جائیگا۔"[1]

---

[1] اب طلق یاد نہیں پڑتا کہ مولانا کو توجہ کس مسئلہ پر دلائی گئی تھی۔ باقی اتنا تو ظاہر ہے کہ اس کا تعلق گاندھی جی کی کسی مذہبی غلط فہمی سے تھا۔ (سنہ ۱۹۵۲ء)

میری ایک گذارش ہے وہ یہ ہے کہ آج کل اسٹاف بہت کم ہے۔ صرف چار آدمی ہیں اور سارا ایڈیٹوریل مجھی کو لکھنا پڑتا ہے۔ اور کسی کسی دن لکھا لکھایا ایڈیٹوریل ضائع کر دینا اور دوسرا لکھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے اخبار میں دیر ہونے کے علاوہ مجھ کو بھی سخت اذیت ہوتی ہے، کیونکہ فوراً لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے گذارش ہے کہ تین چار ایسے مضامین جناب لکھ کر بھیج دیں جو غیر موقت ہوں، اور اگر سال بھر بھی وہ شائع نہ کیے جائیں تو کوئی حرج نہ ہو جیسا کہ آپنے سچ میں ابھی ایک مضمون لکھا تھا جس کو ہمدرد میں بھی نقل کیا گیا تھا، غالباً مسلمان اور خدا کی غلامی پر تھا۔ اگر اسی قسم کے دو چار مضمون محفوظ رہیں تو بہت اطمینان نصیب ہو جائے۔ جنابنے بہت دنوں سے ہمدرد کے لیے کچھ نہیں تحریر فرمایا۔"

قتلِ مرتد پر سلسلۂ بحث گرم تھا اور فرنگی محل، دیوبند، وغیرہ سارے طبقاتِ علماء کے مقابلہ میں ہمدرد ابھی تک جما ہوا تھا۔ ہمدرد کے مضمون تو خیر اوسط درجہ کے ہوتے تھے، لیکن خود مولانا کے قلم سے کام مرتد میں مضمون خوب نکلا تھا۔ مولانا کا نقطۂ نظریہ تھا کہ احادیث میں جس ارتداد کی سزا قتل آئی ہے، وہاں مجرد بدعقیدگی مقصود نہیں، بلکہ بدعقیدگی سے بغاوت مراد ہے، اور اس ضمن میں خود حدیث کے مرتبہ و مقام سے بحث بڑی دلچسپ تھی۔ بحث کے دوسرے جزو، یعنی آیا قادیانی (احمدی) مرتد ہیں یا نہیں۔ اس سے مولانا نے تعرض ہی نہیں کیا تھا۔ بہرحال اس انگریزی مقالہ کے حسنِ انشاء، زورِ استدلال اور حدیث فہمی کی داد میں نے مولانا کو بے اختیار لکھ بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں عارف صاحب کا مکتوب مورخہ ۱۹ر مارچ:-

"مولانا فرماتے ہیں کہ جو تعریف جنابنے فرمائی ہے میں اس کا مستحق نہیں ہوں، بلکہ

مین نے تو جو مواد مجھ کو دوسرون سے ملا، بس اس کو ترتیب دیدیا۔ مجھے تو زیادہ تر امداد انہی جناب مولوی محمد علی صاحب لاہوری سے ملی ہے[۱]۔ مولانا صاحب یہ بھی فرماتے ہین کہ آپ براہ کرم قتلِ مرتد کے متعلق جس قدر احادیث و اقوالِ ائمہ[۲] ہین وہ سب بھیجدین۔ وہ اس مسئلہ کو ادھورا چھوڑنا نہین چاہتے۔ مگر فی الحال ہمدرد مین اس پر بحث کا ارادہ ملتوی ہے۔ اس لیے آپ کا مضمون اور دوسرے بزرگون کے مضامین بھی روک لیے ہیں کہ جب پوری طرح اظہارِ خیال دوسرے لوگ کرلین اس کے بعد ہمدرد اس کو شروع کرے۔

فاروقی صاحب کا کوئی پتہ نہین۔

مین نے کسی سابق عریضہ مین گزارش کی تھی کہ چند ایسے مضامین جو موقّت نہ ہون اور بلا قید زمانہ و موسم ہر ایک وقت کام دے سکین مرحمت فرمائیے تاکہ وہ محفوظ صینہ مین رکھے رہین۔ اور اگر ضرورت اچانک پیش آجائے تو ان سے کام لیا جاسکے۔ سچ کا گزشتہ پرچہ جس مین ہندو مسلم اتحاد کے متعلق دوسرا مضمون شائع ہوا ہے وہ مولانا کے پاس سے گم گیا ہے، اس لیے براہ کرم بھجوا دیجیے!"

عین یہی زمانہ تھا یعنی مارچ کا آخری ہفتہ (اور ماہ مبارک رمضان کی کوئی شروع کی تاریخ) کہ مجھے محسوس ایسا ہوا کہ قلب کے مرض کا دورہ کسی سخت قسم کا پڑا ہے۔ اور ایک صبح کو تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے اب دل کی حرکت رکی سی جا رہی ہے۔ محمد علی یہ چیز پاکر قدرۃً بہت متاثر ہوئے۔ اور انھیں گمان یہ گزرا کہ مین بعض مشائخ اور اہل طریق کی صحبت مین رہ کر اور ان کے ملفوظات وغیرہ سے متاثر ہو کر تقلیلِ غذا وغیرہ کچھ

---

[۱] یہ اشارہ مولانا محمد علی لاہوری کی کتاب مقام حدیث کی طرف ہے، جس مین حجیتِ حدیث پر بڑی سلجھی ہوئی گفتگو موجود ہے۔ [۲] "ائمہ" سے مراد اہل سنت کے ائمۂ فقہ ہیں۔

بہت زائد کرنے لگا ہوں یہ اوہام کا اثر ہے ـــــــــ عارف صاحب کا خط حسب ذیل آیا:-

"آپ کی ناسازیٔ طبع کا حال معلوم کر کے سخت افسوس ہوا۔ واقعی قلبی امراض میں اس قدر طوالت باعثِ تشویش ہے۔ مگر خدا کے لیے دوا علاج کی جانب توجہ فرمائیے دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔ مسلمان پر کچھ حق اس کے جسم کا بھی ہے، کل ہی میں نے بخاری شریف کتاب الصوم میں دیکھا ہے کہ اپنے بدن کا حق بھی مسلمان کو ادا کرنا چاہیے میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ محنت اور شب بیداری کی کثرت و تطویل زیادتی مرض کا باعث ہے۔ مجھے تو جب سے جناب سے نیازمندی کا شرف حاصل ہوا ہے میں ایک قسم کا فخر و غرور محسوس کرتا ہوں، اور اس حالت کو سن کر سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ خدائے تعالیٰ جلد صحت عطا فرمائے۔

جناب کا خط پڑھ کر مولانا سخت متاثر ہوئے۔ اور جواب لکھنے کے لیے انھوں نے خط رکھ لیا ہے۔ ان کی بھی یہی رائے ہے کہ اپنے جسم کا حق آپ کو ادا کرنا چاہیے۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ جناب کو صحتِ کلی عطا فرمائے۔"

ایک لطیفہ بھی اسی سلسلہ میں سن لیجیے۔ حالانکہ اس کے درج کرنے کا اصل موقع کئی ورق قبل تھا ـــــــ ۲۲ء کے آخر میں مولانا کا مہمان ہو کر علی گڈھ پہنچا۔ تو اگرچہ تقلیلِ غذا وغیرہ کے بعض معمولات کچھ تھوڑے بہت اس وقت جاری تھے، لیکن چائے کا غیر معمولی شوق بھی اس زمانہ میں تھا۔ پیالیوں پر پیالیاں، بلکہ چاء دان پر چاء دان خالی کر دیا کرتا تھا۔ سفر میں ایک مستقل سماور ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ صبح کے ناشتہ پر مولانا کی نظر اس سفری سماور پر جو چائے سے لبالب تھا، پڑی۔ معاً ہنس کر بولے

"دیکھیے شیطان بھی بڑا ذہین ہے، آخر اپنے لیے راستہ ڈھونڈ ہی لیا نہ۔ اب آپ تک اسی سماور کی ٹونٹی کے راستہ سے پہنچے گا۔"

محمد علی سے تعلقات تو استنے تھے، اور لکھنؤ وہ بار بار آتے ہی رہتے۔ پر دریاباد تشریف لانے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ میں ہی ہمیشہ چل کر لکھنؤ آجایا کرتا تھا، اور ایک خادم کو مخدوم کے لیے یہی کرنا چاہیے بھی تھا۔ لیکن محمد علی تو اپنے ادنی سے ادنی چاکروں کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ خود ہی لکھنؤ آکر کئی بار فرمایا کہ "دریاباد اب چلتا ہوں" اور "اب کی ضرور چلونگا" میں بھی ہر مرتبہ معذرت کر دیتا، اور یہ واقعہ عرض کر دیتا کہ "جی نہیں میرا غریب خانہ آپ کے چلنے کے قابل نہیں جب خود ہی بلاؤں گا، آئیے گا۔" —— واقعی ہر بار شرم ہی آکر دامنگیر ہو جاتی تھی۔

جون میں خیال آیا کہ آخر پار سال علی برادران بڑے گاؤں کو مشرف کر چکے ہیں، اب کی برسات میں "آموں کی دعوت" پھر رہے، اور ایکی باری دریاباد کی آئے، کچھ نذرانہ پیش کرنے کا بھی تہیہ کر لیا۔ خط و کتابت شروع کی۔ بڑے بھائی مولانا شوکت علی تو چند کی چاٹ میں چٹ سے راضی ہو گئے، اور نیم وعدہ محمد علی نے بھی کر لیا۔ مقصود تو ان ہی کو بلانا تھا، بڑے بھائی کو تو کچھ شرما شرمی ہی شریک کر لیا گیا تھا۔ لیکن کا مرید واقعی محمد علی کے لیے زنجیر پا بنا ہوا تھا۔ عارف صاحب کے ۲۷ جون کے خط میں ہے:-

مضامین کا شکریہ۔ مولانا صاحب نے آموں کی دعوت کے متعلق صرف یہ جواب دیا ہے کہ کامریڈ کو کیا کروں۔ مولانا شوکت علی صاحب کب آرہے ہیں۔ ان کی تاریخ معلوم ہو تو پھر یاد دہانی کروں گا۔ مگر آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ بقرعید سے پہلے یہاں سے نکلنا

ناممکن ہوگا۔ کیونکہ یہان ان کا اس موقع پر رہنا ضروری ہوگا۔"

جولائی کا شاید دوسرا ہفتہ تھا جب مولانا شوکت علی تنہا وارد دریاباد ہوئے۔ قصبہ مین استقبال خوب دھوم دھام سے ہوا۔ اور مجمع یہاں کی تاریخ میں بے نظیر رہا۔ جلوس، جلسہ، تقریرین سارے ہی لوازم پورے ہوئے۔ چندہ بھی قصبہ نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دیا، ساڑھے سات سو کی رقم پیش کر دی۔ جو ۲۲ء کے گرمجوشی کے نہین، ۲۵ء کی ٹھنڈک کے موسم مین غیر معمولی رقم سمجھی گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن دل کی خوشی ادھوری ہی رہی۔ اس لیے کہ بالآخر آمادہ ہوجانے کے باوجود محمد علی عین وقت پر اپنی علالت کے باعث قابلِ سفر نہ ہوسکے۔ ——— آہ! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اصلی خوشی تو ان ہی کے خیر مقدم کرنے کی تھی۔

ہمدرد مین "دریاباد کی دریادلی" کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ بھی نکلا کہ دریاباد کے مسلمانون نے تو یہ نذرانہ مولانا محمد علی کی خدمت کے لیے فراہم کیا تھا۔ مولانا شوکت علی خواہ مخواہ پہنچ گئے اور ساری تھیلی پر بلاتقسیم و شرکت خود قابض ہوگئے شوکت صاحب نے اپنے اخبار خلافت مین اس کا جواب اسی انداز مین دیا ——— دونوں بھائیون کے اخبارون مین نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

عارف صاحب کے ۲۱ر جولائی والے خط مین ہے:-

"دریاباد کی دریادلی کا جواب بھی مولانا شوکت علی کا لکھا ہوا نظر سے گزرا ہوگا۔ محرم والا مضمون ۸ر و ۹ر محرم کے ہمدرد مین لیڈنگ آرٹکل کی صورت مین نکلے گا۔[1]

[1] ہمدرد مین میرے کثرت مضامین بغیر میرے نام کے نکلے ہین، کبھی لیڈنگ آرٹکل بن کر، کبھی مراسلات وغیرہ مین کسی فرضی نام سے۔

اس مضمون نے مجھ کو زحمت سے بچالیا۔ شوکت صاحب سے تحصیلی کا تقاضا کیا گیا مگر آپ
جانتے ہین کہ روپیہ پر بڑے بڑون کے پاؤن ڈگمگا جاتے ہین۔ ایک نوٹ اس حصین چھپٹ
پر بھی لکھا جائے گا۔

کل علی برادران امرتسر گئے۔ مولانا محمد علی کا باوجود ضعف و نقاہت کے یہ سفر کرنا
اچھا نہین مگر وہ نہ مانے"۔

کیسے مانتے۔ اطلاع انھین یہ مل چکی تھی کہ ڈاکٹر کچلو وغیرہ اکابر پنجاب سب خلافت
کمیٹی کے مقابلہ مین صف آرا ہو گئے ہین۔ اب صحت وغیرہ کا خیال کب مانع راہ
بن سکتا تھا۔

باب (۳۰)

سنہ ۱۹۲۵ء (۳)

(ملّت کی طرف سے "قدر دانی")

اگست کا آخری ہفتہ تھا اور مین مولانا کے یہان مقیم۔ خبر ملی کہ مولانا کی بڑی صاحبزادی (زہرہ بی صاحبہ زاہد علی خان) کا بچہ عارف رامپور مین سخت علیل ہے۔ مولانا کو اپنے بچون بچیوں مین نہین کون محبوب تھا لیکن یہ پیارا نواسہ تو شاید سب ہی سے بڑھ کر عزیز و محبوب تھا۔ رامپور مین داخلہ ممنوع تھا۔ جاتے تو کیسے جاتے۔ تڑپ کر رہ گئے۔ معلوم ہوا" ہز ہائینس نواب صاحب فرزند دلپذیر سلطنت انگلشیہ بمبئی میں ہین۔ ان کی خدمت مین داخلہ کی اجازت کے لیے ایک لمبا اور موثر تار بمبئی لکھا۔ ابھی یہ تار جانے بھی نہیں پایا تھا کہ رامپور سے بچہ کی وفات کا تار آگیا! اب محمد علی سارا کام کاج چھوڑ پہلی ٹرین سے رامپور روانہ ہوئے کہ اسٹیشن ہی پر بیٹھے بیٹھے دفن سے قبل لخت جگر کا ایک بار دیدار کرلین گے اور گھر کہلا بھیجین گے کہ معصوم کی میت کو کئی میل کا چکر دے کر پہلے اسٹیشن لائین۔ پہنچے تو معلوم ہوا کہ تدفین ہوچکی ہے! اناللہ۔ اسٹیشن پر چند گھنٹے ٹھہر اور رو دھو کر پہلی ٹرین سے

دہلی واپس آ گئے ——— مولانا کی روئداد زندگی میں یہ ناکامی در ناکامی حسرت در حسرت کی کوئی انوکھی اور نرالی مثال نہیں!

آتے ہی دوسرے دن پانی پت چلنے کی ٹھہری ——— ان مسلسل سفروں کے کامریڈ کا بس خدا ہی حافظ تھا ——— بلووں ہنگاموں کی ہوا تو چلی ہوئی تھی ہی، پانی پت میں (جو دہلی سے کوئی ۵۰، ۵۵ میل کے فاصلہ پر ہوگا) یکم اگست کو قربانی گاؤ کے سلسلہ میں شدید ہنگامہ ہو چکا تھا، اور پانی پت کے مسلمان مصر ہوئے کہ مولانا اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایسے ایسے ہنگامے خدا معلوم کتنے مقامات پر ہو چکے تھے، اور روزانہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ کسی آل انڈیا لیڈر کے پاس اتنا وقت کہاں سے آ سکتا تھا کہ ہر شہر اور قصبہ کے مقامی فساد اور بلووں سے اتنی دلچسپی لے۔ لیکن محمد علی کے ہاں مسلمانوں کا کوئی معاملہ چھوٹا معاملہ تھا ہی نہیں۔ کسی ادنیٰ سے مسلمان کو دنیا کے کسی گوشہ میں تکلیف پہنچ جائے، اور محمد علی اس کے لیے بے چین ہو رہے ہیں، مضطرب پھر رہے ہیں۔ ہر ہر واقعہ کی تحقیق کا اہتمام اس پر مستزاد۔ جب روئداد کے ایک ایک جزئیہ کی خود پوری تنقیح نہ کر لیں، دم نہ لیں۔ اور بغیر ان سارے مراتب کو طے کیے اس موضوع پر لکھنا لکھانا حرام سمجھیں ع

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے!

رات دن اگر ۲۴ گھنٹہ کے بجائے ۴۸ گھنٹہ کے ہونے لگتے جب بھی اتنی فرصت کہاں سے ہاتھ آ سکتی تھی۔ بات موٹی سی تھی۔ لیکن محمد علی کے ہاں مسلمان کی تکلیف کے بعد عقل مصلحت سنج کیا ہر دور اندیشی غائب! پانی پت چلنے کے لیے بےقرار۔ کامریڈ کا

ایک ہفتہ یوں ہی پچھڑا ہوا تھا، یہ رامپور سے آتے ہی دوسرے دن کا مریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو ہمراہ لے پانی پت روانہ ہو گئے۔ رفاقت سفر کی سعادت مجھے بھی حاصل۔ چلنے لگے تو جیب میں دام نہیں۔ پانی پت کا فاصلہ ہی کیا۔ لیکن کرایہ وہاں تک کے لیے بھی سکنڈ کلاس کا تو خیر کیا نکلتا۔ تھرڈ کلاس کا بھی بس جوں توں ہی نکل پایا!
——— یہ تھا، ۸ کروڑ مسلمانوں کا سب سے بڑا لیڈر "چندہ کا لاکھوں روپیہ اڑا جانے والا" لیڈر!

برسات کی گرمی اور امس، دوپہر کا وقت، تیسرے درجہ کی ایک کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر عبدالمجید خواجہ مل گئے۔ دل نے کہا کہ شاید یہ ٹکٹ تھرڈ سے سکنڈ کا تبدیل کرا دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے خواجہ خود بھی اس وقت تہی دست ہو رہے تھے۔ "ترک موالات" کے ماتحت بیرسٹری تو پہلے چھوڑے ہی ہوئے تھے۔ خیر کوئی دو گھنٹہ میں پانی پت پہنچ گئے۔ ایک شکستہ حال سا تانگہ اسٹیشن پر ملا۔ اسی پر تینوں آدمی سوار ہو چلے ——— لیڈر کا استقبال ہمیشہ جلوسوں اور نعروں، موٹروں اور جوڑیوں ہی سے نہیں ہوتا ——— بازاروں سے ہوتے ہوئے پہلے شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضر ہوئے، اور پھر مولوی حافظ لقاء اللہ صاحب عثمانی[1] کے ہاں آ کر ٹھہرے۔ عصر کے وقت سے مولانا کا گشت پیدل شروع ہوا۔ مسلمانوں کا ایک جم غفیر ساتھ، ہندو بھی جا بجا شریک ہوتے گئے۔ کچے اور کچے راستوں کی خاک

[1] اس وقت تک میں انھیں ایک عام ہی خادم و کارکن سمجھتا تھا۔ ان کے بے پناہ اخلاص اور جوش دینی کا اندازہ کئی سال بعد ہوا۔

چھانتے اور خاک پھانکتے۔ پسینہ مین ہم سب لت پت۔ آگے آگے مولانا، قصبہ کی وہ تمام
سڑکیں، گلیاں، پگڈنڈیاں دیکھ رہے ہین، جنکی بابت نزاع ہوچکی، یا آیندہ احتمالِ
نزاع تھا۔ اور سوالات کی بھرمار کرتے جاتے ہین، مین قلم گھسنے کا عادی، اور فلسفۂ
مشائی سے ناآشنا، مولانا سے سن مین ۴۰ سال چھوٹا ہونے کے باوجود اس فوجی
مارچ مین ان کا ساتھ دینے کی ہمت مردانہ کہاں سے لاسکتا تھا۔ میل آدھ میل
کا معاملہ ہوتا تو نباہ بھی لے جاتا۔ غرض، مین تو گھنٹہ بھر کے بعد شل ہوکر راستہ سے
کٹ گیا۔ اور ذیابیطس کے اس مریض کو، جسے صاحب فراش رہے ہوئے بھی ابھی
چند روز گزرے تھے، گھنٹون اسی طرح مسلسل گشت کرتے رہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا!

خاصی رات گئے جب وہ واپس آئے ہین، تو قصبہ کے سربرآوردہ ہندو بھی
ساتھ ساتھ۔ اور ان ہی مین روزنامۂ تیج (دہلی) کے ڈائرکٹر شریمت ویش بندھو
گپتا بھی[1]، اور فلان اور فلان۔ یہ اب اگر مولانا کو چھوڑنا چاہتے بھی تو مولانا انھین
نہیں چھوڑ رہے ہین۔ جرح ایک ایک سے کررہے ہین۔ یہان بھوک سے آنتین
قل ھو اللہ پڑھ رہی ہین۔ اُدھر میزبان صاحب ہین کہ دعوت وضیافت کے انتظامات
ہی سے چھٹی نہین پاچکتے! ½۱۰ پر خدا خدا کرکے کھانا نصیب ہوا ——
آپ کہتے ہوں گے کہ خیر ۱۱ بجے رات کو تو محمد علی غریب کو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے
بعد لیٹنے کو ملا ہوگا۔ جی یہ کہاں! لیٹ کر تو میں سویا۔ محمد علی اس وقت، جی ہاں
اتنے ناوقت، کسی حاکم سے (شاید ڈپٹی مجسٹریٹ تھے) ملنے اور اسی معاملہ پر بحث وگفتگو
کرنے پیدل روانہ ہوئے! کوئی ½۱ بجے کا وقت ہوگا، جب مجھے نیند میں کچھ آہٹ سی

[1] ان کی وفات عین ان سطور کی نظر ثانی کے وقت کلکتہ میں ایک ہوائی حادثہ میں ہوئی (نومبر ۱۹۵۱ء)

محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا اب واپس تشریف لائے ہیں! ½ ۲ بجے گاڑی دہلی کے لیے ملتی تھی اس کے لیے اسٹیشن روانہ ہو گئے اور مجھے سوتا چھوڑ گئے کہ رات ایسے ناوقت اٹھنے میں تکلیف ہوگی! سبحان اللہ۔

"پانی پت کی جنگ چہارم" کے عنوان سے کامریڈ میں جو مسلسل و دلچسپ مضمون کئی نمبروں میں نکلا، وہ اسی سفر کا ماحصل تھا۔ ادنیٰ لیڈروں اور پیشہ ور اخبار نویسوں کو چھوڑیے، بیرسٹر ہو کر جواہر لال نہرو اور مہاتما جی تک کوادنیٰ "جنڈی" اور مقامی معاملات میں اتنی محنتِ شاقہ برداشت کرتے، اتنا تعب اٹھاتے، اور اپنی صحت کی طرف سے یوں بے تکان بے پروائی برتتے کسی نے دیکھا ہے؟

مستقل ولایتی اخبارات تو دفتر کامریڈ میں صرف چند ہی آتے۔ "ڈیلی ہیرلڈ" آبزرور اینڈ پینڈنٹ وغیرہ، لیکن مسلم ملکوں اور مسلم مسئلوں سے متعلق تراشوں کا انبار مختلف رسالوں اور اخبارات سے ہر ہفتہ اتنا آجاتا کہ اسے تقسیم کیا جاتا، تو کئی کئی اخباروں کے لیے کافی ہو جاتا۔ یہ تراشے انتخاب کے بعد کامریڈ میں بالالتزام شائع ہوتے رہتے۔ ایک مفصل "مکتوب ترکی" قسطنطنیہ سے، اور ایک "مکتوب لندن" لندن سے بھی ہر ہفتہ ہونے لگا۔ پھر جہاد ریف، مسائلِ مصر اور سیاسیاتِ سوڈان، موصل عراق، شام، مراقش اور بغاوت کردستان وغیرہ سے متعلق پُرمغز و شگفتہ اور مفصل و مدلل اڈیٹوریل مقالات، ہر ہفتہ کا کامریڈ گویا عالمِ اسلامی اور اسلامیات کی ایک ننھی منی سی انسائیکلوپیڈیا ہوتا! مرتد کی سزائے قتل کے ضمن میں ایک بحث مقامِ حدیث کی آگئی۔[1] یعنی شریعت میں

[1] اس کا ذکر ابھی چند صفحے اوپر گزر چکا ہے۔

احادیث کا کیا درجہ ہے۔ اس پر کامریڈ نے اتنی شستہ ومدلل بحث کی کہ پڑھ کر بے اختیار دل سے داد نکلی۔ اور اسی بے اختیاری کے عالم میں یہ خط شوق لکھ بھیجا کہ "جی میں آتا ہے، دہلی فوراً پہنچوں اور جن انگلیوں سے اتنا نفیس مقالہ نکلا ہے، انھیں آنکھوں اور ہونٹوں سے لگا دوں"۔ سفر دہلی کے لیے ہمیشہ اسی طرح کے بہانے ملتے ہی رہتے تھے —— لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، بپن چندر پال، یہ اس وقت کانگریس کے چوٹی کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ کامریڈ نے ان میں سے ایک ایک کی اس طرح خبر لی کہ کچھ ان غریبوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔ گاندھی جی کے خلاف بغاوت اس وقت تک ان کے کیمپ میں اچھی خاصی پھیل چکی تھی، اونچے ہندو لیڈروں میں سے سیاسی مرتد اکثر ہو چکے تھے، کوئی دل او زبان دونوں سے اور کوئی محض دل سے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ادھر کسی نے گاندھی جی پر حملہ کیا، ادھر کامریڈ پوری بے جگری سے لڑنے اور جواب دینے کو آ ڈٹا۔ ہندو کہتے تھے کہ مہاتما جی علی برادران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے ہیں۔ یہ تو خیر، البتہ یہ ضرور صحیح تھا کہ محمد علی نے اپنے کو مسلمانوں میں بدنام کر کے اپنے کو جس طرح مہاتما گاندھی جی کی ذات میں فنا رکھا، اس کی نظیر آسان نہیں —— اور تماشہ یہ کہ اصول دین اور عقائد مذہبی تو خیر بڑی چیز ہیں، اصولِ اخلاق اور فلسفۂ عمل کی حد تک بھی محمد علی کبھی گاندھی جی کے معتقد نہ ہوئے۔ گاندھی جی کے محض خلوصِ نیت پر یقین اور انکی سیاسی اصابتِ رائے پر اعتماد یہ سب کچھ ان سے کراتا رہا۔

باب (۳۱)

۲۶-۱۹۲۴ء
(۱)

(کامریڈ۔ کامریڈ کا خاتمہ۔ تلاوتِ قرآن)

سیاسی مضامین جو کامریڈ میں حکومت ہند کے خلاف نکلتے رہتے، سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے۔ اپنے مذاق کو سب سے زیادہ پسند وہ مقالہ آیا جو ۲۵ء کے آخری پرچہ (۱۸ دسمبر) میں An Undelivered letter ("ایک مکتوب جو مکتوب الیہ کو نہ ملا") کے عنوان سے دس صفحے کا لمبا میں نکلا ہے، یہ ایک انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسر کی طرف سے خط ہندوستان سے ولایت میں اپنے کسی دوست کے نام ہے۔ اور اس کے اندر بے تکلفانہ انداز بیان میں وہ ساری چالیں اور گھاتیں کھول کر بیان کر دی ہیں، جن سے کام لیکر تحریک ترک موالات و خلافت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ مکتوب بڑا ہی دلچسپ ہے، اور ٹھیک اسی لب و لہجہ میں جو ایک انگریز سویلین کا دوسرے سویلین کے نام کے خط میں ہوتا ہے۔ دسمبر کی آخری تاریخوں میں جب کانپور میں کانگرس اور خلافت دونوں کے سالانہ جلسے ہو رہے تھے، تو میں نے بڑھکر بڑی گرمجوشی سے داد دی۔ مولانا اس وقت تک کامریڈ سے بالکل بددل ہو چکے تھے (اور بددلی کا بڑا سبب یہ تھا کہ سال سوا سال کی تلاش و کوشش کے باوجود بھی کوئی نائب یا

مددگار نہیں مل سکا تھا اور بند کر دینے پڑتے ہوئے تھے۔ میرے بار بار کے اصرار اور عرض معروض کرنے پر اس کا دوسرا نمبر نکالنے پر آمادہ ہوگئے۔ اور پرچہ ۲۲ جنوری سنہ ۲۶ء کی تاریخ کا نکال کر جب بند کیا ہے تو اس نمبر میں مکتوب کا یہی دوسرا نمبر درج تھا اور ضخامت کا حال سنیے۔ مکتوب کا یہ دوسرا نمبر ضخامت میں پہلے سے بھی تقریباً دگنا تھا۔ یعنی وہ اگر دس کالم کا تھا، تو یہ انیس کالم کا! —— اسی آخری نمبر میں جو پہلا اداریتی مقالہ، کالموں کا ہے، وہ کسی سیاسی یا نیم سیاسی موضوع پر نہیں، بلکہ مولانا منور الدین دہلوی کی فقہی کتاب الحج والزیارۃ پر تبصرہ ہے جس کے ضمن میں تبصرہ خود فقہ اسلامی پر ہوگیا ہے! انگریزی کے سیاسی پرچہ میں' اس بیسویں صدی میں، اس نوعیت اور پھر اس ضخامت کا "مولویانہ" مقالہ لکھ ڈالنا محمد علی ہی کا حصہ تھا

کامریڈ کی مالی حالت، اس دور ثانی میں، اچھی کبھی بھی نہ رہی۔ بس پرچہ لستم پشتم کسی طرح چلے گیا۔ ایک مہینہ میں اگر بڑا زور لگاتے سے سو خریدار کہیں بڑھے، تو دوسرے مہینہ سوا سو خریدار گھٹ بھی گئے۔ قوم کو اپنے اس پرچہ سے شکایتیں بھی عجب عجب پیدا ہوتی رہتیں۔ کوئی علم دوست بزرگ یہ کہتے کہ اب کامریڈ میں شیکسپیر کے ڈراموں پر ویسے تبصرے نہیں نکلتے جیسے سنہ ۱۱ء میں کلکتہ والے کامریڈ میں نکلتے رہتے تھے۔ کوئی شوقین صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اب اس رنگ کے "گپ" کے کالموں میں وہ زندہ دلی نہیں ہوتی جو اس کے دور اول میں ہوا کرتی تھی۔ یہ تو خیر سب خوش خیالیاں تھیں، اصلی شکایت اور واقعی تکلیف وہ بات خریداروں کے لیے یہ تھی کہ وقت کی پابندی پرچہ سے نہ نبھ سکی۔ شروع میں چند ہفتہ تو معاملہ غنیمت رہا۔ پھر ناغہ ہوکر

دو دو نمبر ساتھ نکلنے لگے۔ اور آخر میں تو نوبت یہ آگئی کہ چار چار، پانچ پانچ ہفتہ کا وقفہ ہونے لگا جس کے بعد ۳-۳-۴-۴ پرچے اکٹھے نکلتے! پرچہ معنوی حیثیت سے، بہتر سے بہتر سہی، پھر بھی اتنی بے ترتیبی کے بعد کب تک زندہ رہ سکتا تھا! ——— ایسے خریدار جو اصل مضامین کی پرکھ رکھتے ہوں، اور دل سے داد دے سکیں، تعداد میں واجبی ہی سے ہوتے ہیں، بڑا گروہ تو بس یہی دیکھتا رہتا ہے کہ پرچہ کسی طرح اپنے وقت پر ہاتھ میں آجائے۔

کامریڈ کے قدر دان اسے بھی گوارا کر لیتے، اور پرچہ جب بے قاعدگی اور جتنے ناغوں کے ساتھ بھی نکلتا، بہر حال نکلے تو جاتا۔ مشیت سے اجازت اس کی بھی نہ ملی۔ بند کر دینے کا ارادہ محمد علی نے تنگ آکر بار بار کیا۔ ہر دفعہ بات کسی نہ کسی طرح ٹلتی گئی، زیادہ تر مولانا شوکت علی کے دم دلاسوں سے۔ کبھی کہتے۔ میں ابھی شعیب کو سب ایڈیٹری پر بلائے دیتا ہوں۔ کبھی کہتے، اتنے خریدار بمبئی سے بھیج رہا ہوں۔ پرچہ کے لیے وقت کی پابندی پر وہ بھی بہت زور دیتے۔ لیکن عملاً اس کا انتظام کسی سے بھی نہ بن پڑتا۔ ایک سر و ہزار سودا" محمد علی اس کا مجسمہ ہو رہے تھے۔ مصروفیت کا کونسا جز و ایسا تھا کہ جسے چھوڑتے، یا جو انھیں چھوڑتا! کچھ دخل اس میں طبعی بدنظمی اور عدم ضبط کو تھا۔ ۲۵ءٔ جون تو یوں ختم ہوا۔ فروری ۲۶ءٔ میں محمد علی سخت علیل ہوئے۔ ذیابیطس تو تھا ہی۔ اب جسم میں پھوڑے جا بجا نکل آئے۔ اور بالکل صاحب فراش ہو کر پڑ گئے۔ میں نے دہلی جا کر دیکھا تو چلنا پھرنا الگ رہا، اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ کامریڈ چار ہفتوں سے قرض چلا آ رہا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر ۲۲ جنوری کی تاریخ ڈال کر تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا۔ اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح

ممکن ؛ ہوا۔ پریس والوں مشین مینوں، کمپازیٹروں، وغیرہ کے مطالبات، مدت کے چڑھے ہوئے تھے، ان ہی کا چکانا اور بیباق کرنا دشوار ہورہا تھا، نئے مصارف کی گنجائیش کہاں سے نکلتی ! ——— اس طرح کوئی ۵ مہینہ کی آب وتاب کے بعد یہ آفتابِ صحافت غروب ہوگیا، اولب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر وتشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی ؎

کھلا دیوان مرا تو شورِ تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہوگئے خاموش جب مطلع پہ دل آیا

محمد علی کا اصلی جوہر تحریر، وہ ڈاک نہیں، انگریزی انشاء کا میدان تھا۔ ساتھ ہی قوتِ استدلال غضب کی۔ بیان کی دلآویزی، زبان کی شگفتگی، دلائل کی قوت، بحث کے اطراف و جوانب کی جامعیت، سب مل ملاکر عجب سماں پیدا کر دیتے ——— کامریڈ جس دن بند ہوا ہے، حکام والا مقام کے علاوہ خود ہم چشم لیڈروں میں سے بھی نہ جانے کتنوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دور ہوگیا۔ وہ ترازو گم ہوگیا جو بڑے اور چھوٹے کے درمیان صرف انصاف کرنا جانتا تھا۔ کامریڈ نامی ایک اخبار بند نہیں ہوا، مظلوموں کا ایک فریاد رس، اور مسلمانوں کا ایک بڑا ترجمان دنیا سے اٹھ گیا !

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا	تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے،
اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ	جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے
الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ	، اور جو رسول کے جلاوطن کرنے پر کمربستہ بیٹھے،

اَوَّلَ مَرَّۃٍ اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ	اور انھوں نے خود ہی پہلے تم سے چھیڑ کی۔
اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ	کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ اللہ ہی
مُّؤْمِنِیْنَ (توبہ - ۲)	زیادہ حقدار ہے کہ تم اسی سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

دسمبر ۲۳ء؁ تھا۔ دہلی میں ایک روز صبح کچھ دن چڑھے مولانا کے کمرہ یک بیک چلا گیا۔ دیکھا کلام مجید کی تلاوت بلند کر رہے ہیں۔ زیادہ زور سے نہیں۔ مگر اتنی آواز سے کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ سن سکیں۔ کمرہ میں تنہائی تھی۔ وہ مسہری پر بیٹھے ہوئے قبلہ رخ انہماک کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ میں چپکے سے جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ایک مترجم حمائل ہاتھ میں تھی؛ اور سورۂ توبہ اس وقت زیر تلاوت تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ آیت آئی جو ابھی درج ہوئی۔ خشوع وخضوع کی کیفیت پہلے ہی سے نمایاں تھی۔ اس آیت پر پہنچکر جوش سے جھومنے لگے۔ آواز بلند سے بلند تر ہوگئی۔ آخری ٹکڑے، اَتَخْشَوْنَھُمْ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کو بھرائی ہوئی آواز سے بار بار پڑھنا شروع کر دیا۔ تکرار کرتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ زبان سے تو صرف الفاظ قرآنی کی تلاوت ہو رہی تھی، لیکن زبانِ حال سے صاف ایک مستقل اور بلیغ تفسیر ہو رہی تھی، کہ ہم بھی کوئی مسلمان ہیں، جو حکومت سے ڈر رہے ہیں، پولیس سے ڈر رہے ہیں، پریس سے ڈر رہے ہیں، قید و بند سے ڈر رہے ہیں، اس سے ڈر رہے ہیں، اُس سے ڈر رہے ہیں۔ مسلمان کے لیے مخلوق بھی کوئی چیز ڈرنے اور خوف کھانے کی ہے؟ مسلمان کو ڈرنا تو صرف ایک اور اکیلے خالق ذو الجلال سے چاہیے نہ کہ اس کی مخلوق سے، اور مخلوق بھی کون؟ اس کی باغی، اسکی نافرمان، اس کی اطاعت واطاعت سے خارج! ——— یہ منظر اپنی نوعیت میں میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔ یوں تو محمد علی، ہر سچے مومن کی طرح، سارے ہی قرآن کے

عاشق تھے۔ لیکن جن آیات میں بیان توحید الٰہی کا ہوتا ہے یا جن میں تاکید جہاد ہوتی، انھیں پڑھ کر یا سن کر تو وہ بیتاب ہی ہو جاتے تھے۔ تامل کے بجائے حال طاری ہو جاتا، آنسو دھڑا دھڑ بہنے لگتے، وَاِذَا سَمِعُوْا تَفِيْضُ اَعْيُنُهُمْ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھ پیر بھی پٹختے، اور جوش و کیف سے جیسے بیخود ہو جاتے۔

ساتھ رہ کر نماز پڑھتے بھی بارہا دیکھا۔ وقت کی بے انضباطی جو زندگی کے سارے شعبوں میں چھائی ہوئی تھی، اس کے رنگ سے یہ شعبہ بھی خالی نہ تھا۔ نمازیں بارہا وقت سے بے وقت ہو جاتیں کبھی کسی عذر سے کبھی کسی عذر سے لیکن ناغہ کبھی بھی نہ ہونے پاتا۔ فجر کی نماز میں دیر ہو جانے کا ایک مستقل عذر شرعی بھی موجود تھا۔ مرض کے باعث رات میں پیشاب کے لیے بار بار اٹھنا پڑتا۔ ایک تو یوں ہی رات کو دیر میں سوتے، پھر درمیان میں یہ بار بار اٹھنا۔ قدرۃً صبح آنکھ کسی قدر دیر میں کھلتی۔ مولانا شوکت علی کو دیکھا کہ الٹی سیدھی جیسی بھی پڑھیں، نماز وقت ہی پر پڑھ لیتے۔ فجر کو آنکھ کبھی ان کی بھی دیر میں کھلتی (ذیابیطس کے مریض وہ بھی تھے) تو جھٹ پٹ وضو کر نماز پڑھ ڈالتے۔ محمد علی کے ہاں یہ نہ تھا۔ استنجا، طہارت، وضو وغیرہ سب بڑے اطمینان سے کرتے۔ اکثر تو غسل بھی کرتے، اور بعد غسل سر کے بڑے بالوں اور داڑھی میں کنگھی بھی اسی طرح اطمینان سے۔ جب کہیں جا کر نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ سورج اس درمیان میں بلند ہو چکا ہوتا، نیت یقیناً قضا کی باندھتے۔ لیکن پڑھتے اس خشوع و خضوع اور اس اطمینان کے ساتھ کہ ان کی ایک قضا "نماز پر ہم ایسوں کی 'ادا' نمازیں قربان کر دینے کے قابل تھیں۔ عارف رومیؒ کے الفاظ میں ؎

گر نمازت فوت می شد آں زماں　　می زدی از درد دل آہ و فغان
آں تاسف و آں فغان و آں نیاز　　در گزشتی از دو صد رکعت نماز

باب (۳۴)

۲۶-۱۹۲۴ء (۲)

(ہمدرد۔ ہمدرد کا اسٹاف)

یہ تھا ۲۴ء میں انگریزی کے ہفتہ وار کامریڈ کا اڈیٹر، اردو کے روزنامہ ہمدرد کا چیف اڈیٹر، اور ملک کے سب سے بڑے اور پُرقوت اور فعال سیاسی ادارہ، انڈین نیشنل کانگریس کا صدر! بھلا اس صدی کے اڈیٹروں، اور ان سے بھی بڑھکر لیڈروں کو نماز اور قرآن خوانی سے، اور وہ بھی اس شغف و انہماک کے ساتھ کیا واسطہ؟ اور ستم یہ کہ یہ قرآنیت اور اسلامیت لازمی نہیں، متعدی ہو کر رہی۔ اڈیٹر کی ذات تک محدود نہ رہی، کامریڈ اور ہمدرد دونوں کے صفحات میں، آئین صحافت کے خلاف "جرنلزم" کے دستور کے برعکس، برابر جلوہ گر ہوتی رہی۔ جو سرپھرا، کامریڈ میں قتل مرتد جیسے خالص مذہبی مسئلہ پر، بالکل منقولی حیثیت سے، تین تین نمبر اور تیس تیس کالم لکھ ڈالے، اور اردو کی ایک فقہی کتاب کے تبصرہ کے لیے اڈیٹوریل کے سات سات کالم وقف کردے، اسے کیا حق تھا کہ باوجود اپنی مشہور و مسلّم انگریزی انشا پردازی کے، باوجود اپنی شہرۂ آفاق سیاست دانی کے، بیسویں صدی میں انگریزی جرنلزم پر قبضہ جمائے رکھے؟ —— دھارے کے خلاف، پیراک کی قسمت میں بار کر

اور تھک کر آخر ڈوبنا ہی تھا۔ کامریڈ نے سوا سال کی زندگی کے بعد آخری سانس لی۔

ہمدرد پر یہ قیامت آئی کہ اس میں بالالتزام روزانہ قرآنی "حکمت وموعظت" کے درس دیے جانے لگے۔ دسمبر ۲۴ء میں جب میرا دہلی پہنچنا ہوا، تو بڑے گلے شکووں کے ساتھ ارشاد ہوا کہ "تم نے آنے میں اتنی دیر کی۔ تمھارے انتظار میں ہمدرد کا ایک مستقل عنوان اب تک رکا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز بلا ناغہ ہمدرد میں اڈیٹوریل صفحہ کے شروع میں کوئی آیت قرآنی مع اردو تشریح کے درج ہوتی رہے کہ جب مسلمان کے ہاتھ میں ہمدرد جائے، وہ کم از کم ایک آیت تو مع تشریح کے تلاوت کر لیا کرے، اور غیر مسلموں کے سامنے بھی قرآن اس صورت میں مسلسل پہنچتا رہے۔ عنوان "حکمت وموعظت" رہے گا۔ کل سے اس کالم کو اپنے ہاتھ میں لو۔"

تعمیلِ ارشاد میں فخر و مسرت محسوس ہوئی۔ ۱۰ دسمبر سے ہمدرد میں یہ عنوان مستقل ہو گیا۔ اور جب تک ہمدرد مارچ ۲۹ء میں بند نہ ہو گیا، برابر اس کے پرچہ میں کوئی نہ کوئی آیت مع تشریح نکلتی رہی۔ شروع شروع میں یہ خدمت اسی نیازمند کے سپرد رہی۔ دہلی سے جب واپس آنے لگا، تو آیتوں کا ایک ذخیرہ لکھکر وہاں چھوڑ سے آیا تھا۔ پھر دریاباد سے بھی لکھکر بھیجتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسٹاف کے لوگ بھی اس کام میں منجھ گئے۔ اور خود ہی یہ خدمت انجام دینے لگے۔ اردو میں اسوقت تک روزنامے بڑے بڑے ہی لوگ نکال چکے تھے، بلکہ علماء کے بھی بعض مخصوص روزنامے نکل چکے تھے، لیکن اس "بدعتِ حسنہ" کی ایجاد کا سہرا ایک علی گڈھ کے "نیچری" اور آکسفورڈ کے گریجویٹ ہی کے سر رہا۔ اور بعد کو پہلے دکن کے ایک روزنامہ اور پھر بمبئی اور لکھنو

اور دہلی کے بعض روزناموں نے جس طرز کو اڑایا، اس کا نقش اول سید ردہی کا قائم کیا ہوا
یہ محض نمونہ دکھا رہا ہوں محمد علی کے غلبۂ مذہبیت کا۔ اور تو اور، خود اسٹاف کے
"روشن خیال" ممبر اس "مذہبی دیوانگی" سے چیخ پکار اٹھے۔ سارے روزنامے، ڈاک خانہ
کی تعطیل کے باعث، خود بھی اتوار کو چھٹی مناتے تھے۔ یہاں حکم یہ نافذ تھا کہ تعطیل سرکاری
یوم تعطیل کے مطابق اتوار کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے یوم تعطیل جمعہ کو منائی جاتی رہے! اس سے
کاروباری نقصانات اٹھانے پڑے۔ منیجر صاحب نے غل مچایا، ایڈیٹوریل اسٹاف نے
(اخباری اصطلاح میں) "صدائے احتجاج" بلند کی، مادی نقصانات کا احساس
خود مولانا کو ہوا، یہ سب کچھ سہی، لیکن حکم اٹل رہا!

دہلی ایک تو جغرافی حیثیت سے بھی مرکزی مقام۔ یہ نہیں کہ کلکتہ یا بمبئی کی طرح
ایک گوشہ میں ہو، پھر حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، اور سب سے بڑھکر خود مولانا کی زبردست
اور مرکزی شخصیتیں یہیں موجود۔ یہی وجہ تھی کہ خلافت کمیٹی کا صدر دفتر اگرچہ بمبئی میں تھا،
لیکن مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے بمبئی سے کہیں زیادہ دہلی ہی میں ہوا کرتے۔ ہمدرد
اور مولانا کی مستقل کشش تو تھی ہی، پھر ان جلسوں میں شرکت کی طلبی، غرض اب ہر دوسرے
تیسرے مہینہ میرے پھیرے دہلی کے ہونے لگے۔ کبھی دو ہی ایک دن بعد لوٹ آتا، اور
کبھی متصل کئی کئی دن ٹھہر جاتا۔ مولانا کو قریب سے دیکھنے کے موقعے خوب خوب ملتے
رہے ——— خالص سونے کا ایک ڈلا تھا، جتنا اسے پرکھا، تپایا، زیادہ اور نکھرتا ہی گیا
محمد علی کا مکان گویا سارے ہندوستان کا مرکز اعصاب تھا۔ ہر ہر گوشہ سے
ایک ایک خبر وہاں پہنچتی، تار پر تار آتے رہتے، ٹیلیفون کی گھنٹی پہ گھنٹی بجتی رہتی۔

اور آنے جانے والوں کا تانتا جو صبح سے شروع ہو جاتا تو بڑی رات گئے بھی مشکل ہی سے ختم ہو پاتا۔ یہ ڈاکٹر انصاری آرہے ہیں، وہ دہلی کے ہندو لیڈر لالہ شنکر لال چلے آرہے ہیں۔ آج لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی تشریف لا رہے ہیں، کل حیدر آباد سے ہمایون مرزا بیرسٹر وارد ہو رہے ہیں۔ ابھی فلاں ہندو لیڈر الہ آباد سے آئے ہیں، ابھی فلاں مسلمان لیڈر بمبئی سے۔ اخباری نمایندوں، نامہ نگاروں، اڈیٹروں کا تو شمار ہی نہیں۔ سیاسیات ہند کے کون سے مسئلے ایسے تھے، جن پر یہاں دن رات بحث نہ ہوا کرتی۔ کانگرس کی ممبری کے لیے اس وقت ایک لازمی شرط چرخہ کاتنے کی تھی۔ محمد علی صدر کانگرس دفتر میں بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں کہ مشہور سوامی شردھانند آگئے، اب اسی حال میں ان پر تبلیغ اسلام ہو رہی ہے، اور انگلیوں کے ساتھ ساتھ برابر زبان بھی جنبش میں ہے۔ سیاسی تربیت اور واقفیت محمد علی کے ساتھ رہ کر چند روز میں جتنی حاصل ہو جاتی تھی، وہ بجائے خود ایک نعمت تھی اور واقفیت صرف سیاسیات ہندی سے متعلق نہیں، بلکہ سیاسیات عالم سے بھی، خصوصاً سیاسیات عالم اسلامی سے۔

ہمدرد جب نکلنا شروع ہوا ہے، سچ کا اس وقت تک وجود نہ تھا۔ اور جب اس کے ڈھائی تین مہینہ بعد سچ نکلا ہے، جب بھی کئی شریک عمل اور رفیق کار موجود تھے مجھے وقت کم ہی دینا پڑتا تھا۔ اور ہمدرد کی خدمت کے لیے میں بڑی حد تک خالی تھا۔ لکھنؤ، علیگڈھ، وغیرہ کے لیے وقائع نگار میں نے ہی ٹھہرائے تھے۔ بہت سے لکھنے والوں سے مراسلت کر کر کے مضامین حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ خود بھی شروع شروع کثرت سے مضامین لکھ کر دیے۔ زیادہ تر فرضی ناموں سے۔ کبھی کبھی اڈیٹوریل بھی لکھے۔ ان میں مقالات اکثر

اور نوٹ کمتر۔ اور ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ مضمون خود مولانا کے نام سے شائع ہوا لیکن وہ لکھا ہوا اول سے آخر تک ان کے اسی نیازمند کا تھا۔ لکھنؤ کے پنڈت کشن پرشاد کول کشمیری، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر لبرل پارٹی کے رکن رکین، سیاسیات و ذہنیات دونوں میں ہمدرد سے بعد المشرقین رکھتے تھے۔ لیکن بہرحال تھے ایک سنجیدہ لکھنے والے میری فرمائش پر ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں ہمدرد میں ہندو مسلم اتحاد پر لکھا۔ اس پر مفصل ایڈیٹوریل تبصرہ نگاری میرے ہی حصہ میں آئی۔ اسٹاف میں اول اول سب سے پیشتر فاروق صاحب تھے، انھیں مولانا کی دوشناسیوں میں ملکہ حاصل تھا۔ یہ چلے گئے، تو افسری عارف ہسوی صاحب کے حصہ میں آئی۔ یہ بھی مولانا کے مزاج شناس تھے، اور مئی ۱۹۲۶ء تک، جب تک ان کا تعلق ہمدرد سے رہا، انھوں نے کام کو باوجود اپنے بعض سیاسی اور مذہبی اختلافات کے، بہ حیثیت مجموعی خوب نباہا۔ لیکن ۲½ سال کی مدت میں خدا معلوم کتنے نئے نئے لوگ آکر اسٹاف میں شامل ہوتے اور پھر چلے جاتے رہے (بعد کے آنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز نام ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا ہے) سب نہ اس درجہ کے محتاط تھے نہ اس درجہ کے مخلص۔ بلکہ بعض صاحبوں نے تو زبانی اور تحریری بڑے بڑے دعوے مولانا سے محبت و عقیدت کے کیے۔ لیکن تجربہ سے چند ہی روز بعد معلوم ہوگیا کہ ساری محبت و عقیدت، مولانا کی ذات یا ان کے مسلک اور اصول سے نہیں، بلکہ مولانا کے روپیہ سے تھی!

جامعہ کے متعدد ہونہار نوجوان آ آکر شریک ہوئے، اور تجربہ و تربیت حاصل کر کے الگ الگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ جعفری صاحب (جو ہمدرد میں شروع سے آخر تک رہے، اور اس وصف میں کوئی ان کا شریک نہیں) کے جوہر بعد کو کھلے۔

شروع شروع تو انکی حیثیت محض ایک نو عمر کار آموز کی تھی۔ ایک بڑا کام اسٹاف والون کی نگرانی تھی یعنی اس امر کی دیکھ بھال کر کوئی بات ہمدرد کے معیار سے فروتر یا مولانا کے مسلک کے خلاف پرچہ مین نہ نکل جائے۔ مولانا نے بارہا کیا کہ اسٹاف کے کسی سمجھدار ممبر کو بلا کر اپنا مافی الضمیر تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا، بلکہ کامریڈ مین اپنا لکھا ہوا مقالہ بھی انھین پڑھوا دیا، پھر بھی ان صاحب نے جب ہمدرد مین مضمون لکھا، تو مولانا کو عموماً شکایت ہی رہی، بلکہ کبھی کبھی تو وہ مضمون چھپنے ہی کے قابل نہین قرار پایا۔ مولانا کا نام پرچہ پر ہمیشہ بحیثیت ایڈیٹر کے لکھا ہوا رہا لیکن بجز ان چند مضامین کے جو انکے نام کے ساتھ شائع ہوئے ہم۔ ۱½ سال کی طویل مدت مین نہ کبھی وہ ہمدرد کیلئے مضمون لکھ سکے اور نہ کبھی اسکا کوئی پرچہ ایڈٹ ہی کر سکے۔ صرف ہدایات دیدیتے تھے، کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔ اور اسی کام ہی کی نگرانی بڑی حد تک اس خادم سے متعلق تھی ——— جہانتک دہلی کے کام کی نگرانی دریاباد سے ممکن تھی

شروع ہی کا زمانہ تھا۔ اردو کے مشہور لکھنے والے سید سجاد حیدر "یلدرم" بی۔ اے۔ جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے رجسٹرار تھے، ترکی کی تازہ سیاحت سے واپس آئے تھے، اور علی گڈھ مین طلبہ کے جلسہ مین اپنے مشاہدات سفر بیان کیے۔ دہلی کے ہندوستان ٹائمس نے (جسکی مسلم دشمنی اس وقت تک اتنی کھلی نہ تھی) تقریر کو اپنی خاص سرخیون اور رنگ آمیزیون کیساتھ شائع کیا۔ اس پر ہمدرد کے اسٹاف کے ایک ممبر کو بے محل جوش آگیا اور ۱½ کالم کا ایڈیٹوریل سید صاحب کے جواب مین چھاپ دیا جس مین بار بار ان کے "وابستہ دولت برطانیہ" ہونے پر چوٹ تھی۔ سید صاحب سے یہی نہیں کہ مولانا سے تعلقات بہت قدیم اور مخلصانہ تھے، بلکہ مین تو ان سے ہمدرد کے لیے مضمون بھی طلب کر چکا تھا۔ اور پھر انکی اصل تقریر مین کوئی بات ایسی قابل گرفت تھی بھی نہین۔ ہمدرد کا مضمون پڑھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی۔ مولانا کو بھی مضمون ناپسند ہوا۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مین نے نیچ کا معذرت نامہ سید صاحب کو لکھا۔

باب (۴۳)

۱۹۲۴-۲۶ (۳)

(مطائبات ہمدرد۔ محاربات ہمدرد)

شروع ۲۶ء تھا۔ ہمدرد میں گاندھی جی کے خود نوشت تجربات زندگی کا مسلسل ترجمہ ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا سے نکل رہا تھا۔ گاندھی جی نے ایک جگہ اس میں ذکر بچپن میں اپنے چھپ کر گوشت کھانے اور پھر اس کے ترک کے عہد کر لینے کا کیا ہے۔ ہمدرد کا نوعمر جامعی مترجم جب اس مقام پر پہنچا تو توسین کے اندر یہ عبارت بڑھا دی کہ "غالباً اچھا پکا ہوا نہ تھا، ورنہ اس آسانی سے نہ چھوٹتا"۔ مترجم کی نیت ظاہر ہے کہ کسی دلشکنی یا دلآزاری کی نہ تھی، محض ایک خوش طبعی مقصود تھی۔ لیکن چیز تھی فی نفسہ بے موقع، کہ یہ ایک چوٹ گاندھی جی کے عقیدۂ ترکِ حیوانات پر تھی۔ اور جس فضا میں ہر چھوٹی سی چیز ہندو مسلم فساد کا باعث بن رہی تھی، یہ بے ضرر سا مزاح بھی بہت کچھ باعث ضرر بن سکتا تھا۔ ہم لوگ بات کو بالکل معمولی سمجھے۔ تیسرے دن خود مولانا کی نگاہ پرچہ پر پڑ گئی (روز کا روز انھیں اپنا بھی اخبار پڑھنے کو کہاں مل پاتا تھا!) اور مترجم صاحب کی مغالطی ہوئی۔ اور مولانا نے غریب کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچارہ کے آنسو نکل آئے۔ مضمون ۲ فروری کے پرچہ میں نکلا تھا۔ ۴ فروری کے پرچہ

مین ایڈیٹوریل مین مفصل معذرت نکلی ــــ یہ ایک نمونہ تھا ہمدرد کے معیار صحافت کا۔ بھلا اس کو ملک کی عام اخباری فضا سے کیا مناسبت تھی۔ یہاں تو تفنن و خوش طبعی کے معنی ہی دوسرون پر چوٹ کرنے اور کسی کے نسب پر یا وطن پر یا مذہب پر طنز و تعریض کرنے کے تھے۔ اور ظریفانہ کالم تو رکھے ہی اس غرض سے جاتے تھے کہ اس حمام مین قدم رکھتے ہی پوری برہنگی کا مظاہرہ جائز ہو جائے!

ہمدرد غریب مین نہ کبھی "سنسنی خیز" سرخیان دی گئین، نہ ایسی خبرین شائع ہونے پائین جو نوجوانون کے جذبات کے لیے ہیجان انگیز ہوتین۔ مالک ہمدرد کا حکم اور قطعی حکم تھا کہ بس معلومات ہی زیادہ سے زیادہ تعداد مین اور زیادہ سے زیادہ شستہ و شریفانہ انداز مین ناظرین تک پہنچائے جائین۔ اور ایڈیٹوریل اسٹاف اپنی بساط بھر اس حکم کی تعمیل کرتا۔ اخبار یہان تجارت اور دکانداری کی کوئی قسم نہ تھی، تبلیغ و تلقین کی ایک شاخ تھی۔

پنجاب کے دو مشہور معاصرون زمیندار اور تنظیم مین ان کے مالکون کے نام کا "حضرت ظفر الملت والدین" اور "سیف الملت والدین" لکھے جانے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ ہمدرد نے اس وزن و قافیہ مین ایک بار بھی اپنے ہان "محمد الملت والدین" کی ترکیب جائز نہ رکھی، اور نہ کبھی "حضرت" کا لفظ اپنے پروپرائٹر کے لیے استعمال کیا۔ اور تو اور "رئیس الاحرار" کا لقب مولانا کے لیے عام ہو چکا تھا۔ سارے دوسرے اخبارات بے تکلف لکھ رہے تھے لیکن جس اخبار نے یہ بھی کبھی مولانا کے لیے استعمال نہ کیا، وہ خود مولانا ہی کا ہمدرد تھا! ــــ تاکید رہتی تھی کہ زیادہ تعظیمی الفاظ و القاب ہرگز ان کی ذات کے لیے نہ استعمال ہون، بس زیادہ سے زیادہ لفظ "مولانا" کی اجازت تھی۔

ہمدرد کوئی خشک اور واعظانہ رنگ کا پرچہ ہرگز نہ تھا۔ ادبیت اس میں چاشنی کی حد تک نہیں، بلکہ اچھی خاصی نمایاں رہتی تھی۔ افسانے اس نے بارہا شائع کیے۔ ادبی تبصرے اس میں برابر نکلتے رہتے تھے مہذب شوخیاں اسکے اڈیٹوریل میں جھلکتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ظریفانہ کالم بھی اس نے اپنے ہاں کھولے۔ "حاجی بغلول" صاحب اس کے "تجاہل عامیانہ" کے کالموں کو وقتاً فوقتاً مشرف کرتے رہے۔ شعر و سخن کے چرچے بھی اس کے صفحات پر اکثر جاری رہے۔ بایں ہمہ مذاقِ عوام کی پیروی اس سے کبھی بھی نہ ہو سکی۔ بازاریت اور ابتذال، فحش و پھکڑ کی نقالی وہ نہ کر سکا۔ خشک وہ یقیناً نہ تھا، لیکن "چنیا" بھی وہ نہ بن سکا۔ بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی تلاش میں رہتے ہیں، اس جنس سے اس کا دامن ہمیشہ خالی ہی رہا۔ اشتہارات تک میں اس نے احتیاط برتی۔ شراب اور فحش کتابوں، فحش دواؤں کے اشتہارات تو خیر الگ رہے۔ سینما اور تھیٹر کے بھی اشتہارات اس نے کسی اجرت پر بھی نہ چھاپے ——— بات کہنے کو معمولی ہی ہے لیکن ایک روزنامہ کے بار مصارف اور ضروریات زر کا اگر اندازہ ہو، اور معاصرین اور ثقہ معاصرین کا تعامل عام پیش نظر رہے، جب شاید محمد علی کے اس مجاہدہ کی کچھ قدر ہو۔

۱۹۲۵ء کا ابھی شروع ہی تھا کہ بمبئی کا ایک لکھ پتی نوجوان مسلمان موٹر پر جاتا ہوا ایک بیسوا کے عشق کے سلسلہ میں مہاراجہ اندور کے اشارہ سے سرِ راہ قتل کر دیا گیا۔ قتل کا ہونا تھا کہ جیسے اخبارات کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ اکیلے بمبئی ہی کے نہیں دہلی تک کے بڑے بڑے معزز و موقر اخبارات، اردو ہی کے نہیں انگریزی کے بھی، ہفتوں اسی داستان سے رنگین رہے۔ تصویریں نکل رہی ہیں، کارٹون چھپ رہے ہیں،

نظموں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، خبریں رنگ آمیزی کے ساتھ تصنیف ہو رہی ہیں، افتتاحیے اور نوٹ سبھی کی بھرمار ہو رہی ہے، ملک کے طول و عرض میں اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، انگریزی اخبارات میں ایک ہمدرد ہی ایسا تھا جس کے کان پہ کہنا چاہیے کہ جوں تک نہ رینگی! ــــــــ محمد علی تجارت کی دوکان کھول کر نہیں بیٹھے تھے، اصلاح و ہدایت وعظ و تلقین کا ایک منبر تلاش کر لیا تھا۔

معاصرین سے الجھنا ہمدرد نے کبھی اپنا شیوہ نہ رکھا۔ مولانا کی تاکید تو اس باب میں تھی ہی، شروع شروع میں جو سینیر اسٹاف بہم پہنچا، وہ بھی اس بازاریت سے بیزار ہی رہا۔ فاروقی صاحب اور ان کے بعد عارف صاحب دونوں اس مذاق سے بیگانہ تھے۔ بلکہ فاروقی صاحب تو دوسرے سرے پر پہنچ گئے تھے۔ یعنی بعض اوقات بالکل بلا ضرورت بھی بعض معاصرین کی تالیف قلب میں لگے رہتے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود ایسے بیہودہ خوش ظرف معاصرین بھی، خصوصاً خاک پاک پنجاب میں موجود رہے، جو خواہ مخواہ بھی ہمدرد سے الجھتے رہتے، اور جب کبھی ہمدرد کو چھیڑتے تو مخاطب براہ راست مولانا محمد علی کی ذات ہی کو بناتے! حالانکہ یہ سب خوب جانتے تھے کہ مولانا مضامین لکھنا الگ رہا، ہمدرد کو پوری پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بھی مہلت نہیں رکھتے۔

خیر معاصرین کی نیش زنی کا معاملہ تو پھر غنیمت تھا۔ ہمدرد کو اصلی مقابلہ حکومت انگریزی سے کرنا تھا۔ ہندوستان کی آزادی، اور ہندوستان سے بھی بڑھکر ممالک اسلامیہ کی آزادی محمد علی کو عزیز تھی۔ ہمدرد اور کامریڈ دونوں کے اجراء سے ان کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامی کو اسی نقطہ پر لا کر متحد کریں۔ جزئی معاملات میں اختلافات اور

اندرونی نزاعات اس مقصد کے حق مین زہر تھے۔ اس لیے محمد علی کی انتہائی کوشش یہ رہتی کہ ہمدرد کبھی بھی اپنی قوت مسلمانون کے اندرونی باہمی اختلافات مین پڑنے اور ایک فریق بن جانے مین منتشر نہ کرے۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ بہرحال پورا ہوکر رہتا ہے، اور حالات تکوینی پرکس کا قابو چلا ہے۔ محمد علی کو، ہمدرد کی چار ساڑھے چار سال کی زندگی مین بھی، خدا معلوم کتنی بار اندرونی فتنون کی طرف زور و قوت کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ اور ہمدرد کو اس مین قدرۃً پورا حصہ لینا پڑا۔ ان مین سے مین جنگین خاص طور پر طویل اور تلخ رہین۔ پہلی جنگ، شریف سعودی جھگڑے کے سلسلہ مین، مجلس خدام الحرمین اور فرنگی محل اور سارے "مشائخ صوفیہ" کے مقابلہ مین رہی۔ دوسری جنگ، اسی سلسلہ مین، ٹھیک اسی کے برعکس، زمیندار اور مولانا ظفر علی خان اور ساری جماعت اہل حدیث کے خلاف۔ تیسری جنگ کا رخ دہلی کے مشہور عوامی نقیب خواجہ حسن نظامی[1] کے خلاف رہا۔ چوتھی جنگ ہمدرد کے بند ہونے کے بعد لڑی گئی۔ اور یہ جمعیۃ العلما اور "نیشنلسٹ" مسلمانون کے محاذ پر۔ ان جنگون کے تذکرے اس ڈائری کے آیندہ صفحات مین ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئین گے۔ ان مین سے پہلی جنگ جو ۱۹۲۵ء کی دوسری ششماہی مین چھڑی، اس کا ذکر نسبۃً سب سے زیادہ تفصیل سے آئے گا۔ اور یہ اس لیے کہ اس مین خود یہ ڈائری نویس بھی محمد علی کے ایک پرجوش لفٹننٹ کی حیثیت سے پوری طرح شریک تھا۔

یہ جنگ محمد علی کے لیے شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ بھی تھی۔ محمد علی کی عمر لڑنے

[1] خواجہ صاحب کی امتیازی حیثیتین متعدد ہین۔ مثلاً ان کا ایک صاحب طرز ادیب ہونا لیکن اس جنگ کا تعلق ان کی کسی اور حیثیت سے نہ تھا۔

مین گزری، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑائی کے شایق ہرگز نہ تھے، اور جنگ میں ابتدا کرنا
کسی طرح نہیں چاہتے تھے۔ یہ جنگ ناگوار جنگون مین ان کے لیے ناگوار ترین تھی۔ اس
مین مقابلہ دشمنون سے نہ تھا۔ دوستون کو کرنا پڑا، ایسے دوستون کو کرنا پڑا جو عزیزون سے بڑھکر عزیز تھے، اور
مرید کو اپنے مرشد کے مقابلہ مین صف آرا ہو کر آنا پڑا ——— تفصیل کے بغیر یہ باب
پڑھنے والوں کے لیے ایک معمہ رہے گا۔ اور اس خاص جنگ کی تفصیل اب موجود
اور زندہ لوگون مین اس ڈائری نویس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کر نہین سکتا۔

باب (۲۴)

سنہ ۱۹۲۵ء (۴)

(مرشد و مرید۔ شرعی جمہوریت۔ امید افزا حالات)

مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور اپنے زمانہ کے مشاہیر میں تھے۔ ایک نامور اور خاندانی عالم، ایک مشہور اور خاندانی شیخ طریقت۔ اور اب ملک بھر میں شہرت سالہا سال سے ان دونوں حیثیتوں سے بھی بڑھ کر یہ طور ایک قومی لیڈر اور سیاسی کارکن کے تھی، کانگرس میں پیش پیش، گاندھی جی کے ہر مشورہ میں شریک، تحریک خلافت کے علمبردار خصوصی، اور انجمن خدام کعبہ کے تو بانیوں میں سے تھے۔ صاحب نفوذ و اثر۔ اور صورۃً بھی بڑے وجیہہ و شکیل۔ ذاتی خوبیوں کو گنانے پر آیئے، تو بڑے مہمان نواز، بڑے فیاض، بڑے ملنسار، بڑے ذی مروت، جود و کرم کے پتلے، ہر شخص کے کام آنے والے۔ اللہ کا دیا ہوا تھا بھی بہت کچھ۔ "سخنے" اور "قدمے" کے علاوہ "درمے" بھی سب کی مدد و خدمت کے لیے تیار۔ عقائد اور رسوم وہی جو عام طور پر اس زمانہ کے مشائخ کے ہوتے ہیں۔ درگاہوں اور مزاروں پر حاضری کے پابند۔ اپنے ہاں بھی سال میں دو بار عرسوں کی محفلیں دھوم دھام سے کرنے والے۔ علی برادران کے بعض عزیز شاید قبل سے بیعت میں داخل تھے۔ خود علی برادران کے ساتھ خدام کعبہ وغیرہ ابتدائی تحریکات کے زمانہ

مین خوب خلا ملا ہو چکا تھا۔ اُدھر خیال یہ تھا کہ مولویوں اور صوفیوں کی جماعت مین
ایسا روشن خیال اور ملت پرورد دوسرا کہاں ملے گا۔ ادھر قول یہ تھا کہ نیچریوں اور انگریزی
خوانوں کی جماعت مین اس حمیتِ دینی کی مثال ملنی ناممکن۔ دونوں فریق ایک دوسرے
کے عاشق زار۔ وہ ان پر فریفتہ و گرویدہ، یہ اُن کے والہ و شیدا۔ نظربندی کا زمانہ ابھی
شروع شروع کا تھا، برادران ابھی لینسڈون ہی میں تھے، اور چھنڈواڑہ ہنوز منتقل نہیں
ہوئے تھے کہ ایک روز مولانائے فرنگی محلی یک بیک بنفس نفیس تشریف لائے۔ اپنا
ایک خواب بیان کر کے فرمایا "میرے ہاتھ پر بیعت کرلو، ورنہ معلوم نہین کہاں جا پھنسو گے"
برادران نے چپکے سے ہاتھ بڑھا دیئے، اور سلسلۂ عالیہ قادریہ رزاقیہ مین داخل ہو گئے۔
یہ ڈائری محمد علی سے متعلق ہے، ان کے مرشد سے متعلق نہین، تاہم جو کچھ آگے آرہا ہے اسکے
سمجھنے کے لیے ان سے بھی اس حد تک تعارف ناگزیر تھا۔

اگست ۲۵ء[1] کا مہینہ ہے۔ وسط ماہ کی تاریخین گزر چکی ہین۔ محرم کا مہینہ ابھی ابھی
ختم ہوا ہے۔ مولانائے فرنگی محلی آستانۂ اجمیر پر حاضری دیکر لکھنؤ واپس ہوتے ہین۔ دہلی
چند گھنٹہ کے لیے اترتے ہین۔ مع دو رفیقانِ سفر و حضر کے محمد علی سے ملنے آتے ہین۔ دوپہر
کا وقت۔ محمد علی کے ہاں تخلیہ کہاں۔ لیکن آج خلاف معمول اتفاق سے تخلیہ ہے۔ کامریڈ
کے اڈیٹر کے کمرہ کے اندر کل پانچ آدمی۔ مولانائے فرنگی محلی اور ان کے دونوں رفیق، چوتھے
محمد علی اور پانچواں یہ ڈائری نویس۔ محرم کا زمانہ ابھی تازہ تھا۔ گفتگو تعزیہ داری اور
بدعاتِ محرم پر چلی۔ سچ اور مدیر سچ عین اسی زمانہ مین بسلسلۂ محرم بہت "نیک نام"

[1] یعنی غالباً ۱۹۱۵ء کے اواخر میں۔

ہو چکا تھا، اور اس کی "وہابیت" ایسے حلقوں مین جن کا تعلق مولانائے فرنگی محلی سے رفاقت سفر و حضر کا تھا، پوری طرح مسلّم ہو چکی تھی۔ محمد علی نے بھی اس وقت کچھ ایسی ہی "وہابیانہ" باتین شروع کر دین، اور خود مولانا نے بھی بڑی حد تک موافقت فرما دی۔ بات مین بات نکلتی آئی۔ ذکر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا چلا۔ مولاناؒ بہر حال ایک ممتاز فاضل تھے۔ کئی منٹ تک سیرت عثمانی پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔ خلاصہ یہ تھا کہ "حضرتؓ کے مناقب و فضائل کا کیا پوچھنا، مجموعۂ کمالات ہی تھے۔ جس کے دل مین عثمانؓ کی محبت نہ ہو، اس کے ایمان مین فرق۔ لیکن حضرتؓ کے مزاج مین مروت بہت زائد تھی۔ حضرت علیؓ وغیرہ کے سامنے انتظامات میں اصلاح کا وعدہ فرما لیتے اور اُن پر دل سے عمل بھی کرنا چاہتے۔ مروان بیچ مین حائل ہو جاتا، اور کام بنتا ہوا بگاڑ دیتا۔ آپ سمجھتے سب کچھ تھے، لیکن بس وہی مروت کی افراط، اس کی اجازت نہ دیتی کہ رخنہ اندازون کو پاس سے دور فرما دیں"۔ ——— محمد علی سکوت اور سکون کے ساتھ پوری تقریر سنتے رہے۔ جب ختم ہوئی تو زور سے بول اٹھے "حضرت وہی صورت آج بھی قائم ہے۔ عثمان غنیؓ کا حلم و مروّت بھی آج موجود ہے، اور اس حلم و مروت سے فائدہ اٹھانے والے مروان بھی آج موجود ہیں" ——— مولانائے فرنگی محلی بھی بڑے ذہین و زیرک اور نکتہ رس تھے۔ مریدکے اس فقرہ سے پورا لطف لیا۔ معاً سمجھ گئے کہ فقرہ کا رخ کس طرف ہے۔ پہلے مسکرائے پھر ہنسے، اور پھر دیر تک لطف لے لے کر ہنستے رہے۔

ہمدرد، یاد ہوگا کہ نومبر ۱۹۲۴ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شریف حسین کو سالہا سال تک داد شقاوت دینے کے بعد بالآخر تخت حجاز سے رخصت

ہونا پڑا تھا، اور دنیائے اسلام اس کی اور اس کے اولاد کے مظالم سے پکار پکار کر پناہ مانگ رہی تھی۔ ہزارہا بیگناہ مسلمانوں، حاجیوں اور حجازیوں کا خون اس کی گردن پر ثابت ہو چکا تھا۔ مظلوموں کے منہ سے بے اختیار اس کے حق میں بددعائیں نکل رہی تھیں۔ بیواؤں کے سینوں سے گرم گرم آہیں اس کے مظالم پر فریاد کر رہی تھیں اور یتیم بچے بلک بلک کر اس کی سنگدلی کا افسانہ سنا رہے تھے۔ دست قدرت نے آخر کار والیٔ نجد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو انتقام کے لیے اس پر مسلط کر دیا تھا۔ فتوحات سلطانی کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ اور مصر و شام، ہند و عرب سب کہیں کے مسلمانوں کے چہرے کھلے جا رہے تھے کہ آخر کار تو فریاد رس نے ہماری سنی، اور مظلوموں کی نصرت کی گھڑی آ پہونچی۔ شریف اور خاندان شریف کی طرف سے مسلمانوں کے دل ایسے پکے ہوئے تھے کہ اسے نکالنے کے لیے کوئی بھی اٹھ کھڑا ہوتا تو مسلمانوں کے دل اسی کے ساتھ ہو جاتے۔ ادھر سونے پر سہاگا، سلطان نے بار بار یہ اعلانات کرنے اور بیانات دینے شروع کرائے کہ "میں حجاز پر کوئی اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں آ رہا ہوں، میں تو اس ارض پاک کو شریفین کے پنجۂ ظلم و ستم سے نجات دلانے کو اٹھا ہوں۔ ذریات شریف کے نکل جانے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام۔ وہ جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں گے۔" ——— مسلمانوں کے دلوں میں اب سلطان کا گھر اور ہونا شروع ہوا۔ ساتھ ہی فتحمندیوں کی خبریں بھی دھڑا دھڑ آنا شروع ہو گئیں۔ آج مکہ معظمہ پر قبضہ ہو گیا، کل طائف ہاتھ آ گیا۔ آج شریف علی (ولیعہد شریف حسین) جدہ میں محصور ہو گیا، کل ان کی فوج نے علاج بالمثل کے اصول پہ عمل کر کے خود اس غدار سے غداری کر دی۔ ہر صبح یہی چرچے، ہر شام یہی خبریں۔

لیکن شریف کے تعلقات سرکار برطانیہ سے تو آخر سرا خواہی و وفاداری ہی کے تھے۔

اور پھر سلطان نجد آخر "نجدی وہابی" تھا۔ بدایون "شریف" اپنی پوری قوت کے ساتھ شریف کی حمایت و نصرت میں سرگرم ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لاہور اور علی پور اور بمبئی اور پھلواری اور اجمیر اور کلیر، ہندوستان کے شمال و جنوب، شرق و غرب میں جہاں جہاں بھی "خوش عقیدہ" بزرگواروں کی نسبتیں، اور موروثی پیرزادوں کی عملداریاں تھیں، سب کہیں کے تار بیک وقت حرکت میں آگئے۔ اور خیر! یہاں ان ہی سب کا ہوتا جب بھی محمد علی کے نقطۂ نظر سے کچھ ایسا مضائقہ نہ تھا، غضب یہ تھا کہ ان سب کی کمک پر فرنگی محل کا زبردست مورچہ بھی تھا، جو بیک وقت شریعت کا بھی دارالافتا تھا اور طریقت کی بھی خانقاہ، اور سیاست کا بھی پلیٹ فارم!

دنیائے اسلام کی سیاست اور عالم اسلامی کی فلاح و بہبود دوسروں کیلئے چاہے مشغلۂ تفریح ہو، محمد علی نے یہ سودا نقد جان دے کر خریدا تھا۔ اسی ایک غم میں کیا کچھ نہیں جھیلنا پڑا تھا۔ عزت گنوائی، دولت گنوائی، صحت گنوائی۔ برسوں کی مدت نظربندی میں کاٹی۔ جیل خانہ دو دو بار گئے۔ قید تنہائی اٹھائی۔ اللہ کے گھر کی حفاظت کی فکر کی تو خود اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ رام پور کی خاک کے ذرہ ذرہ سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا، اس سرزمین پر قدم رکھنا بھی اب محمد علی کے لیے جرم قرار پا گیا تھا۔ خدا معلوم کتنی راتیں جاگ جاگ کر، کتنے دن بے چینی سے کاٹ کاٹ کر، ہفتوں نہیں، مہینوں بلکہ برسوں کے غور و فکر کے بعد محمد علی بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اصلاح حجاز اگر مقصود ہے تو آئندہ ہمیشہ کے لیے اس ارض پاک کو بادشاہ گردی سے نجات دلا دی جائے۔ یہ سارے فتنے بادشاہت اور ملکیت کے ہیں۔ اب یہ نہ ہونے پائے کہ آج شریف کا دور دورہ ہے تو

ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی کتابیں تلاش کر کر کے ان کے اوراق نذرِ آتش کیے جا رہے ہیں،
کل نجدیوں کا تسلط ہوا تو قبوں اور قبروں پر پھاوڑے چلنے لگے۔ پرسوں باگ حکومت
یمن کے زیدیوں کے ہاتھ میں آئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کی بے توقیری ہونے لگی بس ایک
شرعی جمہوریت، تمام مسلمانانِ عالم کے صلاح و مشورہ سے ساری دنیائے اسلام
کی رائے و شوریٰ سے قائم ہو جائے اور روز روز کا یہ جھگڑا مٹے۔ سیاسی قوت و اقتدار
بھی جبھی ممکن ہے، جب اسے مرکزیت حاصل رہے۔ آج کسی کی نظر میں حکومتِ حجاز کی وقعت
ہی کیا ہے۔ غریب سلطنت اتنی بڑی بھی تو نہیں کہ حیدرآباد تو خیر بڑی چیز ہے، میسور کی بھی
برابری کر سکے۔ فرنگی سمجھتا ہے کہ جب جی چاہے گا، چٹکی سے مسل کر رکھ دوں گا۔ عالمِ اسلام
کی جمہوریت قائم ہو جائے تو کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑے، اور شیر برطانیہ یا
عقاب جرمنی، سب سمجھ لیں کہ اب مقابلہ تنہا حجاز سے نہیں کرنا ہے، بلکہ ایک ہی وقت میں
مصر سے، یمن سے، عراق سے، شام سے، طرابلس سے، البانیہ سے، افغانستان سے، ایران
سے، ٹرکی سے، جاوا سے، سماترا سے، بخارا سے، مسلم چین سے، مسلم ہندوستان سے، سب سے
اور سب کہیں کرنا ہے ——— محمد علیؒ اسلامی ہند کے لیڈر اور زعیم مشرق کی آنکھ
سوتے اور جاگتے برسوں سے یہ خواب شیریں دیکھتی رہی، رات کی نیندیں اور دن کی بیداریاں
مدتوں اس آرزو کی پرورش پر قربان ہوتی رہیں۔ زبان اسی کی دعائیں کرتے کرتے تھکی
جا رہی تھی۔ سلطان نجد کے اعلانات سے پہلی بار خواب کی تعبیر پوری ہوتی نظر آئی۔ دل
باغ باغ ہو گیا اور جی نہال۔ ترکوں کی تنسیخ خلافت کا گہرا زخم دل پر ابھی تازہ تھا۔ جوان
اور لاڈلی بیٹی کا داغ جگر پر تازہ تر تھا۔ محمد علی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے غیب سے نزولِ رحم
کا سامان ہونے لگا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے شام میں وفد حجاز بھجوایا۔ اس کے ذریعے سے

سلطان کے پاس زبانی پیام کہلایا۔ خلافت کمیٹی میں بار بار تجویزین پاس کرائین۔ الگ سے سلطان کے پاس تار بھیجے۔ ہرتان اسی شرعی جمہوریت پر آکر ٹوٹتی ——— خود سلطان نے اپنی تقریرون مین، اعلانات مین، خطوط مین، ایک بار نہین، بار بار اور ڈھکے مُنہ سے اشارون مین نہین، ہانک پکار کر وعدہ کیا کہ مجھے ملک گیری کی ہوس نہین ہے حجاز پر حکومت اپنی نہین، شریعت مطہرہ کی قائم کرانا چاہتا ہون۔ ظالمون کے وجود سے اس خطۂ پاک کو پاک کرنے کو اٹھا ہون، آیندہ حکومت کے لیے خود مسلمان جسے چاہیں منتخب کریں۔

باب (۳۵)

سنہ ۱۹۲۵ء (۵)

"وہابیت" - مدینہ منورہ پر گولہ باری"

محمد علی کی ان بلند خیالیوں تک کس کا دماغ پہنچتا؟ ان دور اندیشیوں اور مصلحت سنجیوں کو کون سمجھتا؟ اور کون ان کی قدر کرتا؟ کس نے ان مسائل پر اتنی دماغ سوزی کی تھی؟ کون ان مسائل کی اُدھیڑ بن میں اس طرح خون جگر کھا کھا کر رہا تھا؟ ادھر سلطان نجد کی پیشقدمیوں اور فتحمندیوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں کہ ادھر شامت کے مارے ہندی مسلمانوں میں دو اکھاڑے قائم ہوگئے۔ اور سب و شتم سے گزر کر نوبت "رفع یدین" تک آگئی۔ ایک صف میں سلطان کے دوست تھے مگر نادان۔ دوسرے فریق میں سلطان کے دشمن تھے مگر دانا وہ بھی نہیں، دوستوں ہی کی طرح نادان۔ اصل مسئلہ کو بھول بھال اور اصلی تنقیح کو چھوڑ چھاڑ، بحث "عقائد" کی شروع ہوگئی۔ اور "تبدیع و تو ہب" کا وہ زبردست دیو، جو سویا کبھی بھی نہ تھا، درمیان میں ذرا اونگھنے لگا تھا۔ نئے سے چونک کر، پوری قوت کے ساتھ ہر طرف دوڑنے دھوپنے، چیخنے چنگھاڑنے لگا۔ ادھر سعودیوں کی فتح سے خوش ہو ہو کر، اہل حدیثوں نے، غیر مقلدوں نے، کتاب و سنت کی پیروی کا دعویٰ رکھنے والوں نے نعرے لگائے کہ اب کیا ہے، پالا مار لیا ہے، یہ

کمبخت بدعتی اور گور پرست اب تو آخر نیچا دیکھ کر رہے۔ اُدھر شریفیون کی شکست سے ملول و مغموم ہو کر بریلویُن نے، علی پوریون نے، "سنی حنفیون" نے شور غم و واویلا بلند کیا، کہ ہائے یہ کیا غضب ہوا کہ جا رہا ہے۔ ان ناشدنی وہابیون کا بھی یہ منہ اور یہ حوصلہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ پر اپنا علم نصب کرنے کا خواب دیکھنے لگین ——— "مشائخ" اور پیرزادے، درگاہوں کے سجادے اور مزارات کے مجاور، سب ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے کہ یہ ہمارا دشمنِ ازلی کہان سے نکل پڑا۔ شریف آلِ رسول تھا۔ یہ اس کے مقابلہ میں آیا ہے، یہ مردود ہے، وہابی ہے، جہنم کا کندہ ہے، کانا دجّال ہے، شیطان ہے، یہ اگر جیتا تو ہم کو جیتا نہیں چھوڑنے کا!

مولانائے فرنگی محلی لکھنؤ مین، محمد علی دہلی مین، دونون کی ٹکٹکی برابر مطلعِ حجاز پر لگی ہوئی۔ ایک کی نگاہ مین مقابر مسلمین کا احترام، دوسرے کے پیش نظر مصالحِ عالمِ اسلام۔ مقصود دونون کا خدمت دین۔ لیکن اپنی اپنی بصیرت اور اپنا اپنا مقام۔ اجتہاد مین غلطیاں بڑے بڑے کاملین سے ہوئی ہین۔ پہلی صدی کے اکابر سے ہوئی ہین، تو چودہوین صدی کے علماء و مشائخ بیچارون پر زیادہ گرفت کیون کیجئے، اور انھین طعن و اعتراض کا ہدف کیون بنائے رکھیے۔ ادھر مولانائے فرنگی محلی کی سمجھ مین یہ نہ آتا کہ محمد علی خوش عقیدہ صوفی اور حنفی ہو کر وہابیہ اور نجدیہ کی حمایت کیسے کرنے لگا، اور غیر مقلدین کا شریک حال کیونکر بن گیا۔ ادھر محمد علی کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر کہ مولانائے فرنگی محلی انگریزی تسلّط سے اس قدر بیزار اور مرکزِ اسلام کی آزادی کے لیے اس قدر بیقرار ہو کر اُس فریق کے شریک کار کس طرح ہوتے جا رہے ہین جو ارض پاک مین فرنگی حکومت کو مداخلت کی دعوت دے رہا ہے۔

یہ اپنی طرف دنگ، وہ اپنی طرف حیران۔ پہلے آپس مین بڑی مفصل وموثر مراسلت رہی۔ اسکے بعد وسط اگست مین مولانا لکھنؤ سے اجمیر جاتے ہوئے دہلی میں اترے اور محمد علی سے مل کر گھنٹون زبانی گفتگو کی۔ یہ سب کچھ ہولیا۔ اس پر بھی مشیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا کہین مٹتا ہے؟ ——— تاریخ ایک چھوٹے پیمانے پر دور عثمان غنیؓ اور دور مرتضیٰؓ کو دہرا رہی تھی۔

غلط فہمیان بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئین۔ ایک گتھی اگر سلجھتی تھی، تو اسکی جگہ دو اور پیدا ہوجاتی تھیں۔ جو دل جڑے ہوئے تھے۔ ان مین روز بروز دراڑین ہی پڑتی چلی گئین، اور درمیانی لوگ طرح طرح کی دراندازیون مین مصروف۔ مولانائے فرنگی محلی نے کہا کہ مصالحت یون ہوسکتی ہے کہ جو مسجدین نجدیون کے ہاتھون مسمار ہوئی ہین، سلطان اس انہدام پر اظہار ملامت کریں اور جو قُبّے گرائے جا چکے ہین، انھین اپنے صرفہ سے ازسرنو تعمیر کرادین، یا کم از کم دوسرون کو اسکی اجازت دیدین۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ خیران مطالبات کے پیش کردینے مین تو مضائقہ نہین لیکن ہے یہ مسئلہ عالم اسلامی ہی کی کانفرنس کے طے کرنے کا، جس مین ہر فرقہ کے علما شریک ہون۔ مولانائے فرنگی محلی کے یہ مطالبات اخبارون مین نکلے۔ لیکن لکھنے والے نے تمہید مین یہ جوڑ دیا کہ مولانا محمد علی کو بھی ان مطالبات سے اتفاق ہے ——— حضرت عثمان غنیؓ کے خطوط بنام مروان کی "اصلاحون" کی یاد تاریخ کی مدد سے تازہ کرلیجیے!

یہ تحریر اور تو اور، خود ہمدرد مین بھی بجنسہٖ نکل گئی"۔ محمد علی نے اپنے اس "اتفاق رائے" کو جب پڑھا، تو بڑی تکلیف قلب محسوس کی۔ دوسرے ہی دن اپنے نام کے ساتھ مفصل تردید۔ مگر اتنے ہی جزو کی، ہمدرد مین چھپوائی۔ یہ مضمون اگرچہ محمد علی کے نام سے ہے، لیکن اب اس راز کے افشا مین بھی کوئی مضائقہ نہین کہ لکھا ہوا تھا انکے اشارہ کے مطابق اور انکی

اصلاح وترمیم کے بعد انکے اسی نیازمند ڈایری نویس کا۔ ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ اُدھر یک بیک ۳۰ اگست کو لندن سے چلا ہوا وہ مشہور و معروف تار آگیا، جس میں مسجد نبوی پر نجدیوں کی گولہ باری کی خبر درج تھی۔ اس تار کا شایع ہونا تھا کہ گویا سرزمین ہند پر ایک بھونچال آگیا، آگ پر مٹی کا تیل پڑ گیا، اور شعلے لپک لپک کر آسمان سے باتیں کرنے لگے!

---

۳۰ اگست ۲۵ء۔ میں دہلی میں کئی روز سے ہوں۔ ریف اور حجاز دونوں جگہ کی خبریں روزانہ جاذب توجہ بنی ہوئی ہیں۔ ریف کی خبریں بڑی امیدوں کے ساتھ اور حجاز کی خبریں تردد و اندیشہ کے ساتھ ہر روز پڑھی جا رہی ہیں۔ محمد علی اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے چھوٹے بچے عارف کی وفات کی خبر پاکر مع بیگم صاحبہ رامپور گئے ہوئے ہیں۔ نہیں، یہ فقرہ تو غلط لکھا گیا، رام پور شہر کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت ہی کہاں تھی۔ رام پور نہیں، صرف رام پور اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے، کامریڈ کے ایڈیٹوریل کمرہ میں میں کھانا کھا رہا ہوں کہ ہمدرد کے چیف سب ایڈیٹر عارف ہنسوی صاحب کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور حسرت و یاس کے ساتھ اتھ پٹخ کر کہتے ہیں کہ "نجدی آخر اپنی ہٹ پوری کر کے رہے، مدینہ پر گولہ باری کی خبر آگئی۔ ہم یہاں انکی بات بنانے میں رہے اور وہ ظالم آخر اپنی والی حرکت کر گزرے" —— میں حیران و ششدر، منہ کا نوالہ منہ میں اور ہاتھ کا ہاتھ میں عارف صاحب کا منہ دیکھنے لگتا ہوں، کیا واقعی خبر آگئی" عارف صاحب جل کر جواب دیتے ہیں۔ "ہاں ہاں صاحب کہہ تو رہا ہوں۔ رائٹر کا تار ہے، صاف صاف بمبارڈمنٹ کی اطلاع ہے" جھٹ پٹ ہاتھ دھو، دھلا عارف صاحب کے ساتھ میں اس کمرہ میں آتا ہوں، جہاں ہمدرد کا

---

[1] اردو روزناموں میں اس وقت تک رات کو کام کرنے کا رواج نہ تھا۔ تار دن ہی میں موصول ہوتے اور دوپہر تک پرچہ مرتب ہو کر پریس کو دیدیا جاتا۔ شام کو شائع ہو جاتا۔

ایڈیٹوریل اسٹاف کام کر رہا تھا۔ اور جی ہی جی میں دعائیں کرتا آیا کہ خدا کرے یہ بات ہی جھوٹ نکلے عارف صاحب انگریزی جانتے نہیں، خدا کرے تار کا مطلب غلط سمجھے ہوں! ——

بے بس بندہ بھی اضطراب و اضطرار میں کیسے کیسے بودے سہاروں کی طرف دوڑتا رہتا ہے!

دفتر میں تار میز پر رکھا تھا۔ خود پڑھا۔ اور دل جس چیز کو ماننا کسی طرح نہیں چاہتا تھا، اسے ماننا پڑا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تار کو کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا اسے شائع ہی نہ کیا جائے۔ دوسروں نے کہا، اس سے نتیجہ؟ تار رائٹر کا ہے، بہرحال انگریزی اور سب ہی اخبارات میں پہنچا ہوگا اکیلے ہمدرد کے نہ چھاپنے سے خبر تو چھپنے سے رہی۔ پھر ہمدرد اپنے سر مزید جرم اخفائے خبر کا کیوں لے؟ —— مولانا موجود نہیں، ہدایت و رہنمائی کس سے حاصل کی جائے؟ حیص بیص قیل و قال؛ بالآخر طے پایا کہ "تار اخبار میں دے تو بہرحال دیا جائے لیکن نمایاں نہ کیا جائے۔ اور عنوان ایسا دیا جائے جس سے خبر کی اصلیت ہی مشتبہ ہو جائے۔ یعنی "حملۂ مدینہ منورہ کے متعلق انگریزی بیان"۔ تار لندن سے آیا تھا اس لیے یہ عنوان بالکل مطابق واقعہ تھا۔ اور تار کے ترجمہ کے ساتھ یہ نوٹ بڑھا دیا جائے کہ مسلمان ابھی اس خبر کی تصدیق کا انتظار کریں۔ اور فوراً کوئی اشتعال نہ قبول کریں۔ سینیر مترجم ڈاکٹر سعید احمد بریلوی تھے۔ انہی نے یہ سب کچھ کیا۔

باب (۳۶)

۱۹۲۵ء (۷)

(ادھر تحقیق واحتیاط - اُدھر رپورٹنگ)

۴ اگست ۱۹۲۵ء - مولانا شب کی ٹرین سے بہت رات گئے واپس تشریف لے آئے تھے صبح سویرے ہی دفتر ابھی کہاں کھلا تھا، اور رات سوئے ایڈیٹوریل عملہ کا کوئی رکن حاضر بھی کیسے ہو سکتا تھا، سب سے پہلی بات جو مجھ سے ارشاد فرمائی، وہ یہ سوال تھا کہ ریف کی کیا کیا خبریں آئیں؟ ریف میں غازی عبدالکریم اسپین کے مقابلہ میں جہاد کر رہے تھے، اور اس وقت تک برابر کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ خبریں سن سن کر خوش سب ہی مسلمان ہو رہے تھے لیکن محمد علی کے دل کی خوشی کا کیا کہنا۔ خدا معلوم صبح تک کا انتظار ان سے کیسے کیا گیا۔ رات ہی میں مجھے جگا کر کیوں نہ خبریں دریافت کیں، یا اسی وقت اخبار پڑھنا کیوں نہ شروع کر دیا!

جواب میں میں نے عرض کیا کہ "جی۔ ریف کی تو ایسی کوئی خاص خبر نہیں۔ البتہ مدینہ منورہ کے متعلق خبر آئی ہے کہ نجدیوں نے مسجد نبویؐ پر گولہ باری کر دی"۔ سنتے ہی، بلا ایک لمحہ کے توقف کے تحقیر کے ساتھ بولے "جھوٹ ہے جھوٹ۔ ہمدرد میں کہیں چھاپ تو نہیں دیا؟" میں جی میں ڈر گیا کہ بس اب ڈانٹ پڑ کر رہی۔ جی کڑا کر کے جواب دیا کہ "رپوٹر کا تار ہے۔ سب ہی اخباروں میں آیا ہوگا نہ کیونکر چھاپا جاتا۔ البتہ خبر ان احتیاطوں کے ساتھ دی گئی ہے"۔ احتیاطوں کی تفصیل بیان کی

بولے "خیر، غنیمت ہے۔" پھر سکون و سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "ان خبرون کے چھاپنے میں بڑی احتیاط رکھنی چاہیے۔ ہر ہر طرح کی چھوٹی خبرین آئین گی تاکہ مسلمان آپس مین خوب لڑین۔" ــــــ
عارف صاحب کی بھی ایک عمر اخبار نویسی مین گزر چکی تھی، اور اپنے خیال میں وہ خبرون کے شعبہ مین مرتبہ ماہر کا رکھتے تھے، لیکن یہان تک نگاہ تو صرف محمد علی کی پہنچ سکتی تھی۔ یہ جھلک اس فراست ایمانی کی تھی جس کا نقشہ ان الفاظ مین دکھایا گیا ہے۔

وَاِذَا جَاءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ
اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ
اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ
لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ
(نساء - آیت ۸۳)

انھین جب کوئی خبر امن یا خوف کی پہنچتی ہے
تو اسے خوب پھیلا دیتے ہین، حالانکہ اگر
یہ اسے رسول اور اپنے مین سے صاحبانِ امر
کی طرف پہنچا دیتے، تو جو ان مین سے بات کی تہ
تک پہنچ سکتے ہین وہ اسے سمجھ لیتے۔

وہی دن، وہی تاریخ۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا ہو چکا تھا، یا ہو رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا کہ ٹرنک کال ہے، اور دفتر کے چپراسی نے آ کر کہا کہ ٹیلیفون لکھنؤ سے بول رہا ہے، اور وہ صاحب خود سرکار سے بات کرنا چاہتے ہین۔ محمد علی خود اٹھ کر فون پر گئے لکھنؤ سے چودھری خلیق الزمان بول رہے تھے۔ چودھری صاحب یو۔ پی کے لیڈرون میں سے تھے۔ ۲۱ء میں جیل کی ہوا کھائے ہوئے، اور تحریک خلافت کے سلسلہ مین نام پائے ہوئے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر اور اس وقت تک محمد علی کے ایک مخلص نائب۔ انھون نے اپنی کوٹھی واقع خیالی گنج سے کہا "مولوی عنایت اللہ صاحب فرنگی محل سے مولانا عبدالباری صاحب کے بھیجے ہوئے ابھی آئے ہین۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہین۔ کہتے ہین، کل کے تار کے بعد اب خاموشی ناممکن ہے۔ مدینہ منورہ کی گولہ باری پر مسلمان کسی طرح ضبط نہین کر سکتے۔ لکھنؤ مین

ایک بڑا جلسہ کرنے والے ہیں۔ مجھ سے شرکت کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ مولانا محمد علی کا مشورہ سب پر مقدم ہے۔ سلطان ابن سعود کا اگر یہ جرم ثابت ہو جائے تو پھر کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔ جو کچھ فرمایئے، ان سے کہہ دوں" ——— یہ مولوی مفتی عنایت اللہ صاحب علاوہ مولانا عبد الباریؒ کے عزیز قریب اور شاگرد اور مسترشد ہونے کے، خود بھی ایک صاحب علم و نظر فقیہ اور مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل کے صدر تھے۔

محمد علی نے جواب میں کہا کہ "بیشک جو بھی کارروائی ہو، متفقہ ہونا چاہیے۔ لیکن مجھے تو ابھی تک خبر ہی پر یقین نہیں۔ سب سے مقدم خبر کی تحقیق ہے۔ تار لندن سے آیا ہے۔ اس میں بھی حوالہ بیت المقدس کے نامعلوم ذرائع کا ہے۔ تحقیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے بیت المقدس مسلم سپریم کونسل (مجلس اعلیٰ) کے نام جوابی تار دے۔ یہ سپریم کونسل بھی انگریزوں ہی کے زیر اثر ہے اور شریف کا بیٹا عبد اللہ بھی وہاں موجود ہے۔ تاہم مفتی امین الحسینی سے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور صحیح اور سچی خبر دیں گے۔ یہاں جو کچھ بھی کیا جائے، اس تحقیق کے بعد نہ کہ اس کے قبل۔ اور اس میں زیادہ دیر بھی نہ لگے گی، ایک ہی دو روز لگیں گے۔ مولانا سے میری طرف سے بہت زور دے کر یہ کہہ دو کہ خدا کے لیے تھوڑے سے صبر و ضبط سے کام لیں۔ جوش کو بے محل نہ صرف ہونا چاہیے۔ شوکت کو ابھی بمبئی ٹیلیفون کریں، میں ابھی انھیں ٹیلیفون کر چکا ہوں (یا کر رہا ہوں)"۔ یہ آخری فقرہ اتنے عرصہ کے بعد خوب یاد نہیں "کر چکا ہوں" کہا تھا یا "کر رہا ہوں"۔ بہرحال کہا جو کچھ ہو بمبئی ان کا فون کرنا اچھی طرح یاد ہے۔ خود ہی ٹیلیفون پر کھڑے ہو کر دیر تک شوکت صاحب کو بیت المقدس جوابی تار دینے کی ہدایتیں کرتے رہے۔ خیال غالب یہی ہے کہ بمبئی کو وہ ٹرنک کال پہلے ہی کر چکے تھے، اس کے بعد لکھنؤ والا فون آیا۔ بیت المقدس کے مفتی اعظم شیخ امین الحسینی (جو آخر ۱۹۵۹ء میں اس ڈائری کے نقش ثانی کی تحریر کے وقت ماشاء اللہ ہر طرح صحیح سلامت اور خدمات ملی میں مصروف

ہیں) انھیں پورا اعتماد تھا ــــــــ آج اتنے عرصہ کے بعد ٹھنڈے دل سے دیکھیے تو یہی روش سب سے زیادہ سلجھی ہوئی، اور عقل و دیانت کے مطابق نظر آئے گی لیکن اُس وقت جوش ہیجان کے عالم میں یہ ہوشمندانہ کارروائی قابل صد ملامت ٹھہری، اور محمد علی کی طویل فرد جرم میں ایک اہم عنوان قرار پائی۔

اصل تار جس پر یہ ساری قیامت برپا ہو رہی تھی اس کا لفظی ترجمہ یہ تھا: "لندن ۲۳ اگست بیت المقدس کا ایک تار مظہر ہے کہ معتبر ذرائع سے علم ہوا ہے کہ نجدیوں نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اور دو روز ہوئے کہ گولہ باری شروع ہو گئی جس کے نتیجہ کے طور پر اس مسجد اعظم کے جس میں پیمبر کا مزار ہے، گنبدوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔" (رائیٹر)

خلافت کمیٹی کا پہلا وفد حجاز جس میں مولوی محمد شفیع داؤدی (ایڈوکیٹ صوبہ بہار) مولانا محمد عرفان، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور قمر احمد صاحب خانپوری۔ بی اے (ایڈیٹر روزنامہ خلافت۔ بمبئی) وغیرہ شامل تھے ابھی ابھی سلطان ابن سعود سے مل کر واپس آیا تھا اور اسے سلطان اطمینان دلا چکے تھے کہ ہم عمارات متبرکہ کے جو واقعات کہ معظمہ میں ان کی غیر حاضری اور لاعلمی میں پیش آچکے تھے، ان کا اعادہ مدینہ میں ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ اس اطمینان اطلاع کے بعد یوں بھی یہ تار قابل اطمینان نہ تھا، پھر اس کا اس چکر کے راستہ سے آنا اسے اور بھی مشتبہ بنا رہا تھا۔ اس سب کے علاوہ وہ تار کا بین السطور خود یہ کہہ رہا تھا کہ نجدی فوج کے حملہ کا اصل ہدف شہر مدینہ ہے، جہاں "شریف زادہ" امیر علی بن حسین کی فوجیں موجود تھیں، نہ کہ مسجد نبویؐ۔ مسجد کے قبوں کو گزند اگر پہنچا ہے تو ضمناً اور گویا محض بے احتیاطی سے پہنچ گیا ہے۔

لے لکم والحمد للہ اس سودہ کی نظر ثانی کے وقت شروع ۱۹۵۳ء میں بھی،

سب سے بڑھکر یہ کہ روضۂ رسول کے گرد نہ پہنچے بلکہ اس پر حملہ ہونے سے بھی پیتا بکیر خاموش تھا! لیکن اندھا دھند جوش کا بھلا ہو کہ ہر طرف شور یہی مچ گیا کہ وہابیوں نے روضۂ رسول پر حملہ کر دیا، اور گنبد سبز پر گولہ باری شروع کر دی! ——— ہندوستان کی ساری آبادیوں میں جہاں جہاں بھی "خوش عقیدگی" کی حکومت تھی، پیرزادوں کی کوئی بستی تھی" مشائخ" کا کچھ بھی اثر تھا، بس ایک ہیجان اور غضبناکی کی رو دوڑ گئی کہ مردود وہابیوں نے گستاخی کی حد اور بے ادبی کی انتہا کر دی! بمبئی، کراچی، مراد آباد، لکھنؤ، لاہور، بدایوں وغیرہ جو جو مشہور مرکز تھے، سب کہیں بڑے بڑے "جنگی" جلسے ہونے لگے اور جلسے ہنگاموں کی شکل پکڑتے گئے۔ لکھنؤ کے شریفی جلسہ میں مولوی عبد الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم نے کچھ بولنا چاہا، تو شریفی رفیقوں کے پیٹنے پیچھے۔ بمبئی کا ماجرا اس سے بڑھ کر رہا۔ کراچی میں مولانا ظفر علی خاں کی خبر لے لی گئی۔ بدایوں "شریف" نے سرکار برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کھلم کھلا کر دی اور حنفی، وہابی، یا سنی۔ وہابی کی جنگ کا میدان سالہا سال سرد رہنے کے بعد تازہ جوش و خروش کے ساتھ از سر نو گرم ہو گیا! ——— یہ ڈائری محمد علی کی وارث و مشاہدات سے متعلق ہے۔ کوئی شریفی، سعودی محاربہ کی تاریخ نہیں۔ ان اوراق میں اس جنگ کی تفصیلات کے منتظر رہیے۔ ڈائری میں اس جنگ کا ذکر تو صرف اس حد تک آئے گا، جہاں تک اسکا تعلق محمد علی سے ہے، اور اس کے بھی صرف وہ حصے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں ہیں۔

باب (۳۷)

۱۹۲۵ء (۷)

(محمد علی کی "وہابیت" شریفی سعودی جنگ)

لکھنؤ اپنی مبالغہ پسندی اور تخیل نوازی کے لیے شروع سے مشہور چلا آ رہا ہے۔ طلسم ہوش ربا اور فسانۂ عجائب کی داستانیں آخر اسی سرزمین پر "تصنیف" ہوئی ہیں۔ عالموں فاضلوں کا نمبر ۱۹۲۵ء میں اگلے شاعروں اور افسانہ طرازوں سے بڑھ چڑھ کر رہا۔ لکھنؤ میں جلسۂ عظیم کا جو اشتہار عظیم شائع ہوا اس کا عنوان عظیم رکھا "قیامت کبریٰ" اور اس کاغذی قیامت کبریٰ کے متن کی شرح میں دوسرا عنوان رکھا "گنبد خضرا پر گولہ باری"! ——— مضمون آفرینی کا یہ وہ مقام، اپنوں کے فہم و دماغ کا حاصل کیا ہوا تھا، جہاں تک فرنگی بیگانوں کے بھی دماغ کی رسائی نہیں ہوئی تھی! تار میں صراحت صرف شہر مدینہ پر حملہ کی تھی، صراحت تو مسجد نبوی تک پر حملہ کی نہ تھی، صرف اس کا استنباط ہوتا تھا۔ نکتہ وران لکھنؤ نے مسجد نبوی الگ رہی، گنبد خضرا تک کی تصریح چھاپ دی! (تار میں روضۂ اقدس کا نام تو صرف مسجد نبوی کی شناخت کی غرض سے تھا) العظمة للہ! ان عنوانات اشتہارات اور پوسٹروں کی ساری عبارت کو قیاس کر لیا جائے۔ نتیجہ وہی نکلا جو قدرۃً نکلتا، اور شاید وہی مقصود بھی ذمہ دار اشتہار نویس بزرگوں کا تھا!

روضۂ اطہر کی بے حرمتی سن کر کون مسلمان اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا تھا؟ اک آگ سی

مانگ گئی۔ شریفی پارٹی کی بن آئی۔ منہ مانگی مراد ملی۔ پروپگنڈہ دل کھول کر اور جی بھر کر ہوا۔ تحریر، تقریر، جلسہ، جلوس، نظم، نثر، اشتہار، پوسٹر، سارے ہی حربے نکل پڑے۔ لکھنؤ کا روزانہ پریس (تین ہی اخبار اس وقت مسلمانوں کے تھے) کہنا چاہیے کہ اسی جماعت کی مٹھی میں تھا۔ تینوں کی حمایت کافی نہ سمجھ کر ایک اور مستقل روزنامہ اسی مقصد سے نکالا گیا۔ سید جالب صاحب اپنی ذات اور خیالات کے اعتبار سے فرنگی محل کے معتقد اور ہم مسلک تھے، لیکن ایک تو طبعاً مرنجان مرنج قسم کے تھے اور متانت اور سلامت روی ان کے قلم کا خاص جوہر تھی، پھر یہ بھی تھا کہ ان کے پرچہ کے ڈائرکٹروں میں اودھ کے نامور ایڈوکیٹ حاجی محمد نسیم صاحب اور لکھنؤ کے مسلم لیڈر چودھری خلیق الزمان جیسے "سعودی" حضرات بھی تھے۔ اس لیے ہمدم تو مخالفتِ ابن سعود میں حد سے آگے نہیں بڑھا۔ باقی عام مقرروں کی آتش بیانیاں، اخبار والوں کی شوریدہ نگاریاں، شیعہ تعلقداروں کی زرپاشیاں، ہاشمی انجمنوں کی کارگزاریاں ان سب نے مل ملا کر لکھنؤ کی فضا ایسی تیار کر دی تھی کہ ادھر کسی نے کلمۂ حق زبان سے نکالا، ادھر معاً اس پر "وہابی" ہونے کا فتویٰ لگ گیا۔ ہمدرد کے وقائع نگار لکھنؤ، فرنگی محل ہی کے ایک اہل قلم تھے۔ اب ان سے اس تعلق کے برقرار رہنے کا کیا امکان رہ گیا تھا۔

ہمدرد کی روش اس موقع پر بھی قابل داد رہی۔ قبوں کی حمایت و مخالفت میں اس نے دو دو سنجیدہ مقالے، دونوں فریقوں کے لے کر اس بحث ہی کو ختم کر دیا۔ قبوں کی حمایت میں لکھنے والے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور مولانا مفتی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی تھے۔ اور مخالفت کرنے والے، مولانا خواجہ عبدالحیٔ (استاد تفسیر جامعہ ملیہ) اور یہ نیازمند ڈائری نویس۔ ہمدرد سلطان ابن سعود کی سیاسی پالیسی کی حمایت کرتا رہا لیکن ان کے مذہبی عقائد کی

ہمنوائی کبھی بھی نہ کی۔ شدید سے شدید اشتعال کے وقت، بجز ایک استثنائی موقع کے (جب بمبئی میں ایک مسجد میں مولانا شوکت علی پر لکڑی سے حملہ ہوا ہے، اور پھر اس ایک موقع کے لیے بھی بعد کو اس نے معذرت شائع کی)، اس نے اپنی متانت و سنجیدگی کی روش کبھی بھی نہ چھوڑی اور اپنے کو برابر سنبھالے رکھا، ذاتیات و شخصیات کے بجائے صرف اصول و مسائل سے بحث کی اور فرنگی محل خصوصاً مولانا عبدالباری ؒ کے ذاتی احترام کا تو ہمیشہ لحاظ رکھا۔ عارف صاحب (ہمدرد کے نائب چار ہزار ایڈیٹر) کو مالک ہمدرد اور فرنگی محل کے باہمی تعلقات کا علم تھا، قدرۃً فرنگی محل کے معاملہ میں بیچ ہی بیچ کر لکھتے لیکن ہیجان جذبات کے وقت حدود کا لحاظ رکھتا ہی کون ہے۔ میدان جنگ میں سب سے پہلے کام آجانے والے تو حق و انصاف ہی ہوتے ہیں! ہمدرد کو اس احتیاط و تقویٰ کا انعام یہ ملا کر الٹے اس کے بائیکاٹ (مقاطعہ) کی تبلیغ و تلقین ”جزو عقیدہ“ حلقوں میں شروع ہو گئی۔

قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کی بحث، صدیاں گزر چکنے کے بعد، آج ہم کو آپ کو کیسی بے روح اور بے حاصل سی معلوم ہو رہی ہے، لیکن اسی ”نزاع لفظی“ کے پیچھے ایک وقت میں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ اور کیسی کیسی عزیز اور بیش بہا جانیں اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے اس پر نثار نہیں ہو چکی ہیں؟ پھر اسی طرح جبریہ و قدریہ کے منازعات، اور بیسیوں دوسرے کلامی محاربات جن سے قدیم فرقوں کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اور خیر یہ تو صدیوں قبل کی اور ہندستان کے باہر کی باتیں ہیں۔ ”آمین بالجہر“ اور ”رفع یدین“ اور اسی قبیل کے بیسیوں دوسرے فقہی جزئیات کی خاطر تو ابھی ایک ہی آدھ نسل قبل اور اسی ہندوستان کے اندر کیسا کچھ خون حرام نہیں ہو چکا ہے! اور پھر مسئلہ میلاد نبوی اور مسئلہ قیام میلاد اور مسئلہ علم غیب رسول اور مسئلہ

امکان خلف وعد! العظمۃ للہ۔ آج آپ جتنا چاہیں یہ کہہ کہہ کر اپنا دل خوش کرلیں کہ بھلا یہ بھی کوئی ایسے اہم اور مہتم بالشان مسئلے ہوسکتے ہیں۔ لیکن ابھی کل تک کس درجہ ان کی اہمیت دلوں میں جاگزیں تھی۔ گویا یہی عین معیار کفر و ایمان تھے۔ مباحثہ، مناظرہ، مشاتمہ، مجادلہ، مشاغبہ یہانتک کہ مباہلہ بلکہ کہیں کہیں مقاتلہ تک کی نوبت ان ہی مباحث کے صدقہ میں آچکی تھی۔ اور جس وقت تک ان کی گرماگرمی رہی، کون ایسا تھا جو اپنے کو اس سیلاب کی زد میں آنے سے بچا سکا تھا؟

بس بعینہٖ یہی کیفیت ۱۹۲۵ء کے نصف آخر اور ۱۳۴۴ھ کے نصف اول میں مسئلہ قبور وقباب میں آپ کے اسی ہندوستان میں، اسی لکھنؤ اور اسی دہلی، اسی اودھ اور اسی پنجاب، اسی دکن اور اسی بہار میں ان آنکھوں نے دیکھی۔ دائیر کی اصل حکایت، جس پر یہ سارے قصے قضیے چل پڑے تھے، وہ تو درمیان میں غت ربود ہوکر رہ گئی، اور ہر مجمع میں، ہر محفل میں، ہر گھر میں بحث یہ چھڑ گئی کہ قبور کو پختہ کرنا اور پھر ان پر قبہ یا گنبد بنوانا جائز ہے یا ناجائز؟ مستحسن ہے یا حرام؟ اور بنے ہوئے گنبدوں کے باقی رکھنے نہ رکھنے کے باب میں کیا احکام ہیں؟ فرنگی محل کے عالم، اور ندوہ کے فاضل، دیوبند کے فقیہہ اور جامعہ ملیہ کے استاد، سچ کا اڈیٹر اور بدایوں و پھلواری کے خانقاہ نشین، جنھیں دیکھئے اسی بحث میں الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہوئے۔ آج ایک فریق کا مضمون نکلا تو کل دوسرے فریق کی طرف سے اس کا جواب آج ایک نے پمفلٹ لکھا، کل دوسرے نے اس کا رد شائع کیا۔ نوبت زبانی تو تو میں میں سے گزر کر کہیں کہیں ہاتھا پائی بلکہ فوجداری کی آگئی۔ گھر گھر اختلاف و شقاق کی آگ دوڑ گئی۔ باپ شریف ہے تو بیٹا سعودی۔ ایک بھائی قبہ شکن ہیں تو دوسرے قبہ نواز۔ بیوی "بدعتی" ہیں تو میاں "وہابی" ——— محمد علی کو اپنی ذات سے ان بحثوں میں بہت ہی

کم دلچسپی تھی۔ وہ انھیں فروع ہی نہیں، فروع در فروع کے درجہ میں رکھتے تھے۔ رجحانِ طبع اگر کچھ تھا تو عقائد فرنگی محلی ہی کی جانب، نہ کہ عقائد سعودیہ نجدیہ کی جانب۔ کہا کرتے تھے کہ "بلند و پختہ قبور کو اسلام نے پسند یقیناً نہیں کیا ہے، لیکن ان کی تعمیر کی کوئی قطعی ممانعت یا بنے ہوئے مزارات کے ڈھا دینے کا کوئی صاف حکم بھی ابھی تک میرے علم میں نہیں۔ جس دن آجائے گا، میں خود ہی ہاتھ میں پھاوڑا لیکر تعمیل ارشاد کو بڑھوں گا"۔ ہمدرد میں میرا ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں مسلک فرنگی محل کے رد میں اور مشاہد و مزارات کے عدم جواز میں نکلا۔ محمد علی نے اس رائے اور عقیدہ سے کچھ زیادہ اتفاق نہ کیا۔ وہ جو اس وقت سلطان ابن سعود کی تائید کر رہے تھے، اس میں سلطان کے مذہبی عقائد کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ان کی تائید اس وقت تمامتر اس خیال کے ماتحت تھی کہ اب ارض حجاز کو ملوکیت و استبداد کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے نجات ملی جا رہی ہے، اور جمہوریۂ شرعی کی بنا و خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر قائم ہوئی جاتی ہے۔ اس پر بھی جتنی "بدنامی" ان کی قسمت میں تھی، ہو کر رہی، اخبارات کے ہیجان و تلاطم میں کسے تحقیق کی فرصت اور کس کو صداقت کی پروا؟ محمد علی کی وہابیت اور بدعقیدگی کی تشہیر کے لیے بس اس قدر کافی تھا کہ کسی پہلو سے اور کسی بنا پر سہی، بہرحال وہ ہیں تو سلطان ابن سعود کے حامی و ہمدرد۔ غریب کی حنفیت اور قادریت، بیعت اور مزارات پر حاضری، عرسوں میں شرکت اور قوالی کی محفلیں، کوئی چیز بھی آڑے نہ آئی، اور گلی گلی، گھر گھر ڈھنڈھورا پٹ گیا کہ محمد علی وہابی ہیں وہابی، بلکہ وہابیوں کے سردار اور نجدیوں موذیوں کے گرو گھنٹال!

باب (۳۸)

۱۹۲۵ء (۸)

(بزم اور پھر رزم)

خلافت کمیٹی نام کے لیے اب بھی زندہ تھی۔ حقیقۃً اس کی زندگی ایک آدھ سال پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اودھ میں بھی ایک مستقل صوبہ خلافت کمیٹی تھی۔ یہ نیاز مندؔ بے عمل و پست ہمت، اس کے دورِ عروج میں تو اس سے چھٹکا چھڑا، اب محمد علی کی مروت اور ان کی تعمیل ارشاد میں مجبوراً اس میں شرکت کرنا پڑی، اور کچھ عملی حصہ لینا پڑا۔ یا لوگوں نے کوئی ذمہ داری کا عہدہ بھی سر منڈھ دیا۔ اس کی تفصیلات تو اب یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس نئی اور اہم ذمہ داری کے سر آ پڑنے پر اسی جولائی کے مہینہ میں محمد علی کو خط لکھا کہ "اپنی قسمت کو کیا کہیے کہ یہ فرض اپنے حصہ میں آیا تو اب جبکہ فضا بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے، اور کوئی ولولۂ عمل کہیں باقی ہی نہیں رہا ؎

ہر کس خمے کشیدہ در مجلسِ وصالش　　چوں دورِ خسرو آمد جام و سبو نماندہ!"

دریاباد کے لیے دعوت بھی اس خط میں تھی کہ تشریف لائیے، تو آم کھائیے، اور میرے تربیت دیے ہوئے قوالوں کی زبان سے اپنا کلام سنیے۔ جو عارف صاحب کے قلم سے آیا، اور اسی خط میں بعض اور پہلوؤں پر بھی روشنی موجود ہے:-

مولانائے محترم۔ عدم فرصت اور کچھ ناسازیٔ طبع کی وجہ سے اس عرصہ میں خط نہیں لکھ سکا

جعفری صاحب سے لکھوا تا رہا۔

ابتک جسقدر بھی ایڈیٹوریل مضامین ہمدرد مین شایع ہوئے وہ سب میرے ہی قلم سے نکلے ہین، البتہ اب تین روز سے ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے مضامین لیڈنگ آرٹکل کی صورت مین شائع ہو رہے ہین۔ اور مراکش کے متعلق مسلسل ان ہی کے قلم سے کام ہو رہا۔ مضامین اردو قالب مین ڈھال کر شائع کیے جائین گے۔ یہ بزرگ ایک سب اسسٹنٹ سرجن ہین جو شاہجہانپور مین پریکٹس کرتے تھے۔ "ضرورت" کے عنوان سے جو اشتہار ہمدرد مین نکلتا رہا ہے، اس کو دیکھکر ڈاکٹر صاحب کی بھی درخواست آئی تھی۔ اور منجملہ بہت سے لوگوں کے ڈاکٹر صاحب کے نام قرعۂ انتخاب نکلا۔ مضامین سے انکی قابلیت کا اندازہ آپ کو ہو جائیگا۔ آدمی ذہین اور ادبی مذاق کے ہین۔

مولانا نے آپ کے خط کے جواب مین فرمایا ہے کہ بڑے زور سے "ہان" لکھدو، اور فرمایا خواہ کچھ ہو مگر آم اور قوالی نہین چھوڑی جاسکتی مگر مولانا یہ تنہا مولانا کو دعوت دینے کے کیا معنی، آخر آم اور قوالی سے تو اور لوگوں کو بھی ذوق ہے۔

"جون وو بغسرو آمد" کے جواب مین مولانا فرماتے ہین کہ کام کا تو وقت یہی ہے۔ اس وقت تو ایک سیلاب تھا، اور سب ہی اس مین بہے چلے جا رہے تھے۔ اب کام کرنا عزیمت کا ثبوت ہے "پرزور مقابلہ" کا دوسرا نمبر سچ سے نقل کر دیا گیا۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ سچ جس وقت سے نکلا ہے ہماری قسمت میں صرف اس کے مضامین نقل کرنا ہی رہ گیا ہے۔"

یہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی میرے ایک مرحوم بھائی، سن مین مجھ سے بہت بڑے کے، ہم سبق تھے، اور اس لیے میرے لیے بالکل اجنبی نہ تھے۔ بلکہ میرے لیے ایک حد تک قابلِ احترام بھی تھے۔ مناسبت انھین اپنے فن سے بڑھ کر شعر و ادب سے تھی۔ مولانا نے جب ان کا تعارف کیا تو مجھ سے فرمایا کہ "مین ان کی قابلیت سے تو کم ان کی ادبیت سے زیادہ متاثر ہوا۔"

——— اب ہمدرد میں عارف صاحب کے بعد سب سے سینئر یہی تھے۔ اور عارف صاحب جب چلے گئے تو یہی انچارج ایڈیٹر ہوگئے۔ مولانا انھیں اپنے کامریڈ کے مضامین پڑھنے کو بتا دیتے، اور پھر انھیں اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ان کو مزید ہدایات زبانی بھی دیتے رہا کرتے۔

یہ ذرا سا جملہ معترضہ آگیا تھا۔ اب پھر وہی داستان جنگ ملاحظہ ہو۔ قلم اور زبان کے محاربے زور شور سے جاری ہیں۔ ہمدرد پہلے تو زور و دل سے لکھتا رہا، مگر اب کچھ سرد سا ہوگیا۔ محمد علی تو اپنے اسی اونچے سیاسی تخیل پر قائم، اور آویزش کو تمامتر عالم اسلامی کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ میں خود اتنی بلندی پر ساتھ نہ دے کر اسی عام "فرقہ وارانہ" پستی کی سطح پر ہوں، اور ہمدرد میں قبور و قباب پر لکھ رہا ہوں۔ محمد علی غریب اس حرب عقائد سے بیزار اب تک اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کم از کم ان کے مرشد تو سنبھل جائیں، اور ہندوستان میں اس خواہ مخواہ کی کشمکش کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ خوب جانتے تھے کہ فرنگی محل میں مولانا کے گرد و پیش بڑے بڑے غالی موجود ہیں اس لیے اس کا بھی اہتمام رکھے ہوئے تھے کہ ان کی نج کی سعی اصلاح میں یہ حضرات دخل نہ دینے پائیں، بلکہ انھیں اس مراسلت کی سن گن بھی نہ ملے۔

عارف صاحب کا ایک مکتوب ستمبر کا ملاحظہ ہو۔ اس سے بہت سے مسائل منقلقہ صاف ہوجائیں گے۔

"مولانائے محترم۔ السلام علیکم

آپ کے دو گرامی نامے رجسٹرڈ موصول ہوئے۔ مضمون کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے۔ باوجود کوشش کے ممکن ہے کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں۔ دوسرا آج شائع ہو رہا ہے۔ مگر صفحۂ اول پر نہ جا سکا، اس لیے کہ وہ چھپ چکا تھا۔ اب اس سلسلہ کو میں بند کرتا ہوں۔ آپ کے جواب میں

مضامین آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ لکھنؤ و بدایوں وغیرہ میں زور و شور سے جواب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے آج ایک نوٹ کے ذریعہ کچھ عرصہ کے لیے اس سلسلہ کو بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

آپ کا پہلا خط جس وقت آیا مولانا شملہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو اندر زنانخانہ میں بیٹھ کر کام کرتے رہے، اور کل پھر پٹنہ چلے گئے، اس لیے اُن امور پر گفتگو نہیں کر سکا جن کا جناب نے ذکر فرمایا تھا۔

مولانا عبدالباری صاحب کو جو خط مولانا محمد علی نے لکھا تھا اس کی اطلاع میں نے آپ کو مولانا کے علم و اجازت کے بغیر کی تھی اس لیے میں وہ خط طلب نہیں کر سکا۔ مبادا مجھ سے جواب طلب کرتے کہ کیوں تم نے اطلاع دی۔ یہ خوف مجھے یوں پیدا ہوا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھ دیا تھا کہ اس کو پڑھ کر چاک کر ڈالیے گا اور کسی کو دکھلایئے گا نہیں۔ اس کے جواب میں فرنگی محل سے دو خط خاص مولوی صاحب کے قلم کے موصول ہوئے ہیں۔ انھوں نے بھی یہی تاکید محمد علی صاحب کو کی ہے۔ تاہم ارادہ تھا کہ میں اس طرح ذکر کروں کہ آپ کو کسی ذریعہ سے اس خط کا حال معلوم ہو گیا ہے اس لیے آپ نے ایک خط میں اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ اس کی نوبت آئے وہ اس خط کو مع مولانا عبدالباری کے دونوں خطوں کے لیکر پٹنہ چلے گئے، تاکہ وہاں شوکت صاحب کو دکھلائیں۔ واپسی پر اگر آپ فرمائیں تو ان سے لیکر بھجوانے کی کوشش کروں۔

ایڈیٹوریل مضامین میں جو تغیر آپ نے محسوس کیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس مسئلہ نے خود میرے اندر ایک جوش پیدا کر دیا تھا اور حریفوں کو جو باطل پر تھے شکست دینے کا جذبہ کام کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزوں کی دشمنی کام کر رہی تھی جن کا ہاتھ اس فتنہ کی پشت

پہ ہے۔ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ میں اب بھی اچھا اور زور دار لکھ سکتا ہوں مگر اس وقت
جب میرے دل میں کوئی کیفیت پیدا ہو۔ اگر یہ فتنہ نہ دبتا اور کمزوری کے آثار مخالف کیمپ میں
نہ پیدا ہو جاتے تو شاید عرصہ تک قلم میں زور باقی رہتا۔ لیکن الحمد للہ کہ تمام مخالف سمتوں میں
اضمحلال و کمزوری کے آثار و علائم پیدا ہو گئے ہیں اور چند روز میں یہ فتنہ بالکل دب جائے گا۔
گو لکھنؤ میں اس کو ابھارنے کی کوشش کی جائے گی مگر زندگی کا حال معلوم۔ اصل یہ ہے کہ نیک نیتی
کا فریق مخالف کے ہاں فقدان ہے۔ زیادہ تر علی برادران کی رقابت کام کر رہی ہے۔ البتہ
حسرت موہانی کا افسوس ہے۔"

محمد علی "پارٹی" کی لیڈری کیلئے خلق ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ پارٹی چاہے سیاسی ہو یا مذہبی
اور نہ انھیں ایسی محدود اور تنگ قسم کی لیڈری سے کچھ دلچسپی تھی۔ مذہب ہو یا سیاست
وہ ہر مسئلہ کو "رہبر ملت" کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی، اور اس پر عالمی نقطۂ نظر سے
نظر کرنے کے خوگر تھے۔

ہمدرد میں مضامین و مراسلات برابر میرے اشاروں پر جا رہے تھے، مخالفت کا مرکز
مولانائے فرنگی محلی کو بنائے ہوئے۔ استدلال ہم لوگوں کا یہ تھا کہ اُدھر سے شریفی پریس جب
سب کا سب محمد علی کو اپنے طعن و طنز کا ہدف بنائے ہوئے ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم مولانائے
فرنگی محلی کو چھوڑے ہوئے رہیں۔ ہمدرد کا اسٹاف دینا ہم خیال تھا، اور خوشی سے ایسے مراسلے
وقائع وغیرہ لے رہا تھا۔ لیکن خود محمد علی کی نظر جب بھی پڑ جاتی بس اسٹاف والوں کی خیر نہ
تھی۔ مجھ حقیر کا لحاظ اس میں شبہ نہیں کہ محمد علی بہت کرتے تھے۔ کرم و شفقت میرے حال پر
بے نہایت رکھتے تھے۔ لیکن اصول کے معاملہ میں، حق و انصاف کے معاملہ میں، محمد علی کسی کی

مروت یا رعایت کرنا جانتے ہی نہ تھے ــــــــ عارف صاحب ۲۱ اکتوبر کو خط کیا لکھتے ہیں رو رو کر اپنا حال زار سناتے ہیں :-

"مولانائے محترم۔ مولانا محمد علی صاحب نے سخت تاکید کر دی ہے کہ اب آیندہ سے مولانا عبد الباری صاحب کے متعلق ایک حرف نہ لکھا جائے۔ خیر میں اتنی پابندی تو نہیں کر رہا ہوں، مگر جناب والا نے "فرنگی اور فرنگی محلی" کے عنوان سے جو مضمون بھیجا ہے، مجبوراً پروف پر سے حک کروا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے معذور و مجبور سمجھ کر معاف فرمائیں گے۔ میں فرنگی محل کے متعلق آپ سے زیادہ متشدد ہوں اور اسی میلان طبع اور خیالات ذاتی کا اثر تھا کہ اس قدر کثرت سے فرنگی محل کے خلاف ہمدرد میں لکھا گیا۔ مولانا نے پہلے بھی مجھکو منع کیا تھا مگر اب سختی سے منع کر دیا ہے۔ لہٰذا مجبوری ہے۔

مولانا شوکت علی اس کے حق میں تھے کہ فرنگی محل کی خبر لی جاتی رہے۔ مگر مولانا محمد علی صاحب اس سے زیادہ جلنا ہو گیا پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ مولانا ایک سادہ لوح آدمی ہیں اور جو پاس رہتا ہے اس کا ان پر قبضہ ہو جاتا ہے۔

میں نے "وقائع لکھنؤ" بغیر پڑھے ہوئے لکھنے کے لیے دیدیا تھا۔ ورنہ میں فوراً آپ سے صورت حال عرض کرتا اور پھر آپ سے مشورہ کرتا۔ لیجئے زاہد علی صاحب[1] نے ابھی پروف مولانا کو دکھلا دیا اور انھوں نے باز پرس کر لی۔ اور خود اس حصہ پر سیاہی پھیرنے کا حکم دیدیا۔ یہ خط لکھنے کے دوران میں ہوا ہے۔

امید ہے کہ آپ میری صحیح پوزیشن کو سمجھ لیں گے اور مجھ سے ناراض نہ ہوں گے۔ آج شیخ عبد العلی بھیا روی[2] کا بھی مراسلہ آیا ہے جس میں احمد حسین[3] والے معاملہ پر روشنی ڈالی ہے،

[1] مولانا محمد علی کے بھتیجے اور بڑے داماد اس وقت ہمدرد کے منیجر تھے۔ [2] مولانا فرنگی محلی کے ایک عزیز قریب (باقی ص ۲۴۹ پر)

یعنی یہی معاملہ جس پہ آپ نے بھی لکھا تھا۔ اس تحریر کو مولانا کو دکھلانے کو لیے جا رہا ہوں، اگر اجازت دیں گے تو شائع کر دوں گا، نہیں تو نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں اب زیادہ لکھنؤ کانفرنس کا ذکر کرنا اس کو اہمیت دینا ہے "

خادم عارف ہسوی

عبد العلی میاں کے مراسلہ کی اشاعت کی اجازت دیدی ہے۔ مگر مع ایک نوٹ کے جو کل شائع ہوگا"

محمد علی کا غیظ و غضب، آتش بیانی اور تیز زبانی تو دنیا میں خوب اچھلیں۔ کمتر لوگ ہوں گے جنھوں نے محمد علی کی اس شرافت قلب کو جانا، یا اس حالی ظرفی کو پہچانا۔ مسلسل حملوں اور اشتعال انگیزیوں کے درمیان اپنے مقام عدل اور نقطۂ اعتدال پر قدم جمائے رکھنا، کام ہم عوام کا نہیں، خاص اہل اللہ کا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۸) جو اس وقت دینی اور بزرگ کے شدید مخالف تھے۔ ۳؎ تبلیغیوں کے مشہور کھلاڑی۔ اس وقت خلافت کے خاص کارکن تھے۔ تبلیغیوں کی کانفرنس (لکھنؤ) میں شرکت کے لیے گئے تھے۔

باب (۳۹)

سنہ ۱۹۲۵ء (۹)

(پیر اور مرید کی آویزش)

ارض حجاز پوری کی پوری سلطان ابن سعود کے قبضہ میں آچکی، لیکن ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اس تسلط کے خلاف بغاوت ابتک جاری۔ سنہ کا سارا مہینہ ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کی کشمکش میں گزرا۔ جہاں دیکھیے یہی آویزش، جدھر آنکھ اٹھایئے یہی چپقلش لکھنؤ، فرنگی محل کی پرقوت سرپرستی کے بل پر، ابن سعود کے دشمنوں کا ایک زبردست مرکز۔ پوسٹر، پمفلٹ مضامین و مقالات، کارٹون، تمسخر آمیز ہجویہ نظمیں، ماتمی انجمنوں کی آہ و بکا، ماتمی جلوس اور جھنڈے گرما گرم تقریریں، پرخروش جلسے، ایک مستقل ادارہ "خدام الحرمین" کا قیام، ایک نام کی آل انڈیا کانفرنس وغیرہا۔ غوغائیوں کی بڑی تعداد کے ساتھ چند مخلصین کی شرکت سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔ سالار لشکر مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔ میمنہ اور میسرہ پر حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی بنے۔ عقب میں شیعہ امراء و تعلقدار خصوصاً راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خاں[1]، خلافت والے غریب کہاں تک ظلم و ستم سہتے، اور آخر کب تک نہ بپھرتے! مولوی ظفر الملک علوی[2]،

---

[1] گدیہ (ضلع بارہ بنکی) کے تعلقدار، دو بیرسٹر۔ بڑے پرجوش مسلمان۔ انگریزی میں چھوٹی بڑی متعدد تبلیغی کتابوں کے مصنف۔ اب مرحوم (سنہ ۱۹۵۲ء)

اور چودھری خلیق الزماں نے بھی ایک لمبی انگڑائی لی — یہ پایا کہ باطل کے سارے رسی کے سانپوں کو نگل جانے کے لیے عصائے حق کا ایک اژدر کافی ہے۔ نظر سب کی محمد علی ہی پر پڑی —————

اتفاق سے عین اسی زمانہ میں ۱۸ اکتوبر کو سیتاپور میں صوبہ کی پولیٹیکل کانفرنس کا اجلاس مولانا شوکت علی کی صدارت میں تھا۔ گاندھی جی بھی اس میں بولنے والے تھے اور محمد علی بھی۔ (اس مقدس "تثلیث" کے اجتماع کے بغیر اس قسم کا کوئی اہم کام ہو ہی کہاں سکتا تھا)۔ صلاح یہ ٹھہری کہ ۱۷ اکتوبر کو محمد علی لکھنؤ چند گھنٹہ کے لیے اتر پڑیں، اور ایک تقریر کر دیں جس سے ساری غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں اور غلط گمانیوں کے بادل چھٹ کے رہ جائیں۔ یہ نیازمند اس سفارت پر پہنچا یا گیا۔ دو چار گھنٹے علی برادران کے ساتھ بسر کیے۔ مزیدار کھانے ان کے ساتھ کھائے۔ اس سے زاید مزیدار باتیں ان کی سنیں۔ اور بات پکی کر کے شام واپس آ گیا۔

تاریخ موعود آئی، اور تاریخ کے ساتھ ہی محمد علی وارد لکھنؤ ہوئے ————— مرید کا کام تو شیخ کی اطاعت، حمایت و نصرت ہی ہر حال میں سمجھا گیا ہے۔ ارشاد و بیعت کی ساری تاریخ میں یہ واقعہ شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو، کہ مرید اپنے شیخ کی مخالفت کرنے اعلی الاعلان اور پرزور مخالفت کرنے دور دراز کا سفر اختیار کر کے، اپنا وقت اور اپنا پیسہ خرچ کر کے آ رہا ہے! بیعت، ارادت، محبت عقیدت کی بنیاد جس طرح حق و اخلاص پر تھی، مخالفت، تردید، تغلیط کی بنیاد بھی حق و اخلاص پر رہی۔ محبت اگر اللہ کے لیے تھی، تو اس علی گڈھ کے نیچری اور آکسفورڈ کے گریجویٹ نے، اس چودھویں صدی ہجری میں، اپنی مثال سے یہ دکھا دیا کہ مخالفت بھی اللہ ہی کے لیے ہو سکتی ہے!

————— حب فی اللہ کے بعد بغض فی اللہ کی یہ کیسی قابل رشک تفسیر رہی!

لکھنؤ کی منزل تو ابھی بعد کی تھی۔ امتحان کی گھڑی اس سے قبل سیتاپور ہی میں آ گئی۔[1] بعد مغرب وہاں

---

[1] سیتاپور معتقدین و مریدین فرنگی محل کا ایک خاص مرکز تھا۔

کی جامع مسجد میں پرزور تقریر اسی مسئلہ حجاز پر کر رہے تھے، کہ حاضرین میں سے کوئی صاحب بول اٹھے کہ "آپ کے مرشد کا مسلک تو اس کے خلاف ہے، پھر یہ مرشد سے مخالفت کیسی"، محمد علی نے تقریر کی اسی رو اور روانی میں بغیر یک لمحہ کا خلل ڈالے جواب دیا "میں نے تو مرشد اسی لیے انھیں بنایا تھا کہ جن معاملات میں مجھے ہدایت کی ضرورت ہوگی وہ مجھے حق کی راہ دکھائیں گے، لیکن اس خاص مسئلہ میں تو وہ خود میری رہنمائی کے محتاج ہیں، ان کی اعانت کرنا میرا فرض ہے" ——— مرشد کو مرشد کے مرتبہ پر، اور اللہ کو اللہ کے مرتبہ پر رکھنے کی ایسی ناقص ایمانی مثالیں میرے علم میں متعدد نہ اس کے قبل آئی تھیں، نہ اس کے بعد ہی آئیں!

مرید اپنے مرشد کا محض مطیع ہی نہ تھا، دوست و محب بھی تھا، عاشق و شیدائی بھی تھا، ممنون کرم بھی رہا کرتا تھا۔ پارٹی نے ایک بڑی بے ڈھب ایک شرط یہ لگا دی تھی کہ لکھنؤ میں قیام اس بار مجلس فرنگی محل میں نہیں بلکہ چودھری خلیق الزماں کے ہاں ہو، ورنہ تعلقات کی ذہنی کشیدگی کی حالت میں اپنے لوگوں میں سے فرنگی محل جانا کون گوارا کرے گا؟ سالہا سال کا معمول ٹوٹا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دل سے محمد علی نے ایک فرنگی محل چھوڑ کر خلیق صاحب کی مہمانی قبول کی۔ یہ محض اتفاق کہیے یا کچھ اور، کہ مولانائے فرنگی محلی بھی اس تاریخ کو لکھنؤ سے باہر تھے، ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور حیدرآباد میں۔ صبح ہوئی کہ خلیق صاحب کی کوٹھی (واقع خیالی گنج) میں محمد علی کے گرد مجمع ہو گیا۔ پرانے مخلصوں اور معتقدوں، خلافت کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ بعض نئے حواری بھی! ——— محمد علی کی محبت دارادت میں نہیں، فرنگی محل کی ضد اور عناد پر! حب علی میں نہیں، بغض معاویہ پر! ادھر محمد علی خود فرنگی محل جانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ پارٹی کا حکم اس حد تک تو بہر حال نہیں مان سکتے تھے کہ فرنگی محل سے کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔

پارٹی کا کوئی شخص کیوں ہمراہ جانے لگا تھا بس یہی ڈائری نویس، جو پارٹی بھر میں سب سے زیادہ ٹھنڈے مزاج کا سمجھا جاتا تھا، اور جس کے تعلقات اس وقت تک بھی فرنگی محل سے بدستور نیازمندانہ تھے، ہمراہ ہوا، خلیق صاحب کے موٹر پر محمد علی فرنگی محل کے لیے دوپہر سے کچھ قبل روانہ ہوئے لیکن کے بجائے زیارت صرف مکان کی ہوئی۔ مولانا کے صاحبزادہ جو اب ماشاء اللہ جمال میاں کے نام سے مشہور ہیں اس وقت بالکل بچہ تھے، اور کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ البتہ مولانا کے دوسرے سن وآ اعزہ مولوی سلامت اللہ صاحب، مولانا مفتی محمد عنایت اللہ وغیرہم بڑھ کر ملے۔ حسرت موہانی بھی یہیں مل گئے۔ عجب نہیں جو کمک کے لیے بلا لیے گئے ہوں۔

فرنگی محل کی میزبانی اور مہمان نوازی مشہور ہے۔ دوپہر کا کھانا یہیں ہوا۔ لیکن دسترخوان ہی پر گرم گرم اور لذیذ کھانوں کے ساتھ گفتگو بھی گرماگرم اور زیادہ بدمزہ شروع ہوگئی۔ محمد علی بجز اپنے مرشد کے اور کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہی نہ تھے۔ لیکن سوالات شروع ہوگئے اور جواب انھیں بادل ناخواستہ دینے پڑے۔ چلتے چلتے بات بڑھنے لگی۔ اور جب رخصت ہو کر فرنگی محل کے پل پر، پوسیں چوکی کے سامنے، موٹر پر سوار ہونے لگے، تو فریقین کا لہجہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ راہگیروں کا ایک خاصہ مجمع گویا تماشا دیکھنے ہی کے لیے ہوگیا۔ اور اس کم ہمت کو ہمت کر کے مولانا عنایت اللہ صاحب کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا، اور ادب کے ساتھ عرض کرنا پڑا کہ "مولانا، یہ چوراہا ہے چوراہا" —— یہ سارے جزئیات جذبات کی شدت اور زبان کی حدت کا نمونہ دکھانے کو قلمبند ہو رہے ہیں —— محمد علی کی طرف سے بڑی گرفت اس لکھنؤ والے بڑے جلسے کے اشتہار کی اشتعال انگیزی اور مبالغہ آمیزی پر تھی جس کا کوئی جواب فریق ثانی کے پاس نہ تھا۔

باب (۴۰)

سنہ ۱۹۲۵ء (۱۰)

میدان جنگ کا ایک منظر

جلسہ کے اصلی کرتا دھرتا مولوی ظفر الملک علوی تھے۔ ان ہی نے سارے انتظامات کر رکھے تھے لیکن عین وقت پر پیر میں زخم آگیا تھا، اور اس "غدر لنگ" پر گھر کے اندر معتکف تھے۔ کہیں آنے جانے کے قابل نہ تھے۔ محمد علی فرنگی محل سے اٹھ ان ہی کے ہاں آئے۔ یہ دفتر الناظر دریچ اس وقت وکٹوریہ اسٹریٹ پر فرنگی محل سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھا۔ یہیں ان کے ملاحظہ میں لکھنؤ کے وہ اخبارات خصوصاً "پنچ" اخبارات لائے گئے، جنھوں نے مزاح وظرافت کو آڑ بنا کر تہذیب، شرافت وانسانیت کا اپنے ہاتھ سے گویا گلا گھونٹ گھونٹ دیا تھا۔ ـــــــ کلکتہ اور بمبئی میں جس طرح سالسٹر بڑے بڑے بیرسٹروں کو مقدمہ کے کاغذات دکھا دکھا کر پیروی کے لیے تیار کرتے ہیں، کچھ ایسی ہی منزل میں اس وقت مولوی حاجی ظفر الملک تھے۔ انھیں خود تو جلسہ میں جانا نہ تھا البتہ محمد علی کو ہر طرح لیس کر دینا تھا۔

یہاں سے چل کر محمد علی قیصر باغ میں راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں آئے احباب مہاراج ہو چکے تھے، اور اس وقت یو۔پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر تھے۔ در پردہ ان کی بھی ہمدردیاں محم… ابن سعود ہی کے ساتھ تھیں، لیکن بہرحال یہ کھلے ہوئے معاند نہ تھے اور شیعہ رئیسوں میں سب سے غنیمت تھے

محمد علی سے جس طرح ہمیشہ ملتے آئے تھے، ابکی بھی ملے۔ محمد علی کا معمول ہمیشہ سے ان کی ملاقات کا تھا، اور اس میں ان کے سرکاری عہدہ نے بھی فرق نہ پڑنے دیا۔ نہ ان کی طرف سے نہ محمد علی کی طرف سے۔ آج کے ہونے والے جلسہ کا بھی ذکر رہا۔ مہاراجہ نے رات کے کھانے پر بھی مدعو کر دیا۔ باتوں باتوں میں ذکر شیخ مشیر حسن قدوائی کا آ گیا، جو اتفاق سے اس وقت محمد علی کے بالکل ملحق کیمپ میں تھے۔ مہاراجہ نے ان کا ایک اعتراض (تمامتر لغو) محمد علی کی پبلک زندگی سے متعلق نقل کر کے ان کا یہ قول بھی دہرایا کہ "اگر یہ غلط ہے تو محمد علی حلف سے اس کا انکار کر دیں"۔ محمد علی نے برجستہ ایک الزامی جواب شیخ صاحب کی خانگی زندگی کے متعلق مہاراجہ کے کان میں دیا۔ اور کہا کہ "اگر یہ غلط ہے تو مشیر حسین حلف سے اس کا انکار کر دیں"۔ جواب تھا بڑا دلچسپ، لیکن اتنا عریاں کہ صفحۂ کاغذ پر اس کے لانے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ مہاراجہ تھے بڑے مستعلیق، مہذب اور شائستہ۔ ایسا غیر متوقع جواب سن کر اور کچھ نہ بن پڑی بجز اس کے کہ زور سے لاحول ولا قوت پڑھ دیں!

——— محمد علی بے حد برجستہ گو اور حاضر جواب تھے، چپ رہنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وقت آنے پر ہزل گوئی اور فحاشی یا پھکڑ کسی بات میں چوکنے والے نہ تھے۔ افسوس کہ انکے متعلق یہ علم، صرف علم سینہ ہی رہے گا، علم سفینہ نہ بن سکے گا۔

جلسہ کا مقام، عمارت رفاہ عام کلب کا عقبی صحن تھا۔ اس وقت تک علاوہ امین الدولہ پارک کے پبلک جلسے یہاں بھی ہوتے رہتے تھے۔ وقت وہی سہ پہر بعد عصر کا، جو لکھنؤ کے پبلک جلسوں کے لیے اس وقت عام وقت تھا۔ جلسہ کے داعیوں میں شہر کے معززین، شرفاء، اور ہر طبقہ کے نمایندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ ڈائری نویس سایہ کی طرح محمد علی کے ساتھ ساتھ جس وقت ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہنچے ہیں، بہت بڑا مجمع پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ موٹر برساتی میں رکا

اور ہم لوگ اتفاق سے عمارت کے ہال کے اندر سے ہوکر گزرے۔ دیکھا کر حال کے اندر تماشائیوں کی نظر سے مخفی و مستور، راجہ صاحب سلیم پور اور راجہ نواب علی خاں بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھ سادہ لوح کو حیرت ہوگئی کہ یہ حضرات یہاں کہاں۔ سرسری صاحب سلامت ہوئی۔ ادھر ذہن بھی نہ گیا کہ اگر جلسہ میں شرکت ہی کھلے خزانہ انھیں منظور ہوتی، تو بجائے صحن میں ہونے کے، ہال کے اندر ان کا "قیام" کیوں ہوتا۔

صدارت کے لیے انتخاب چودھری خلیق الزماں صاحب کا ہوا۔ اور جلسہ شروع ہوا۔ ایک عرب سیاح توفیق شریف اس زمانہ میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے انھوں نے عربی میں ایک تقریر کی۔ اور اس کے ایک ایک فقرہ کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کرتے گئے اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، اور نماز اسی صحن میں بہت بڑی جماعت کے ساتھ ہوئی۔ بعد نماز محمد علی تقریر کو اُٹھے۔ اُنکا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا قیامت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سب سے پہلے بہت دور سے فرنگی محل کے ایک مرید خاص کی طرف سے ایک سوال کی آواز اور اس آواز پر معاً دوسری آواز، اور تیسری آواز، اور پھر ایک ساتھ بیسیوں آوازیں! گویا ایک کورس تھا، جو بجائے نغمہ و ترنم کے، شور و غوغا کی لے میں بلند ہو رہا تھا۔ اب سوالات موقوف تھے، اور انکے بجائے صرف یہ مطالبہ اور یہ نعرہ کہ "ہم نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے" حلق کی پوری قوت اور چیخ کی انتہائی بلندی کے ساتھ فضا میں قائم! صدر مجلس بار بار نظم قائم رکھنے کی ہدایت اور خاموش ہونے کی تلقین فرما رہے ہیں، چمکار کر بھی اور گھُڑک کر بھی، لیکن جو محمد علی سے بغاوت پر تُل کر آئے تھے، وہ خلیق الزماں غریب کو کیا خاطر میں لاتے، غوغائیوں کی تعداد کچھ ایسی بڑی نہ تھی، سو ڈیڑھ سو ہونگے۔ لیکن صحن کے مختلف حصوں میں بڑی ترکیب اور اُستادی کے ساتھ کھڑے

ہوئے تھے، اور جلسہ کو درہم برہم کردینے کے لیے بالکل کافی بلکہ کافی سے زاید تھے۔ بعض ماتمی انجمنوں
کے ارکان پیش پیش دکھائی دیے، اور ان شیعہ رئیسوں کی تشریف آوری کے معنی اب بالکل
روشن تھے!

سیکڑوں ہزاروں عام حاضرین دنگ وحیران، متحیر و پریشان کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!
اندھیرا تو ہو ہی چلا تھا کہ اتنے میں ایک بڑا سا ڈھیلا تخت صدارت کے سامنے آکر گرا۔ عین
اس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا اور حسرت موہانی کے ایک ندیم خاص بھی۔ ڈھیلا گرتے ہی ایک شور
برپا ہوا "لینا" "پکڑنا" "یہ کس کی حرکت ہے" "جانے نہ پائے"۔ ایک ملیح آبادی سرخ پوش
خاں صاحب (ایک مشہور ملیح آبادی کے والد ماجد) ڈنڈا لیکر یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "یہ بدمعاش
یوں نہ مانیں گے"۔ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اور اپنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ خدا کے لیے کہیں ڈنڈا
نہ چلا بیٹھیے گا، غضب ہو جائے گا۔" بولے کہ "نہیں، شہر کا مجمع ہے، یہ یوں ہی ٹھیک ہو سکتا ہے"۔
— حلقہ فرنگی محل کے ایک خاص متوسل کھدر پوش اور اس وقت تک مولانا شوکت علی
سے تعلق خاص رکھنے والے، دکھائی دیے کہ ہر طرف گھوم پھر کر گویا اس لشکر کی کمان کر رہے ہیں۔
محمد علی نے چلا چلا کر درود شریف پڑھا اور دوسروں سے پڑھوایا۔ لیکن اثر کس پر ہوتا؟ جب خود
آل محمد کی خطابت میدان کربلا میں امت کے لیے بے اثر رہی، تو آل محمد کا محض نام کب ہمیشہ
اور ہر جماعت پر اثر کر سکتا ہے؟ جالب صاحب (ایڈیٹر ہمدم) بھی تخت صدارت کے قریب
ہی تھے، اور سب کے ساتھ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ محمد علی نے ان کا نام لیکر پکارا، اور پوچھا
"جالب صاحب آپ میری تقریر سننا چاہتے ہیں یا نہیں؟" بولے "کیوں نہیں۔ ضرور سنوں گا"۔
"اچھا تو پھر باقاعدہ بیٹھ جایئے"۔ لیکن ایک جالب بیچارہ کی شرافت اور باقاعدگی سے کیا ہوتا تھا۔

گیس کے ہنڈے بجھائے جانے لگے، اور پوری کیفیت ہڑبونگ کی پیدا ہوگئی۔ ایک افراتفری کا عالم نفسی نفسی پڑگئی، اندھیرے میں یہ اس پر گرتا، وہ اسے ڈھکیلتا۔ حکومت اس وقت نہ عقل کی نہ نقل کی، نہ شریعت کی نہ شرافت کی۔ صرف شرارت اور ننگے پن کی تھی ——— عارف رومی نے مثنوی میں ایک جگہ کہا ہے کہ ایک شخص جب سننا نہ چاہے تو سو سنانے والوں کا ناطقہ بند کر سکتا ہے

یک کس نا مستمع ز ستیز و رد / صد کس گوینده را عاجز کند

اور پھر جب غوغائیوں کی تعداد ایک دو نہیں، بیسیوں اور پچاسوں ہو تو ظاہر ہے کہ انھیں سنانا کس کے بس میں ہے؟

---

۵ منٹ۔ ۱۰ منٹ۔ ۲۰ منٹ۔ صدر صاحب بھی آخر کب تک صبر و انتظار کرتے؟ کچھ دیر اور موقع دینے کے بعد جلسہ برخاست کر دیا ع

بات رہ جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے!

اللہ کی شان، کہ مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے ساتھ یہ سلوک، غیروں کا نہیں خود مسلمانوں کا دیکھنے میں آیا! اور وہ بھی کہاں، مسلمانوں کے خاص شہر اور مسلم تہذیب و شائستگی کے مرکز لکھنؤ میں! کہاں ہزاروں کا مجمع محض محمد علی کا نام سنکر تقریر کے شوق و اشتیاق میں آیا تھا، اور کہاں چند شریروں کی جسارت نے نوبت یہ پہنچا دی۔ محمد علی جلسہ گاہ سے چلے، اور اب کی پھر اسی حال کے اندر سے گزرے۔ مخلصوں اور معتقدوں کا ایک ایک ہجوم ہمراہ تھا۔ بعض کا اصرار ہوا کہ جلسہ اب منعقد ہو، شور و پشت عنصر چلا گیا، اس لیے مشتاقوں کا اشتیاق اب پورا کیا جائے۔ میری شامت کہ ان لوگوں کے کہنے سے یہی بات میں نے محمد علی کے کانوں تک پہنچا دی۔ اسی بھرے مجمع میں میرے اوپر وہ زبردست ڈانٹ پڑی کہ واسے آج تک نہیں بھولا ہوں ———

محمد علی کے غصہ میں تمامتر آ رہی آ رہو تی تھی۔ تصنع و آورد کی ہر آمیزش سے خالی۔ اتنی مصلحت بینی کی گنجایش ہی کہاں ہوتی تھی کہ یہ جگہ خلوت کی ہے یا جلوت کی! مجرم پر محض عتاب ہی ہو رہا ہے۔ یا اس کی تفضیح بھی ہوتی جا رہی ہے۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف وہی کھدرپوش "آنریری" فرنگی محلی جو غوغائیوں کی کی کمان کرتے ہوئے دیکھے گئے تھے، اب یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ "محمد علی صاحب اور جا کر ٹھہریں خلیق الزماں کے ہاں"! یہ گویا اقرار اس امر کا تھا کہ اصل مخالفت خود محمد علی سے نہیں، بلکہ ضد و کد جو کچھ ہے وہ ان کے لکھنوی رفیقوں اور ہمدردوں سے ہے ـــــ غوغائی سرداروں نے ایک عارضی وقتی ہنگامی "فتح" حاصل کر کے مستقل بدنامی اپنے لئے حاصل کر لی۔ شہر میں گلی گلی، گھر گھر ان پر نفرین ہونے لگی۔ اور تو اور، خود "مخلصین" کے ہم خیالوں میں جو لوگ سنجیدہ، شریف المزاج اور خوش فہم تھے جیسے حسرت موہانی، سید جالب، وغیرہم، انھوں نے بھی اس طریقہ کو ناپسند کیا۔ اور روزنامہ ہمدم نے تو علانیہ اس سے اپنی بیزاری ظاہر کی۔ ساری شریف پبلک کے سامنے اب یہ سوال آ گیا کہ مخالفت کا یہی طریقہ اگر چل نکلا، تو آئندہ پبلک جلسوں کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے معنے تو یہ ہوئے کہ جس کسی نے بھی کرایہ پر دس بیس لفنگوں کو جمع کر لیا، وہ جس مقرر کو چاہیگا بولنے سے روک دےگا

باب (۳۱)

سنہ ۱۹۲۵ء (۱۱)

مستقل کیمپ: قبتی ولاقبتی
(دو)

ڈھائی ہفتہ کی مدت ہی کیا ہوتی ہے، بات کہتے گزر گئی۔ ۸ر نومبر کے لیے دوسرا جلسۂ عام قرار پایا۔ اور اس کی جلسہ کا مقام بجائے رفاہ عام کے کھلے ہوئے میدان کے، ممتاز یتیم خانہ اسلامیہ (واقع باغ گونگے نواب) کی عمارت تجویز ہوئی، جو باوجود لق و دق ہونے کے بہرحال ایک محدود و مقید عمارت تھی، بے قید میدان نہیں۔ جلسہ کے داعیوں میں اس کی پہلے سے بھی کہیں زاید لوگ شامل ہوئے۔ کوئی ۹۰ آدمیوں کے دستخط اعلان پر تھے۔ ان میں وکیل، بیرسٹر، رئیس، تاجر، عالم، ڈاکٹر، زمیندار، پیشہ ور، اور برادریوں کے چودھری، ہر طبقہ کے نمایندے پوری طرح پر تھے۔ اور اس کی محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء دہلی کے دو مشہور مقرر عالموں کو بھی بلایا گیا۔ مولوی حاجی ظفر الملک اپنا حجرۂ اعتکاف چھوڑ کر باہر نکلے۔ اور اس کی انتظامات گویا تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں رہے۔ ادھر مولانا عبدالباری صاحب بھی سفر سے واپس آچکے تھے اور فرنگی محل ہی میں مقیم تھے۔ اخباری جنگ اور تحریری جنگ ہنوز بلکہ چار چند جوش و سرگرمی کے ساتھ جاری۔ لکھنؤ کا مقامی پریس تقریباً سارے کا سارا فرنگی محل کا ہمنوا، لیکن باہر کے اخبارات زمیندار (لاہور) خلافت (بمبئی)، مدینہ (بجنور) تنظیم (امرتسر) وغیرہ اکثر ہمدرد و محمد علی کے ساتھ۔ ادھر سے اگر اخباری مضامین و مقالات بہ کثرت نکلتے تو

اُدھر سے (خصوصاً فرنگی محل اور پھلواری سے) ان کے جواب میں پمفلٹ اور رسالے شائع ہوتے اور ادھر خلافت کمیٹی جیسا زبردست ادارہ موجود تھا، جو لاکھ لٹ جانے پر بھی بہت کچھ منظم تھا۔ ادھر بھی اس کے جواب میں ایک نیا ادارہ انجمن خدام الحرمین کے نام سے عالم وجود میں آچکا تھا، اور اس کے کارکنوں کا نیا نیا جوش و ولولہ قدرۃً بہت بڑھا ہوا تھا۔

اصل نزاع جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی نجدیوں کے روضۂ مبارک پر حملہ کرنے کی روایتیں سو یہ روایت اب سب کے نزدیک ضعیف کیا، باطل و موضوع ثابت ہو چکی تھی، اور یہ مسئلہ ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اب نہ اس پر بحث تھی نہ اس کا کوئی تذکرہ ——— جب جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو لوگ اصل حقائق اور نفس مسائل کی طرف سے ایسے ہی غافل و بے پروا ہو جاتے ہیں ——— بلکہ اب سارا زور اور ساری گرماگرمی وہابیت اور خوش عقیدگی کی باہمی اور قدیم جنگ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف یہ اصرار کہ قبوں اور پختہ قبروں کا نام و نشان بھی دنیا میں نہ رہنا چاہیے اور جو ہمت والا یہ کر گزرا، وہی مجاہد ہے، غازی ہے، سچا متبع سنت ہے۔ اور دوسری طرف یہ غلو کہ جس نے قبوں کو ہاتھ لگایا، اس گستاخ و بے ادب کے ملعون ہونے میں کیا شک۔ وہ رسولؐ اور آل رسولؐ کا کھلا ہوا دشمن اور اسلام کا مجرم و باغی ہے۔ دو ڈھائی مہینہ کے اندر جس کثرت سے اشتہاروں، اعلانوں، مضمونوں، رسالوں، پمفلٹوں کا انبار اس موضوع پر فریقین کے پرجوش اہل قلم کی طرف سے لگ گیا، انھیں کوئی یکجا کرے، تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائیں ——— اور جب ہر فریق کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو جائیں اور ہر گروہ ان ہی بحثوں کو دین کا بنیادی مسئلہ بنالے، تو ظاہر ہے کہ فریق مخالف اور اس کے پیشواؤں اور سرداروں کے لیے کسی نرمی و رواداری کی گنجائش اس کے قلب میں کہاں نکل سکتی ہے؟

گویا "مقلد" و "غیر مقلد" کے وزن پر اب مسلم ہندوستان "قبی" و "لاقبی" کے دو مخالف کیمپ
میں بٹ چکا تھا۔ قبہ شکنی، ور قبہ نوازی کے اس ہنگامہ و غلغلہ میں ادھرادھر ڈگمگائے بغیر جادۂ مستقیم
پر گنتی کے جن چند لوگوں کے قدم ثابت و استوار رہے، ان کے سردار و پیشوا محمد علی تھے۔ محمد علی اس "حرب
عقائد" سے بے تعلق و ماوراء اس سارے قضیہ کو اس سے کہیں بلند تر زاویۂ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔
وہ سلطان ابن سعود کے دوست، ہمدرد و ہوا خواہ اس وقت بیشک تھے۔ مگر صرف اس بناء
کہ ان کے خیال میں اب سلطان کے ذریعہ سے جزیرۃ العرب اغیار کے خطرۂ دست برد محفوظ ہو رہا تھا
اور اب ارض حرم میں صحیح و آزاد "اسلامی" یعنی عالم اسلام کی مشترک حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی
رہیں یا گریں، بہرحال محمد علی کی نظر میں سلطان نجد کی حیثیت ارض حرم کو شریفی مظالم سے نجات دلانے
والے محسن کی تھی، اور امید یہ تھی اب ارض حجاز پر کسی ایک نسل یا خاندان کو موروثی ملوکیت کے بجائے
اسلامی جمہوریت قائم ہوگی۔ محمد علی کو جزئیات کلامیہ و فقیہ میں پڑنے کی فرصت کہاں تھی، ان کے پیش نظر
تو اتنا عظیم الشان کام تھا کہ جس کی نظیر ہی خلفائے راشدین کے بعد کہیں نہیں ملتی۔ وہ محض ان ہی توقعات
اور امیدوں کے سہارے سلطان کے ہمدرد و حامی تھے، اور باوجود ذاتی طور پر قبہ نوازی کی جانب میلان
رکھنے کے قبہ نوازوں کی اس ہنگامہ آرائی کو اپنے مقاصد عالی کے حق میں سخت مضر سمجھ رہے تھے۔ اور
دل سے چاہ رہے تھے کہ کسی طرح ہندوستان میں یہ شور فرو ہو۔ اور سلطان کو بجائے مخالفت و
مزاحمت کے ہندوستان سے تائید و امداد حاصل ہو ——— ان باریکیوں اور بلند خیالیوں
تک نظر کس کی پہنچتی؟ نتیجہ قدرۃً یہ نکلا کہ ادھر ہندوستان کے سارے قبہ شکن خوش ہوئے کہ محمد علی
جیسی زبردست شخصیت کی تائید ہاتھ آگئی۔ ادھر ملک بھر کے قبہ نواز اسی درجہ میں ناخوش و ناراض
بھی کہ راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ، راستہ کا سب سے بھاری پتھر یہی محمد علی کی ذات ہے۔ اگر اسے گرا
تو بس بیڑا پار ہے۔ ان چند ہفتوں کے اندر جتنے مارٹن محمد علی کے نکل گئے، جتنی ہجو یہ نظمیں ان کے

متعلق جو چبھن جتنی گالیاں اور کوسنے ان پر پڑے، ان کے سننے اور برداشت کرنے کے لیے بھی محمد علی ہی کا جگر درکار تھا۔

مثنوی کے شروع ہی میں ایک شعر ہے ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نجست اسرار من

اب اس کا مصداق ہندوستان کے طول و عرض میں محمد علی سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ دوست و دشمن دونوں کا منطقی استدلال یہ تھا کہ

سلطان ابن سعود وہابی اور قبہ شکن ہیں۔

محمد علی سلطان کے دوست و ہمدرد ہیں،

اس لیے محمد علی بھی وہابی اور قبہ شکن ہیں!

تحریک خارجیت نے، جو ایک طرح کی "انارکزم" (لاحکومتی) کے مرادف ہے، جب خلافت کے دور رابع میں جنم لینا شروع کیا تو اتفاق سے مسند خلافت پر حضرت علیؓ فائز تھے، اور اسلیے خارجیت جو درحقیقت ہر بشری حکومت کے خلاف ایک بغاوت تھی اور اپنی ناسمجھی سے قرآن کو ہر انسانی حکومت کا مطلق صورت میں مخالف سمجھ رہی تھی، اس کی بغاوت کا رخ تمہ رنہ اس وقت امیر المومنین حضرت علیؓ کی جانب ہو گیا۔ اس سے لوگوں میں یہ خیال چل پڑا کہ خارجیت کوئی تحریک شیعیت کے مقابل، اور بالذات حضرت علیؓ کی مخالفت میں تھی، اور عوام تو عوام خواص تک اب تک اس خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خارجیت اور شیعیت ہم سطح تحریکیں، ایک دوسرے مقابل، اور ذات علیؓ کی مطلق دشمنی اور مطلق دوستی کے مرادف ہیں!

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

اس وقت خلیفہ اگر اتفاق سے بجائے حضرت علیؑ کے حضرت عمرؓ یا حضرت ابوبکرؓ ہوتے، تو خارجی یقیناً ان کے بھی اسی درجہ میں دشمن ہوتے۔ اس لیے کہ انھیں اپنے اصول و عقائد کے لحاظ سے مخالفت ان میں سے کسی کی متعین شخصیت سے نہیں بلکہ نفس امارت و امامت و حاکمیت انسانی سے تھی، خواہ وہ حکمراں ان کے سامنے زید، عمر، بکر کوئی بھی انسان ہوتا۔ ——— ٹھیک اسی حال میں اس وقت محمد علی تھے۔ وہ ہر اس مسلمان کے حامی و ہمدرد ہو جاتے (بغیر اس کے جزئیات عقائد کے اندر گھسے ہوئے) جو ارض حجاز کو غیر مسلم اور فرنگی اثرات سے آزاد کرتا۔ خواہ وہ مسلمان "مقلد" ہوتا یا "غیر مقلد" خارجی ہوتا یا شیعی، زیدی ہوتا یا حنبلی، "وہابی" ہوتا یا "بدعتی"۔ یہی بات انھوں نے سلطان ابن سعود میں پائی تھی۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ سلطان حنبلی تھے، قبہ شکن تھے، ابن عبد الوہاب کے ہم مشرب تھے۔ محمد علی کو ان کی حنبلیت، وہابیت، قبہ شکنی، ان چیزوں سے کیا غرض اور کیا بحث تھی۔

باب (۴۲)

۱۹۲۵ء (۱۲)

(حُبِ عَلی کم، بغضِ معاویہ زیادہ)

فرنگی محل کے دورِ متاخرین میں ایک جامع شریعت وطریقت، عالم باعمل وسالک بے بدل مولانا ابوالحیاء محمد نعیم (المتوفی سنہ ۱۹۰۲ء) قدس اللہ سرہٗ گزرے ہیں، ان کے ایک مسترشد روایت کرتے تھے کہ حضرت نے جب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، تو فرمایا کہ میاں، اگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے میری مغفرت کر دی تو وعدہ کرتا ہوں کہ اُس وقت تمہیں یاد رکھوں گا۔ اب تم بھی اسی طرح کا اقرار مجھ سے کرو کہ حق تعالیٰ کے ہاں اگر تمہیں مقبول ثابت ہوئے تو تم بھی مجھکو بھول نہ جاؤگے۔ معاہدۂ بیعت تو طرفین سے ہوتا ہے۔ پیر و مرید دونوں میں سے جس کسی کا نصیب یاوری کر جائے، وہ دوسرے کو اپنے ساتھ گھسیٹے"۔ پیر و مرید کے سلسلہ میں عام عقیدہ دلوں میں جما ہوا یہ ہے کہ حقوق سارے کے سارے مرشد ہی کو حاصل رہتے ہیں۔ اور فرائض کا بار سارے کا سارا مرید کے ذمہ رہتا ہے۔ مولانا کے ارشاد نے اس کے برعکس یہ حقیقت واضح کر دی، کہ کچھ حقوق مرید کے بھی ہوتے ہیں، اور دونوں پر ایک دوسرے کی ہواخواہی واجب ہوتی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کا فضل و کمال کسی تعارف کا محتاج نہیں اپنے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے عاشق زار بھی تھے۔ مرشد نے مکہ معظمہ سے اپنی تازہ تصنیف "فیصلۂ ہفت مسئلہ"

کے دو سو نسخے ان کے پاس گنگوہ روانہ فرمائے۔ مولانا نے بجائے اس کے کہ مرشد کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر اور آنکھوں پر جگہ دیتے، تعظیم و تکریم یہ کی کہ انھیں ہاتھ تک نہ لگایا، بلکہ ایک روایت تو یہاں تک ہے کہ ان سے حمام گرم کرایا! یہ اس لیے کہ مولانا کی رائے میں حضرت حاجی صاحب کی تحقیق ان مسائل میں صحیح نہ تھی، اور رسالہ کی اشاعت مصالح امت کے حق میں مضر تھی۔ مرشد اور مرید کے تعلقات اس واقعہ کے بعد بھی ایک طرف سے شفقت و کرم کے اور دوسری طرف سے والہانہ عقیدت کے بدستور قائم رہے۔

ماضی قریب کے دو مسلم الثبوت بزرگوں کی حکایتوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ عوام افراط عقیدت اور غلو سے خوش عقیدگی میں جو کچھ بھی سمجھتے رہیں، محققین نے مرید کا بھی ضمیر ایک زندہ ضمیر تسلیم کیا ہے؛ اور مرشد کے وجود میں ضم ہوئے بغیر بھی؛ اس کی مقبولیت کا امکان تو بہر حال مانا ہے ———

اور پھر عین دور حاضر میں حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نے جس جس طرح مرشد کے مطاع و مقتدا ہونے پر قیدیں لگائی ہیں، اور اس کی اطاعت و تقلید کو واجب جن جن حدود کے اندر رکھا ہے۔ اس کا تعلق تو صرف ان کے رسائل و مقالات کے دیکھنے سے ہے۔

محمد علی کے دامن پر، خوش عقیدہ گروہ کی طرف سے، ایک بہت بڑا داغ مرشد کی مخالفت کا عاید کیا جاتا ہے۔ اور اچھے اچھوں کی زبان پر یہ فقرہ آ جاتا ہے کہ "وہ کچھ بھی سہی، شیخ کی مخالفت آئین طریقت میں کفر سے کم نہیں"۔ حالانکہ یہ اختلاف جو کچھ بھی تھا، سلوک طریقت کے کسی باطنی معاملہ میں تو کیا، شریعت ظاہری کے بھی کسی مسئلہ میں نہ تھا۔ اور تصادم افکار کا تعلق عقاید سے ذرہ بھر بھی نہ تھا۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ سیاسیات حجاز بلکہ سیاسیات عالم اسلامی کے سمجھنے میں اس وقت مولانا عبد الباری صاحب کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے۔

وہ غلط اطلاعات پر اعتماد کر کے سلطان کو مآثر مسلمین کا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں، اور اس لیے اس کی مخالفت پر تل گئے ہیں۔ حالانکہ سلطان ایک مبشر ہے، حجاز کو نکبت سے اور فرنگی اثرات سے نجات دلانے والا ہے، جمہوریت و شورویت کی بنیاد قائم کر کے خلافت راشدہ کی روح کو تازہ کرنے والا ہے ——— ان کی سیتاپور والی تقریر کا اقتباس ابھی چند صفحے اوپر درج ہو چکا ہے کہ جب کسی نے دوران تقریر میں سوال کر دیا کہ آپ تو ہمیں ابن سعود کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ کے شیخ ابن سعود کو نکلوا رہے ہیں، مرشد و مرید میں یہ مخالفت کیسی؟ تو محمد علی نے برجستہ جواب دیا کہ

"یہ مخالفت نہیں ہے۔ رائے و بصیرت کا اختلاف ہے۔ جن معاملات میں مجھے ہدایت و رہنمائی کی ضرورت تھی، وہ میری دستگیری کر رہے ہیں۔ جس مسئلہ میں خود انھیں صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے، میرا فرض ہے کہ میں ان کی اعانت کروں۔"

بات بالکل صاف و واضح تھی۔ لیکن دنیا اتنی نیک، صلح جو، معقولیت پسند کب رہی ہے؟ یہاں تو لوگوں کو مزہ لڑائی کا تماشہ دیکھنے میں ہمیشہ آیا ہے۔ جب امیرالمومنین علی مرتضیٰ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے درمیان لگائی بجھائی کرنے والوں، نفاق ڈلوانے والوں کی کمی نہ تھی، تو چودہویں صدی کے محمد علی اور ان کے مرشد کس شمار قطار میں تھے ———
اُدھر ہر وقت یہ کہہ کہہ کر ابھارا جاتا، اکسایا جاتا رہتا تھا کہ "دیکھیے یہ آپ کے مرید ہیں۔ مرید ہو کر شیخ سے یہ بغاوت، گستاخی، نافرمانی۔ ان کی مریدی باقی کب رہی؟ مریدی سے ان کے عاق ہونے کا اعلان کیجیے۔ ایسے بے ادب وہابی نیچری کو اپنے حلقہ میں رکھنے سے نتیجہ کیا؟" اور ادھر بار بار یہ صلاحیں اور یہ کمیٹیاں ہوتی رہتی تھیں کہ جو کچھ بھی ہو جائے اب محمد علی کو مولوی عبدالباری سے ہرگز ملنے اور ایک نہ ہونے دیا جائے۔ اور یہ ڈائری نویس چونکہ محمد علی کے ہاں کا

خاص مقرب اور منہ لگا سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کے اوپر دباؤ خاص طور سے اس کے لیے پڑتے رہتے تھے۔ اور یہ دباؤ ڈالنے والے ہوتے کون تھے؟ کوئی باہر کے اور بیگانے نہیں۔ آپس ہی کے اسی چوادا اور اپنی برادری ہی کے لوگ۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے مولانائے فرنگی محلی سے ملال رکھتے تھے ——— ہر کینہ اور بغض کے نکالنے کا یہ موقع "خداداد" ہاتھ آگیا تھا!

ہمیشہ کے بیگانے اور اجنبی، جنھیں نہ محمد علی کی ذات سے کبھی عقیدت رہی، نہ ان کے اخبارات یا تحریکات سے کوئی دلچسپی یا تعلق رہا، اس وقت جسم پر ہمدردی کا لبادہ پہن اور چہرہ پر عقیدت کا نقاب ڈال، محمد علی کے پاس آتے، اور بے تکلفی کی جرأت کے ساتھ جھٹ سے سوال کر بیٹھتے کہ "یہ تو فرمائیے، اب فسخ بیعت کا اعلان کب ہوگا؟ ہم تو اس دن کے منتظر ہیں۔ ہم لوگ اس ذلت کو اب مزید برداشت نہیں کر سکتے" ——— ملیح آباد کے ایک جوان عمر اجنبی نے، چودھری خلیق الزماں کے مکان پر آکر، محمد علی کو ایک کمرہ میں تنہا پاکر اور مجھے اپنا ہمدرد گمان کر کے، میرے سامنے جھٹ سے یہ سوال کر دیا۔ محمد علی نے بالکل روکھے ہو کر جواب دیا،

"یہ معاملہ بالکل میری ذات کا ہے۔ آپ کو کسی قومی معاملہ پر گفتگو کرنا ہو تو کیجیے۔"

ادھر اگر محمد علی پر جی کھول کر تبرے ہو رہے تھے، آوازے کسے جا رہے تھے، کارٹون بن رہے تھے، ہجویں کہی جا رہی تھیں، تو ادھر "مسعودی" پریس میں بھی مولانائے فرنگی محلی کی بھی توہین و تضحیک کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ایک عزیز قریب نے، جو کسی خانگی رنجش کی بنا پر مولانا سے سخت بیزار تھے، پارٹی کے مشورہ سے (اور اس مشورہ پر آج بصد حسرت وندامت اعتراف ہے کہ آخری صاد کرنے والا یہ ڈائری نویس ہی تھا) مولانائے فرنگی محلی کی، وہ اسکو

سعات فرمائے) "فرنگی محل کا کچا چٹھا" ایک لمبے چوڑے اشتہار کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا ——— یہ چٹھا "سچا" خدا جانے کس حد تک تھا، لیکن "کچا" تو یقیناً تھا!

ان ذاتی قصوں اور فضیحتوں سے بلند اور مستثنیٰ صرف ایک ذات تھی، اور وہ خود محمد علی کی تھی۔ اپنی "پارٹی" کے جوش و خروش کو ہمیشہ ٹھنڈا کرتے رہتے۔ اور ہمدردی پر اس باب میں حقیقت نگاہ رکھتے، اس کا تذکرہ ابھی چار نمبر قبل آچکا ہے۔

باب (۴۳)

۱۹۲۵ء (۱۳)

(خطرناک جلسہ)

۸ر نومبر اتوار کا دن تھا کہ محمد علی دس بجے دن کو وارد لکھنؤ ہوئے۔ میں حسب معمول محمد علی کی پیشوائی کے لیے دو ایک روز قبل دریاباد سے چل کر لکھنؤ آ گیا تھا، بلکہ محمد علی کو لینے رات کی ٹرین سے سندیلہ اسٹیشن تک چلا بھی گیا تھا۔ اتفاق کہ محمد علی بجائے ادھر سے آنے کے، کانپور کی طرف سے آئے۔ بہرحال اسٹیشن سے موٹر پہ ان کا ساتھ رہا۔ اسی ٹرین سے جمعیۃ العلماء کے بھیجے ہوئے مولانا عبد العلیم صدیقی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی اترے۔ مولانا شوکت علی صاحب عارف صاحب کے ساتھ بمبئی کی طرف سے دو گھنٹہ قبل وارد ہو چکے تھے۔ فرنگی محل کے مقابلہ کا اصل مورچہ (یا ہیڈ کوارٹر) چودھری خلیق الزمان کے مکان پر تھا، یہ بھی علی برادران وہیں اترے۔ جذبات کا ہیجان؟ اتنے زور پر تھا کہ ابھی کل تک جو مخلص دوست، رفیق کار وشریک عمل تھے، وہ آج ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، بلکہ ایک دوسرے کی عزت وآبرو کے خواہاں تھے۔ یہ وہ ڈھائی ہفتہ کا وقفہ جو ملا تھا، یہ

صلح تھی اک مہلت سامان جنگ

اس میں جذبات دھیمے پڑنے کے بجائے، اور بھڑک چکے تھے۔ اور نفرت وعداوت کے شعلے بلند

سے بلند تر ہو چکے تھے۔ ادھر یہ ٹھن چکی تھی کہ (بہ زبان مولوی ظفر الملک) جو کچھ بھی ہو، فرنگی محل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہنا ہے۔ ادھر یہ ضد سما گئی تھی کہ (ایک جوشیلے فرنگی محلی کی زبان میں) دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے "یہ شہر کے لونڈے دہابیوں" کا طلب کیا ہوا جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے گا۔ داعیان جلسہ نے پچھلے جلسہ کی ناکامی سے ہوشیار ہو کر اپنی ہر طرح کی خوب مضبوط بیاں کر لی تھیں، اور سب کے سرخیل اور نگراں اعلیٰ مولوی ظفر الملک علوی تھے ——— مخالفین جلسہ کی ریشہ دوانیوں کا نمبر ان سے بھی بڑھا ہوا رہا۔ اور سب جانتے ہیں کہ کسی جلسہ میں نظم قائم رکھنے کے مقابلہ میں اس میں بدنظمی، برہمی، ہلڑ پیدا کر دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔

لکھنؤ پہنچتے ہی یہ سننے میں آیا تھا کہ تخریبیئے اب کی، پچھلے جلسہ کی طرح صرف حلق و حنجرہ اور آواز ہی کی قوت سے نہیں، بلکہ ہاتھ پیر، لاٹھی اور ڈنڈے کی بھی قوت سے پوری طرح کام لینگے اور جنھوں نے حجاز میں تھے توڑے، ان کے ہمدردوں کے سروں اور کھوپریوں کے تھے لکھنؤ میں توڑ کر اپنے دست و بازو کی رستمی کا ثبوت دیں گے۔ یہ خبر بھی کان میں پڑی کہ سلیم پور اور اکبرپور کے شیعہ تعلقداروں (راجہ احمد علی خاں اور راجہ نواب علی خاں) کے ساتھ ایکی گدیہ کے سنی تعلقدار شیخ مشیر حسین قدوائی) کا بھی ساز ہو گیا ہے اور اسی اتحاد ثلثہ نے جلسہ کو درہم برہم کرنے کو دیہات سے اپنی رعایا کو طلب فرمایا ہے۔

بعض خبریں ان سے بھی بڑھ بڑھ کر وحشت ناک سنیں۔ دل نہ اس وقت ان کے یقین کرنے پر آمادہ تھا اور نہ اس وقت ان کے بیان کرنے پر۔ موٹر پر جب محمد علی کے ساتھ بیٹھا تو اسٹیشن سے مکان تک یہ مفصل رپورٹ ان کے گوش گزار کر دی لیکن اللہ رے ظرف!

ہراس و اندیشہ پیدا ہونا کیا معنی، اطمینان قلب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ یہاں بیان کرتے دل ہولا جاتا تھا، وہاں خود اپنے کو خطرہ کی زد میں سنکر ذرا بھی تغیر نہ ہوا! موٹر کے رکتے رکتے میں نے آخری اپیل التجا کے لہجہ میں کی "مولانا، آج آپ کے جوش کا نہیں، آپ کے تدبر کا امتحان ہے۔ تقریر جوشیلی نہیں، حکیمانہ و مدبرانہ ہو" جواب میں محمد علی صرف مسکرا دیے۔ جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ "ایاز قدر خود بشناس۔ لقمان کو حکمت سکھانے چلے ہو" ——— سچ ہے اللہ جسے بڑا بناتا ہے، اس کا ظرف، تحمل، حوصلہ بھی بہت بڑا کر دیتا ہے۔

فرنگی محل حاضری کی وضعداری میں ابکی بھی محمد علی نے فرق نہ آنے دیا۔ پچھلی بار جب ان کے شیخ موجود نہ تھے، جب تو انھوں نے معمول میں ناغہ ہونے نہیں دیا، تو ابکی تو شیخ موجود تھے۔ ابکی کیسے نہ جاتے۔ ابکی میں بھی ہمراہ نہیں گیا، اور میرے سوا کوئی اور تو جا سکتا ہی نہ تھا۔ بالکل تنہا گئے، اور ملاقات تخلیہ کی رہی۔ محمد علی تو رقیق القلب تھے ہی، ان کے مرشد بھی رونے رلانے میں کچھ کم نہ تھے۔ جذبات سے بہت جلد متاثر بلکہ مغلوب ہو جاتے۔ بچھڑے ہوئے مرید کو ایک بار پھر اپنے آستانہ پر دیکھ، گلے سے لپٹ گئے اور لپٹ کر رونے لگے۔ ایک صاحب نے مشہور یہ کر دیا کہ دونوں مل کر خوب روئے۔ محمد علی نے مجھ سے اس کی پرزور تردید کی، اور تصریح کیا کہا کہ "اس وقت تو وہی روتے تھے، میرے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا"۔

آج کا دن لرزہ خیز افواہوں اور دہشت انگیز دھمکیوں کا دن تھا، افواہیں طرح طرح کی سننے میں آ رہی تھیں۔ مارپیٹ کی افواہیں، گالم گلوج کی افواہیں، فوجداری اور لٹھ بازی کی افواہیں، خون خرابہ کی افواہیں۔ اور دھمکیاں یہ مل رہی تھیں کہ آج شہر کے "وہابیوں" اور "سودیوں" کی خیر نہیں۔ ملیح آباد کے جنگ آزما اور پرجوش خطہ کے کچھ جوان چودھری صاحب

اور ظفر الملک صاحب کی کمان میں ہیں، ان سے مقابلہ کے لیے دیہات سے لٹھ بند سپاہی بلوائے گئے ہیں۔ اودھ کے تعلقہ داروں نے اپنی اپنی رعایا کی فوج بھرتی کرلائی ہے ـــــــ ممکن ہے اور کچھ ملیں کیا، اب کہتا ہوں کہ یقیناً ایسی ہی خبریں ہم لوگوں کی تیاریوں سے متعلق اُدھر بھی پہنچ رہی ہوں گی۔ لیکن میرے علم میں تو بہرحال اسی فریق کی جارحانہ اور سفاکانہ تیاریوں کی خبریں آتی رہیں۔

مولوی عبد الرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم ہماری جماعت میں بڑے نیک اور معصوم صفت جوان صالح تھے ان بیچارہ نے روزہ رکھ لیا کہ اگر نوبت شہادت ہی کی آگئی تو حالتِ صوم میں شہید ہونے کا اجر مزید ہو۔ جلسہ کا وقت بعد عصر تھا، میں بعد ظہر اپنے یہاں سے کھانا کھا خلیق صاحب کے ہاں آگیا۔ خوب یاد ہے کہ کھانا کھاتا جاتا تھا اور خیال کرتا جاتا تھا کہ کیا عجب جو یہ زندگی کا آخری کھانا ہو ـــــــ روایتیں ایسی ہی ہولناک کان میں پڑ چکی تھیں ـــــــ جلسہ اور جلسہ گاہ دونوں کے انچارج مولوی ظفر الملک صاحب تھے۔ انھوں نے از راہ احتیاط اپنے فریق میں منادی کرا دی تھی کہ کوئی شخص لاٹھی لیکر جلسہ میں نہ آئے کہ اس سے خواہ مخواہ دوسرے فریق کو اشتعال ہوگا۔ مگر مخالفین کا بیان ہے کہ لاٹھیوں کی ایک تعداد پہلے ہی سے جلسہ میں چھپا کر جمع کر لی گئی تھی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال دوپہر ہی سے نہتوں اور لٹھ بند دل دونوں کا جماؤ شروع ہو گیا۔ جلسہ گاہ کا دروازہ ابھی بند ہی تھا، اور جلسہ کے داعیوں اور منتظموں سے کا کا ہی کوئی پہنچا ہوگا کہ مخالفین نے باہر سے گویا پورا محاصرہ کر لیا اور جا بجا اپنے مورچے قائم کر لیے ـــــــ سرپھٹول کی یہ تیاریاں مسلمان کی مسلمان کے مقابلہ میں ہو رہی تھیں خلیق صاحب کے ہاں خبریں منٹ منٹ پر پہونچ رہی تھیں۔ میں خود تو گھبرا چلا، اور میری ہی طرح کے دوسرے کمزور دل و ہمت والے بھی۔ لیکن علی برادران اور اُنکے میزبان خلیق صاحب کے نہ چہرہ پر شکن نہ کسی انداز و گفتار میں کوئی خوف و ہراس۔ بلکہ خلیق صاحب نے تو ایک مرتبہ جوش میں آکر اپنے ایک ملیح آبادی لفٹنٹ کو بزن بول دینے کا حکم بھی دیدیا۔ محمد علی بیٹھے ہوئے بہ اطمینان باتیں کر رہے ہیں، اور اسکے منتظر کہ کسی طرح جلسہ کا وقت آئے، اور جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوں!

باب (۴۴)

۱۹۲۵ء (۱۴)

(عثمانؓ علیؓ کے نقش قدم پر)

وقت خدا خدا کر کے آیا۔ جلسہ گاہ کی عمارت، ممتاز دار الیتامیٰ، کچھ ایسی دور نہ تھی، چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ علی برادران سواری پر روانہ کیے گئے، اور پیچھے پیچھے ہم لوگ، یعنی جمعیتی مولوی صاحبان چودھری خلیق الزماں اور یہ ڈائری نویس، دوسرے راستہ سے۔ جلسہ گاہ پر پہنچے، تو ایک عجیب ہی منظر دیکھنے میں آیا۔ کانوں جو خبریں سنی تھیں، وہ تو عجیب تھیں ہی، آنکھوں سے جو باتیں دیکھنے میں آئیں وہ عجیب تر نکلیں۔ دیہات کے نیچ ذات کے ہندو، پاسی وغیرہ کی قسم کے، سینہ پر نئی اور نو خیز انجمن خدام الحرمین کا بلا، خادم الحرمین، لگائے ہوئے، اور ان کا ایک جم غفیر لاٹھیاں لیے جلسہ گاہ کے ارد گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے ـــــ ایسے عجیب وغریب خادم الحرمینؓ ہم نے آپ نے کیا معنی چشم پیر فلک نے بھی کبھی کیوں دیکھے ہوں گے! ـــــ اور ان ہی کے درمیان جا بجا حلقۂ فرنگی محل کے متوسلین چھٹکے ہوئے۔ یہیں ایک خالص فرنگی محلی صاحب کو دیکھا، چلا چلا کر دعوٰی فرما رہے ہیں کہ یہ مردود وہابی گستاخ و بے ادب ہیں، روضۂ رسول کے دشمن ہیں۔ ہمارے شاہ مینا صاحبؒ کا مزار کھود ڈالنے کی فکر میں ہیں، وقس علی ہذا۔ کیسی تحقیق شرعی اور کہاں کا استدلال عقلی، پروپیگنڈا اور صرف پروپیگنڈا۔ شاہ مینا صاحب کا مزار لکھنؤ کے بچہ بچہ کی آنکھ

میں سرمۂ عقیدت بنا ہوا تھا، اس کا نام بڑے موقع سے لایا گیا۔ یہ صاحب اس نیازمند کے خاص الخاص کرم فرما تھے۔ نظر سے نظر ملی، علیک سلیک ہوئی۔ دل نے محسوس کیا کہ آنکھیں جھکی ہوئی ہیں، اٹھ نہیں رہی ہیں۔

پھاٹک پر ایک غل، ہنگامہ، شور، پکار، ہڑبونگ اور چپقلش۔ ہر شخص دوسرے پر پلا پڑتا ہے کہ دروازہ میں میں ہی سب سے پہلے داخل ہو جاؤں۔ دروازہ کے تنگ زینہ پر ہجوم کا وہ ریلا کہ دبلا پتلا آدمی تو اب کچلا اور جب کچلا! علی برادران سواری پر تھے، چند منٹ قبل پہنچ چکے تھے۔ ان کا داخلہ تو دیکھنے میں آیا نہیں کہ کس شان سے ہوا۔ سننے میں یہی آیا کہ لٹھ بند "خدام الحرمین" انھیں دیکھ خود ان کی شوکت و وجاہت سے مرعوب ہو گئے اور بجائے روک ٹوک کے بے اختیار "محمد علی شوکت علی کی جے" پکارنے لگے! اپنی آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ خلیق صاحب کے لیے بھیڑ خود بخود چھٹتی گئی اور راستہ خود نکلتا آیا۔ اس سے قیاس یہی ہوتا ہے کہ علی برادران کا استقبال ان کے شان کے شایان ہی ہوا ہوگا۔ میں جب داخل ہونے لگا تو دیکھا کہ اپنی جماعت کے ایک صاحب اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے معاً مجھے ہاتھ سے کھینچ کر اندر لے لیا! ——— یہ تحقیق کبھی نہ ہو سکی کہ گنوار دیہاتیوں بلکہ پاسیوں تک کو خدام الحرمین بنا ڈالنے کی اپچ میں آیا مولانا فرنگی محلی کی اجازت بھی شریک تھی یا یوں ہی بالا بالا یار لوگوں نے یہ کارروائی کر ڈالی تھی۔ کم از کم اس نیازمند کو تو مولانا کے ساتھ یہ سوءِ ظن قائم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اور محمد علی کو تو یقین تھا کہ مولانا ہرگز اسے روا نہیں رکھ سکتے تھے۔

تاریخوں میں جب یہ پڑھتا تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مروان اور فلاں فلاں جعلی کارروائیاں حضرت کے نام سے کر گزرے، اور لوگوں نے انتقام حضرت سے لیا

یا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وقت ایک آن میں فلاں فلاں افراد بدخواہی میں خود خلیفہ کی نافرمانی کر بیٹھے، اور بار بار حد و دسے باہر نکل نکل گئے، تو وہ لوگ کچھ بہت عجیب سے معلوم ہوتے اور یہ باتیں دل میں پوری طرح اترتی بھی نہ تھیں۔ قدرت نے اس موقع پر ان تاریخی اور نفسیاتی حقائق کا ایک چھوٹے سے پیمانہ پر مشاہدہ کرا دیا، اور عملاً یہ سبق دے دیا کہ فطرت بشری کے تلونات ہر دور ہر عصر میں، اپنے اپنے ظرف و ماحول کے ماتحت یکساں ہی رہے ہیں۔ عجب عجب کارروائیاں ادھر سے بھی ہوتی رہتیں اور ادھر سے بھی۔ مقصد تمامتر یہ ہوتا کہ اشتعال برابر بڑھتا رہے، اور اختلاف کی آگ کسی طرح بجھنے نہ پائے۔ اپنے فریق کی کارگزاریوں کا علم ذرا تفصیلی ہے اور چشم دید۔ فریق ثانی کی حرکتوں کا علم اجمالی ہے اور وہ بھی زیادہ تر سماعی ——— بس گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو شخصیتوں اور پارٹیوں سے نظر قطع کیے ہوئے، محض اصول کی خاطر، اخلاص کے ساتھ محمد علی کے جھنڈے کے نیچے تھے۔ اور ان چند میں ایک ممتاز، اور اپنے کو گمنام دبے لگے رکھنے کی کوشش کے باوجود ممتاز ہستی، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مرید و مسترشد، جواں مرد و جواں ہمت جوان صالح مولانا عبد الرحمٰن ندوی نگرامی کی تھی۔

باہر کے بے دردوں کو کیا خبر کہ محمد علی کے دل و جگر پر اس وقت کیا گزر رہی تھی۔ پیر و مرشد سے جنگ، اور پھر کیسا مرشد، جس کے ساتھ روحانی تعلقات کے پہلو بہ پہلو، محبت کے، دوستی کے سالہا سال کی رفاقت و شرکت عمل کے، بھائی چارہ کے مادی تعلقات بھی گہرے اور شدید تھے! جنگ آسان نہ تھی۔ محمد علی جیسے شیر دل کے لیے بھی آسان نہ تھی۔ خدا معلوم کس کس طرح دل میں گھٹ گھٹ کر رہتے ہوں گے۔ پچھلے جلسہ کے موقع پر (جو اکتوبر میں رفاہ عام میں ہوا تھا اور ناکام و ناتمام رہا تھا) تو خیر مولانا نے فرنگی محلی لکھنؤ سے باہر ہزار ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر تھے، اور محمد علی کے پاس اپنا دل سمجھانے کے لیے یہ عذر کافی تھا۔ لیکن ابکی تو بات یوں بھی نہیں بن پا رہی تھی

آج تو مولانا بنفسِ نفیس موجود تھے۔ آج ان ہی کے شہر میں، ان ہی کے مریدوں کی سپہ سالاری میں عین ان ہی کی انجمن (خدام الحرمین کے صدر مولانا ہی تھے) کی طرف سے یہ استقبال محمد علی کا ہو رہا تھا!
—— محمد علی یہ حیرت انگیز تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاتے؟ سنی کو ان سنی بارہا کر چکے تھے، اب دیکھی کو ان دیکھی کیسے بنا لیتے؟

۱۹۱۹ء کا ذکر ہے، جب علی برادران قیدِ فرنگ میں تھے کہ دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا ریلا زور و شور سے آیا۔ ہندو مسلمان دونوں ایک ہی میدان میں سنگینوں اور گولیوں کا نشانہ بنائے جا چکے تھے۔ اسی ہیجانِ اتحاد کے وقت جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا، اس میں آریہ سماجیوں کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ جلسہ کے بعد باہر کے مسلمانوں نے لے دے شروع کی کہ مسجد کے اندر ہندو کیسے گھسا، اور گھسا تو خیر گھسا مسجد کے ممبر پر بھی چڑھ گیا؟! اس اعتراض میں پیش پیش فرنگی محل تھا۔ ہمدم مرحوم کی پرانی فائلیں اس کی گواہی دیں گی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ۱۹۲۵ء میں بھی فرنگی محل، نیچ ہندوؤں اور پاسیوں کو کھلے بندوں، بانگے پکارتے "خادم الحرمین" بنا رہا تھا! گویا ۱۹ء میں اگر اونچی ذات کے معزز ہندو بھی مسلمانوں کی اجازت کے بعد مسجد میں داخل ہونے کے قابل نہ تھے، تو ۲۵ء میں نیچی ذات کے ادنیٰ ہندو، مکہ و مدینہ کی خدمت کے قابل ہو گئے تھے —— ضد اور غصہ میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!

بہر حال ان ہی لاٹھیوں اور لٹھ بندوں کو چیرتے اور ان کے درمیان گھستے چلتے، ہم لوگ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ مولانائے فرنگی محلی خود تو تشریف فرما نہ تھے، باقی ان کے خاندان کے دوسرے ذمہ دار حضرات، نیز ان کی پارٹی کے اکابر سب موجود۔ مجمع موافقین و مخالفین کو ملا کر عظیم الشان۔ علی برادران ڈائس پر جا کر بیٹھ لیے، تو مولوی ظفر الملک صاحب نے بحیثیت داعیِ جلسہ پکار کر کہا کہ "ہم لوگ جلسہ

کرنے کو تیار ہیں اور میں داعیانِ جلسہ کی طرف سے حفظِ امن کا ذمہ لیتا ہوں۔ اب فریق مخالف کے لیڈر، مولانا حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی سامنے آکر اسی طرح کا وعدہ کریں اور اعلان کریں کہ ”اُن کے فریق کی طرف سے نقضِ امن نہ ہوگا“۔ دونوں صاحب اس پر صاف نکل گئے، اور یہ عجیب قسم کا احساس ذمہ داری تھا لگے کہنے کہ ”ہم کوئی ذمہ داری نہیں لیتے“۔ مولوی ظفر الملک نے جب یہ قبول کرالیا تو پھر پکار کر کہا کہ ”دیکھ لیجئے، ایک فریق فساد پر آمادہ ہوکر آیا ہے، اور اس کے لیڈر قیامِ امن کی طرف سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، تو اب میں اعلان کرتا ہوں کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے، آپ لوگ پرامن طور پر منتشر ہو جائیں“۔

جلسہ برخاست ہوگیا، لیکن پبلک نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پچھلے جلسہ کی طرح اگلی بھی فساد پر تُل کر کون آیا تھا۔ اور عامۂ مسلمین کے دلوں میں شورش پسندوں کی طرف سے بیزاری و نفرت کی جو لہر دوڑ گئی، اس کا دور کرنا اب کسی کے بس کی بات نہ رہی۔ ”پاسبانِ خدمتِ حرمین“ کا دربار، و مظاہرہ اب شہر لکھنؤ میں ممکن نہ رہا۔

باب (۴۵)

۱۹۲۵ء (۱۵)

(ذاتیات و قومیات۔ مقامِ عدل)

محمد علی کی فراست غضب کی تھی اور کام کرنے کا جذبہ بے پناہ۔ آج کا رنگ دیکھ کر سمجھ گئے کہ اصلی ضد اور کد جو کچھ ہے وہ مقامی کارکنوں سے ہے، نہ کہ خود ان سے۔ شوکت صاحب کی قوتِ عمل کچھ ان سے بھی بڑھ کر تیز تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے یہ فیصلہ کر لیا کہ جلسہ کل ہی پھر ہو، اور اس کی طلب کرنے والے لکھنؤ کے کارکنانِ خلافت نہیں، بلکہ خود مولانا شوکت علی ہوں، اور صدرِ جلسہ بھی اپنی پارٹی کا کوئی شخص نہ بنایا جائے جو دوسروں کی نظر میں معتوب و بدنام ہو، بلکہ کوئی غیر جانبدار شخص ہو۔ میں جلسہ کے بعد جلسہ گاہ کے باہر اور امین الدولہ پارک میں لوگوں سے ملنے ملانے، پبلک کے خیالات و تاثرات کا اندازہ کرنے کو ٹھہر گیا تھا۔ ـــــ میری چھوٹی موٹی "لیڈری" پر کہیں غالب میری "ایڈیٹری" اور صحافت رہتی تھی ـــــ کیا خبر تھی کہ خلیق صاحب کے ہاں آناً فاناً یہ فیصلے ہو جائیں گے۔ بعد مغرب دن بھر کا تھکا ماندہ سیدھا اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستہ میں محض اتفاق سے ایک صاحب مطلع مل گئے۔ کل کے جلسہ کا اشتہار چھاپنے بھاگا بھاگ چلے جا رہے تھے، ان سے مسودہ لے کر پڑھا۔ مقامِ جلسہ وہی باغ امین الدولہ میں ممتاز حسین بیرسٹر مرحوم کا لق و دق مکان۔ بالکل ٹھیک، داعیِ جلسہ مولانا شوکت علی، یہ بھی ہر طرح مناسب لیکن صدرِ جلسہ؟ حیرت کی آنکھوں سے دیکھا، اور استعجاب کی عینک

سے بڑھا کر یہ گمنام! اور یہ انتخاب بھی گویا اتفاقی بلکہ الہامی کہ خود اس صدر کی منظوری اور اس سے پوچھ گچھ کی بھی کچھ ضرورت نہیں! شوکت صاحب کے احکام و فرامین ایسے ہی نادری ہوا کرتے تھے۔

یہ گمنام، گمنام ہی تھا، اور یہ سچ ہے کہ خلیق صاحب یا ظفر الملک صاحب کا سا "بدنام" نہ تھا۔ تاہم کہاں اتنے اہم جلسہ کی صدارت کا بارِ گراں اور کہاں اپنا دوشِ ناتواں! وہ تو کہیے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ خبر اشتہار چھپنے سے قبل ہی ہو گئی، ورنہ عین وقت پر تو کچھ بھی بنائے نہ بن پڑتی۔ جوں توں، ان صاحب مطبع کو روکا کہ یہ اشتہار فی الفور نہ چھاپ دیجئے گا، اور دوڑا ہوا شوکت صاحب کے پاس پہنچا کر "ایسا غضب نہ کیجئے، ایک ادنیٰ سپاہی کو دفعۃً سالارِ لشکر کے مرتبہ پر تو نہ پہنچا دیجئے، خدمت ہی لینا ہے تو کوئی چھوٹی موٹی ڈیوٹی لگا دیجئے، ان شاء اللہ اس سے سرتابی نہ ہو گی"۔ بارے شوکت صاحب کو رحم آ گیا۔ حکم ہوا، کوئی اور نام پیش کرو۔ سید ظہور احمد ایڈووکیٹ لکھنؤ کے ایک بڑے پرانے قومی کارکن تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے، ان کا نام معاً ذہن میں آ گیا۔ پیش ہوا اور شوکت صاحب کی بارگاہ میں منظور ہو گیا۔ غرض بات کی بات میں دوسری شام کا جلسہ طے پا گیا، اور اشتہارات رات میں چھپ چھپا گئے۔

۹ر نومبر کی صبح ہوئی، اور راجہ نواب علی خاں مع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے — راجہ صاحب کی افسرانہ اور خود مختارانہ حیثیت اور ان مولانا کی دبی ہوئی اور ماتحتانہ ہیئت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی[۱] — علی برادران سے ملنے خلیق صاحب کی کوٹھی پر آئے۔ خلاصۂ گفتگو یہ تھا کہ "ہمیں اختلاف آپ سے نہیں۔ ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ آپ کے یہ لکھنوی دوست ہم لوگوں کو نکال کر لکھنؤ میں جلسہ نہیں کر سکتے۔ اب جلسہ مولانا شوکت علی صاحب

---

[۱] بہ قول شیفتہ ؎ غیر اس بزم میں مختار بنے بیٹھے ہیں × ہم الگ چور گنہگار بنے بیٹھے ہیں۔

طلب کر رہے ہیں، وہ شوق سے کریں، ہم اس میں مخل اندازنہ ہوں گے، بلکہ وہ جلسہ تو بدمغز ہے۔ ہم اپنا ایک جلسہ وکٹوریہ پارک میں بعد ظہر کیے دیتے ہیں۔ آپ وہاں آکر تقریر فرمائیں، ہم سب آپ کی تقریر کو سنیں گے۔" شوکت صاحب جواب میں بولے "آپ لوگوں کو میرا معمول تو معلوم ہے۔ میں مخالفین کے جلسہ میں جاتا ہی نہیں، اس سے بدمزگی اور بڑھتی ہے۔" معاً محمد علی نے لقمہ دیا "مگر میرا یہ معمول نہیں۔ میں تو مخالفین ہی کے جلسہ میں شوق سے جاتا ہوں کہ مخالفین کے درمیان تبلیغ کروں۔ یہ عین سنت رسول ہے۔ حضورؐ اپنا پیام ابوجہل کو سناتے تھے، ابوبکرؓ کو اس کی حاجت نہ تھی ——— کیا ظرف تھا "خود بین و خود پرست" محمد علی کا! محمد علی نے معتقد سے واہ واہ حاصل کرنے والی تقریر میرے علم میں تو کبھی کی ہی نہیں۔ ولولہ انھیں جب پیدا ہوتا تو منکروں پر تبلیغ کا، گمراہوں کو راہ راست پر لانے ہی کا ہوتا۔ اور اپنے حق پر ہونے کا اس درجہ اعتماد و وثوق رہتا تھا کہ مخالفین کے ہجوم و کثرت سے کبھی گھبرائے ہی نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ پبلک سے ڈرنا کیا معنی، جس کے دل میں پبلک کا خوف بیٹھا ہوا ہے اور جو پبلک سے بدگمان ہے، اس کی جمہوریت جھوٹی جمہوریت ہے، اور وہ لیڈری کا کسی طرح اہل نہیں۔

ادھر وہ لوگ اٹھ کر گئے، ادھر محمد علی پر لے دے ہونے لگی، خود اپنی پارٹی والوں کی طرف سے زیادہ برسا خلیق صاحب نے شروع کیا کہ "ان لوگوں کے جلسہ میں آپ کا جانا ہماری شدید توہین کرنا ہے" ——— محمد علی بہت بڑی پارٹی اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود بھی اکیلے ہی تھے! وہ جس بلند سطح پر تھے وہ نہ مخالفین کی سمجھ میں آتی نہ موافقین کی۔ گھوم پھر کے سوال ان سب کی نظر میں وہی ذاتی توہین و تحقیر کا تھا۔ محمد علی لاکھ لاکھ اپنے زاویۂ نظر کی توضیح کر رہے ہیں، پارٹی والے کب سمجھنے پر آمادہ تھے۔ اتنے میں خبر معلوم ہوئی کہ راجہ نواب علی خاں صاحب نے اعلا

جلسۂ عام کا کیا ہے۔ مفر کا یہ موقع قدرت نے محمد علی کو دیدیا۔ محمد علی نے خط لکھ بھیجا کہ "میرا وعدہ آپ کے جلسہ میں، مخالفین کے جلسہ میں، خدام الحرمین کے جلسہ میں آنے کا تھا۔ آپ نے اسے جلسۂ عام بنادیا۔ میں آپ کے طلب کیے ہوئے جلسۂ عام میں آنے سے معذور ہوں" ـــــــــ چلیے بڑی خیر ہوگئی ۔ خلیق صاحب اور ان کی پارٹی کے آنسو بچھ گئے، اور بات رہ گئی۔

صبح کا وقت ہے۔ اور غالباً وہی صبح۔ میں خلیق صاحب کے یہاں بیٹھا ہوا ہوں کہ بالاخانہ پر ایک فرنگی محلی صاحبزادہ آئے، اور ہاتھ میں ایک روزنامچہ کے اوراق لیے ہوئے۔ صاحبزادہ خود بھی اپنے خاندان سے باغی اور مولانا عبدالباری کے شدید مخالف، اور جن مرحوم بزرگ کی آخر عمر کا روزنامچہ لائے ہیں، وہ بھی اس زمانہ میں مولانا کے شدید مخالف ہو چکے تھے۔ روزنامچہ کے سفینہ میں وہی سب کچھ درج تھا، جو گھر کے بھیدی" کے سینہ میں خانگی رنجشوں اور عداوتوں کے بعد بھرا رہا کرتا ہے۔ اور پھر روزنامچہ کی نقل وقل نہیں، بجنسہ روزنامچہ، اُن مرحوم کے دست خاص کا لکھا ہوا ــــــ نعمت غیر مترقبہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہاتھ آسکتی تھی ؟ وہ صاحبزادہ چاہتے تو منہ مانگے دام بھی اس پارٹی والوں سے وصول کرلیتے۔ مخالفوں کے سردار کی مخالفت کے لیے اس سے بہتر مصالحہ اور کہاں سے ہاتھ لگ سکتا تھا! کوئی ایک آدھ حربہ نہیں پورے کا پورا میگزین ہاتھ آرہا تھا۔ کون حریف اس موقع کو چھوڑتا ؟ دنیا میں جنگ اور مناظرہ اور پارٹی بازی کے وقت جو ذہنیت ساری دنیا کی ہو جاتی ہے، اس معیار سے دیکھیے تو کون اتنے بڑے شکار کو ہاتھ سے جانے دیتا ؟ بڑے بڑے لیڈر، اور اڈیٹر، اور اچھے اچھے مولوی اور مشائخ ایسے موقع پر کیا کیا کرتے ہیں! لگ لپک لپک بڑھے، اور لگے اُن صاحبزادہ کو حلقہ میں لیکر، مزہ لے لے کر، روزنامچہ کو پڑھنے۔ کوئی بیٹھا اور کوئی کھڑے ہی کھڑے ــــــ سارے مجمع میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو مجمع سے ہٹا ہوا،

پہلے تو اس "تماشہ" کو دور سے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا، قریب آیا۔ اور شوق و مسرت سے بچائے: ناگواری کے لہجہ میں بولا "یہ کیا واہیات ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے قومی معاملات میں ہے، ذاتیات اور خانگی زندگی کی راہ نہیں کھل گئی ہے"!

اس شخص کو آپ نے پہچانا؟ یہ محمد علی تھا۔ وہی محمد علی جس کے غصہ ور و زود اشتعال ہونے، جنگجو و جنگ پسند ہونے کی داستانیں اور حکایتیں خدا جانے آپ کتنی سن چکے ہوں گے! انسان کا اصلی ظرف، مخالفت اور شدید مخالفت ہی کے وقت کھلتا ہے۔ جب تک دوستی و موافقت ہے، ہر عیب ہنر ہے۔ ادھر مخالفت شروع ہوئی، اُدھر ہر ہنر عیب بن گیا۔ اور پھر ہمارے اخبار نویس تو شدید مخالفت کے بغیر بھی ایسی ایسی خانگی دستاویزوں کی ٹوہ ہی میں رہا کرتے ہیں۔ انھیں تو خدا ایسے موقع دے! اپنی مخالفت کا کمال ہی اسے سمجھتے ہیں کہ آج اسے ننگا کر دیا، کل اس کی پگڑی اچھال دی، پرسوں تیری اور میری رسوائیاں مزے لے لے کر چھاپ ڈالیں۔

باب (۴۹)

۱۹۲۵ء

(ڈائری نویس پرڈانٹ - عالی ظرف محمد علی)

"فرنگی محل کا کچا چٹھا" دوسروں کے علاوہ اس ڈائری نویس ہی کی سازش سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر گھر گھر شائع ہو رہا ہے - باہر کے اکثر اخبارات میں نکل چکا ہے - لیکن خود محمد علی کے اخبار ہمدرد میں اب تک نہیں نکلا - خیر، لکھنؤ کا پریس تو اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، اس کی طرف تو صبر تھا لیکن یہ ہمدرد میں نہ نکلنے کے کیا معنی؟ کہیں اور چھپتا نہ چھپتا، ہمدرد میں تو اسے سب سے پہلے نکلنا تھا - عارف صاحب (ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) لکھنؤ میں محمد علی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں - صبح کوئی ۱۰، ۱۱ کا وقت ہو گا کہ خلیق صاحب کی کوٹھی پہ "چٹھے" نویس صاحب ملے - فریاد و داد خواہی کے لہجہ میں مجھ سے بولے کہ ہمدرد میں چھپنے کے لیے میں نے عارف صاحب کو دیا تھا - عارف صاحب نے لکھا کہ مولانا کی اجازت لے لوں - مولانا نے اجازت نہ دی - اب آپ کہیے" میں نے دل میں کہا، یہ نہ چھپنے کی خوب رہی - یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ جنگ میں غنیم کے گولے تو ہمارے سروں پر آ کر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں، اور ہم ہیں کہ اپنی سب سے بڑی توپ کے دہانے پر مہر لگائے ہوئے ہیں! .... عوام کی نظر میں یہ ساری جنگ بجز فرنگی محل اور محمد علی کی جنگ کے اور بھی کیا؟ اور "خواص" اس باب میں کب "عوام" سے ممتاز تھے؟

جی کڑا کر کے محمد علی سے عرض کی۔ کہنے کی دیر تھی کہ ایک زبردست ڈانٹ پڑی، وہ بھی تنہائی میں نہیں، پارٹی والوں کے بھرے مجمع میں! گرجتی ہوئی آواز میں اس قسم کے فقرے ہوا میں گونجے "ہرگز نہیں چھپ سکتا۔" "میرے اخبار میں اور ایسی لغو چیزیں۔" "یہ ہرگز صحیح اور شریفانہ صحافت نہیں۔" "یہ طریقے جنٹامنی ایڈیٹر لیڈر کو مبارک ہوں۔" "یہ آپ نے جنٹامنی کا طریقہ کہاں سے سیکھ لیا۔" یہ کہا اور "چٹھا" میرے ہاتھ سے لے سب کے سامنے پرزہ پرزہ کر ڈالا!۔۔۔۔۔۔۔ میں لاکھ معتقد اور شیدائی سہی، بہرحال ایک زندہ نفس رکھتا تھا۔ اور نفس ایک مجمع کے سامنے اپنی خواری کب برداشت کر سکتا ہے؟ اس توہین کی تاب نہ آئی۔ لیکن کرتا کیا، دل ہی دل میں جھنجھلاتا اور غصہ کرتا رہا کہ محمد علی کا دوست بھی خراب اور دشمن تو خراب ہی ہے۔ یہی مزاج ہے، جبھی تو کوئی ان کا دوست باقی نہیں رہا۔ یہاں تو ان کے واسطے مٹے جا رہے ہیں، اور یہ ہیں کہ نہ دوسرے کی عزت کا خیال کریں نہ جذبات کا۔

کچھ دیر روٹھا ہوا ان سے الگ بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانے کا وقت آگیا۔ سب اٹھے۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ خود ہی بولے "اٹھو، کھانا بچھ گیا۔" میں نے کہا "مجھے بھوک نہیں"۔ اٹھ کر پاس آئے۔ گلے سے لپٹا لیا۔ اور بولے "واہ بس اتنے میں خفا ہو گئے۔" لوٹے میں پانی لے کر کھڑے ہو گئے کہ "لو میں خود ہاتھ دھلاتا ہوں۔ تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔" طبیعت جز بز تو ہوئی لیکن پھر وہی کرنا آخر کرنا کیا۔ اپنی ہار ماننی ہی پڑی ـــــــــــ کوئی ڈائری خواں کہیں یہ نہ فرمانے لگیں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات میں رکھا کیا ہے۔ لیکن یہی روزمرہ کے واقعات ہی تو ہر شخصیت کے ناپنے کا اصل پیمانہ ہوتے ہیں۔ سیرت پر، کردار پر، باطن پر، سرشت و جبلت پر روشنی اگر ان واقعات سے بھی نہ پڑے گی تو آخر اور کہاں سے واقعات لائے جائیں گے؟

۹ر کی شام خدا خدا کرکے آئی ۔ جلسہ گاہ پر سارے رضاکاروں کا پہرہ بہت قبل سے تھا ۔ لاٹھیاں اور چھڑیاں سب سے باہر رکھوا لی جاتی تھیں ۔ آنے والوں میں موافقین ہی اکیلے نہ تھے، مخالفین بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے ۔ بعد مغرب مجمع خوب کھچا کھچ ہو گیا، اور جلسہ کی کارروائی امن اطمینان سے شروع ہوئی ۔ پہلے ایک گھنٹہ کے قریب مولانا شوکت علی بولے ۔ اور پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو گھنٹہ محمد علی ۔ تقریر تھی کیا ؟ کیا اپنے اوپر جو مسلسل و لاتنار حملے دو ڈھائی مہینوں سے جاری تھے، ان کا کوئی جواب ؟ حریفوں پر کوئی جوابی حملہ ؟ قبہ نوازی کی تردید میں، قبہ شکنی کی حمایت ؟ ابن سعود کے مناقب و فضائل ؟ "وہابیت" کی حوصلہ افزائی ؟ فرنگی محل پر چوٹیں ؟ لوگ کہتے، اور صحیح کہتے ہیں کہ محمد علی جذبات کے پتلے تھے لیکن وہ محض جذباتی ہرگز ہرگز نہ تھے عقلی و استدلالی بھی اسی قدر تھے، جتنے جذباتی ۔ جب جذبات کا دریا موج زن ہوتا تو بیشک سب کچھ اپنے ساتھ بہالے جاتا لیکن جب استدلال پر آتے تو منطقی گرفتیں وہ رنگ دکھاتیں کہ اچھے اچھے وکیلوں اور بیرسٹروں کو نیچا دیکھنا پڑتا ——— آج کی تقریر تمام تر ٹھوس، مدلل، سنجیدہ و معقول تھی، گو خشک تو ان کی کوئی تقریر ہو ہی نہیں سکتی تھی ۔ بس جمعیتہ خلافت اور مسئلہ حجاز میں اس کی روش و مسلک کی تائید میں ایک مفصل و مکمل بیان تھا ۔ شروع سے ایک ایک واقعہ گن کر اور اس کے جزئیات کی تفصیل میں جا کر حاضرین سے اس قسم کے سوالات کرتے جاتے کہ اب بتلائیے واقعات حجاز پر پردہ کون ڈالنا چاہتا ہے، آیا خلافت کمیٹی جس نے مدتوں قبل دسمبر [illegible] ہی میں اپنا خاص وفد تحقیق حال کے لیے روانہ کر دیا تھا، یا شریف علی ابن حسین جس نے جدہ سے آگے ہی اس وفد کو نہ بڑھنے دیا ؟ اسی طرح ایک ایک چیز کو دہرا کر آخر میں پوچھا کہ کوئی ایک بھی بات ایسی بتائیے جو خلافت کمیٹی کے کرنے کی تھی، اور وہ اس سے قاصر رہی، یا ایک بھی ایسی بات جو نہ کرنا چاہیے تھی اور اس نے کر ڈالی ؟ ——— سارے مجمع پر کامل سکوت چھایا ہوا ۔ فرنگی محلی حاضرین جلسہ بھی سب آئے

پُراحترام و پُرعظمت سکوت میں شریک۔ کسی کو کوئی تلخی نہ اپنے عقائد کے خلاف محسوس ہوئی نہ اپنی ذات کے خلاف، نہ اپنے خاندان کے خلاف۔ آخر میں جناب حسرت موہانی کھڑے ہوئے اور فرمایا "مجھے دونوں بھائیوں کی تقریر سے کامل اتفاق ہے۔"

یہ تھی اس "وہابی" اور "قبہ شکن" محمد علی کی وہ ہولناک و مہیب تقریر، جسے لکھنؤ کے ذات شریف "شریفی" حضرات خدا معلوم کن کن غیر شریفانہ طریقوں سے لکھنؤ میں روک رہے تھے! محمد علی اتنا وقت بھی کن مشکلوں سے نکال کر آئے تھے، دوسرے ہی دن دہلی واپس ہوگئے۔ لکھنؤ میں جلسے اس کے بعد بھی برابر دو دن اور ہوتے رہے۔ فضا ہموار ہو ہی چکی تھی۔ اب تقریر کرنا کیا دشوار تھا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء کے دونوں مولوی صاحبان کی تقریریں ہوتی رہیں، محمد علی کے ڈائری نویس کو ان سے تعلق نہیں۔

بڑا فرق محمد علی اور ہم لوگوں میں یہ تھا کہ ہماری نظریں چھوٹے چھوٹے مسائل تک محدود ان ہی میں الجھ کر رہ جاتیں، اور ان ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتیں۔ ان ہی جزئیات پر ہمارے بان پارٹیاں، اور پھر پارٹیوں کے اندر پارٹیاں بن جاتیں، محمد علی کی نظر کہیں زیادہ عمیق اور کہیں زیادہ بلند، ان جزئیات سے بالاتر رہتی، یہی سبب ہے کہ وہ نہ خود کوئی پارٹی بنا سکے اور نہ کسی بنی بنائی پارٹی میں عرصہ تک نباہ سکے۔ ہر شخص انھیں اپنی پارٹی میں کھینچنے کا آرزو مند۔ ہر پارٹی اس کو پکڑ کو اپنے میں ملا لینے پر حریص۔ لیکن وہ خود ہر پارٹی سے، اور قومی معاملات میں ہر دو دستی سے بلند تر، محض حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا۔ جس چیز کو اس نے حق سمجھ لیا، بس اسے دانت سے پکڑ لیا پھر چاہے اس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے۔ حق کے معاملہ میں پروا نہ کسی دوست کی نہ عزیز کی، نہ بزرگ کی نہ خورد کی۔ نہ اپنے کسی محسن کی، نہ اپنے مرشد کی۔ لیکن حدود کا لحاظ اس کے

باوجود بھی ـــــــ اب خود اسی موقع سے بڑھ کر اور کون سی جگہ لغزش قدم کی ہو سکتی تھی۔ بڑے بڑے متین اور ضبط رکھنے والے بھی ایسے موقعوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہ ظرف محمد علی ہی کا تھا کہ اس حال میں بھی حدود کو ملحوظ رکھا، اور اپنی ذات سے ایک بات بھی ایسی نہ ہونے دی جس پر ان وقتی جذبات کے ٹھنڈے پڑ جانے پر، اور برسوں کی مدت گذر جانے کے بعد آج ان کے کسی نیازمند کو آنکھیں نیچی کرنی پڑیں ـــــــ لکھنؤ کا معرکۃ الآرا جلسہ ختم ہو گیا لیکن وہ قضیۂ اختلاف کہاں ختم ہوا۔ مسلمانوں کی قسمت ایسی کہاں تھی۔ ابھی تو اس قضیہ کو ہفتوں نہیں، مہینوں چلنا تھا، بلکہ ایک معنی میں تو برسوں۔ اور ایک بڑے محترم بزرگ اور لیڈر کی جان بھی اسی قضیہ کی نذر ہونی تھی!

دلی اس کے بعد اور اس کے قبل اس زمانہ میں جب بھی جانا ہوا، یہی قصے اور قضیے وہاں بھی پھیلے ہوئے پایا۔ ایک جمعہ میں محمد علی کی تقریر بھی اسی موضوع پر جامع مسجد میں سنی۔ حسب معمول شگفتہ و دلآویز، موثر، مدلل۔ تقریر کا ایک خاص اسلوب (ٹیکنیک) محمد علی نے یہ ایجاد کیا تھا کہ مخاطبین سے برابر سوال پر سوال کرتے جاتے اور ان سے ہر سوال کا جواب لیتے جاتے ـــــــ اسی جلسہ میں کسی نے دور بیٹھے ہوئے غصہ سے پکار کر کہا تھا کہ یہی خبر اس بحث میں شامیؒ نے کیا لکھی ہے۔ محمد علی نے غصہ کے جواب میں مسکرا کر کہا کہ "مجھے نہ شامی سے بحث نہ نجدی سے، میرے لیے تو کتاب اللہ کافی ہے، اور اس کے بعد سنت رسول جس دن مجھ پر ان نصوص سے قبول اور پختہ قبروں کی حرمت ثابت ہو گئی، میں گلابی وہابی نہیں پورا وہابی بن جاؤں گا اور اپنے ہاتھ میں ان کے کھودنے اور گرانے کے لیے پھاوڑا لے لوں گا"۔ اسی تقریر یا کسی اور تقریر میں ذکر وہ بھی بہرحال جامع مسجد ہی کی تھی، اس نامہ سیاہ کا تعارف کرایا کہ یہ سچ کے ایڈیٹر ہیں۔ جن کا مقولہ ہے الحق مُرٌّ (سچی بات کڑوی ہی ہوتی ہے) اور ان کے ساتھ ایک دوسرے ایڈیٹر بھی ہیں مولوی ظفر الملک علوی، ان کا مقولہ ہے المرحق (کڑوی بات سچی ہی ہوتی ہے)

---

[1] فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار کی مستند و ضخیم شرح ردالمحتار، علامہ ابن عابدین مصری کے قلم سے، عرف عام میں اس کا لقب شامی یا فتاوائے شامیہ ہے۔

باب (۴۷)

۱۹۲۵ء (۱۷)

(نئی اودھ خلافت کمیٹی)

نومبر تو پا گزر چکا، اور دسمبر کا بھی بڑا حصہ ختم ہو گیا۔ قلم اور زبان کی جنگ ابھی اسی تیزی اور تندی سے قائم۔ ابھی لاہور سے ٹیلیفون محمد علی کے پاس چلا آ رہا ہے کہ فوراً آیئے اور سب کام چھوڑ کر کیئے، یہاں کے جلسہ میں قبہ نوازوں کے مقابلہ میں آکر تقریر کیجئے۔ ابھی ایسی ہی طلبی پٹنہ سے تار پر ہو رہی ہے۔ یک سر و ہزار سودا۔ یک انار و صد بیمار۔ ایک وقت میں کہاں کہاں پہنچے۔ قوم نے جیسے طے کر لیا تھا کہ کلکتہ ہو یا بمبئی، لکھنؤ ہو یا دہلی، ہر درد کے درمان محمد علی ہی ہیں، کہیں بھی کوئی ضرورت پیش آئے، اور وہی دوڑے ہوئے پہنچیں ——— ۲۳ دسمبر ۲۵ء۔ شام کا وقت ہے۔ کانپور میں کانگریس اور خلافت کانفرنس دونوں کے سالانہ اجلاس ہو رہے ہیں۔ دونوں کیمپ ملا کر ایک پورا نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔ ہزارہا ہزار کا مجمع خیموں کا یہاں سے وہاں تک ایک جنگل ہی جنگل۔ ایک پختہ عمارت میں نئے صدر خلافت کمیٹی مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے اکابر ٹھہرائے گئے ہیں۔ اسی کے ایک کمرہ میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور سب سے زیادہ معرکۃ الآرا مسئلہ مجلس کے سامنے زور شور سے یہ چھڑا ہوا ہے کہ صوبہ اودھ کی دو خلافت کمیٹیوں میں سے جائز اور مستند کس کمیٹی کو ٹھہرایا جائے، اور کس کے نمائندے مرکزی مجلس میں قبول کئے جائیں؟

لیکن یہ دو صوبہ کمیٹیاں کیسی؟

فرنگی محل کی سرگرمیاں "پاسبانہ" خدمت حرمین کے مظاہرہ کے بعد کچھ ختم تھوڑے ہی ہو گئی تھیں۔ سعودی شریفی جنگ اسی ہماہمی کے ساتھ ہندوستان میں جاری تھی، اور قبہ نوازی و قبہ شکنی کے دونوں مورچے اسی شدت و حدت کے ساتھ گولہ باری اور آتش افشانی میں مصروف۔ تحریریں، تقریریں، مناظرے، اور مناظروں کے چیلنج، پوسٹر، اشتہارات، پمفلٹ، تردیدی پمفلٹ، جواب و جواب الجواب کا سلسلہ اسی شد و مد سے قائم۔ صوبۂ اودھ کی جو صوبہ کمیٹی شروع سے چلی آرہی تھی، اس کے صدر و ناظم دونوں فرنگی محلی ہی تھے، اور دونوں اپنے مسلک کی اشاعت میں جوش کے ساتھ لگے ہوئے۔ اب یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ ادھر آل انڈیا مرکزی جمعیت خلافت تو سلطان ابن سعود کی حامی و ہمدرد، اور ادھر اس کی اس صوبائی شاخ کے ذمہ دار ارکان سلطان کی مخالفت میں سرگرم، اور خود جمعیت مرکزی سے بغاوت پر کمربستہ! مولوی ظفر الملک صاحب ایسے موقع پر کب چوک جانے والے تھے۔ قواعد و ضوابط سے پوری طرح لیس اور آئین و قانون سے مسلح، انھوں نے نومبر ہی میں جھٹ ایک دوسری اودھ خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھ دی تھی، اور اخبارات میں اس کا اعلان قبل سے کرا کر، بارہ بنکی میں اس کی ضابطہ سے تشکیل بھی کر دی تھی۔ روح رواں تو وہ خود اور چودھری خلیق الزماں تھے۔ نام کے لیے صدارت اس ڈائری نویس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ ادھر وہ قدیم خلافت کمیٹی بھی بہرحال موجود تھی۔ مرکزی کمیٹی کے سامنے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ یہی پیش ہوا کہ صوبۂ اودھ کی ذمہ دار اور حقیقی کمیٹی وہ کس کو تسلیم کرے

مولانا شوکت علی نے بحیثیت ناظم مجلس مرکزی، تحریک پیش کی کہ قدیم اودھ کمیٹی کا الحاق توڑ کر مرکزی سے الحاق جدید اودھ کمیٹی کا منظور کیا جائے۔ بحث شروع ہوئی۔ ہم لوگ یعنی جدید کمیٹی

کے ارکان ابھی کہاں بار پا سکتے تھے، ایک بغلی کمرہ میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ جلسہ میں قدیم کمیٹی کے صدر صاحب اور ناظم صاحب، بس دو صاحب یہ، اور تیسرے حسرت موہانی اور چوتھے ایک صاحب صوبہ متوسط کے (اور ان دونوں صاحبوں کا فرنگی محل سے رشتۂ ارادت بھی تھا) بس ان چار صاحبوں کو چھوڑ کر جلسہ کا جلسہ شوکت صاحب کی تائید میں تھا۔ ڈاکٹر سید محمود، مولوی عبدالقادر قصوری، "غازی" عبدالرحمن امرتسری، مفتی کفایت اللہ صاحب، سیٹھ یعقوب حسن مدراسی، مولانا داؤد غزنوی امرتسری، آصف علی صاحب بیرسٹر دہلوی، قمر احمد صاحب علیگ (ایڈیٹر "خلافت") عارف صاحب ہنسوی وغیرہ بہ کثرت حضرات نے اپنی تقریروں میں یہی کہا ــــــ اب آج ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء میں کوئی کیسے بتائے اور سمجھائے کہ ۱۹۲۰ء میں ان ناموں کا کیا وزن تھا اور کتنی اہمیت تھی ہے ــــــ اور مولوی ظفر الملک اور چودھری خلیق الزماں نے جدید کمیٹی کے نمائندوں کی حیثیت سے جلسہ کے سامنے جاکر موثر و مدلل بیانات دیے ــــــ جلسہ کی کارروائی دلچسپ سہی لیکن جو ڈائری صرف محمد علی سے متعلق ہے وہ اس تفصیل کی متحمل کہاں سے ہو سکتی ہے؟

سب کو اشتیاق و انتظار محمد علی کی تقریر کا۔ توقع کیا معنی یقین تھا کہ محمد علی کی تقریر بڑی گرماگرم اور پر زور ہوگی، اور قدیم کمیٹی والوں کا تار تار الگ کرکے رکھ دے گی۔ لیجئے، تقریر شروع ہوئی، اور سب کے کان لگ گئے کہ مخالفین میں سے ایک ایک کی قلعی کھل رہی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ دو منٹ، چار منٹ، چار منٹ، پانچ منٹ تقریر کے ہو گئے، اور نہ آتش بیانی نہ شعلہ افشانی۔ نہ اس پر اصرار کہ ان "دشمنوں" کو فوراً نکال دیا جائے، نہ اس کا مطالبہ کہ ان "دوستوں" کو فوراً لے لیا جائے ایک معتدل سی تقریر، جذبات کو بھڑکانے کے بجائے دھیمی کرنے والی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیمی کمیٹی کا الحاق توڑنا لازمی نہیں، اگر کوئی صورت اصلاح حال کی نکل آئے، تو ان لوگوں کی ممبری بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے"۔ ہمارے فریق کے اہل غلو (اور غلو سے کس فریق کا کون فرد خالی تھا)

دنگ و حیران کر دیئے جن کے واسطے یہ سب کچھ کیا گیا تھا، وہ وہی اتنے بجھے ہوئے نکلے — اتنے "چست" گواہوں کے ہوتے ہوئے کوئی مدعی اتنا "سست" کہیں کاہے کو ثابت ہوا ہوگا؟

قدیم کمیٹی کی قسمت کا جو فیصلہ ہونا تھا وہ تو بالآخر ہو کر رہا لیکن محمد علی کے یہ الفاظ اپنے جوش بے لفت میں ہم لوگوں کے دل میں بار بار کھٹکتے رہے کہ "الحاق توڑ دینا صحیح طریق عمل نہیں، آئینی کارروائی یہی کہ ان لوگوں کو خود کمیٹی کے اندر (Out vote) کیا جاتا یعنی ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی جاتی"۔ اس اشتعال و ہیجان کے عالم میں عدل و ضابطہ کو اتنا ملحوظ رکھتے تو ان آنکھوں نے محمد علی ہی کو دیکھا۔ ورنہ دنیا تو اس سے کہیں ہلکے موقع پر بھی، بس ہر ممکن طریقہ سے مخالف کو شکست دیدینا ہی جانتی ہے۔

محمد علی مجلس مرکزی کے سامنے تقریر کر رہے تھے کہ اثنائے تقریر میں کہیں یہ فقرہ ان کی زبان سے نکلا کہ "یہ خلافت کمیٹی کا کام قوم کا کام ہے، ملت کی خدمت۔ کوئی موروثی گدی نشینی نہیں ہے۔ جو لوگ اسکے کام کے لیے تیار و مستعد ہوں، وہی اس میں رہیں۔ باقی جو مادہ فاسد اس میں گھس آیا ہے، اسے خارج ہی ہو جانا چاہیے"۔

یہ فقرہ سننا تھا کہ محمد علی کے ایک مرشد زادہ[1] قدیم اودھ خلافت کمیٹی کے صدر، تڑپ کر اٹھے، اور سر جلسہ یہ کہتے ہوئے کہ "آپ ہمیں مادہ فاسد کہتے ہیں، ہم آپ کو بیکر باطل سمجھتے ہیں" مع اپنے ایک کھدر پوش متوسل خاندانی کے، جو لکھنؤ کے جلسہ لکھنؤ کے توڑنے میں بہت پیش پیش تھے، باہر چلے گئے۔

یہ لکھنؤ نہ تھا، کانپور تھا۔ اور مجمع خاندانی معتقدین کا نہ تھا، جلسہ مرکزی خلافت کا تھا۔ انکا

[1] اس سے مراد جمال میاں صاحب نہیں، جو اس وقت بالکل بچے تھے۔

کی بہت بڑی تعداد فرنگی محل کی طرف سے بھری بیٹھی تھی۔ کتنوں کے چہرے غصہ سے تمتما اٹھے۔ کتنوں نے چاہا کہ فوراً ایک ملامت کا ووٹ پاس کرا دیں، اور یہ تو سب ہی سمجھے کہ اب فرنگی محل کی خیر نہیں محمد علی کی زبان شستہا پشت کی خبر لے ڈالے گی ــــــ لیکن ہوا کیا؟ محمد علی کی زبان سے صرف یہ فقرہ تو غصہ کے تیوروں سے ادا ہوا کہ "آپ بچے ہیں، بچے ہیں" اور اس دو حرفی جواب کے بعد تقریر اسی اعتدال و توازن کے ساتھ جوں کی توں جاری! یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی ناگوار و اشتعال انگیز واقعہ پیش بھی آیا ہے۔ محمد علی کے "غصہ کرنے" کے واقعات آپ نے بہت سے سنے ہوں گے، اور وہ صحیح بھی ہوں گے۔ بہتر ہوگا کہ "غصہ سہنے" کی بھی اس مثال کو اپنی یادداشت میں ٹانک لیجئے! محمد علی تو خیر واقعی غصہ ور تھے، کوئی حلیم سا حلیم انسان بھی ہوتا تو اس موقع پر کیا کرتا؟ کیا محمد علی سے زیادہ کسی حلم و تحمل کا ثبوت دیتا؟

جلسہ کے بعد اور جلسہ کے باہر جدید و قدیم دونوں خلافت کمیٹیوں کے ارکان میں باہم اکثر زور آزمائی ہوتی رہی۔ اور قدیم کمیٹی چونکہ کمزور تھی، اپنی کمزوری کے نتائج بھی اسے برداشت کرنے پڑے۔ لیکن محمد علی کو ایک بار بھی ان آویزشوں میں الجھتے کم سے کم ان آنکھوں نے تو نہیں دیکھا۔

باب (۴۸)

۱۹۲۵ء (۱۸)

(خلافت کانفرنس۔ مسلم لیگ)

یہ نیاز مند کانپور ۲۲ر دسمبر کی شام ہی کو پہنچ گیا تھا۔ صوبہ خلافت کمیٹی کا صدر تھا، اور وہ بھی نیا نیا۔ خوب خوب خاطریں ہوئیں، اور بجائے خادم کے مخدوم بنا رہا۔ دوسرے دن صبح محمد علی آگئے۔ چند ہی روز قبل کامریڈ میں ان کے قلم سے ایک بڑا لمبا مضمون، گویا ہندوستان سے ایک انگریز سیلین کا مکتوب کسی دوسرے سیلین کے نام جو انگلستان میں ہے، نکلا تھا (اس مضمون کا ذکر اسی ڈائری کے باب (۳۱) میں کامریڈ کے ذیل میں آچکا ہے)۔ یہ مضمون محمد علی کے بہترین مقالات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اور یہ تو پہلے ہی عرض ہو چکا ہے کہ محمد علی اصلی اہل قلم انگریزی کے تھے، کاردو کی ساری مشق ان کی انگریزی انشا پردازی کی تھی۔ زبان اور خیالات دونوں کا پورا لطف بس ان کی انگریزی تحریر پڑھنے میں تھا۔ ملنے کے ساتھ اس مضمون کی میں نے دل کھول کر داد دی۔ محمد علی چاہے اسے تحسین ناشناس ہی سمجھے ہوں، تاہم میری دلدہی کے خیال سے تو بہرحال اپنے کو مسرور و مطمئن ہی ظاہر کیا۔

زنانہ ان کے ہمراہ بھی تھا اور میرے بھی۔ خود جس خیمہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، اسی کے متصل ایک خیمہ مجھے بھی مل گیا تھا۔ محمد علی بے حد مشغول تھے۔ کانگریس کی صدارت کو ابھی ایک سال ہی تو

گزرا تھا۔ کانگریس والے بے طرح چھٹے ہوئے تھے۔ اور خلافت کے تو سب ہی کچھ وہ تھے۔ وہی مرتبہ حاصل جو بارات میں نوشہ کو حاصل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا معلوم اور کتنی چھوٹی بڑی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ بہتوں کے کارکن انھیں گھیرے ہوئے۔ خیمہ متصل نہ ہوتا، تو مجھے تو باریابی بھی مشکل ہی نصیب ہوتی۔ مگر اس قرب و ہمسائگی نے مشکل آسان کر دی۔ ہر وقت کے خلا ملا کا موقع حاصل۔ کانگریس کا اجلاس مسز نائیڈو کی صدارت میں بڑے معرکہ کا اجلاس تھا، ہزاروں کا مجمع۔ میرے پاس کانگرس کے لیے ٹکٹ تو ایک کی جگہ دو موجود تھے، ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے (ڈیلیگیٹ منتخب ہونا دشوار ۲۳ء میں بھی تھا، مگر نہ اس شدت سے دشوار جتنا کہ بعد کو ہو گیا) دوسرا پریس ٹکٹ بہ حیثیت سچ کے ایڈیٹر کے تھا۔ لیکن ان دو ٹکٹوں کے باوجود ہوا یہ کہ صوبہ متحدہ کے ڈیلیگیٹوں کیلئے جو جگہ پنڈال میں رکھی گئی تھی، وہ ڈائس سے بہت دور تھی، ایسی کہ وہاں تک مقرر کی آواز پہنچنی مشکل تھی۔ (۲۵ء میں لاؤڈ اسپیکروں کا یہ رواج کہاں تھا!) اتنی دور بیٹھنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ رہا پریس ٹکٹ تو پریس رپوٹروں کے لیے جگہ بیشک اچھی تھی لیکن یہاں تقریباً سب وہی لوگ تھے، جو اپنے اپنے روزناموں کے لیے پنسل یا فاؤنٹین پن ہاتھ میں لیے بیٹھے برابر نوٹ لے رہے تھے۔ سچ کے ناکارہ ایڈیٹر کو ان کے درمیان خالی ہاتھ بیٹھے کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔ طبیعت اسی شش و پنج میں تھی کہ محمد علی اپنے خیمہ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ سابق صدر کانگرس تھے، اور اس حیثیت سے متعدد اعزازی ٹکٹ ان کی خدمت میں نذر کیے گئے تھے۔ آتے ہی ایک ٹکٹ بلا میری طلب کے میرے سامنے کر دیا! اور اب میں ڈائس نشین تھا ——— "کم خرچ بالانشین" سنا تھا، یہاں "بالانشینی" کم خرچی کے ساتھ نہیں، بالکل بلا خرچ، مفت ہاتھ آگئی!

دوستوں کو ساتھ لیے بغیر کسی جلسہ میں، دعوت میں، تماشہ میں، وعظ میں، لکچر میں، تنہا جانا محمد علی کے مذہب میں گویا گناہ تھا۔ اور جس طرح وہ کھانا بغیر دو چار شخصوں کو دسترخوان پر

ساتھ بٹھائے تنہا نہیں کھا سکتے تھے ۔ اسی طرح جس چیز سے بھی انہیں لطف آرہا ہو اس سے دوستوں کو محروم رکھنا وہ جانتے ہی نہ تھے ۔ وہ فرمائش اور تقاضا کا انتظار نہ کرتے ، خود دوڑ دوڑ کر بلاتے اور گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے ـــــــ جس کا معمول دنیا میں زندگی بھر یہ رہا کیا وہ جنت میں اپنے دوستوں کو ساتھ لائے بغیر ان کی پروا کیے بغیر داخل ہو جانا گوارا کرے گا ؟

خلافت کمیٹی کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا ظفر علی خان ، مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی صاحب تھے ، آخر اکتوبر میں حجاز روانہ ہوا تھا ۔ کانپور میں آخر دسمبر میں خلافت کے جلسے ہو رہے تھے اور عین اس وقت شاید مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا کہ وفد حجاز کا ایک طویل تار موصول ہوا کہ سلطان نجد کا قبضہ مدینہ منورہ پر ہو گیا ، اور شریفی فوجیں بھاگ نکلیں ۔ یہ خبر ظاہر ہے کہ ہم سب کے لیے کتنی مسرت انگیز تھی ، لیکن ساتھ ہی کوئی ایسی اطلاع بھی پہنچی (اتنے روز کے بعد اب تفصیل ذہن میں نہیں کہ کس ذریعہ سے) کہ سلطان نجد خود شاہ حجاز ہو جانا چاہتے ہیں ، اور شعیب قریشی اور مولانا عرفان کی مخالفت کے باوجود مولانا ظفر علی خاں سلطان کی ہمنوائی پر آمادہ ہیں ۔ سقوط مدینہ کی خبر سے مسرت و شادمانی کی جو لہر دوڑ جانی چاہیے تھی ، اسے خبر کے اس جزو نے اداسی سے بدل دیا ۔ لیکن یہ اداسی زیادہ تر محض محمد علی کی اداسی کا عکس تھی ، ورنہ ہم عوام کی سمجھ میں آیا بھی نہیں کہ آخر اس میں حزن و تاسف کی کیا بات ہے ۔ تقریباً ہم سب کے سب ، ایک آدھ فرد کو مستثنیٰ کر کے ، بس اسی قدر چاہتے تھے کہ فتح سلطان کو حاصل ہو اور شریفی حکومت و تسلط کے اعادہ کا امکان باقی نہ رہے ۔ سلطان کے عقائد سے اکثر افراد کو اتفاق تھا ، فتح سلطانی کی تائید کی اصلی اور قوی بنیاد بھی ہم عقیدگی تھی ۔ محمد علی کی افسردگی آج دیکھ کر پہلی بار محسوس ہوا کہ محمد علی جو سلطان کی تائید کر رہے تھے اس سے مقصود سلطان کی ذات یا ان کے عقائد کی تائید نہ تھی ، بلکہ اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ ان کے

خیال میں سلطان ملکیت وشخصیت کی بدعت کو مٹا کر جمہوری وشوری حکومت قائم کرنے والے ہیں۔ اور ارض حجاز کی خدمت کا موقع اپنے ساتھ سارے عالم اسلامی کو دینے والے ہیں۔ آج وہ کہاں اس توقع کو پہنچ رہا تھا؟ آج امید یہ ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا صدمہ محمد علی کو نہ ہوتا تو اور کس کو ہوتا؟

علی گڑھ کی جوبلی کا بھی عین یہی زمانہ تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے اپنی مسلسل علالت وضعف کے باوجود علی گڑھ کالج کی ۵۰ سالہ سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منانے کا تہیہ کیا تھا، اور وہ جشن اسی زمانہ میں ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کا نوکیشن وغیرہ کے علاوہ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی وہیں تھا۔ محمد علی سے بڑھ کر علی گڑھ کا شیدائی اور کون رہ چکا تھا؟ لیکن ساتھ ہی اس وقت سب سے زیادہ ان ہی کا دل بھی علی گڑھ کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ چند سال قبل کا زمانہ ہوتا تو جوبلی میں وہی سب سے پیش پیش ہوتے۔ اس وقت علی گڑھ کی طرف رخ کرتے ان کا دل دکھتا تھا۔ کالج کے در و دیوار انھیں محبوب تھے۔ خاک علی گڑھ کے ذرہ ذرہ سے انھیں شیفتگی تھی۔ گھر کے مالک کی اولاد پر اگر گھر کا دروازہ بند ہو جائے، تو وہ اولاد کیسی تڑپ تڑپ کر رہے گی۔ بس یہی حال محمد علی کا تھا۔ لیکن ادائے فرض کا احساس ان کے ہاں بہر حال ہر شے پر غالب تھا۔ مسلم لیگ پر مختلف دور گزرے ہیں، اس وقت اس پر بڑے بڑے خیر خواہان سرکار برطانیہ۔ فلاں "سر" نائٹ اور فلاں "خان بہادر" اور فلاں "سی۔ آئی۔ ای" قابض تھے، اور اس اجلاس میں مسلمانوں کے نام سے بڑے اہم فیصلے صادر کیے جانے والے تھے۔ اکثر کا خیال یہ تھا کہ محمد علی اس وقت کانگرس میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ابھی انھیں کہاں فرصت کہ کانگرس چھوڑ چھاڑ کانپور سے علی گڑھ دوڑے آئیں۔ اچھا ہے وہ غائب ہی رہیں، یہاں جو جی چاہے گا پاس کر لیا جائے گا ———

وقت کے وقت لوگوں نے محمد علی کو توجہ دلائی کہ آپ مسلم لیگ میں نہ شریک ہوئے، تو بڑا غضب ہو جائیگا۔
میں تو جلسۂ خلافت کو ختم کرا اور کانگریس کے بھی دو ایک جلسوں میں شرکت کر کرا، کانپور سے سیدھا
علی گڈھ جوبلی کے باقی پروگرام میں شریک ہونے، روانہ ہوگیا۔ محمد علی دو ایک وقت بعد خدا جانے
کن کن مشکلوں سے اپنا پیچھا چھڑا علی گڈھ پہنچے۔

آدھی رات کا وقت تھا، اور رات آخر دسمبر کی، کڑاکے کی سردی رکھنے والی۔ مولانا شوکت علی،
ڈاکٹر سید محمود، اور اور کئی صاحب ساتھ تھے۔ مشہور بیرسٹر عبد المجید خواجہ کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا،
اور ان کا مکان مہمان سرا بنا ہوا تھا۔ وہیں یہ قافلہ بھی آیا، اور سب کو سوتے سے جگایا۔ سیاسی
مجلسوں سے اس ڈائری نویس کو زیادہ دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک
استثنائی تھی۔ مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا، نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت ہی سے شریک ہوا۔
محمد علی مع اپنے دو چار "احرار"[1] رفیقوں کے جاتے تھے۔ واپسی پر ان ہی کی زبانی حالات سن لیتا تھا۔
چشم دید منظر صرف ایک ہے۔ جلسہ کے اندر نہیں، جلسہ کے باہر۔ محمد علی، خواجہ صاحب کے ڈرائنگ روم
میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ رات زیادہ آچکی ہے۔ دوسرے دن جلسہ صبح ہی سے ہے۔ رزولیوشن اسی
وقت تیار کر لینے ہیں۔ احرار کی ساری پارٹی کا اصرار ہے کہ فلاں مسئلہ پر کل ایک لمبی تحریک پیش ہو،
جس کے لیے ضرورت بھی لمبی تیاری کی تھی۔ محمد علی نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی صاحب مسودہ
تو تیار کریں، پھر کاٹ چھانٹ میں کرلوں گا۔ کمرہ میں خاموشی رہی۔ پھر یہ کہا "اچھا میں بولتا جاتا ہوں
کوئی صاحب لکھتے جائیں"۔ کمرہ میں سناٹا اب بھی بدستور چھایا رہا۔ آخر میں بمشکل الہ آباد کے ایک نوجوان بیرسٹر
قلم ہاتھ میں لیکر بیٹھے کہ محمد علی کے املاء کیے ہوئے الفاظ لکھتے جائیں۔ اور لوگ تو جا جا کر سو رہے

[1] خلافت کمیٹی کے ضعیف مضمحل ہو جانے کے بعد اس وقت (یعنی ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں) سیاسیات کے میدان میں تنہا
جماعت مسلم لیگ کے مقابل "جمعیۃ احرار" ہی کے نام سے زندہ تھی۔)

محمد علی غریب نے خدا معلوم کب تک جاگ کر کام ختم کیا ـــــــ یہ نظارہ اپنی نوعیت میں انوکھا نہ تھا۔ کتنے ہی حضرات ایسے تھے جو نام اپنی پارٹی کا چاہتے تھے۔ لیکن کام سارا محمد علی ہی سے لینا چاہتے تھے۔ اور محمد علی کی ذات گویا ایک مشین تھی، جس کو نہ آرام کی ضرورت اور نہ جس کو کبھی کوئی معذوری پیش آسکتی تھی۔

———•———

باب (۴۹)

۱۹۲۶ء (۱)

(ظرف کا امتحان۔ اشتعال انگیزیاں)

شریفی سعودی جنگ شروع اگست ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ اب جنوری ۱۹۲۶ء آگیا، سرزمین حجاز پر تو کہنا چاہیے کہ اب ختم ہی ہو چکی تھی، لیکن ہندوستان کی سرزمین پر اسی شدت اور اسی حدت، اسی جوش اور اسی سرگرمی کے ساتھ قائم، تیغ و تفنگ کے بجائے زبان و قلم سے جنگ کے پہلو بیسیوں اور اطراف درجنوں تھے، لیکن اب ایک عرصہ سے سارے نزاعات سمٹ سمٹا کر صرف دو شخصیتوں کے دامن کے نیچے آگئے تھے۔ ایک طرف مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور دوسری طرف مولانا محمد علی۔ دنیا جس جنگ کا تماشہ مزہ لے لیکر دیکھ رہی تھی، وہ یہی "پیر و مرید" کی جنگ تھی۔ محمد علی سے جس کسی کو دل کا بخار نکالنا ہوتا، جھٹ فرنگی محلی لشکر میں شریک ہو جاتا۔ فرنگی محل کے درپے جو کوئی بھی ہوتا، معاً محمد علی کے جھنڈے کے نیچے آکھڑا ہوتا۔ لیکن یہ خیال دنیا والوں کا تھا ممکن ہے فرنگی محلیوں کا ہو، خود محمد علی نے ابتک ایک دن کے لیے بھی نہ جنگ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا نہ مولانائے فرنگی محلی کو اپنے حریف مقابل کی حیثیت سے دیکھا، اور نہ اپنے کو اپنے مرشد سے آمادۂ جنگ پایا —— محمد علی کا نقطۂ نظر ہی بالکل دوسرا تھا۔ تصریح کئی بار گزر چکی دُہرائی کہاں تک جائے؟

پانچ مہینے کی مدت میں کیسے کیسے انقلابات ہو گئے۔ کتنے اچھے دل بُرے ہو کر رہے۔ کتنے
جڑے ہوئے دل ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ دوست دشمن بن گئے، اور کتنے بھائی بھائیوں کی عزت کے
خواہاں ہو گئے لیکن خود محمد علی کی زبان پر ابتک اپنے پیر و مرشد کے معاملہ میں مہر لگی ہوئی۔ لوگ
چھیڑتے، پوچھتے، گدگداتے، ہنستے کہ اب تو مرید کسی طرح مشتعل ہو کر بپھرے، محمد علی کی زبان فرنگی محل
پر کھلے اور محمد علی کا قلم اپنے مرشد پر اٹھے لیکن محمد علی نے اپنی بیسیوں تقریروں اور ان سے کم لیکن
پھر بھی بہت تحریروں میں ایک لفظ بھی ایسا نہ آنے دیا جس سے مولانا کی توہین نکلتی ہو۔ ہمدرد میں
جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، کبھی اتفاق سے جب دوسروں کے قلم سے (اور ان دوسروں میں خود
یہ ڈائری نویس بھی شامل ہے اور عارف صاحب چیف سب اڈیٹر بھی) کوئی چیز اس قسم کی نکل جاتی
تو علم ہونے پر محمد علی سخت ناخوش ہوتے۔ زبانی گفتگوؤں میں بھی اپنا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ جب
کبھی فرنگی محل کی بدزبانیوں یا زیادتیوں کی شکایت شروع کی گئی تو معاً محمد علی یہ جرح کرنے لگے
کہ یہ الفاظ کس کے ہیں؟ خود مولانا کے ہیں؟ آپ نے اپنے کانوں سے ان ہی کی زبان سے سنے
ہیں؟ اور جب ان سوالات کا جواب اثبات میں نہ دیا جا سکتا، تو فرماتے کہ "بس مجھے پروا نہیں۔
کوئی کچھ بھی کہا کرے، میرا معاملہ تو صرف مولانا سے ہے، کسی اور سے نہیں" ——— ہم لوگ
پارٹی والے جب آپس میں بیٹھتے تو کہتے کہ شوکت صاحب کی طرف سے تو اب اطمینان ہے،
وہ تو فرنگی محل کو خوب پہچان گئے ہیں، اب نہیں بدلنے کے لیکن ان حضرت (محمد علی) کی طرف سے
اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ جس وقت بھی پھر ادھر ڈھل جائیں، ان سے کچھ بعید نہیں۔"

بارہ بنکی کے ضلع میں دریاباد کے پڑوس میں ایک مشہور قصبہ ردولی ہے۔ یہاں سلسلہ صابریہ
چشتیہ کے ایک مشہور بزرگ مخدوم شاہ احمد عبد الحق کی درگاہ ایک مشہور و معروف درگاہ ہے۔

وسط جمادی الثانی میں عرس کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ زائرین، شائقین دور دور سے آتے ہیں، اور فرنگی محل خاندان کی یہ شاخ مولانا عبدالباری صاحب والی تو اپنی حاضری لازمی سمجھتی ہے۔ اس سال عرس دسمبر ۲۵ء کی بالکل آخری تاریخوں میں آکر پڑا۔ عارف صاحب کانپور تک تو کانگرس و خلافت کے جلسوں کے لیے آہی چکے تھے، وہاں سے اٹھے تو سیدھے ردولی پہنچے۔ سماع و قوالی کے بڑے ہی شائق تھے۔ یہاں فرنگی محلی جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی، جس میں خود مولانا بھی شامل تھے۔ یہاں کیا کیا گزری، اس کا پورا حال تو اللہ ہی کو معلوم، البتہ عارف صاحب جب فتح پور ہسوہ واپس پہنچے ہیں تو فرنگی محل، اور خصوصاً مولانائے فرنگی محلی کی شکایتوں کا طومار زبان پر بھی تھا اور قلم پر بھی۔ ہمدرد میں ان کے قلم سے، اور ایک فرضی نام سے، لکھی ہوئی بڑی مفصل رپورٹ ۷، ۸ کالموں میں دو نمبروں میں شائع ہوئی جس میں یہ تصریحات موجود تھیں:۔

"...... فرنگی محلیوں نے یہاں آکر کذب و افترا کا ایک جال بچھا دیا ...... فرنگی محلیوں کی شرکت کو شرکت عرس پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس دفعہ تو مولانا عبدالباری اور علی برادران اور خلافت کمیٹی کے خلاف جہاد کرنے میں زیادہ تر سرگرم رہے، اور جس قدر آپ سے ہو سکا مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے خلاف خود آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے زہر اگلا اور پروپگنڈا کیا ...... مولانا عبدالباری صاحب مع دو قد رائی اور بہت سے فرنگی محلیوں کے جس وقت سے ردولی تشریف لائے اس وقت سے لیکر واپسی تک اسی جد و جہد اور سعی و کوشش میں مصروف رہے کہ خلافت کمیٹی اور اس کے جملہ ارکان کو عموماً اور علی برادران کو خصوصیت کے ساتھ طرح طرح کے غلط اور جھوٹے الزامات لگا کر بدنام کریں۔ چنانچہ کذب و افترا کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا، جو برادران محترم کو نہ صرف وہابی بلکہ ملحد و کافر مشہور کرنے میں فروگذاشت کیا گیا ...... علی برادران کی نسبت کذب و افترا کا وہ طوفان برپا کیا گیا کہ الامان والحفیظ ... الخ

علی برادران فرنگی محل کے دائرۂ اسلام سے بھی قریب قریب خارج ہیں۔ یعنی اب شریفی و سعودی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ راویٔ معتبر کے بیان کے مطابق، بہ قول مولانا عبدالباری کے الحاد و اسلام کا مقابلہ درپیش ہے۔ یعنی خلافت کمیٹی اور علی برادران الحاد پھیلا رہے ہیں، اور فرنگی محل اپنے ناتواں بازوؤں سے اس کا مقابلہ کر رہا ہے...... صرف زبانی پروپگنڈا نہیں کیا گیا، بلکہ ٹریکٹ، پمفلٹ اور ہینڈبل وغیرہ بھی کثیر تعداد میں تقسیم کئے گئے۔"

عارف صاحب دہلی جنوری کے پہلے ہفتہ میں پہنچے۔ مضمون کے دونوں نمبر ۱۲ و ۱۳ جنوری کے ہمدرد میں نکلے۔ پارٹی والے (اور ان ہی میں یہ ڈائری نویس بھی تھا) پڑھ پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ اور عارف صاحب کے "قلم توبہ رقم" کی داد دل کھول کھول کر دی (مضمون عارف صاحب کے نام سے نہ تھا۔ صرف "از قلم توبہ رقم" تھا۔ عارف صاحب کے نام کا راز خود محمد علی نے دوسرے ہی دن طشت از بام کر دیا تھا) لیکن محمد علی کے دل پر کیا بیت رہی؟ ——
کسی مرید کی ارادت و عقیدت پر اس سے سخت بار کبھی کیوں پڑا ہوگا؟ کسی دوست کی دوستی کی اتنی سخت آزمائش کبھی کاہے کو ہوئی ہوگی؟ مولانا عبدالباری پیر و مرشد بھی تھے اور نہایت عزیز دوست و محبوب بھی۔ برسوں کی دوستی، سالہاسال کی محبت، مدتوں کی عقیدت، ایک عمر کا خلوص، سب کا خاتمہ ایک ساتھ ہو رہا تھا! سارے رشتے دم کے دم میں ٹوٹ رہے تھے! کون سا دل اتنے کڑے امتحان کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے؟ اور پھر محمد علی جو محبت کا پتلا، سرتاپا دل ہی دل تھا!

مولانا کو چھوڑنا تنہا ایک شخص کو چھوڑنا نہ تھا۔ ایک ہی وقت میں دینی مربی کو چھوڑنا تھا، دنیوی محسن کو چھوڑنا تھا، بہترین رفیق کار کو چھوڑنا تھا، مخلص ترین مشیر کو چھوڑنا تھا، محبوب ترین

عزیز کو چھوڑنا تھا، عزیز ترین بھائی کو چھوڑنا تھا، اور ان سب کو ایک ہی وقت میں چھوڑنا تھا! جسم کا جان کو چھوڑنا تھا ——— اس شب میں محمد علی کو نیند کیسے آئی ہوگی؟ اس دن محمد علی کو کھایا پیا کیسے گیا ہوگا؟ محمد علی نے کبھی ایک غزل کہی تھی، جس کا ہر شعر مزیدار ہے۔ کہا تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس شاعری کا امتحان اب واقعات کی دنیا میں تھا۔ مرید نے مرشد کا دامن خود مرشد ہی کی فرمائش پر، اللہ کے لیے پکڑا تھا۔ آج وہی دامن اللہ ہی کے لیے ہاتھ سے چھوٹ بھی رہا تھا! ——— ایمان کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو دنیا کی کوئی سی بھی قوت محمد علی کو فرنگی محل سے چھڑا سکتی تھی؟

پھر عارف صاحب محمد علی کی نظر میں کوئی لاغی اور واہی وادی نہ تھے، ہمدرد کے سرگرم کارکن اور ذمہ دار رکن تھے۔ مالک ہمدرد کی ہواخواہی میں بہتوں سے آگے، اور کم از کم اُس وقت تک تو محمد علی کے ایک خاص معتمد علیہ تھے۔ جب وہ اپنی چشم دید شہادت جزم و وثوق کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تو محمد علی کیسے نہ اس پر اعتبار کرتے، اور کہاں تک اسے جھٹلاتے؟ خصوصاً جبکہ سارے قرائن و قیاسات اور پہلے کی سنی ہوئی حکایات و روایات اس کی عین تائید میں ہوں؟ ——— مہینوں کا اہتمام ضبط ختم ہوا۔ مدتوں کی وضع احتیاط رخصت ہوئی۔ اور عارف صاحب کے مضمون کا پہلا نمبر نکلتے ہی دوسرے دن خود محمد علی کے قلم سے ہمدرد میں تقریباً ۵ کالمون کا مضمون "تقاضائے وفا" کے عنوان سے نکل گیا۔

باب (۵۰)

۱۹۲۶ء (۲)

(دوبدو - کڑی آزمائش)

"میں نے ابتک کوشش کی اور اس میں ایک حدتک کامیاب رہا کہ باوجود فرنگی محلی سرگرمیوں کے ہم لوگ اور تمام کام چھوڑ کر فرنگی محل سے بحث ومباحثہ میں منہمک نہ ہو جائیں" مقالہ شروع یوں ہوا۔ لیکن ناگواری اور یاس کی حالت میں بھی اعتدال و توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ آگے چل کر کہتے ہیں :۔

"عارف صاحب غلطی پر ہیں، اگر وہ اس پروپگنڈا کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے میں تمام کام چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ عارف صاحب میں غالباً مجھے احساس تناسب کی کمی محسوس ہوئی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ردولی شریف کے عرس کے پروپگنڈے سے انھیں اس قدر متاثر پاتے ہیں۔"

اجمیر کا "آل انڈیا" عرس، عرس ردولی کے دو ڈھائی ہفتہ بعد ہونے والا تھا۔ عارف صاحب نے خبر دی تھی کہ فرنگی محل اصل تیاریاں وہاں مقابلہ کے لیے کر رہا ہے، اور وہاں ردولی سے بھی کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ زبردست پروپگنڈا ہوگا، اس لیے اہل خلافت کو وہاں پہنچنا بہت ضروری۔ اس پر محمد علی لکھتے ہیں، "اور وہی یہ لکھ بھی سکتے ہیں :۔

اجمیر شریف کے عرس میں شرکت میں اپنے لیے باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ اور اگر اس آستانۂ گرامی سے فیض حاصل نہ بھی ہوتا جب بھی جہاں اتنے مسلمان جمع ہوں پہنچنا ہم جیسے خادمانِ ملت کے لیے یوں بھی بسا ضروری ہے لیکن ہم نہ بھی حاضر ہو سکے (اور خوف یہ ہے کہ میں تو اس بار شاید محروم ہی رہوں) تب بھی خداوند کریم نے جس طرح اچانک ردولی شریف میں کذب و افترا کے تارِ عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم فرما دیا، اسی طرح اجمیر میں بھی وہی مسبب الاسباب اس کا سامان فراہم فرما دے گا۔ بیت عنکبوت سب گھروں سے زیادہ کمزور ہے۔ اس کی شکست و ریخت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔"

بڑا اعتراض عوام (اور ان ہی میں بہت سے خواص بھی شامل تھے) کی نظر میں نقضِ عہد "بیعت" (بیعت اصطلاحی) کا آ کر پڑ رہا تھا۔ اس کے جواب میں یہ لکھنے کے بعد کہ اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم انگریزوں سے لڑے، جن میں مل کر ہم جوان ہوئے تھے۔ شریف سے لڑے۔ ترکوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے، ہندوؤں سے لڑنے کو تیار ہیں، آخر میں لکھتے ہیں۔

"اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم نے علمائے ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا، اور کبھی نکث عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے لیکن اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم ایک بار نہیں ہزار بار اُن سے اپنے رشتہ کو توڑ دیں گے، اور صرف اسی خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے، جس سے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کہہ کر رشتہ جوڑ لیا تھا...... ہم اپنے پیر و مرشد کے پاس فنا فی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے، بلکہ فنا فی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لیے وہی پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ و رسولہ ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم الآخر۔"

معیار کی اس بلندی تک عام مخالفین و موافقین کیا پہنچتے۔ پارٹی والے، اِدھر کے ہوں یا اُدھر کے، روح کی ان گہرائیوں کو کیا پہچانتے ——— اہل نظر خود دیکھ لیں کہ ذرح عارف صاحب کے مضمون کی کیا تھی اور سوختہ دل، تفتہ جگر محمد علی کے مضمون کی کیا،

موسیا! آدابِ دانان دیگر اند
سوختہ جان در دانان دیگر اند

دنیا جو چاہے سمجھا کرے، جو چاہے کہتی رہے، بہرحال خود محمد علی اپنی زبان سے یہ صدائے حق لگاتے ہیں:

"جو کوئی ہم پر نکث عہد کا الزام لگائے، وہ میرے اس عہد کو یاد رکھے جس کو بہ حالت نظر بندی میں نے اپنی سب سے پہلی غزل میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

اور اگر اسی زمانہ کے میرے اس شعر پر بھی نظر رہے تو برا نہیں ؎

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یہ تقاضائے وفا صرف انگریزی حکومت ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ ہر غیر اللہ کے مقابلہ میں ہے۔ میں نے آج تک ایک لفظ بھی مولانا عبد الباری صاحب کے خلاف نہیں لکھا، اور جو کچھ مولانا صاحب کے متعلق سنا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کہتے اور کرتے ہیں، اسے کبھی یاد نہیں کیا تھا، مگر ....

اس "مگر" کے بعد فرنگی محل اور خدام الحرمین پارٹی کی چند حرکتوں کی تصریح ہے اور اس کے بعد "یہ وہ چیزیں تھیں جن کے بعد میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ مولانا صاحب

جو خدام الحرمین کے صدر اور فرنگی محلی حضرات کے بزرگ....... ان کے افعالِ قبیحہ پر اظہار بیزاری فرماتے تھے یہی نہیں کہ اظہار بیزاری اب تک نہیں فرمائی گئی بلکہ........"

اس "بلکہ" کے بعد مزید جرائم کی تصریح ہے، یہاں تک کہ

"اب عارف صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ردولی شریف میں جو پروپیگنڈا کیا گیا، اس میں مولانا صاحب خود بنفس نفیس شریک تھے۔"

محمد علی کے سینہ میں بھی آخر گوشت و پوست ہی کا دل تھا، پتھر کا کلیجہ نہ تھا۔ پیمانۂ صبر کیا بھی نہ چھلکتا؟ .... آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خون دل سے لکھا ہے۔ طیش و غضب سے بگڑ کر نہیں، حزن و شکستگی سے گھٹ گھٹ کر:۔

"بحمد اللہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں، اور ان شاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا۔ جب آٹھ برس علی گڑھ اور چار برس آکسفورڈ میں رہ کر مجھ میں کفر و الحاد نے سرایت نہ کی، تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڑھ سے بھی منہ موڑا، اور آکسفورڈ پر بھی لات مار دی، کیا خداوند کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لیجائیگا؟ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ گو زندگی عبادات و ریاضات میں صرف نہ ہوئی، مگر موت اس آخری عبادت و ریاضت میں نصیب ہو جس کا نام شہادت ہے، اور میرا شعر سچا ثابت ہو ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

فاطر السموٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والاٰخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصٰلحین

(اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے دین و دنیا میں تو ہی ولی ہے، مجھے اسلام پر موت دے اور صلحا میں مجھے شامل فرما)

مجھے فقط تیری خوشنودی منظور ہے ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

مجھ سے سب بیزار ہو جائیں، مگر تو اور تیرا رسول بیزار نہ ہوں۔ کسی سے بھی نکث عہد ہو، مگر تجھ سے اور تیرے رسول سے نہ ہو۔ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے ...... خداوندا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک سے اور تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسول کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہو گا اور میں ہوں گا، اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہو گا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

محمد علی کو دشمن تو دشمن، دوستوں اور محبوں نے بھی زود رنج اور مغلوب الغضب کہا ہے۔ زود رنجوں اور غصہ وروں کے یہی تیور، یہی شان یہی زبان ہوتی ہے؟ کسی کی بدزبانی نے "مردود الطریقت" بھی کہہ دیا تھا۔ "مردودوں" کی جبین عقیدت ایسی ہی نورانی ہوتی ہے؟ حالات وحوادث تکوینی تو وہ چیزیں ہیں، جنھوں نے ام المومنین صدیقہؓ اور امیر المومنین مرتضیٰؑ تک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا کر کے چھوڑا، پھر محمد علی اور ان کے مرشد کی کیا بساط تھی ______ لیکن کیا امیر المومنین جب ام المومنینؓ سے مقابلہ کے لیے نکلے ہیں، تو کیا ان کا دل اسے کوئی خوش آیند مشغلہ یا تفریح سمجھ رہا تھا؟ کیا طبع گرامی پر شدید گرانی نہیں محسوس ہو رہی تھی؟ محمد علی کے قلب کی حالت اس وقت کی کون بتائے؟ کون بتا سکتا ہے؟

مرید کو چھوڑیے، مرشد کا سینہ بھی بہرحال خالی نہ تھا۔ یہ تو شاید وہ موقع تھا کہ بے جس و بیجان پتھر تک میں حرکت پیدا ہو جاتی، تو پھر یہ تو ایک مومن کا قلب، ایک صاحب دل کا دل، ایک صاحب طریق کا سینہ تھا۔ اثر کیسے نہ ہوتا؟ اثر ہوا۔ مگر وہ بات اسی سطر میں اور اسی لمحہ کہنے کی نہیں اُس وقت تو ظاہری آنکھوں کو یہ نظر آیا کہ اثر محمد علی کی تحریر کا نہیں، عارف صاحب کے مضمون کا پڑا۔ فریقین میں ضدیں بڑھیں، جوش انتقام بھڑکا، اور مقابلہ کی تیاریاں اس عظیم الشان پیمانہ پر شروع ہوئیں کہ گویا آخری اور فیصلہ کن ہی معرکہ ہو کر رہے گا۔ اب تک آویزش سپاہیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ اب سورماؤں کے سورما، دونوں سپہ سالار، خود تلوار سونت سونت کر، ایک دوسرے کے مقابلہ کو بڑھے۔ ایک عظیم الشان، ہولناک اور زلزلہ افگن تصادم اب ہوا اور جب ہوا۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے ہجوم میں کوئی خوف سے لرز رہا ہے، کوئی شوق و مسرت سے مست ہو رہا ہے، لیکن منتظر سب کے سب، نگاہیں سب کی جمی ہوئی، کان سب کے کھڑے ہوئے —— ادھر بندے ان سرگرمیوں میں غرق، اُدھر تقدیر ایک دوسرے ہی کھیل، دردناک اور عبرت انگیز کھیل میں مصروف!

باب (۵۱)

سنہ ۱۹۲۶ء (۳)

(مرشد کی آخری گھڑیاں ۔ وصال)

۱۷ر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء یکشنبہ، رجب سنہ ۱۳۴۴ھ کی غالباً دوسری تھی ۔ یہ ڈائری نویس لکھنؤ میں تھا، اور اپنے ہاں عشا کی نماز اول وقت پڑھ ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا، مولانا سے فرنگی محلی پر سہ پہر کے وقت یک بیک فالج کا زبردست حملہ ہوا اور مولانا اس وقت سے بیہوش ہیں ـــــ مولانا کسرتی جسم کے آدمی تھے، توانا و تنومند صحت بہت اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ، اور عمر بھی ابھی پچاس سال کے اندر! ـــــ راوی خود ایک طبیب حاذق تھے، مولانا کی حالت دیکھے ہوئے چلے آرہے تھے، فرمایا کہ حملہ بہت شدید قسم کا ہے، اور زندگی کے لیے اچھا خاصہ خطرناک!

آہ، انسان ضعیف البنیان اور اس کی تدبیریں اور ارادے! کیا کیا تجویزیں ہو رہی تھیں، کیسے کیسے منصوبے بندھ رہے تھے، اور یہ ہو کیا گیا! ـــــ عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کر چکا تھا، وہ کام جو اب تک کسی کے بنائے بھی نہ بن آیا تھا، نہ چودھری خلیق الزمان کے بنائے نہ ظفر الملک علوی کے، نہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے، نہ عبدالماجد دریابادی کے، مولانا فرنگی محلی سے محمد علی کو باغی و برگشتہ کرنے کی کوشش اور تدبیریں اب تک محمد علی کے فدا جانے کتنے نیازمند اور رفیق کر چکے تھے، بعض حبِ علی کی بنا پر، اور زیادہ تر بغضِ معاویہ کی بنا پر کوئی محمد علی

سے فرط اخلاص و نیاز کی بنا پر، اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ لکھنؤ ان تحریکی کوششوں کا مرکز تھا، اور اپنے حیدرآبادی کے حضرات ان کوششوں میں سرگرم۔ یہ ڈائری نویس بھی (اللہ اسے معاف کرے) ان کارروائیوں میں بڑی حد تک تو نہیں، لیکن کسی درجہ میں بہرحال شریک و معین۔ محمد علی کے تعلقات محبت ("محبت" نہ کہ عقیدت) مولانائے فرنگی محلی سے اس درجہ محکم و استوار تھے کہ کسی کی کچھ نہ چلتی ــــــــ عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا کہ گوشت ناخن سے جدا ہوا۔ دوست کا دل دوست سے، عزیز کا دل عزیز سے، مسترشد کا دل مرشد سے ہٹا۔ اور دل کی ٹیسیں لفظ و عبارت کا جامہ پہن کر ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی تھی؟ یاروں کی دیرینہ تمنا بر آئی۔ عارف صاحب کو داد بھی ملی اور مبارکباد بھی، زبانی بھی اور اخباری مضمون میں بھی۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجریؒ کا عرس اجمیر میں ہر رجب کو ہوتا ہے۔ اور جس طرح حضرت کا مرتبہ خواجۂ خواجگان کا سمجھا جاتا ہے، اس عرس کو بھی عرس الاعراس کہنا چاہیے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا عرس شاید یہی ہے۔ معتقدین کا ہجوم عظیم، زائرین کی ریل پیل، خوش عقیدگی کی حکومت مشائخ اور پیرزادے ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا۔ علی برادران اور خلافت کمیٹی پر یورش کا موقع اس سے بہتر اور کہاں مل سکتا تھا۔ ردولی کے عرس کو اور عارف صاحب کے مضمون کو ابھی دن ہی کے ہوئے تھے۔ غصہ تازہ، جوش بے اندازہ، زخم ہرا۔ ٹھہری یہ کہ خدام الحرمین علیہم السلام کا جلسہ بیمانہ پر وہیں ہو، اور لکھنؤ اور دہلی اور بمبئی اور لاہور، سب کہیں کا جمع شدہ بخار، وہیں دل کھول کر نکالا جائے، اور یلغار اس زور کی کی جائے کہ ان "مردود وہابیوں" کا نام و نشان بھی نہ رہ جائے۔ ــــــــ اصل منصوبے تو جو کچھ بندھے ہوں گے، ان کا پورا اور صحیح علم تو ان ہی حضرات کو ہو سکتا تھا

البتہ کچھ اڑی پڑی خبریں اُدھر کی اس کیمپ میں بھی آجاتی تھیں، اور یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ صوفیانِ باصفا و مرشدانِ بے ریا" نے ایکا کرکے ابکی یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اپنی جان لڑادیں گے، اور نا ہنجار وہابیوں کا قلع قمع کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ ان بدبختوں کا سردار و پیشوا محمد علی ہے، اسے زیر کرلیا تو بس فتح ہی فتح ہے۔ اسے گرالیا، تو پھر مقابلہ پر کون کھڑا رہ سکتا ہے؟

عرس کی اصل تاریخ ۶ رجب تھی۔ مولانائے فرنگی محلی کا مقدمۃ الجیش کئی دن قبل روانہ ہوچکا تھا، مولانا بنفس نفیس ۲ کی شام کو روانہ ہونے والے تھے کہ یک بیک سہ پہر کو یہ واقعۂ فاجع پیش آگیا! آج کا دن خاص مشغولیت، تیاری اور اہتمام کا دن تھا۔ خدام الحرمین کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ کئی گھنٹہ تک زور شور سے رہا تھا، مولانا اس کے خادم الخدام یا صدر تھے حسرت موہانی سے بھی خاص مشورے ہورہے تھے ——— محمد علی سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ شریفی فوج نے اپنے سب سے بڑے جنرل کی زندگی ہی کو داؤں پر لگا دیا! مولانا کے کان خوب ہی بھر دیے گئے تھے کہ ذرا دیکھیے تو محمد علی کی گستاخیاں، مرید ہوکر شیخ سے یہ زبان درازیاں! ایسا بے ادب ہرگز کسی رد و رعایت کا مستحق نہیں۔ خدا کے لیے اٹھیے، اور اس "بے دین" و "لامذہب" کو ایسا سبق دیجیے کہ دنیا کو عبرت ہوکر رہے!

لکھنؤ میں دوا علاج میں کون سی کسر اٹھ رہ سکتی تھی؟ بہتر سے بہتر طبیب اور نامور سے نامور ڈاکٹر جمع ہوگئے، مولانا کی خدمت اپنے لیے باعثِ سعادت و موجبِ نجات سمجھنے والے، اور کچھ ایسے بھی جو سرتاسر مولانا کے ممنونِ کرم و بندۂ احسان تھے۔ مولانا کا مزاج اس قسم کا تھا کہ شفقت وکرم کا برتاؤ، مرید و غیر مرید، معتقد و غیر معتقد، مخلص و غیر مخلص، سب کے ساتھ یکساں رکھتے تھے۔ درِ فیض سب کے لیے کھلا ہوا۔ جود و سخا کے لیے قید نہ زمان کی نہ مکان کی۔ شام تک اچھے اچھے معالجین

کا مجمع لگ گیا، وہ نازک مزاج ماہرین فن، جو دوسروں کے لیے گرانقدر فیس پر بھی قدم مشکل ہی سے باہر نکالتے، یہاں بے بلائے خود ہی حاضر۔ زبانِ حال پر دعویٰ کہ ؎

ہر یکے از ما مسیح عالمےست

ہر الم را درکف ما مرہمےست

سب نے مل کر جان لڑادی۔ تیمارداری کے سامان بہتر سے بہتر موجود۔ عزیزوں مخصوص مریدوں نے دن کو دن سمجھا، نہ رات کو رات۔ بانسہ، بڑا گاؤں، ستر کھ، بیار وغیرہ کے اخلاصمندوں کا نمبر فرنگی محل کے خاص عزیزوں سے بھی کچھ بڑھا ہوا۔ غرض مادی تدبیریں ایک سے بڑھکر ایک جتنی بھی ممکن ہوئیں، سب عمل میں آکر رہیں۔ اور علاج اس مرکہ کا ہوا کہ اچھے اچھے رئیسوں امیروں کا بھی اس سے بڑھ کر نہ ہوسکتا۔ لیکن ؎

ہر چہ کردند از علاج واز دوا

گشت رنج افزوں وحاجت ناروا

یہ فالج طبی اصطلاحی فالج تھا کب؟ ـــــــــــ اور جو مرض تھا وہ کسی ڈاکٹری، یونانی معالج کے بس کا تھا ہی کہاں؟ ؎

بیخبر بودند از راز دروں

استعیذ اللّٰہ مما یفترون

نبض اور قارورہ کی دیکھ بھال کرنے والے روح کی مہک کا علاج کیا کرتے، اور تھرمامیٹر کی ڈگریاں ناپنے والے دل کی کسک کو کیا پہچانتے؟ ؎

رنجش از صفرا واز سودا نبود

بوئے ہر ہیزم پدید آید ز دود

تن کی رنجوری کو سب نے دیکھا۔ دل پر جو گزر گئی تھی، اس سے باخبر کوئی نہ ہوا۔ اوپر کے زخم پر مرہم رکھنے سب دوڑے، اندر کے ناسور کا پتہ بھی کسی کو نہ چلا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ

تن خوش ست واو گرفتارِ دل ست

اس آزار کا درد کس کو؟ اس تڑپ کی خبر کسے؟ اس بیماری کی مثال ظاہر کی کس بیماری سے دی جائے؟ اور اس کی دوا، اپنے دیس کی کس قرابادین اور "صاحب" کی ولایت کی کس فارماکوپیا میں تلاش کی جائے؟ ؎

نیست بیماری چو بیماری دل
عاشقی پیداست از زاری دل

عشق ہمیشہ لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، نل ودمن ہی کے درمیان نہیں ہوتا، شمس تبریزی اور جلال الدین رومی کی داستانِ عشق بھی آخر اسی دنیا کی ساعت میں آچکی ہے!

عارف صاحب کے مضمون کا اثر سب نے دیکھا۔ محمد علی کا مضمون خونِ دل کی روشنائی اور سوزِ جگر کے قلم سے لکھا ہوا بھی آخر اسی ہمدرد میں چھپا۔ اور عارف صاحب کے مضمون سے کہیں زیادہ پڑھا گیا تھا، اس کا اثر کسی نے نہ دیکھا! پارٹی کا نام لے کر جو وار ہوا، اس تلوار کی چمک سب نے دیکھی۔ اللہ کے نام کی گونج میں جو پھانس دل میں چبھی، گھسی، رگ جاں میں اتری، رُوح کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوئی، اس پر نظر کسی کی نہ گئی۔ خدام الحرمین کے صدر کے جسم کو، زبان کو، قلم کو، سرگرم عمل سب نے پایا۔ محمد علی کے مرشد کی روح کو حرکت میں آتے، غیرت کھاتے بیخود ہوتے کسی نے نہ دیکھا ——— محمد علی کا مضمون، کوئی معمولی، سطحی مضمون تھا؟ تقاضائے وفا کا تقاضا کوئی معمولی، رسمی تقاضا تھا؟ ایمان واسلام کی پکار کوئی معمولی پکار تھی؟

مضمون کی عبارتیں ابھی ایک ہی نمبر اوپر نقل ہوچکی ہیں، دل والے آج بھی پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ اُن کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا؟ یہ پکار کیا تھی؟ پکارنے والا کون تھا؟ اور پکار اکس کو گیا تھا؟ واسطہ کس کے نام کا دلایا گیا تھا؟ مضمون ۱۳ جنوری کے اخبار میں دہلی میں شائع ہوا، مولانا پر فالج ۱۷ کو لکھنؤ میں گرا۔ حیرت فالج گرنے پر نہ کیجئے۔ حیرت اس پر کیجئے کہ فوراً کیوں نہ گرا، اور یہ تین چار دن کا وقفہ درمیان میں کیسے پڑ گیا؟

مولانا کا قلب کیا بالکل بے حس تھا؟ آخر ایک صاحب ایمان کا قلب تھا، ایک صاحبِ ارشاد کا قلب تھا، محمد علی کے شیخ کا قلب تھا، روحانی رہنما کا قلب تھا۔ مولانا صاحبِ سماع تھے اور صاحبِ سوز و گداز۔ پیشہ ور قوالوں کی زبان سے کسی کا نام سن سن کر بارہا اپنا ملبوس اور اپنا خرقہ اپنا پیرہن اور اپنا عمامہ اتار چکے تھے۔ آج اُسی ہیبت والے اور عظمت والے کا نام ایک اخلاص کے پتلے، سرفروش و جانباز سے سنا تھا۔ کیا جامۂ ہستی اتار پھینکنے میں اب بھی رکتے اور جھجکتے؟ محمد علی کے حلقوم سے آواز تو وہ نکلی تھی، جو پتھر کو پگھلا دیتی، فولاد کو گلا دیتی، چٹان کو ہلا دیتی۔ کیا اپنے ہی مرشد کے قلب پر اتنا بھی اثر نہ کرتی؟ فرنگی محل کے یہ آخری دور کا شیخ طریقت بزرگانِ سلسلہ کے نام پر خدا جانے کیا کچھ لٹا چکا تھا، اللہ کا نام سن کر کیا نقدِ جان کی نذر دینے میں تحمل کرتا رہ جاتا؟ کیا اس کی روح خشیت سے خدانخواستہ بالکل خالی اور اس کا سینہ انابت سے بالکل بے نور تھا؟ روح تھرتھرائی، جان کپکپائی، اور ناسوتیوں نے اپنی محدود زبان میں ایک اصطلاح فالج کی گڑھ لی ——— یہ فالج ۷۲، ۹۶ گھنٹہ کے بعد کیوں گرا۔ حق تو یہ تھا کہ عین اسی وقت قلب ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ اسی لمحہ جگر پانی پانی ہوکر رہ جاتا۔ آنکھیں اس تحریر کے بعد کوئی دوسری تحریر نہ دیکھتیں۔ کان اُس آواز کے بعد پھر کوئی آواز نہ سنتے!

شمس تبریز کی قسمت میں کہا جاتا ہے کہ اپنے عاشق زار مرید و طالب جلال الدین رومی کے

ایک فرزند کی تلوار سے جام شہادت پینا لکھا تھا۔ محمد علی کے مرشد اپنے نصیب میں محمد علی کے قلم سے اپنا شہید ہونا لکھا کر لائے تھے۔ وہ حکایت کتابوں میں پڑھی، یہ ماجرا اپنی آنکھ سے دیکھنے میں آیا۔

——— عاشقوں کی موت و شہادت کے بھی آہ، کتنے ڈھنگ اور کتنے آہنگ ہیں! کہیں غیروں کی تلوار، کہیں اپنوں کا پیار۔ اور شہادت زار یا الفت میں بلانے کے کتنے حیلے اور کتنے بہانے ہیں! اور بلانے والے کے چہرہ کے کتنے نقاب!

عشقِ معشوقاں نہان ست وستیر　　عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشقِ معشوقاں دو ورخ افروختہ　　عشقِ عاشق جانِ او در اسوختہ
کہربا عاشق بشکلِ بے نیاز　　کاہ می کوشد دراں راہ دراز
عقل حیراں کایں عجب او را کشید　　یا کشش زاں سو بدیں جانب رسید!

باب (۵۲)

۱۹۲۶ء (۴)

(از بیکرت بساط صفائے خیال یافت
اصل تو از قرآن توبتواں شناختن)

انتقال ۱۹ اور ۲۰ جنوری (سہ شنبہ و چہار شنبہ) کی درمیانی شب میں ہوگیا۔ محمد علی غریب تین سو میل دور، دہلی میں بیٹھے ہوئے، کچھ خبر نہیں کہ لکھنؤ میں آناً فاناً کیا قیامت گزر گئی۔ لکھنؤ سے انھیں خبر کون کرتا؟ کس کو کیا پڑی تھی؟ کرتا تو یہی ڈائری نویس کرتا۔ مخالفت کے عین شباب میں اس وقت اس فرض کا احساس کہاں؟ محمد علی کو شدید و خطرناک علالت کی اطلاع سب سے پہلے چہار شنبہ کو قریب دوپہر کے، سید جالب مرحوم کے روزنامہ ہمدم سے ہوئی۔ اسی وقت لکھنؤ تار دیا، پھر ٹرنک کال کرکے لکھنؤ کے مشہور کارخانہ دار میر احمد حسین کے ہاں سے ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی۔ جواب میں انتقال کی خبر پہنچی! انا للہ —— جو لوگ محمد علی کی حساس طبیعت اور بے پناہ جذبۂ شرافت سے واقف ہیں، وہی اس ناگہانی اطلاع پر ان کے غم و صدمہ کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ پیر و مرشد اور بہترین رفیق و دوست کی وفات کی خبر بالکل اچانک ملی اور اب نہ کوئی گنجائش مصالحت باقی رہی اور نہ کوئی موقع آخری خدمت گزاری کا! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ محمد علی کس طرح تڑپ تڑپ کر اور کیسا کیسا تلملا کر رہے ہوں گے!

پہلی ٹرین سے مع اپنی بیگم صاحبہ کے روانہ ہوگئے۔ اور لکھنؤ ۲۱ جنوری پنجشنبہ صبح تڑکے پہنچ گئے تدفین ۲۰ کی دوپہر کو خاندانی قبرستان، باغ ملا انوار میں ہو چکی تھی۔ اور اس دھوم دھام اور اس اژدہام کے ساتھ کہ لکھنؤ کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ اسٹیشن سے سیدھے قبرستان پہنچے اور مٹی کے ڈھیر سے (سنگ مرمر کا مزار تو بہت بعد کو بنا، اس وقت کچی مٹی کا ڈھیر ہی تھا) لپٹ کر بے اختیار رونے لگے۔ ع

بر جنازہ گر نہ آئی بر مزار خواہی آمد

مصرعہ شاعری کی خیالی دنیا میں نہیں، واقعات کی عملی دنیا میں ایکٹ ہو رہا تھا! ——

اس وقت کی مصوری کون کر سکتا ہے؟ کن لفظوں میں کی جا سکتی ہے؟ دل ایک دن قبل ہی سے رو رہا تھا، اس وقت آنکھوں سے بھی چشمے ابل پڑے۔ آہ، جو قلب سراپا درد تھا، یکسر سوز و گداز تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لیے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا تھا، اس وقت اپنے محبوب ترین دوست کی قبر پر کھڑا تھا، اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا! جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا سب بجا تھا۔ خدا جانے دل میں کتنے ارمان ہوں گے، کیا کیا آرزوئیں ہوں گی، کیسے کیسے گلے شکوے بھرے ہوں گے، کیسے کیسے راز و نیاز سینہ سے لب پر آنے کو مچل رہے ہوں گے۔ کتنی ہدایتیں لینی تھیں کتنے مشورے دینے تھے۔ آہ، کہ یہ سب اب ہمیشہ کے لیے سینہ کے صندوق میں بند کے بند رہ گئے! جیتے رہتے تو کبھی محبوب بصفت مرشد روٹھ جاتے، عاشق زار مرید منا لیتا۔ کبھی مرید ناز کرتا، شیخ فرط شفقت سے گلے لگا لیتے۔ یا الٰہ العالمین، یہ سب باتیں کہتے، پلک جھپکتے، خواب و خیال بن گیا! ——
بلا وہم و گمان، بالکل دفعۃً اور اچانک۔

لکھنؤ والوں کو کچھ نوٹس مل گیا تھا۔ تین دن تو بہرحال بیماری کی دیکھ بھال، اتار چڑھاؤ میں لگ گئے۔ محمد علی بیچارہ کو تو گویا بس وہی ایک خبر یک بیک پہنچی، جس کے بعد پھر کوئی خبر

نہیں رہ جاتی۔ محمد علی جذبات و محبت کا پتلا، حیرت ہے کہ اتنا ضبط بھی کیونکر کر سکا۔ صرف رونے اور لپٹنے پر کفایت کیسے کی۔ بیہوش ہو کر گر کیوں نہ پڑا! کلیجہ پاش پاش کیوں نہ ہو گیا! ——

کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ ، تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهَارُ (اعراف - ۵) جو کچھ انکے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے غبار تھا، اسے ہم دور کر دینگے، اور انکے محلوں کے نیچے دریا جاری ہوں گے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ تذکرہ اہل جنت کا ہے، آیت وہیں کی ہے۔ آیت سے بالکل ظاہر ہے کہ جنھیں جنت میں بڑے بڑے درجے نصیب ہوں گے، ان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے، جو دنیا میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ دنیا میں ایک دوسرے کی طرف سے اپنے سینہ میں رنج و کدورت رکھتے تھے —— گویا یہ باہمی فصل و تفرقہ، کدورت و رنجش نہ لازمی طور پر ان کے کمالات روحانی و فضائل اخلاقی کے منافی ہے اور نہ انعاماتِ جنت کے۔ اور تفسیروں میں قتادہ تابعیؒ کے واسطے سے یہ روایت حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان سے نقل ہوئی کہ یہ آیت میرے اور طلحہؓ و زبیرؓ وغیرہم کے حق میں ہے —— اللہ اللہ! ہم ضعفائے امت کی رعایت ربِّ کریم کو کس درجہ ملحوظ ہے۔ اور ہماری تسکین و دلدہی کے سامان قدم قدم پر کس طرح ہم پہنچا دیے گئے ہیں۔ جب صحابیانِ رسول، اور ان میں بھی چیدہ و برگزیدہ، عشرۂ مبشرہ تک اس آیت کے تحت میں آجاتے ہیں تو چودھویں صدی ہجری کے صالحین و ابرار کے لیے کیوں کڑھا جائے، اور ان کے آپس کے اختلافات کتنے ہی شدید ہوں، لیکن بہرحال اگر اخلاص و حسن نیت کے ساتھ ہیں، اور نتیجہ محض اختلاف فہم و بصیرت کا ہے، تو ان کے لیے درجۂ قرب و اصول سے محرومی کا اندیشہ ہی کیوں کیا جائے؟

مرشد و مرید کی جنگ ختم ہوئی۔ حبیب و محبوب میں وصال ہو کر رہا، ع

در میانِ جان و جانان ماجرائے رفت رفت

صلح ہوئی لیکن سنگ مزار کے اوپر!

نزع میں لائے دلآرام کو۔
عید ہوئی ذوقؔ ڈھلے شام کو

شاعر نے روئے دلآرام کا دیکھنا حالت "نزع" میں بیان کیا ہے، یہاں معاملہ "نزع" میں نہیں نزع کے بعد کا ہو کر رہا۔

کبھی تربت پر فاتحہ پڑھکر فرنگی محل آئے۔ یہاں کے فاتحوں میں شریک ہوئے۔ مولانا کے صاحبزادہ تو اس وقت بالکل بچہ تھے، بھتیجے اور داماد قطب میاں صاحب کی باضابطہ جانشینی ہوئی۔ محمد علی بھی اس تقریب میں شریک رہے۔ اپنی طرف سے اور اپنے بھائی (شوکت علی) کی طرف سے نذر پیش کی۔ ایک ایک سے ادائے تعزیت کی۔ ایک فرنگی محلی عزیز سے یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا:-

"لوگ کہتے ہیں کہ مولانا میں یہ کمزوری تھی اور وہ کمزوری تھی۔ میں کہتا ہوں کہ ان کمزوریوں کے باوجود بھی تو اتنی خوبیاں کسی اور میں دکھاؤ"

غم و الم کے شدت تاثر میں یہ توازن مقام قائم رکھنا محمد علی ہی کا کام تھا!

پارٹی والے جب ملنے آئے تو ایک ایک کو سمجھایا کہ بس اب جنگ ختم ہوئی، پچھلی باتوں پر خاک ڈالو جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اب قطب میاں مستحق ہمدردی ہیں، ان کے ساتھ مل جل کر کام کرو، انھیں بناؤ ــــــ کسی نے یہ سنکر سمعنا و اطعنا کہا، اور کسی نے صرف سمعنا۔ کسی نے صرف

ظاہر کے کانوں سے سنا، اور کسی نے دل کے کانوں سے بھی۔

ڈائری نویس کا قلم ورق پر ورق سیاہ کرتا چلا گیا، اور اب جا کر شریفی سعودی جنگ کے صرف ایک رخ کا خاتمہ ہوا، وہ بھی جہاں تک محمد علی کی زندگی کا تعلق تھا، اور ان کی بھی صرف وہ زندگی جو براہ راست میرے قلم میں آتی رہی۔ حساب لگائیے تو ۳ اگست سے ۱۲ جنوری تک کل پانچ ہی مہینے تو ہوتے ہیں یہ رُوداد زندگی گویا کل ۵ مہینے کی تھی! محمد علی کی تو ساری زندگی ہی مجموعۂ محاربات ہے۔ آج اس سے لڑائی، کل اس سے لڑائی۔ گورنمنٹ برطانیہ سے جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، کانگریس سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، جمیعۃ العلماء سے جنگ، پنڈت موتی لال نہرو سے جنگ خواجہ حسن نظامی سے جنگ، ڈاکٹر انصاری جیسے عزیز ترین دوست سے جنگ، "یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے" کی عملی تصویر۔ لیکن اتنی تفصیل کیا معنی، اس کی آدھی بلکہ چوتھائی تفصیل کی بھی توقع آئندہ کسی جنگ سے متعلق نہ رکھیے۔ کچھ تو اس لیے کہ یہی ایک جنگ ایسی تھی جس میں محمد علی کے ایک وفادار لفٹنٹ کی حیثیت سے میں براہ راست شروع سے آخر تک شریک رہا۔ کسی اور جنگ میں شرکت رہی بھی تو یا بالواسطہ اور یا مقدار و حجم میں بہت کم۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ اسی معرکہ آرائی کی تفصیل سے محمد علی کی سیرت کے ہر پہلو پر روشنی پڑ گئی، اور ان کا جوہر شرافت ہر طرح نمایاں ہو گیا۔ اب آگے ضرورت کسی مزید منقبت سرائی کی نہیں۔ — 'ڈائری' یوں ہی اپنے حدود ایجاز و اختصار سے قدم باہر نکال کر "حیات" یا "سوانح عمری" کا بسط و اطناب اختیار کرتی جا رہی ہے!

باب (۵۳)

سنہ ۱۹۲۶ء (۵)

(نیا دھچکا۔ خلافت کمیٹی کا مسلک)

"قاہرہ۔ ۱۰ر جنوری۔ جدہ کا ایک تار مظہر ہے کہ ابن سعود نے حجاز کے بادشاہ ہونے کا مکہ معظمہ میں اعلان کر دیا ہے۔"

رائٹر کا یہ ذرا سا تار ۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو ہندوستان کے سارے روزناموں میں ایک معمولی خبر کی طرح شائع ہوا۔ محمد علی کے لیے بم کے گولے سے کم نہ تھا۔ ایک مصیبت عظمیٰ کا پیام تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟ آخر دسمبر میں کانپور میں ان کا دل سلطان کی طرف سے جو کھٹک گیا تھا، وہ اندیشے پورے ہو کر آج سامنے آ گئے! ان کی تو ایک عمر ملوکیت کے خلاف جہاد کرنے میں گزر چکی تھی، اور حجاز میں بادشاہت کا استیصال، اور اس کے بجائے خلافت راشدہ کے نمونہ پہ ایک جمہوریۂ شرعیہ کا قیام ان کی رائے میں عالم اسلام کی آئے دن کی مصیبتوں کا واحد علاج تھا۔ سالہا سال کے تجربہ و فکر کے بعد انھیں سو دواؤں کی ایک دوا نہیں یہی نظر آئی تھی۔ استیصال ملکیت سے ان کی یہ مراد نہ تھی کہ حجاز میں بادشاہت کسی قسم کی بھی نہ رہنے پائے بلکہ مراد صرف اس قدر تھی کہ آئندہ وہاں کا جو حکمران ہو، وہ اپنی ذاتی اہلیت اور شخصی صلاحیت کی بنا پر چنا جائے، اور اس اہلیت و صلاحیت کی جانچ عالم اسلام کے نمائندوں کے ہاتھ میں"

یہ نہ ہو کہ چونکہ فلاں شخص فلاں خاندان کا ہے، یا پچھلے فرمانروا کا فرزند اکبر ہے، اس لیے وراثۃً
وہی حکمراں بھی ہو جائے۔ خلافت راشدہ کا نام جو بار بار لیتے تھے، اس سے بھی مقصود اسی حقیقت
کا اظہار تھا کہ وہاں حکمرانی نہ کسی خاندان کے ساتھ مخصوص تھی اور نہ وراثۃً باپ سے بیٹے
کو منتقل ہوتی تھی۔

ملوکیت کی جڑ کاٹنے کی وہ کیسی کیسی سعی اب تک خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے کر چکے تھے۔
خود سلطان ابن سعود کی زبان سے بار بار اس کے وعدے لے چکے تھے۔ ترکوں کے الغائے خلافت
کے بعد بس اسی توقع پر جی رہے تھے۔ اور سلطان کے ان ہی وعدوں پر بھروسہ کرکے خدا جانے
اپنے کتنے پرانے رفیقوں، دوستوں، عزیزوں سے لڑائی مول لے چکے تھے۔ اب جو یہ خبر یک
ہر وعدہ اور ہر توقع کے خلاف، آئی تو گویا زمین پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسروں نے
اس خبر کو عام خبروں کی طرح معمولی طور پر چھاپ دیا۔ اب جو سلطان کے ہم مسلک و ہم عقیدہ
تھے وہ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ ہمدرد نے جب یہ خبر چھاپی تو سیاہ ماتمی جدول کے اندر
اور وہ بھی اس جلی عنوان

ایک نہایت اندوہناک خبر

کے تحت، اور خبر کے معاً بعد یہ نوٹ بھی درج تھا کہ "ہم اس خبر کو جس نے ہمارے قلب کو
سخت ترین صدمہ پہنچایا ہے اسی طرح شائع کرتے ہیں جس طرح کہ رائٹر کے ذریعہ سے ہم تک
پہنچی ہے۔" اور اس کے بعد کی عبارت نوٹ میں بہت جلی خط میں کر دی گئی تھی کہ "ہندوستان
کے مسلمانوں کو چاہیے کہ خداوند کریم کی کارسازی پر بھروسہ رکھیں، اس سے مایوس نہ ہوں۔ جو کچھ
کیا جائے، سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ نہ کہ حالت اضطراب و سرگردانی میں۔"

جو لوگ محمد علی کے اصل مسلک کو سمجھ چکے تھے، انھیں ہمدرد کا یہ رویہ بالکل قدرتی اور صحیح

نظر آیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مسلک کو سمجھ جانے والے تھے ہی کتنے ؟

ہندوستان کے مسلمان، اپنے عقائد کے لحاظ سے، دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک سلطان کے دوست، دوسرے سلطان کے دشمن۔ ایک وہ جو سلطان کے ہم عقیدہ تھے۔ ان کے نزدیک سلطان، سلطان اسلام تھا، مرد مجاہد تھا، غازی تھا، مردان حق میں سے تھا، دین حقیقی کا محافظ و مجدد تھا، اور بدعت شکن کہ صدیوں کے مشرکانہ رسوم کو مٹا دیا۔ دوسرے وہ جو عقائد میں سلطان کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ابن سعود وہابی تھا، ضال تھا مضل تھا، سو گمراہوں کا ایک گمراہ تھا، کانا دجال تھا، اور اس کا یہ جرم ناقابل معافی اور ناقابل تلافی تھا کہ اس نے مزارات مقدسہ کے قبے گرا دیے تھے، قبور صالحین کی بے حرمتی کر ڈالی تھی، قبہ شکن تھا، گور کن تھا، دشمن رسول و آل رسول تھا ـــــــ ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان کی آبادی کا جزو اعظم انہی دو غالی گروہوں کے درمیان تقسیم تھا۔

محمد علی مع ایک مختصر جماعت علماء کے (اور جمعیۃ العلماء کا بھی اس وقت تک یہی مسلک تھا) ان دونوں گروہوں کے فقہی و کلامی، یا زیادہ صحیح طور پر "فرقہ وارانہ" غلو سے بالاتر تھے۔ وہاں تو دھن ہی دوسری تھی۔ اپنی ذات سے حنفی تھے، صوفی تھے۔ لیکن آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور دل رو رہا تھا کہ اسلام پر وقت کون سا آ کر پڑا ہے۔ جب حملہ عین قلب و جگر اور دماغ پر ہو رہا ہو تو پیر کے ناخنوں کے بچانے کی فکر کون کرے گا، اور سر کے بالوں کی حفاظت کی پروا کسے رہے گی۔ کفر و الحاد کی گولیاں تو بلا تفریق و امتیاز "وہابی" و "بدعتی" ہر کلمہ گو کے سینہ پر آ کر یکساں پڑ رہی تھیں۔ اور کبھی یہ پوچھتی بھی نہ تھیں کہ ان میں ابوحنیفہؒ کا ماننے والا کون ہے اور ابن تیمیہ کا نام لیوا کون؟ معتزلی کون کہلاتا ہے، اور اپنی اشعریت پر ناز کس کو ہے؟ معراج جسمانی

کے قائل کون کون ہیں اور اس کے منکر کون کون؟ محرم میں غم امام میں سینہ کوبی کون کرتا ہے اور گیارہویں میں "بڑے پیر صاحب" کے نام کی نیاز کون دلاتا ہے؟ اندرونی اختلافات و نزاعات جو کچھ بھی ہوں، فقہی و کلامی موشگافیاں جزئیات کو جو جو شکلیں بھی دے چکی ہوں، وہاں تو محض مسلمان کا نام کافی تھا۔ جو زبان اپنے کو کلمہ گو کہے، اور مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے کو مسلمان لکھائے۔ "فلک پیر" کی طرح فرنگیت کا بت بے پیر تو بس اسی کا دشمن تھا، اور محمد علی اسی کا دلسوز خادم اور غمخوار ہوا خواہ۔ دل میں درد تھا تو بس اسلام کے کلمہ کا، اور تڑپ تھی تو اس کی کہ اغیار کے دست برد سے کسی طرح محفوظ ہو کر سارا عالم اسلامی متحد ہو، اور منکروں کے مقابلہ میں اللہ کا نام لینے والوں کا، اور 'لامحمدیوں' کے مقابلہ میں محمدیوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو جائے۔ جس نے اس اتحاد پر ضرب لگائی، بس محمد علی اس کے دشمن۔ شریف حسین کا اصل قصور یہی تھا کہ اس نے عین وقت پر خلیفۃ المسلمین سے غداری کر کے قبائے خلافت چاک چاک کر دی۔ مصطفےٰ کمال کی جوانمردی سپہگری سب مسلم لیکن اس کے اس جرم کو محمد علی نے آخر دم تک معاف نہ کیا کہ اسی سفاک نے منصب خلافت توڑ کر ہمیشہ کے لیے مرکزیت اسلام پر ضرب کاری لگا دی! جس کے خیالات یہ ہوں، جو رہتا اور جیتا اور سانس لیتا اس عالم میں ہو، وہ نجدیوں کی رو رعایت کیوں کرنے لگا تھا، اور ابن سعود کی مروت میں کیسے آ کر رہتا!

خلافت کمیٹی، محمد علی کی تحریک، پونے ڈیڑھ سال پہلے اپنا نقطۂ نظر سلطان ابن سعود کے سامنے یوں واضح کر چکی تھی:۔

"...... ہندوستانی مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیائے اسلام کا مرجع ہے کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنی چاہیئے

جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مد نظر رکھنا چاہیے۔ تاکہ جنگ و خونریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اراکین حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہو جائے، اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑا جائے، اس لیے کہ دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر نا قابل قبول ہے۔"

خلافت کی جس مجلس عاملہ نے یہ تجویز پاس کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجی تھی، اس میں محمد علی کے علاوہ، مولانا شوکت علی، مولانا ابو الکلام، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر کچلو، اور شعیب قریشی شامل تھے۔ ان سب کے اتفاق رائے سے ۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو دہلی میں یہ تجویز منظور ہوئی، اور ۶ر اکتوبر کو تار پر روانہ ہوئی۔ ۲۴ر اکتوبر کو اس کا جواب بھی تار ہی پر مولانا شوکت علی کو وصول ہو گیا تھا۔

"آپ کا تار پہنچا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے صحیح خیالات کا شکریہ۔ جب تک حسین یا اس کے خاندان کا کوئی فرد مکہ معظمہ میں حکومت کرتا رہے گا، اس وقت تک پبلک کو امن و صلح میسر نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ واقع ہوا، اس کا ذمہ دار صرف حسین ہے۔ جس کے افعال سے اب مکہ معظمہ کو آزادی مل گئی۔ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔"

محمد علی کیا اب بھی مطمئن نہ ہوتے؟ دل خوش کہ دیرینہ آرزو کے بر آنے کی گھڑی قریب آگئی۔ طبیعت مسرور کہ خوش آیند خواب کی تعبیر پوری ہونے کو آئی ـــــــ ۲ر نومبر ۱۹۲۴ء کو نجد کے قاضی القضاۃ عبد اللہ بن بلیہد کا روانہ کیا ہوا ایک طویل تار موصول ہوا جس میں یہ تھا کہ سلطان نے نجد سے مکہ روانہ ہوتے وقت حسب ذیل تقریر کی :۔

"میں مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور نا قابل برداشت ٹیکسوں کی مصیبت سے نجات دلانے جا رہا ہوں ...... اب مکہ معظمہ میں بجز شریعت کوئی سلطان نہ ہوگا ...... چونکہ مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانانِ عالم کو تعلق ہے، اسلیے

وہاں کی پالیسی ابنائے اسلام کی مرضی کے مطابق ہوگی، ہم جملہ نمایندگانِ عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے، اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی جس کی بدولت بیت اللہ گنا ہوں اور ذاتی اغراض کی تحریک سے پاک رہے ...... حجاز ہر شخص اور ہر نیک بندہ کے لیے کھلا رہے گا۔"

اس نے گویا اور مہر تصدیق لگا دی۔ درمیان میں سلطان کے جو جو بیانات اس سلسلہ میں آئے یا شائع ہوئے وہ سب اسی کے موید۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں جو دعوت نامہ سلطان کی طرف سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ العلماء کے اکابر کے نام آیا، اس نے تو شک اشتباہ کی گنجائش ہی نہ چھوڑی، طویل دعوت نامہ کے درمیان یہ عبارتیں بھی تھیں:

"میں اس خدائے برتر کی قسم کھا کر جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہتا ہوں کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں ہے۔ حجاز میرے ہاتھ میں اس وقت تک ایک امانت ہے جب تک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کرلیں، جو عالم اسلامی کی بات ماننے والا ہو، اور ان اقوام اسلامی اور طبقات کی زیر نگرانی رہے، جنھوں نے اپنی غیرت و حمیتِ دینی کا ثبوت ہم پہنچایا ہو، مثلاً مسلمانانِ ہند ......

ہمارا وہ مطمع نظر جس کا عالم اسلامی سے ہم نے وعدہ کیا ہے۔ اور جس کے لیے ہم شمشیر بکف رہیں گے۔ مجملاً حسب ذیل ہے۔

(۱) حجاز کی حکومت حجازیوں کا حق ہے۔ لیکن عالم اسلامی کے جو حقوق حجاز سے متعلق ہیں ان کے لحاظ سے حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔

(۲) ہم ایک استفتاء عام عنقریب جاری کریں گے جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم اسلام کی نگرانی کے متعلق استفتاء ہوگا۔ اس کے لیے وقت کی تعین بعد میں کی جائے گی، اور پھر ہم اس امانت حجاز کو ان اصول کے ماتحت اس حاکم کے سپرد کردیں گے۔"

باب (۴۵)

۱۹۲۶ء (۶)

(خبرِ صاعقہ اثر)

محمد علی کیا اب بھی اعتماد نہ کرتے ؟ کیا اتنی تصریحات کے بعد بھی غیر مطمئن رہتے ؟ اُس وقت کے لیے تو یہ کہہ لیجیے کہ جذبات میں تلاطم تھا، آج اتنا زمانہ گزرنے کے بعد، وقت کے اتنے فاصلہ کے بعد بھی ان اعلانات، ان بیانات کو پڑھکر فیصلہ کیجیے کہ محمد علی کا اعتماد کیا کسی سادہ دلی کا، عجلت پسندی کا، بے احتیاطی کا، زود اعتمادی کا نتیجہ تھا ؟ ——— ابھی کل ایک ہی ہفتہ تو ہوا، جب محمد علی نے یہ تار خلافت کمیٹی (زیر صدارت مولانا ابو الکلام) کی طرف سے سلطان کو دلوایا تھا:-

"خلافت کانفرنس کا یہ سالانہ اجلاس (منعقدہ کانپور) آپ کو مدینہ منورہ اور جدہ میں پُر امن داخلہ پر مبارکباد دیتا ہے ...... تطہیر حجاز کا شکریہ ادا کرتا ہے ...... ہم موتمر کی شرکت کے لیے تیار ہیں۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ اگلی حج کا موسم اس کے لیے موزوں ہوگا۔ ہم اپنے اُس رزولیوشن پر قائم ہیں، جو اکتوبر سنہ ۲۴ء میں آپ کو بھیجا گیا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر کے مکتوب میں اس سے اتفاق کیا ہے۔"

یہ تار ۴ جنوری سنہ ۲۶ء کو روانہ ہوا تھا۔ ۱۱ جنوری کو سلطان کے اعلان بادشاہت کا وہ تار آگیا۔ جو پچھلے باب کے آغاز میں درج ہو چکا ہے! ——— کل ایک ہفتہ کے

کے اندر یہ انقلاب روزگار!

گویا کردشمنی بے اثر کو دعا کے ساتھ!

ہا! چاہا کیا تھا، ہوا کیا! سوچا کیا تھا، نتیجہ کیا نکلا! مانگا کیا تھا، ملا کیا! ——— دعائیں دنوں کو رو رو کر اور راتوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر کی گئی تھیں، اور وہ قبول کس طرح ہوئیں! الٹ ہی دی گئیں!

دعائیں، اس کے قبل بھی، تحد علی کی قبول ہی کون سی ہوئی تھیں؟ بغداد کے لیے، سارے عراق کے لیے، بیت المقدس کے لیے، سارے فلسطین کے لیے، مصر کے لیے، شام کے لیے، ریف کے لیے ہندوستان کے لیے، ان سب کی آزادی اور تسلط اغیار سے نجات کے لیے دعائیں کون سی اٹھا رکھی تھیں؟ خشوع و خضوع میں، تضرع و الحاح میں اپنی والی کوئی کسر اٹھا رکھی تھی؟ ——— اپنے نصیب میں کسی بھی دعا کی مقبولیت لکھا کر لائے تھے؟

اسرار تکوینی کے اتھاہ سمندر کی گہرائیوں کو کوئی ناپ سکا ہے؟ حکمت کاملہ کے دفتر بے پایان کی شرح بڑے بڑے دانایان راز و محرمان اسرار بھی کر سکے ہیں؟ حکیم مطلق کے کاروبار کی تھاہ کوئی بھی پا سکا ہے؟ یعقوبؑ بن اسحاقؑ خود پیمبر برحق، پیمبر زادہ، پیمبر کے باپ، پیمبر کے پوتے، ہر سمت و جہت سے پیمبری ماحول سے گھرے ہوئے، چہیتوں کے چہیتے، پھر کیا انھیں غم دل بند میں برسوں رلایا، تڑپایا، کلپایا نہیں گیا؟ یوسفؑ بن یعقوب، شاہ بھی تھے اور شاہزادے بھی، حسن و جمال کے پتلے، محبوبوں کے محبوب، پھر کیا کنوئیں میں ڈھکیلے نہیں گئے۔ کنوئیں کی تہ میں، تہ بہ تہ تاریکیوں میں ایک مدت تک پڑے نہیں رہے؟ غلام ہو کر نہیں بکے؟ مشرک کی غلامی میں مدتوں نہیں رہے؟ جیل میں چوروں، قزاقوں اور خونیوں کے ساتھ بند نہیں کیے گئے؟

نوحؑ اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ، یونسؑ اور ایوبؑ، سرداروں کے سردار، مخدوموں کے مخدومؐ، ان سب کی آزمائشیں کیا کیا نہیں ہوئیں؟ ابتلاء کے کیسے کیسے سخت دور ان پر گزر کر نہیں رہے؟ ان کی دعائیں، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور اخلاص و عبودیت میں ڈوبی ہوئی دعائیں کتنی اور کیسی کیسی، پلٹ کر نہیں رکھ دی گئیں؟ ——— عجائب کا دربار ہے، اور عجیب سے عجیب تر اسرار! جہاں معاملات بڑے بڑوں کے ساتھ یہ ہوں، وہاں چھوٹوں کا ذکر ہی کیا؟ اور جہاں آفتاب و ماہتاب ماند پڑے جا رہے ہوں، وہاں شمع کا فوری یا موم بتی زبان اپنی بے رونقی اور پھیکے پن پر کھولے تو کیا کھولے!

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضاے ما!

کہیں عوام تک کی یہ دلدہی، کہ

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ — مجھے پکارے جاؤ، مجھ سے دعا کیے جاؤ، میں سب ہی کی سنتا ہوں

اور کہیں خواص، بلکہ اخص خواص تک کو اس ادب کی تعلیم، کہ

فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ — اس چیز کی درخواست مجھ سے نہ کرو جس کی تم کو کچھ خبر نہیں، میں تمہیں نصیحت کیے دیتا ہوں کہ ایسی درخواست کرکے ناواقفوں میں نہ شامل ہو جاؤ۔

کسی کو بشارت یوں دی جاتی ہے کہ ؎

تو چنین خواہی خدا خواہد چنین
می دہد یزداں مراد متقین

یا ؎

گفت حق گر فاسقی و اہل صنم   چوں مرا خواندی اجابت‌ها کنم
شاد باش و فارغ و ایمن کہن   آن کنم با تو کہ باراں در چمن

اور کسی کو ہدایت یوں کی جاتی ہے کہ ؎

حق بفرماید نہ از خواری اوست   عین تاخیر عطا یاری اوست
نالۂ مومن ہمی داریم دوست   گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست
خوش ہمی آید مرا آواز او   واں خدایا گفتن و آں راز او

محمد علی کے دل پر خبر پاکر کیا گزری ہوگی۔ امیدوں کا سارا قلعہ یک بیک دھم سے زمین پر گرتا ہوا دیکھ قلب پہ بجلی سی گر پڑی ہوگی! جس کی حمایت میں بڑے بڑے پرانے دوستوں، رفیقوں سے لڑ پڑے تھے، حسرت موہانی کا، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کا، فرنگی محل کا، ساتھ چھوڑنا پڑا تھا، جس کی خاطر اپنے پیر و مرشد تک سے جنگ پر آمادہ ہوجانا پڑا تھا، یہ وار اس کے ہاتھ سے ہوا! ——— قدرت کی نیرنگیاں اور شگوفہ کاریاں دیکھیے کہ عین جس وقت محمد علی اپنے مرشد سے جنگ پر آمادہ ہوئے، اسی وقت ان پر غیبی گولا آکر گرا! ان کا خون دل کی روشنائی سے لکھا ہوا مضمون "تقاضائے وفا" ۳ر جنوری کے ہمدرد (ص ۳ و ۵) میں نکلا اور ٹھیک اسی تاریخ کے پرچہ میں، نہ ایک دن آگے نہ ایک دن پیچھے، ص ۵ پر یہ ابن سعود کی اعلان ملکیت والی خبر موجود!

قدرت مسکرا رہی تھی کہ یہ بے خبر بندہ اعلان جنگ کس سے کر رہا ہے، اور واقعۃً جنگ کرنی کس سے پڑے گی! اپنا حریف و مدمقابل اس وقت سمجھ کسے رہا ہے، اور واقعی نکلے گا کون؟ ہمدرد میں خبر کے گرد سیاہ چوکھٹا سب نے دیکھا۔ ہمدرد کے مالک اور چیف ایڈیٹر

کے صفحۂ قلب پر غم و الم، حزن و یاس کے سیاہ بادل جو چھا کر رہے، ان کے دیکھنے اور ہمدردِ سرؔن کو دکھانے کے لیے کوئی آلہ کہاں سے لایا جائے؟

ہمدرد کا کام محض خبر دے دینا نہ تھا، رہنمائی کرنا بھی تھا۔ رہنما کا قلب مضطرب کہ خبر دینے کے ساتھ ہی رہنمائی کا بھی حق پورا پورا ادا کر دیا جائے، لیکن دماغ بیدار و خبردار، کہ مجالس کے آئین و ضوابط کے حدود سے قدم باہر نہ نکلیں۔ خبر کے ساتھ جو نوٹ نکلا، اس کی عبارت ابھی ختم کہاں ہوئی، یہ بھی تو تھی:۔

"ہمیں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار ہے جوں ہی اجازت آئی، ان شاء اللہ ہمدرد اور دیگر قومی اخبارات میں وہ تمام اطلاعیں شائع کر دی جائیں گی جو اب تک دفتر خلافت کو موصول ہوئی ہیں، جن سے ہر شخص سمجھ لے گا کہ بحمد اللہ خلافت کمیٹی بغیرکسی تذبذب یا تزلزل کے برابر اسی مسلک پر قائم ہے، جو اس نے غور و فکر کے بعد ۵ر اکتوبر ۲۳ء کو اس مسئلہ پر اپنا مسلک قرار دیا تھا۔"

مشہور تھا کہ محمد علی اور مولانا ابوالکلام میں صفائی نہیں، اُن بن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے۔ اس شہرت کی صحت و عدم صحت سے یہاں بحث نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ محمد علی شدید تاثر کی حالت میں بھی آئین و ضابطہ کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ غصہ میں کتنے ہی بھرے ہوں، دہان سے الفاظ کی جگہ شعلے ہی نکل رہے ہوں، آئین و ضابطہ کے خلاف بہرحال نہیں جاتے تھے۔ کانپور خلافت کانفرنس کے موقع پر یاد ہوگا کہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی وہ مجلس مرکزی سے قدیم اور وفد خلافت کمیٹی کا الحاق تڑوانے کے حق میں نہ تھے، بلکہ محض ووٹوں کی کثرت سے ان خطاکاروں کو شکست دینا چاہتے تھے۔ وہی صورت اس وقت بھی پیش آئی۔ جدہ کی اس خبر سے

حد درجہ مضطرب تھے۔ چاہتے تھے کہ دل کھول کر سب کچھ ہمدرد میں لکھ ڈالیں۔ اور ہمدرد، خلافت کمیٹی کا نہیں، ان کا اپنا اخبار تھا، اس میں وہ لکھ ڈالنے پر پوری طرح آزاد تھے۔ پھر بھی تقاضائے احتیاط اس درجہ کا تھا کہ اپنے اخبار کے لیے بھی دل پر جبر کر کے صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار کرتے رہے۔

باب (۵۵)

۱۹۲۶ء (۷)

(پھر میدان رزم۔"پنجابی ٹولی")

۱۹۲۶ء۔ مہینہ فروری یا مارچ کا ہے۔ اور محمد علی سے "غیر مقلد" مقلدین ابن سعود کی مخالفت خوب زوروں پر ہے۔ اخباروں میں سب سے پیش پیش مولانا ظفر علی خاں کا روزنامہ زمیندار ہے، اس کے ایڈیٹر مہر صاحب ہیں۔ دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ میں حسب معمول دریاباد سے چل کر حاضر ہوا ہوں۔ محمد علی آجکل بیمار اور زیادہ بیمار ہیں۔ لیکن اس ضعف وعلالت شدید کے باوجود اپنے کو جلسہ میں کسی طرح لے آئے ہیں، اور ایک کوچ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جلسہ میں کوئی تجویز پیش ہوئی، اور بڑی گرما گرم بحث کے بعد، صدر (مولانا ابوالکلام) نے ووٹ لینے کا حکم دیا۔ "پنجابی ٹولی" (یہ لقب محمد علی ہی کا دیا ہوا تھا) نے فیصلہ سے ناراض ہو کر "واک آؤٹ" (بہ طور احتجاج جلسہ چھوڑ دینا) کرنا چاہا۔ سب سے پہلے خود مولانا ظفر علی خاں اٹھے، اور پھر ان کے صاحبزادہ اختر علی خاں اور پھر زمیندار کے نفس ناطقہ مہر صاحب۔ ادھر ان تینوں صاحبوں کا اٹھنا تھا کہ اُدھر بیمار و ناتوان محمد علی بھی جھٹ اپنے کوچ پر اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے:

"غضب ہوا، باپ بیٹے، روح القدس تینوں خفا ہو گئے!"

یہ ایک نمونہ ہے محمد علی کی برجستگی اور حاضر دماغی کا۔ غصہ میں بھرے ہوئے ہوں، رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں، ضعیف و مضمحل ہوں، غرض یہ کہ کچھ بھی ہو، اور کسی حال میں ہوں، ذہانت ساتھ نہ چھوڑتی، اور بذلہ سنجی منہ نہ موڑتی ـــــــ غصہ کی حالت میں عقلیں ماند پڑ جاتے ساری دنیا کی دیکھیں، محمد علی کی ذہانت ایسے موقع پر اور چمک جاتی۔ اور برجستہ وہ سوجھ جاتی جو دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھ پڑتی۔

زمیندار ابھی کل تک مسئلہ حجاز میں ہمدرد کا سب سے بڑا حلیف تھا، اب وہی سب سے بڑا حریف بھی بن گیا۔ ہمدرد کے لیے تو خیر لیکن مالک ہمدرد یعنی ذات محمد علی کے لیے توہین، تحجیر، تعریض کا کوئی دقیقہ اس میں اٹھا نہ رہا ـــــــ مخالفت کے جوش و ہیجان میں حدود کا خیال رہتا ہی کس کو ہے؟

خلافت کمیٹی محمد علی کی رہنمائی میں ابتک اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھی۔ اسے نہ وہابی حنفی قضیہ سے دلچسپی، نہ قبہ نوازی و قبہ شکنی سے سروکار۔ اس کے پیش نظر تو صرف یہ مقصد اعظم تھا کہ حجاز کسی طرح بیگانوں کے تسلط سے آزاد ہو کر سارے اسلامی فرقوں کے لیے کھلا ہوا رہے۔ کسی خاص نسل و خاندان کی ذاتی یا موروثی ملکیت اسی لیے اسے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اور اسی کے خلاف وہ سلطان سے عہد و پیمان لے چکی تھی۔ سلطان کے اعلانِ ملکیت کے بعد وسط جنوری میں ان کے نام حسب ذیل تار مولانا ابوالکلام صدر جمعیۃ خلافت کی طرف سے روانہ ہوا:-

"ہم حیران ہیں کہ اخبارات اہل حجاز کے آپ کو بادشاہ منتخب کرنے اور نیز آپ کے اس کو قبول کر لینے کی خبریں شائع کر رہے ہیں۔ ہم متوقع تھے کہ حکومت حجاز کے مستقبل کا فیصلہ آنے والی موتمر کے ذریعہ سے ہوگا جس کو آپ نے مدعو کیا ہے۔ ہم ان غیر متوقع واقعات کے متعلق،

جس نے فکر پیدا کر دی ہے، مستند اطلاع کا تشویش کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔"

لب و لہجہ اس سے زیادہ نرم بلکہ مودبانہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن زبان کی نرمی کہیں حقائق کی سختی کو، اور عبارت کی شیرینی کہیں واقعات کی تلخی کو بدل سکتی ہے؟ کس ملک نے آج تک لائل کی قوت کے سامنے اپنے لشکر جرار کو بے ہتھیار کر دیا ہے؟ کس فرمانروا نے تاریخ کے طول و عرض میں کہیں بھی بے قوت انجمنوں اور محض کاغذی اور زبانی زور رکھنے والی کمیٹیوں کے ڈر سے تخت و تاج سے دست برداری کی ہے؟ فطرت بشری کبھی اتنی متواضع و خاکسار ثابت ہوئی ہے؟

سلطان نے حجاز میں کیا کچھ کیا یا نہ کیا، اس سے اس ڈائری کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو ذکر صرف اس کا ہے کہ محمد علی پر اثر ان حالات کا کیا کیا پڑتا رہا۔

محمد علی ابھی کل تک چونکہ سلطان کے حامی و ہمدرد تھے، اس لیے "وہابی" تھے، قبہ شکن تھے، بے ادب تھے، گستاخ تھے، آستانوں اور درگاہوں کے اکھاڑ پھینکنے والے تھے۔ اور آج چونکہ سلطان پر معترض و نکتہ چین تھے، اس لیے وہی محمد علی یک بیک "بدعتی" تھے، قبہ نواز تھے، گور پرست تھے، شرک کے حامی و مددگار تھے اور تطہیر حجاز کے دشمن! ؎

تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھکو!

یا یوں کہہ لیجئے ؎

از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد!
وز پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد!

سلطان کی موافقت و مخالفت دونوں میں ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں نے حصہ لیا۔ اچھے اچھے اکابر وقت و مشاہیر عصر اول سے آخر تک یا سعودی رہے یا شریفی۔ لیکن یہ امتیاز محمد علی ہی کے حصہ میں آیا کہ فتنہ کے پہلے ہلے میں ان ہی کو سب وہابیوں کا سالار قرار دیا، اور اب ہنگام

کے دوسرے دور میں بھی بدعت پسندوں کے سب سے بڑے سرغنہ وہی قرار پائے! ـــــــــ یہ صلہ تھا اس عالم میں اس کا، جس نے حق کا معیار بجائے اشخاص ورجال کے مسلک اور اصول کو قرار دیا تھا۔ محمد علی نے اپنے ساتھیوں اور اپنی "پارٹی" کی اس کایا پلٹ پر، بجائے مضطرب ہونے کے سکون واطمینان کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ

"کل جو لوگ ذاتِ ابن سعود کے ساتھ تھے وہ آج بھی ابن سعود کے ساتھ ہی ہیں، اور کل جو حق کے ساتھ تھے، وہ بحمداللہ آج بھی حق ہی کے ساتھ ہیں"

دن اور تاریخ تو اب یاد نہیں، مہینہ بھی خوب ذہن میں نہیں۔ سنہ ۲۶ء کی پہلی سہ ماہی شاید ختم ہو رہی تھی، جب خلافت کی مجلس مرکزی اور مجلس عاملہ دونوں کے جلسے دہلی میں ہوئے۔ مخالفت کا ہنگامہ عین شباب پر تھا۔ جلسہ سے ایک ہی دو روز قبل ہمدرد میں ایک مضمون، خود محمد علی کے قلم سے پنجابی "سعودیوں" کے جواب میں نکلا تھا۔ مضمون میں اتفاق سے ایک ضرب المثل ایسی آگئی تھی، جس سے مولانا ظفر علی خاں کے نام نہاد لقب پر (یعنی اس لقب پر جو مخالفین میں ان کا مشہور تھا۔) صاف تعریض نکل سکتی تھی۔ جلسہ کل صبح کو تھا۔ میں شام کو دہلی پہنچ گیا تھا۔ محمد علی کئی کئی بیماریوں میں مبتلا، اور صاحب فراش۔ مسہری پر لیٹے ہوئے، میں پاس جاکر بیٹھ گیا۔ دو ہی چار باتوں کے بعد اس مضمون کا ذکر چھیڑ کے میں نے کہا کہ "خیر اور تو سب ٹھیک تھا، لیکن فلاں فقرہ سے تو صاف زد ظفر علی خاں کے لقب پر جاکر پڑتی ہے۔" حیرت سے بولے "یہ کیسے؟ اردو کی عام مثل ہے۔ اس میں تعریض کیسی؟" میں نے مختصر تشریح کی۔ گھبرا گئے، اور ایک شریف مسلمان کی شان سے بولے "مجھے واللہ اس تلمیح کا آج تک علم نہ تھا آپ کی زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں" پھر حسرت وتاسف کے لہجہ میں کہا کہ "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

مضمون تو چھپ چکا، معذرت چھاپوں تو بات اور زیادہ کھلتی ہے۔ اور جو اب تک میری طرح ناواقف ہیں، وہ بھی واقف ہو جائیں گے" ـــــــ یہ تھی "تھندی" محمد علی کی حق پسندی اور شرافت گستری۔ اپنی غلطی واضح ہو جانے پر ایک بار بھی میں نے محمد علی کو بات کی پچ کرتے اور معذرت میں تامل کرتے نہیں دیکھا۔ پوری کشادہ دلی کے ساتھ ایک ایک سے عذر خواہی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وصف ان کے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور میں بھی تھا۔

دوسرے دن شام کو مجلس عاملہ کا ہوا۔ پانچ سات ارکان کی ایک مختصر سی کمیٹی۔ صدر جلسہ پنجاب کے ایک نامور اہلحدیث مولوی عبد القادر صاحب قصوری۔ (ذکی یہ "اہلحدیثیت" ذہن میں رکھیے) تذکرہ کمیٹی میں اسی مضمون کا آ گیا۔ موصوف نے محمد علی کی ہوا خواہی کے لہجہ میں کہا کہ "دینداری تو مسلّم لیکن آپ بھی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ابھی اسی مضمون کے فلاں فقرہ کا آخر کیا مطلب تھا۔" محمد علی بولے "مجھے اس تلمیح کی مطلق خبر اس وقت تک نہ تھی، یہ تو کل شام کو عبد الماجد دریابادی نے آ کر بتایا۔ میں یہ قرآن مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" قصوری صاحب بڑے دیندار اور ذی علم تھے، بات کاٹ کر کہا "لیکن خود قرآن کی قسم کھانا بھی تو جائز نہیں۔" محمد علی بجلی کی سرعت کے ساتھ جھک کر بولے "اچھا حدیث کی قسم سہی" ـــــــ یہ فقرہ کیوں کسی اور کو سوجھنے لگا تھا! کوئی مسکرا دیا، کوئی ہنس پڑا، لطف سب نے لیا! ایسے ایسے لطیفے اور چٹکلے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، خدا جانے کتنے گویا محمد علی کی جیب میں پڑے رہتے تھے۔

باب (۵۶)

۱۹۲۶ء (۸)

(دیوانۂ خلافت۔ "غیر مقلد مقلدینِ ابن سعود")

عملی سیاسیات میں علی العلوم کنارہ کش ہی رہا ہوں۔ ۲۴ء کے آخر تک میں کسی سیاسی کمیٹی کا ممبر نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۲۵ء میں محمد علی ہی کی رفاقت اور کشش کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی۔ شرکت کی تبلیغ زبانی گفتگوؤں میں بارہا کرتے رہے تھے۔ اکتوبر ۲۵ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ خلافت کمیٹی کا عروج اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ اس پر بھی مرکزی کی ممبری ایک بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ نومبر ۲۵ء میں لکھنؤ کے کارکنان خلافت، خصوصاً چودھری خلیق الزماں نے، یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار سر پر رکھ دیا۔ مرکزی کے صدر اس وقت تک حکیم اجمل خاں صاحب تھے۔ اواخر دسمبر ۲۵ء میں ان کے جانشین مولانا ابوالکلام ہوئے۔ ۲۶ء میں مرکزی کے جلسے متعدد ہوئے۔ اکثر دہلی میں اور ایک آدھ لکھنؤ میں۔ صدر دفتر بمبئی میں تھا، اور مولانا شوکت علی جنرل سکریٹری تھے لیکن جلسوں کے لیے سہولت کے خیال سے کوئی مرکزی ہی مقام اختیار کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا، اور اس پر قوت اور اسلامیٔ ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

محمد علی کی حیثیت ضابطہ سے بس ایک ممبر کی تھی۔ نہ صدر تھے، نہ سکریٹری نہ اور کچھ۔ لیکن عملاً ساری مجلس کی رہنمائی کی باگ، دیکھنے میں آیا کہ ان ہی کے ہاتھ میں تھی، اصول میں بھی، فروع میں بھی یعنی جمعیۃ کا مسلک عمومی (پالیسی) بھی وہی مقرر کرتے تھے، اور پھر اس کے بڑے بڑے جزئیات بھی ان ہی کے چلائے ہوئے چلتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ اوروں کی سنتے نہ ہوں۔ اور یہ تو اور بھی نہیں، کہ لوگ ان کے سوا کسی اور کی سنتے نہ ہوں، یا ممبر صاحبان سب اپنی اپنی سناتے نہ ہوں، بلکہ سب سر جھکائے چپکے سے ان کی ہر بات کو مان لیتے، یا کم از کم یہ کہ ادب و احترام کے ساتھ سن ہی لیتے ہوں۔ جی نہیں، یہ کہاں؟ اس کے بالکل برعکس، اور توقع و اندازہ کے برخلاف، ان آنکھوں نے تو یہ دیکھا کہ ان کی مخالفت بات بات پر ہو رہی ہے، اور ان کی راہ میں رکاوٹ قدم قدم پر پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن اب ان کی زبردست قوت استدلال کا کرشمہ سمجھئے، یا ان کی حق گوئی و دیانت کا ثمرہ کہیے، یا ان کی وجاہت و شخصیت کا اثر قرار دیجئے۔ بہرحال ہوتا بالآخر عموماً وہی تھا، جو ان کی رائے ہوتی، اور رہنمائی تقریباً ہر موقع پر ان ہی کی صحیح قرار پاتی ——— جمعیۃ خلافت کا روح رواں، عرف عام میں شوکت علی کو سمجھا جاتا تھا، اور یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ ضابطہ سے سکریٹری بھی وہی تھے۔ لیکن اسی سنہ ۲۲ میں مرکزی کے جلسے ایسے بھی ہوئے جن میں شرکت تک سے مولانا شوکت علی معذور رہے (ایک بار تو ہندوستان کے باہر یہ داعی خلافت ہی کے کام سے گئے ہوئے تھے) اور اس سے جلسہ میں کوئی خاص فرق محسوس ہی نہ ہونے پایا۔ برخلاف اس کے محمد علی کے بغیر مرکزی کا کوئی جلسہ قابل عمل تو کیا ہوتا، قابل تصور بھی مشکل ہی سے تھا! بغیر ان کے محفل سونی، جلسہ میں سناٹا۔ ادھر وہ آئے اور ادھر جیسے جلسہ میں جان پڑگئی اور اداسی اور افسردگی کی جگہ رونق، تازگی، شگفتگی اور چہل پہل نے لے لی۔ زبان پر تابو،

دل کے جذبات نے باقی ہی کب رہنے دیا تھا۔ جو کچھ جس کے متعلق دل میں ہوتا، سب بے دھڑک، بے جھجک زبان پر لے آتے، اور اس میں لحاظ نہ دوسروں کے جذبات کا رکھتے نہ اپنے وقار کا، وقت ایسے موقع پر سب سے بڑھ کر غریب صدر جلسہ کو پیش آتی تھی۔ نہ یہ ہمت کہ محمد علی کو بولنے سے روکے، نہ اس کی سکت کہ جو کچھ محمد علی چاہیں، وہ انھیں کہہ لینے دے۔

یہ اثر و اقتدار خود بخود یا زبردستی نہیں پیدا ہو گیا تھا۔ محمد علی تحریک خلافت کے پیچھے، اس کے نظام مجلس کے پیچھے، اپنے کو فنا بھی تو کیے ہوئے تھے۔ کانپور کے جلسہ عام میں دیکھا، لکھنؤ کے جلسۂ عام میں دیکھا، اور دہلی، کانپور، لکھنؤ کے مرکزی جلسوں میں بار ہا دیکھا کہ فلاں اور فلاں لیڈر صاحبان، اور حد یہ ہے کہ خود صدر صاحب اچھے خاصے بٹے کٹے، اپنے کمرہ میں یا اپنے خیمہ میں خوش گپیاں فرما رہے ہیں اور چند قدم اٹھ کر جلسہ میں تشریف نہیں لا رہے ہیں! خیالی علالتوں کا بنا بنایا عذر ایسے موقع پر خوب کام دے جاتا تھا —— محمد علی غریب کے لیے ایسی کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔ خود بیمار ہوں، محبوب ترین عزیز یا عزیزہ بیمار ہو، جلسہ کا وقت شدید سردی میں آدھی رات کا ہو، سخت گرمی میں ٹھیک دوپہر کا ہو، بہر حال جلسہ میں پہنچ ہی جاتے۔ بیماری میں صاحب فراش ہو گئے، تو جلسہ یا تو گھر ہی پر طلب کرایا، یا پھر جلسہ گاہ تک کسی طرح گرتے پڑتے پہنچ، کوچ پر لیٹ گئے، پیسہ پاس نہ ہوا، تو کہیں سے قرض وام کر کے ریل کا کرایہ دیا۔ لیکن پہنچے ضرور، اور غیر حاضری نہ ہونے دی —— اتنی فنائیت، یہ اخلاص مندی کہیں بالا بالا جا سکتی تھی؟ اس کا اثر دوسروں پر کیسے نہ پڑتا۔ موافقین کو چھوڑیے، مخالفین تک اس سے غیر متاثر نہ رہتے۔

فرنگی محل اب ساتھ تھا۔ گو مولانا عبد الباریؒ کے اٹھ جانے کے بعد اب فرنگی محل خود

ایک جسدِ بے روح تھا۔ مولانا عبد الماجد قادری بدایونی، حسرت موہانی اور بہت سے بچھڑے ہوئے دوست اب پھر آملے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں خدا جانے کتنے اور جھڑے ہوئے دل اب اور سے ٹوٹ بھی چکے تھے۔ اسلامی ہند قضیۂ نجد و حجاز کو ابتک حربِ عقائد کا ذریعہ بنائے ہوئے تھا۔ محمد علی نے لاکھ سمجھایا۔ ملکیت و جمہوریت کی بحث کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔ بس گھوم پھر کر وہی وہابیت اور ہدم مزارات کا قصہ۔ محمد علی نے سلطان کا ساتھ یہ سمجھ کر دیا تھا کہ وہ جمہوریۂ اسلامی قائم کریں گے۔ اور اب جو ساتھ چھوڑا وہ اس لیے کہ وہ توقع باطل ثابت ہوئی۔ پہلے ہندوستان کے اہلِ حدیث خوش ہوئے تھے اور مشائخ ناراض۔ اب مشائخ کی خوشی کی باری تھی اور اہلِ حدیث کی خفگی کی۔ اس وقت خفگی میں سب سے پیش پیش پنجاب تھا۔ مرکزی کے جلسوں میں ارکانِ پنجاب خاصی بڑی تعداد میں متحد و متفق ہو کر آتے، اور بزم میں جلوہ اچھا خاصہ میدانِ رزم کا نظر آجاتا۔

ایک روز جلسۂ مرکزی سے قبل شام کو دہلی پہنچا۔ محمد علی پلنگ پر لیٹے ہوئے بیماری سے کراہ رہے تھے۔ پنجاب کے مشہور لیڈر مولوی ظفر علی خاں صاحب کے رویہ سے شدید بیزاری کا اظہار تلخ و تند لہجہ میں ہمدرد میں کر چکے تھے۔ میری ہمت تنہا عرض کرنے کی تو پڑتی بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر سید محمود[1] اور مولانا محمد عرفان[2] اور مولانا حسین احمد صاحب کو پہلے سے ہموار کر کے انھیں اپنے ساتھ لے لیا اور ان کی تائید کے ساتھ، ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ "اتنی سختی تو مناسب نہیں، جبکہ آپ کی تحریکِ خلافت خود ہی اتنی سست پڑ چکی ہے، اور لوگ خود ہی ساتھ

---

[1] موجودہ وزیرِ صوبۂ بہار۔ اس وقت تک تحریکِ خلافت کے دعتِ اول کے لیڈروں میں تھے۔ (جنوری سنہ ۱۹۵۲ء)

[2] ان کا نام بھی ان صفحات میں بار بار آرہا ہے۔ محمد علی کے مخلص ترین رفیقوں میں تھے۔ ہزارہ (صوبہ سرحد) کے باشندہ۔ اس وقت جمعیۃ العلماء (دہلی) کے رکن رکین اور غالباً سکریٹری تھے۔ بعد کو بمبئی منتقل ہو گئے۔ اور مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے تھے۔ اب مدت ہو گئی مرحوم ہو چکے ہیں۔

چھوڑتے جا رہے ہیں۔" محمد علی ان سب کے خلوص کے قائل تھے۔ اور مولانا حسین احمد صاحب کے تو اسوقت تک معتقد ہی تھے لیکن اب ان کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے تو جواب کچھ یوں ہی سا سرسری دیا۔ لیکن مولانا پر ابل ہی پڑے لیٹے سے اٹھ بیٹھے۔ اور جھک کر بولے:-

"مولانا آپ نائب رسول ہو کر مجھے مشورہ نرمی یا مداہنت کا دے رہے ہیں! میں مداہنت برتوں قوم کے غداروں کے ساتھ؟ کیا آپ ہی نے اپنے وعظوں میں بارہا حضرت عمرؓ کا یہ اسوۂ حسنہ بیان نہیں فرمایا ہے کہ انھوں نے عین معرکۂ جہاد و قتال میں مسلمانوں کے سب سے بڑے سپہ سالار خالد بن ولیدؓ صحابی رسول کو ایک دم سے معزول کر دیا؟ آپ کے اصول پر تو خلیفۂ ثانی کی بھی یہ سختی اور بیجا سختی تھی۔ میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن کسی مصلحت سے بھی تو می غداری پر معاف نہیں کروں گا۔ سب میرا ساتھ آج چھوڑ دیں۔ میں نے کام سب کے بھروسہ پر نہیں، اللہ کے بھروسہ پر شروع کیا تھا۔ اسے منظور ہو گا تو وہ نئے ساتھی پیدا کر دیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں وقتی مصلحت سے مداہنت برتنے لگوں۔ جسم کا جو عضو فاسد ہو جائے، اسے کاٹ ہی ڈالنا چاہیے۔"

یہ آواز ۂ حق سن، سب دم بخود ہو گئے ــــــ یہاں اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ نہیں کہ محمد علی کی رائے خواہ مخواہ صحیح و صائب ہی تھی۔ مقصود صرف انکی حرارت ایمانی اور جذبۂ دینی کو دکھانا ہے۔ ظفر علی خاں بھی علیگڈھ ہی کے گریجویٹ تھے، اور مولانا شوکت علی کے ہم سبق۔ محمد علی کا انکا پرانا یارانہ۔ محمد علی انھیں عزیز ہی نہیں، اپنے بڑے بھائی کی جگہ پر سمجھتے تھے لیکن جہاں معاملہ مفاد ملت و فلاح امت کا آیا، محمد علی نے آنکھیں ہر ذاتی دوستی و مروت کیطرف سے پھیر لیں۔ جس چیز کو انھوں نے حق سمجھ لیا بس اسکے آگے کوئی نہ ان کا دوست تھا نہ عزیز ــــــ جو شخص اس غم اور ان فکروں میں ہر وقت گھلتا رہتا ہو، وہ جی کتنے تک سکتا تھا؟ خلاف توقع اور حیرت انگیز اس کا جلد مر جانا نہیں، بلکہ اتنے دنوں تک جیتا رہنا تھا!

باب (۵۰)

۱۹۲۶ء (۲)

(دوبدو - کڑی آزمائش)

"میں نے ابتک کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب رہا کہ باوجود فرنگی محلی سرگرمیوں کے ہم لوگ اور تمام کام چھوڑ کر فرنگی محل سے بحث و مباحثہ میں منہمک نہ ہوجائیں" مقالہ شروع یوں ہوا۔ لیکن ناگواری اور یاس کی حالت میں بھی اعتدال و اقتصاد کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ آگے چل کر کہتے ہیں :-

"عارف صاحب غلطی پر ہیں، اگر وہ اس پروپگنڈا کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے میں تمام کام چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ عارف صاحب میں ہمیشہ مجھے احساس تناسب کی کمی محسوس ہوئی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ردولی شریف کے عرس کے پروپگنڈے سے انھیں اس قدر متاثر پاتے ہیں"

اجمیر کا "آل انڈیا" عرس، عرس ردولی کے دو ڈھائی ہفتہ بعد ہونے والا تھا۔ عارف صاحب نے خبر دی تھی کہ فرنگی محل جل تیاریاں وہاں مقابلہ کے لیے کر رہا ہے، اور وہاں ردولی سے بھی کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ زبردست پروپگنڈا ہوگا، اس لیے اہل خلافت کو وہاں پہنچنا بہت ضروری۔ اس پر محمد علی لکھتے ہیں "اور وہی یہ لکھ بھی سکتے ہیں :-

"اجمیر شریف کے عرس میں شرکت میں اپنے لیے باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ اور اگر اس آستانۂ گرامی سے فیض حاصل نہ بھی ہوتا جب بھی جہاں اتنے مسلمان جمع ہوں پہنچنا ہم جیسے خادمانِ ملت کے لیے یوں بھی بسا ضروری ہے لیکن ہم نہ بھی حاضر ہو سکے (اور خوف یہ ہے کہ میں تو اس بار شاید محروم ہی رہوں) تب بھی خداوند کریم نے جس طرح اچانک ردولی شریف میں کذب افتراء کے تارِ عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم فرما دیا، اسی طرح اجمیر میں بھی وہی مسبب الاسباب اس کا سامان فراہم فرما دے گا۔ بیت عنکبوت سب گھروں سے زیادہ کمزور ہے۔ اس کی شکست و ریخت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔"

بڑا اعتراض عوام (اور ان ہی میں بہت سے خواص بھی شامل تھے) کی نظر میں نقضِ عہد "بیعت" (بیعت اصطلاحی) کا آ کر پڑ رہا تھا۔ اس کے جواب میں یہ لکھنے کے بعد کہ اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم انگریزوں سے لڑے، جن میں مل کر ہم جواں ہوئے تھے۔ شریف سے لڑے۔ ترکوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے، ہندوؤں سے لڑنے کو تیار ہیں، آخر میں لکھتے ہیں۔

"اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم نے علمائے ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا، اور کبھی نکث عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے لیکن اسلام و خلافت ہی کے لیے ہم ایک بار نہیں ہزار بار ان سے اپنے رشتہ کو توڑ دیں گے، اور صرف اسی خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے، جس سے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کہکر رشتہ جوڑ لیا تھا...... ہم اپنے پیر و مرشد کے پاس فنا فی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے، بلکہ فنا فی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لیے وہی پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ و رسولہ ان کنتم تومنون باللہ و الیوم الآخر۔"

معیار کی اس بلندی تک عام مخالفین و موافقین کیا پہنچتے۔ پارٹی والے، ادھر کے ہوں یا ادھر کے، روح کی ان گہرائیوں کو کیا پہچانتے ——— اہل نظر خود دیکھ لیں کہ ذرح عارف صاحب کے مضمون کی کیا تھی اور سوختہ دل، تفتہ جگر محمد علی کے مضمون کی کیا،

موسیا! آداب دانان دیگر اند

سوختہ جان در وانان دیگر اند

دنیا جو چاہے سمجھا کرے، جو چاہے کہتی رہے، بہر حال خود محمد علی اپنی زبان سے یہ صدا سے حق لگانے کی "جو کوئی ہم پر نکث عہد کا الزام لگائے، وہ میرے اس عہد کو یاد رکھے جس کو بہ حالت نظر بندی میں نے اپنی سب سے پہلی غزل میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا تھا ؎

عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو

تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

اور اگر اسی زمانہ کے میرے اس شعر پر بھی نظر رہے تو برا نہیں ؎

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم

پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یہ تقاضائے وفا صرف انگریزی حکومت ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ ہر غیر اللہ کے مقابلہ میں ہے۔ میں نے آج تک ایک لفظ بھی مولانا عبد الباری صاحب کے خلاف نہیں لکھا، اور جو کچھ مولانا صاحب کے متعلق سنا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کہتے اور کرتے ہیں، اسے کبھی یاد نہیں کیا تھا، مگر........

اس "مگر" کے بعد فرنگی محل اور خدام الحرمین پارٹی کی چند حرکتوں کی تصریح ہے، اور اس کے بعد "یہ وہ چیزیں تھیں جن کے بعد میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ مولانا صاحب

جو خدام الحرمین کے صدر اور فرنگی محلی حضرات کے بزرگ...... . ان کے افعالِ قبیحہ پر اظہار بیزاری فرماتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اظہار بیزاری ابتک نہیں فرمائی گئی بلکہ ......"

اس "بلکہ" کے بعد مزید جرائم کی تصریح ہے، یہانتک کہ

"اب عارف صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ردولی شریف میں جو پروپیگنڈا کیا گیا، اس میں مولانا صاحب خود بنفس نفیس شریک تھے۔"

محمد علی کے سینہ میں بھی آخر گوشت و پوست ہی کا دل تھا، پتھر کا ٹکڑا نہ تھا۔ پیمانۂ صبر کیا اب بھی نہ چھلکتا؟ ـــــــ آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خونِ دل سے لکھا ہے، طیش و غضب سے بگڑ کر نہیں، حزن و شکستگی سے گھٹ گھٹ کر۔

"بحمد للہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا، آج بھی مسلمان ہوں، اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا۔ جب آٹھ برس علی گڈھ اور چار برس آکسفرڈ میں رہ کر مجھ میں کفر والحاد نے سرایت نہ کی، تو اب جبکہ اسلام کی خاطر میں نے علی گڈھ سے بھی منہ موڑا، اور آکسفرڈ پر بھی لات ماردی، کیا خداوند کریم مجھے کفر والحاد کی طرف لیجائیگا؟ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ گو زندگی عبادات و ریاضات میں صرف نہ ہوئی، مگر موت اس آخری عبادت و ریاضت میں نصیب ہو جس کا نام شہادت ہے۔ اور میرا شعر سچا ثابت ہو ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والاٰخرۃ توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین
(اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے دین و دنیا میں تو ہی ولی ہے، مجھے اسلام پر موت دے اور صلحاء میں مجھے شامل فرما)

مجھے فقط تیری خوشنودی منظور ہے ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

مجھ سے سب بیزار ہو جائیں، مگر تو اور تیرا رسول بیزار نہ ہوں۔ کسی سے بھی نکث عہد ہو، مگر تجھ سے اور تیرے رسول سے نہ ہو۔ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے...... خداوندا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک سے اور تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے۔ اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسول کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہوگا اور میں ہوں گا، اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہوگا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

محمد علی کو دشمن تو دشمن، دوستوں اور محبوں نے بھی زود رنج اور مغلوب الغضب کہا ہے۔ زود رنجوں اور غصہ وروں کے یہی تیور، یہی شان، یہی زبان ہوتی ہے؟ کسی کی بدزبانی نے "مردود الطریقت" بھی کہہ دیا تھا۔ "مردودوں" کی جبین عقیدت ایسی ہی نورانی ہوتی ہے؟ حالات و حوادث تکوینی تو وہ چیزیں ہیں، جنھوں نے ام المومنین صدیقہؓ اور امیر المومنین مرتضیٰ رضی تک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا کر کے چھوڑا، پھر محمد علی اور ان کے مرشد کی کیا بساط تھی ————

لیکن کیا امیر المومنین جب ام المومنین سے مقابلہ کے لیے نکلے ہیں، تو کیا ان کا دل اسے کوئی خوش آیند مشغلہ یا تفریح سمجھ رہا تھا؟ کیا طبع گرامی پر شدید گرانی نہیں محسوس ہو رہی تھی؟ محمد علی کے قلب کی حالت اس وقت کی کوئی بتائے؟ کون بتا سکتا ہے؟

مرید کو چھوڑیے، مرشد کا سینہ بھی بہرحال خالی نہ تھا۔ یہ تو شاید وہ موقع تھا کہ بے جس و بیجان پتھر تک میں حرکت پیدا ہو جاتی، تو پھر یہ تو ایک مومن کا قلب، ایک صاحب دل کا دل، ایک صاحب طرز کا سینہ تھا۔ اثر کیسے نہ ہوتا؟ اثر ہوا۔ مگر وہ بات اسی سطر میں اور اسی لمحہ کہنے کی نہیں، اس وقت تو ظاہری آنکھوں کو یہ نظر آیا کہ اثر محمد علی کی تحریر کا نہیں، عارف صاحب کے مضمون کا پڑا۔

فریقین میں ضدیں بڑھیں، جوش انتقام بھڑکا، اور مقابلہ کی تیاریاں اس عظیم الشان پیمانہ پر شروع ہوئیں کہ گویا آخری اور فیصلہ کن ہی معرکہ ہو کر رہے گا۔ اب تک آویزش سپاہیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ اب سورماؤں کے سورما، دونوں سپہ سالار، خود تلوار سونت سونت کر، ایک دوسرے کے مقابلہ کو بڑھے۔ ایک عظیم الشان، ہولناک اور زلزلہ انگن تصادم اب ہوا اور جب ہوا۔ ہزاروں لاکھوں سپاہیوں کے ہجوم میں کوئی خوف سے لرز رہا ہے، کوئی شوق و مسرت سے مست ہو رہا ہے لیکن منتظر سب کے سب، نگاہیں سب کی جمی ہوئی، کان سب کے کھڑے ہوئے ——— ادھر بندے ان سرگرمیوں میں غرق، اُدھر تقدیر ایک دوسرے ہی کھیل، دردناک اور عبرت انگیز کھیل میں مصروف!

———※———

باب (۵۱)

۱۹۲۶ء (۳)

(مرشد کی آخری گھڑیاں۔ وصال)

۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء۔ یکشنبہ، رجب ۱۳۴۴ھ کی غالباً دوسری تھی۔ یہ ڈائری نویس لکھنؤ میں تھا، اور اپنے ہاں عشا کی نماز اول وقت پڑھ ہی رہا تھا، کہ معلوم ہوا، مولانائے فرنگی محلی پر سہ پہر کے وقت یک بیک فالج کا زبردست حملہ ہوا اور مولانا اس وقت سے بیہوش ہیں —— مولانا کسرتی جسم کے آدمی تھے، توانا و تنومند صحت بہت اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ، اور عمر بھی ابھی پچاس سال کے اندر! —— راوی خود ایک طبیب حاذق تھے، مولانا کی حالت دیکھتے ہوئے چلے آرہے تھے، فرمایا کہ حملہ بہت شدید قسم کا ہے، اور زندگی کے لیے اچھا خاصہ خطرناک!

آہ، انسان ضعیف البنیان اور اس کی تدبیریں اور ارادے! کیا کیا تجویزیں ہورہی تھیں، کیسے کیسے منصوبے بندھ رہے تھے، اور یہ ہو کیا گیا! —— عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کرچکا تھا، وہ کام جو ابتک کسی کے بنائے بھی نہ بن آیا تھا۔ نہ چودھری خلیق الزماں کے بنائے، نہ ظفر الملک علوی کے، نہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے، نہ عبدالماجد دریابادی کے، مولانائے فرنگی محلی سے محمد علی کو باغی و برگشتہ کرنے کی کوشش اور تدبیریں ابتک محمد علی کے خدا جانے کتنے نیازمند اور رفیق کرچکے تھے، بعض حبِ علی کی بنا پر، اور زیادہ تر بغضِ معاویہ کی بنا پر، کوئی محمد علی

سے فرطِ اخلاص دینیاز کی بناپر، اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ لکھنؤ ان تخریبی کوششوں کا مرکز تھا۔ اور اپنے جوار ہی کے حضرات ان کوششوں میں سرگرم۔ یہ ڈائری نویس بھی (اللہ اسے معاف کرے) ان کارروائیوں میں بڑی حد تک تو نہیں لیکن کسی درجہ میں بہرحال شریک و معین۔ محمد علی کے تعلقات محبت ("محبت" نہ کہ عقیدت) مولانائے فرنگی محلی سے اس درجہ محکم و استوار تھے کہ کسی کی کچھ نہ چلتی ——— عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا کہ گوشت ناخن سے جدا ہوا۔ دوست کا دل دوست سے، عزیز کا دل عزیز سے، مسترشد کا دل مرشد سے ہٹا۔ اور دل کی ٹیسیں لفظ و عبارت کا جامہ پہن کر ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی سی تھی؟ یاروں کی دیرینہ تمنا بر آئی۔ عارف صاحب کو داد بھی ملی اور مبارکباد بھی، زبانی بھی، اور اخباری مضمون میں بھی۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجریؒ کا عرس اجمیر میں ۶ رجب کو ہوتا ہے۔ اور جس طرح حضرت کا مرتبہ خواجۂ خواجگان کا سمجھا جاتا ہے، اس عرس کو بھی عرس الاعراس کہنا چاہیے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا عرس شاید یہی ہے۔ معتقدین کا ہجوم عظیم، زائرین کی ریل پیل، خوش عقیدگی کی حکومت مشائخ اور پیرزادے ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھا۔ علی برادران اور خلافت کمیٹی پر یورش کا موقع اس سے بہتر اور کہاں مل سکتا تھا۔ ردولی کے عرس کو اور عارف صاحب کے مضمون کو ابھی دن ہی کے ہوئے تھے، غصہ تازہ، جوش بے اندازہ، زخم ہرا۔ ٹھہری یہ کہ خدام الحرمین کا جلسۂ عظیم اتنا بیانہ پر وہیں ہو، اور لکھنؤ اور دہلی اور بمبئی اور لاہور، سب کہیں کا جمع شدہ بخار وہیں دل کھول کر نکالا جائے، اور یلغار اس زور کی کی جائے کہ ان "مردود وہابیوں" کا نام و نشان بھی نہ رہ جائے۔
——— اصل منصوبے تو جو کچھ بندھے ہوں گے، ان کا پورا اور صحیح علم تو ان ہی حضرات کو ہو سکتا تھا

"تطہیر" حجاز کی خبریں اب حد تواتر کو پہنچ چکی تھیں۔ اخبارات میں روزانہ سرخیاں اسی کی ہوتی تھیں۔ کم از کم برطانیہ کے حلیف شریفوں کی حکومت تو اب حجاز سے اٹھ ہی چکی تھی۔ اپریل ۲۶ء میں محمد علی حج کا تہیہ کر بیٹھے، اور ہمدرد میں اس کا اعلان بھی کر دیا۔ وسط اپریل میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا، اور محمد علی ہی کے مکان پر۔ اس نے موتمر اسلامی کے لیے، جس کی دعوت سلطان کی طرف سے اگلی حج کے موقع کے لیے موصول ہو چکی تھی، اپنا ایک نمایندہ محمد علی کو بھی منتخب کیا۔ موتمر نے خلافت کمیٹی سے کل چار نمایندے طلب کیے تھے۔ جلسہ میں نام متعدد اشخاص کے پیش ہوئے، لیکن آخر میں جب رائے شماری ہوئی تو کامیابوں میں شوکت علی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی کے ساتھ ایک نام محمد علی کا بھی تھا۔ ارکان مجلس میں سے حاضر غالباً ۴۵ سے زاید نہ تھے۔ پنجاب کے ۱۴، ۱۵ ممبر محمد علی کی شدید مخالفت میں متفق و متحد، اس لیے خیال یہ ہو رہا تھا کہ محمد علی کا انتخاب تنہا ہی ہو سکے۔ لیکن انتخاب نہ صرف یہ ہوا، بلکہ بڑی اکثریت کے ساتھ ہوا۔ اور محمد علی نے اپنے اور اپنے بھائی کی طرف سے سر جلسہ اعلان کیا کہ چونکہ ہم لوگ حج فرض ادا کرنے جا رہے ہیں، اس لیے نمایندگی موتمر اسلامی کے لیے اپنے سفر حجاز کے مصارف کا بار خلافت کمیٹی پر نہ ڈالیں گے، اور اپنے ہی مصارف سے جائیں گے ——— یہ تھا وہ محمد علی جسے بعض خوش ظرف معاصرین نے پیسہ کا حریص بھی قرار دیا تھا!

اولوالعزمی محمد علی کی سرشت میں تھی۔ (دوسرے لوگ اسے اسراف سے تعبیر کرتے تھے) حج و زیارت کو چلے تو تنہا نہیں، بیوی کو بھی ہمراہ لیا۔ اپنی بیگم سے محمد علی کو نہایت درجہ محبت تھی۔ پہلے سے بھی قریب کی عزیزہ تھیں، اور محبت شادی کے قبل ہی پیدا ہو چکی تھی (خدانخواستہ

کسی ناجائز معنی میں نہیں) جوانی بھر عشق کی سی کیفیت رہی۔ سن اترنے پر محمد علی کہا کرتے تھے، کہ "قبل از وقت ناکارہ سا ہو گیا ہوں، لیکن بیوی کی محبت بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کوئی بھی سفر انھیں ساتھ لیے بغیر نہ کروں"۔ بہرحال انھیں بھی ساتھ لیا، اور دوہرے مصارف گوارا کیے۔ خود اپنے ہی مصارف کے لیے خدا معلوم کیا سبیل سوچی تھی، چہ جائیکہ یہ دوہرے اخراجات! ـــــــــ عطیے اور نذرانے، کم از کم نقد کی شکل میں محمد علی اپنے محبوں اور مخلصوں سے بھی، بڑی مشکل سے قبول کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک آدھ عالی ہمت مخلص نے، اختلاف مسلک کے باوجود، نقد ہی سے کچھ خدمت کی، اور ایک حقیر سی رقم کا نذرانہ اس نامہ سیاہ نے بھی پیش کیا، جسے شرف قبول بخشا گیا۔ ۱۰رمئی کو یہ گرامی نامہ خود محمد علی کے ہاتھ کا نہیں، بلکہ منور علی خاں صاحب رام پوری (جو مولانا کے بزرگ عزیز ہونے کے علاوہ دفتر ہمدرد کے خزانچی بھی تھے) کے ہاتھ کا لکھا ہوا وصول ہوا:۔

دہلی ۸رمئی ۲۶ء

برادرم۔ السلام علیکم

احمد آباد گیا ہوا تھا۔ پرسوں آیا ہوں۔ آپ کا خط اور ...... روپیہ ملے۔ مرض کی حالت میں اب پہلے سے فرق ہے۔ مگر تنہا ہوں، ہر طرح کا کام خود ہی کر رہا ہوں۔ سفر حج کی فکر علیحدہ۔ گھر کی فکریں جداگانہ۔ آپ کی محبت کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ۱۰رمئی کو ارادۂ روانگی ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر پہنچائے۔ آپ کا نام میں نے یادداشت میں لکھ لیا ہے۔ خانۂ کعبہ میں ضرور دعا کروں گا۔ اور مدینۂ پاک میں سلام عرض کروں گا۔ بیگم صاحبہ کو بھی ہمراہ لیے جاتا ہوں۔ بچیاں یہاں رہیں گی

زیادہ سلام۔

محمد علی"

جہاز روانہ ہوا۔ اور اسی جہاز پر خلافت کمیٹی کے پورے وفد کے علاوہ جمعیۃ العلماء کے ارکان وفد بھی تھے۔ قرنطینہ کامران کے قریب پہونچ کر محمد علی نے خط لکھا، خاصہ مفصل ہے گے ملاحظہ ہو۔ تاریخ اندر تو درج اندر تو درج نہیں، لفافہ کی مہر پر ۲۴ رمئی درج ہے۔

ضمیمہ باب (۵۶)

[فاضل گرامی مولانا سید سلیمان ندوی، رئیس وفد خلافت، نے مسئلۂ آثر و مقابر پر مسلک جمعیۃ خلافت کی اتنی بہتر ترجمانی صحیح شرعی نقطۂ نظر سے بھی فرما دی تھی کہ ان کی تقریر کا مختصر خلاصہ جو دستیاب ہو سکا، اُسے اس نمبر کا ضمیمہ بنا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے]

مولانا سید سلیمان صاحب نے مسئلۂ مقابر و آثر پر ایک پر زور تقریر کی۔ اور آیات واحادیث، تاریخ وسیر کے حوالے سے اپنے مدعا کو ثابت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہاں مجلس خلافت کی طرف سے تین باتیں لے کر آئے ہیں۔ اول یہ کہ کتاب وسنت کے ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیے جس میں خود صحابۂ کرام اور تابعین مختلف تھے۔ مقرر نے اس کی متعدد مثالیں احادیث اور عمل صحابہ سے پیش کیں۔ اور پھر کہا کہ دوسری چیز یہ ہے کہ کتاب وسنت کے اتباع کا سب سے پہلا نمونہ خود حکومت کو ہونا چاہیے۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب شرعی ہو اور وراثت سے پاک ہو۔ تیسری چیز مقابر و آثر کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں جان لینا چاہیے کہ یہاں دو چیزیں ہیں۔ مقابر اور آثر۔ اور ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ مسئلہ مقابر کی نسبت بناء علی القبور اور تجصیص القبور وغیرہ کی ممانعت آئی ہے۔ گو ایک مختصر فریق کے نزدیک اس کے معنی کچھ اور ہوں۔ اسی بنا پر اگر سلطان تمام دنیائے اسلام کے فیصلہ کا انتظار کرتے تو یقیناً کوئی نقصان نہ تھا۔ اور اس طرح ذمہ داری بجائے

ان کی ذات یا اہل نجد کے تمام دنیا پر بٹ جاتی۔ آثر سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیاءؑ یا صحابہؓ کی طرف کسی حیثیت سے نسبت ہے۔ قرآن اور حدیث و آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان مآثر پر عمارتوں کے بنانے یا مسجد بنانے سے منع کرتی ہو۔ بلکہ قرآن پاک، احادیث، سیر اور آثار میں ایسے مآثر کا ذکر ہے۔ اسی بنا پر ان عمارتوں کو منہدم کر دینا شدت اور غلو کے سوا کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم کو معلوم ہے کہ جاہل مسلمان وہاں بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں۔ ان اعمال کو روکنا چاہیے تھا۔ یا بعض عمارتیں غیر شرعی طور پر یا غیر مستند طور پر بنائی گئی تھیں تو ان کی تصحیح کی جاتی۔ مثلاً مولد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (جائے پیدائش حضورؐ) کی موجودہ شکل یقیناً صحیح نہ تھی، مگر زمانۂ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی جس میں نماز پڑھی جاتی تھی مگر موجودہ شکل حقیقی مولد کے کمرہ کی بنائی گئی تھی، جو صحیح و مستند نہ تھی، اس لیے درست کر دینی چاہیے تھی اور غلاف، کٹہرا، سنگ مرمر کی سل وغیرہ ہٹائی جا سکتی تھیں۔ مگر نفس عمارت کو توڑ ڈالنا شدت اور غلو کی انتہا ہے۔ مقام ابراہیم، صفا و مروہ، چاہ زمزم وغیرہ تمام مآثر ابراہیمی ہیں، کیا ان کو بھی منہدم کر دیا جائے گا؟

باب (۵۹)

۱۹۲۶ء (۱)

(مکتوبِ حجاز۔ ناکام مراجعت)

جہاز اکبر۔ قرنطینہ کامران۔ بحر احمر (لفافہ کی مہر پر) ۱۴ مئی ۲۶ء

پیارے ماجد میاں ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جتنی خوشی اپنے اس سفر کی ہے، اسی قدر افسوس آپ کی شرکت نہ ہونے کا ہے۔ یہ درباره وہ ہے کہ باوجودیکہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کو اپنے مرحوم بھائی کے شریک نہ ہونے کا افسوس تھا، وہ خود ہر بار حاضری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہاں ایک حد تک خود غرضی جائز ہے، مگر یقین جانئے کہ آپ کے، اور میرے دوست قاسم حسین[1] اور تیسرے دوست مسعود علی صاحب ندوی[2] کے اور مستورات میں بیگم صاحبہ انصاری[3] کے شریک نہ ہونے کا سخت قلق ہے۔ سفر خوب لطف سے ہوا۔ میری اہلیہ کو دو تین دن تے آئی اور گھمن تو

[1] قاسم حسین صاحب بدایونی (علیگ) محمد علی کے خاص مخلصوں میں تھے۔ شاید ماتحت کے پڑھے ہوئے بھی تھے۔ پہلے یو۔پی میں نائب تحصیلدار تھے۔ ۱۹۲۱ء میں محمد علی کی دوستی کے سلسلہ میں معتوب ہوئے، عہدہ پر استعفا دیکر حیدرآباد چلے گئے۔ آخر میں محمد علی کے ہم مرض تھے یعنی ذیابیطس میں مبتلا۔ اور محمد علی کے انتقال کے بعد ہی ہمیشہ یہ خود بھی راہی ملک بقا ہوئے۔

[2] مولوی حاجی مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین (اعظم گڑھ) [3] ڈاکٹر انصاری (دہلی والے) کی بیگم صاحبہ

سب عورتوں کو چار پانچ دن رہی مگر مرد اکثر اچھی طرح رہے اور ہم لوگ تو خوب مزے سے کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔ عدن سے گزرنے سے ایک دو دن پہلے ہی سمندر میں مطلق جوش نہ رہا تھا، جوش تو پہلے بھی نہ تھا، مگر بعض لوگوں کو ناگوار گزرتی تھی لیکن جب ہوا بند ہوئی تو سب گرمی کے شاکی تھے اور ایک شب تو بہت تکلیف رہی۔

میں نے پہلی بار سمندر کا سفر ۱۹ برس کی عمر میں کیا تھا۔ ۱۱ رجون کو مانسون شروع ہوئی۔ ۱۹ رکو میں نے ساحل ہند چھوڑا، طغیانی کا زور تھا۔ جو کیفیت شروع کے ۵ دن رہی تھی، اسے اندازہ کر سکتا ہوں کہ اوروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ لیکن حج کا شوق وہ شوق ہے کہ ایسی تکلیف پر بھی لوگ گلہ سنجی سے محترز رہتے ہیں۔ میرے کاربنکل کو چلنے سے پہلے آرام ہو گیا تھا، مگر ریل کے سفر میں ایک اور نکل آیا۔ پھر بھی جہاز کا ایک چکر تو روز ہو جاتا تھا۔ اگر اس سے نجات مل گئی ہوتی اور بیوی کی تسلی و تشفی لازمی نہ ہوتی تو میں زیادہ وقت تھرڈ کلاس ہی میں گزارتا۔ کمپنی تو مفت لیجانا چاہتی تھی مگر میں نے کہہ دیا کہ اس سفر کو بلا خرچ کیے ہوئے اختیار نہ کرنا چاہیے۔ اور تھرڈ کلاس میں سب کے ساتھ جانے ہی کی نیت تھی۔ اور اتنا ہی روپیہ پاس تھا، تاہم کمپنی نے تھرڈ ہی کے ٹکٹ سے فرسٹ میں ٹھہرایا۔ جمعیۃ العلماء کو بھی سکنڈ میں ٹھہرایا۔ شوکت صاحب کو کپتان نے اپنے پاس ایک خاص کیبن دیا، جس میں وہ اور ہمشیرہ[1] رہتے ہیں۔ مگر افسروں کا سارا ڈک (Deck) تھرڈ کلاس والوں سے اتنا بھرا رہتا ہے کہ خود افسروں کو بعض وقت راہ تک نہیں ملتا۔ افسر بہت خلیق اور بامروت ہیں۔ بالخصوص کپتان جو ایک نیک اور سیدھا آدمی ہے۔ میری اہلیہ اور بہن اور ان سے ملنے والی عورتوں کو کپتان نے اپنا آدھا ڈک دے رکھا ہے۔ اپنے غسل خانہ میں خود اس لیے کم

[1] مولانا کی ہمشیرہ بھی اس سفر حج میں ہمراہ تھیں۔

جاتا ہے کہ مستورات ادھر بیٹھتی ہیں۔ ان کو نقاب نہ ڈالنا پڑے۔ پرسوں رات مجھے سوجھی کہ اہل ہند غیر ہندی مسافروں کی دعوت کریں۔ بالخصوص بخاریوں کی جو باوجود گندے اور پسینے کے باعث سخت بدبودار اونی اور روئی بھرے کپڑے پہننے کے نیک اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ کوئی پانچ سو روپیہ صرف تیس چالیس آدمیوں سے وصول ہوگیا۔

کل یہاں کامران میں قسطنطنیہ والوں کی دیگیں لے کر سامان منگا کر کھانا پکوایا گیا۔ رات پون بجے خود کھانا کھایا اور کوئی دو بجے سونے کو لیٹا، بہت کھانا بچ رہا اور جنس بھی۔ بنگالی "بھوکے" مشہور ہیں، رات ثبوت مل گیا۔ باوجود سوائے ایک خاتون کے چند مطلق نہ دینے کے ناخواندہ مہمان بن کر آگئے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں ٹالا تھا۔ اب سب کی رائے تھی کہ ان کو کھلوا دیا جائے۔ سخت ندیدے اور حریص اور اس معاملہ میں بے حیا ہیں۔ لوٹ مچا رکھی تھی۔ خیر ضیف اللہ ہیں۔ جب اللہ ان کو مہمان بناتا ہے تو ہم کیوں ناک بھوں چڑھائیں اس سے بھی فارغ ہوئے اب کہ دن کے گیارہ بج رہے ہیں، جہاز پر واپس جا رہے ہیں۔ کوئی بارہ بجے تک لنگر اٹھ جائے گا۔ انشاءاللہ پھر شام کو احرام باندھا جائے گا اور "لبیک اللّٰھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک" کی صدائیں بلند کی جائیں گی اس وقت آپ پھر یاد آئیں گے اور خوشی کے ساتھ قلق بھی ہوگا۔ مگر اب شوق کی بیقراری بڑھ جائے گی۔ دیکھیے کیا کیفیت قلب پر طاری ہوتی ہے۔ ایک تو اور مسافروں کی دیکھ بھال سے فرصت نہ رہی کہ دھیان اسی میزبان کی طرف کیا جائے جس کے مہمان ہوکر ہم جا رہے ہیں۔ دعا کیجیے کہ عمرہ، حج اور زیارت روضۂ اقدس نصیب ہوں اور قبول ہوں۔ آمین۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ حکم آگیا کہ اٹھو، چلو۔ آخری کشتی اب جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ یہاں ان عربوں سے جو ملازم ہیں، خوب مزے دار باتیں ہوئیں۔ عرب اور باشندگان عرب کی محبت دل میں

اور بڑھ رہی ہے۔ خدا جلد اس قوم کا اور اسلام کا احیا کرے۔ سب کو سلام شوق خصوصاً ظفر الملک کو کہہ دیجئے کہ دیکھو بھائی ہمارے پیچھے نہایت احتیاط سے کام کرنا۔ قوم کو سنبھالنا اب آپ لوگوں کا کام ہے۔ بچوں کو پیار، گھر میں سلام شوق میری اہلیہ کا سلام بھی قبول فرمایئے اور گھر میں پہنچا دیجئے۔

والسلام - آپ کا پیارا بھائی

محمد علی"

وفد مئی میں روانہ ہوا تھا، اگست میں واپس آگیا۔ ارض حجاز میں محمد علی کو جو کچھ دیکھنا پڑا، خدا جانے ان سے دیکھا کیونکر گیا۔ ہر طرف ملکیت کی قہرمانی، ہر سمت نجدیت کی کرختگی۔ قبریں مسمار، دل غمگین، جمہوریت معدوم، شوریت بے نشان۔ بہت کچھ چیخے، چلائے اور جلسوں میں گرجے برسے روئے (تفصیلات کا اس ذاتی ڈائری سے کوئی تعلق نہیں)۔ اثر کچھ نہ ہوا۔ مرکز اسلام، اور اس طرح بالواسطہ سارے عالم اسلامی کی اصلاح حال کا آخری سہارا اسی موتمر سے وابستہ تھا، اسکا یہ حشر ہوا۔ دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ایک مرتبہ سخت غش آیا، اور آثار بالکل فالج کے سے طاری ہونے لگے —— حیرت ہے کہ جو فالج پانچ سال بعد جان لیوا ثابت ہوا، وہ اسی وقت کیوں نہ گر پڑا! اتنی شدید اور دل شکن مایوسیوں کے بعد زندہ سلامت واپس آجانا بس ایک کرشمۂ قدرت ہی تھا —— لوٹ کر آئے تو نہایت درجہ خستہ و مغموم، شکستہ دل و ملول۔

باب (۶۰)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱۲)

(ھمدرد۔ کامریڈ مرحوم)

عارف صاحب گو انگریزی سے ناواقف تھے، لیکن تھے کام میں خوب منجھے ہوئے۔ اور ہمدرد کے لیے بہت مفید۔ کام کرتے کرتے مشاقی آہی جاتی ہے۔ عقائد اور مذہبی مسلک میں البتہ مولانا سے مختلف تھے۔ مولانا کی سی دینی پختگی اور ایمانی جوش کی توقع عملہ کے ہر رکن سے کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ فروری سنہ ۲۶ء کے تیسرے ہفتہ میں مجھے دفعتہً خبر پہنچی کہ عارف صاحب ہمدرد سے الگ ہو گئے۔ میں نے اپنے تعلقات کے اعتماد پر معاً خط لکھا کہ "یہ غضب عارف صاحب آپ نے کیا کیا۔ کوئی ناگوار صورت پیدا ہوئی تھی تو کم از کم مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا" جواب ۲ر مارچ کا لکھا ہوا آیا۔ ان کے اور مولانا اور ہمدرد کے تعلقات پر پوری روشنی ڈالنے والا۔ اس لیے تمام و کمال درج ہوتا ہے:۔

"مولانائے محترم۔ وعلیکم السلام۔

جواب میں تاخیر ہوئی۔ اس کی وجہ آشفتہ خاطری تھی جو آج بھی مسلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے استعفاء دے دیا ہے۔ بے شک آپ کو شکوہ ہونا چاہیے کہ اتنا اہم معاملہ اور میں نے آپ سے مشاورت نہیں کی۔ مگر مولانا یہ واقعہ بالکل فوری ہوا۔ اور مقامی احباب میں

بھی کسی متنفس سے گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تک کہ رفقائے کار سے بھی میں نے ذکر نہیں کیا، بلکہ دوسرے دن آپ سے ذکر آیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مولانا نے ایک مضمون لکھنے کے لیے زبانی ہدایات دیں۔ میں نے مضمون لکھا اور دکھایا۔ حسبِ معمول پھر اس میں ترمیم و اضافہ کا حکم ہوا جو کیا گیا۔ مگر پھر جب کاپی ان کے پاس گئی تو مزید حک و اضافہ کیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کاپی پریس میں دیر میں جا سکی۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ بالکل غیر متوقع طریقہ پر ایک عتاب نامہ نازل ہوا جس میں بے توجہی، عدم احساسِ فرائض اور تن آسانی کے الزامات کا مورد ٹھیرایا گیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس کا بھی اظہار تھا کہ میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے پہلے ہی سے اخبار کے لیے بیکار سا ہوں گو مفت کی مجھے تنخواہ دی جاتی ہے اور محض میری پرورش منظور ہے۔ اس وقت وہ تحریر میرے پاس نہیں، جب آپ تشریف لائیں گے تو دکھاؤں گا۔ بہر حال وہ ایسی تحریر تھی کہ اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں مستعفی ہو جاؤں۔ چنانچہ تمام الزامات تسلیم کر کے نہایت نرم اور مودبانہ الفاظ میں میں نے اس مضمون کا استعفا بھیجا کہ جب آپ مناسب سمجھیں اور آپ کے حالات اجازت دیں، مجھ کو سبکدوش کر دیجیے۔ اس تحریر کا آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ اور چونکہ مولانا کی صحت اچھی نہیں ہے، اس لیے میں نے دوبارہ یاددہانی بھی نہیں کی کہ اس حالت میں ان کو پریشانی میں مبتلا کرنا مقتضائے انسانیت و شرافت کے خلاف ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا اصرار ایسے وقت میں کہ پہلے ہی سے اسٹاف کم ہے اور متواتر دو مہینے کے استعفا کے باوجود وہ نہیں ملا، مولانا کے لیے کسی قدر ضرور تکلیف کا باعث ہوگا۔ اور میں ذرہ برابر تکلیف دینی معصیت سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ اب میں بالکل برداشتہ خاطر ہو گیا ہوں۔ اور اس برتاؤ اور سلوک کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے۔ میں

دفتر والوں کی طرف سے پہلے سے سنا کی تھا مگر کبھی اس کا خیال نہیں کیا؛ اور یہ سمجھتا رہا کہ میرا معاملہ تو مولانا کے ساتھ ہے۔ وہ مجھ سے مطمئن ہیں، یہ کافی ہے۔ لیکن مولانا کی اس تحریر نے میرے حواس مختل کر دیے، اور میں ہر وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری حیثیت اس دفتر میں ایک ملازم کی سی ہے اور وہ بھی غیر محفوظ۔ حالانکہ ابتک میں اپنے آپ کو ہمدرد کا اور ہمدرد کو اپنا سمجھتا تھا۔

میں آج آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ آج سے کئی ماہ قبل ڈاکٹر کچلو نے مجھے تنظیم[1] اخبار میں پونے دو سو روپیہ تنخواہ پر علاوہ مکان کے بلایا تھا اور کئی طرف سے مجھ پر زور ڈالا گیا، مگر میں نے لکھ دیا تھا کہ میں اول تو آپ کی پالیسی سے متفق نہیں، اور اگر میری خاطر سے آپ اس میں کچھ تغیر کرنے کے لیے تیار بھی (جس کا اشارہ خط میں موجود تھا) ہوں تو میں ہمدرد کو اور محمد علی صاحب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا علم میرے رفقا کو ہے، کیونکہ بعض رفیقوں کو میں نے تنظیم کے بلاوے کا خط دکھا دیا تھا۔ یہ اس حالت میں میں نے کیا تھا کہ موجودہ تنخواہ میں میرا کسی طرح گزارہ نہیں ہوتا اور برابر مقروض ہوتا چلا جاتا ہوں۔ مگر کبھی تنخواہ کے متعلق ایک حرف میں نے نہیں کہا، اس لیے کہ ہمدرد کی جب پہلے ہی سے حالت مخدوش ہے تو میں کس منہ سے اضافہ کا مطالبہ کروں۔

بہر حال اب میں شوکت صاحب کا انتظار کر رہا ہوں کہ وہ آ جائیں تو پھر از سر نو میں اس معاملہ کو چھیڑوں اور یکسوئی حاصل کر لوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو تنخواہ مجھے ہمدرد سے ملتی ہے اور وہ بھی دوسرے مہینہ، اتنی رقم تو میں آزادہ رہ کر اور اس سے بہت کم وقت صرف کر کے گھر پر پیدا کر سکتا ہوں۔ اس وقت بھی مجھے دو تین ماہوار و ہفتہ وار رسائل و اخبارات کام دینے کے لیے تیار ہیں، جن سے سو سے زاید وصول ہوں گے، اور یہ سب کام مشکل سے پندرہ روز

[1] ۲۴ء میں جب تحریک خلافت کو تنزل ہونے لگا تو مسلمانوں میں (خصوصاً صوبہ پنجاب میں) تبلیغ اور تنظیم کے نام سے دو تحریکیں بڑے زور و شور سے اٹھی تھیں، تنظیم کا مرکز امرتسر تھا، اور اس کے کرتا دھرتا ڈاکٹر سیف الدین کچلو (بیرسٹر) تھے۔ ان کے روزنامہ کا نام بھی تنظیم تھا۔

کا میرے کرنے کا ہوگا۔

یہ ہیں حالات مفصل داستان زبانی سنیئے گا۔

آپ کا خادم

عارف ہنسوی؟"

سنہ ۲۶ء بھی سال غم ہونے کی حیثیت سے محمد علی کے لیے سنہ ۲۲ء سے کچھ کم نہ تھا ——— اور سال مسرت ان کی ساری پبلک زندگی میں تھا ہی کون سا سال ——— سال شروع ہوتے ہی پہلے حجاز سے ان کے لیے نہایت درجہ دل شکن خبریں (بہ سلسلۂ اعلان ملکیت ابن سعود) آنا شروع ہوئیں۔ پھر مرشد اور محبوب مرشد کا انتقال ہوا۔ فروری میں ہمدرد سے عارف صاحب جو اس وقت تک بہ جبر کے روح رواں تھے، رخصت ہوئے۔ فروری میں خود بھی سخت بیمار پڑے کئی ہفتہ صاحب فراش رہے۔ اپریل تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر مئی میں حجاز جا کر جون و جولائی میں سرزمین حجاز میں اپنی آنکھوں سے ملکیت کے بڑے تکلیف دہ نظارے دیکھے۔ اور اگست میں جب ہندوستان واپس آئے، اس وقت سے لیکر برابر ہندی سعودیوں سے جنگ و جدال ہی میں مصروف رہے۔ خلافت کمیٹی کے اندر بھی اور باہر بھی، اور عین اسی زمانہ میں ایک بڑی ہی شدید اور طویل جنگ دہلی کے مشہور و صاحب اثر اہل قلم اور صوفی خواجہ حسن نظامی سے بھی چھڑ گئی۔ ——— یہ نظارہ بھی کتنا حسرت انگیز تھا کہ جس نے کام غیروں سے، بیگانوں سے، دشمنان اسلام سے جہاد کرنا تھا، اسکے بیش قیمت وقت اور قوت کا کتنا بڑا حصہ اپنوں ہی سے مقابلہ کرنے میں صرف ہو رہا تھا!

کامریڈ کا بند ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جنھوں نے کامریڈ کا زمانہ دیکھا نہیں ہے۔

اب انھیں کیا بتایا جائے، کہ کامریڈ کیا چیز تھی، اور کن الفاظ میں سمجھایا جائے کہ اس کے نکلتے رہنے کے کیا معنی تھے۔ اور اس کے بند ہو جانے کے کیا معنی ہوئے۔ اس ڈائری کے نمبر (۳۰) میں کامریڈ کے خاتمہ کا ذکر آچکا ہے۔ آج دو چار سطریں اور سہی۔ ۱۴-۱۵ سال قبل یعنی ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۲ء میں کامریڈ کی زندگی گویا سارے مسلمانانِ ہند کی تعلیم یافتہ جماعت کی زندگی تھی۔ ایک روح تھی جو ساری قوم کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ علم و ادب، سیاسیات و اصلاح معاشرت، زبان و انشا پردازی، حریت و جمہوریت، شوخی و ظرافت، ہنسی دل لگی، سب ہی کے نمونے، اس کے صفحات میں درج، ہر سامان اس میں موجود۔ اس وقت کامریڈ "مسٹر" محمد علی کا تھا۔ اب محمد علی "مولانا" ہو چکے تھے[1]۔ جیل ہو آئے تھے۔ برسوں کی نظربندی اٹھا چکے تھے۔ سوٹ، بوٹ، ہیٹ کے بجائے اب کھدر پوش تھے۔ کلام مجید کے نیم حافظ ہو چکے تھے۔ صاحب ریش تھے۔ اُس وقت ۳۰-۳۲ سال کے تنومند جوان تھے۔ اب ۵۰ سے اوپر ادھیڑ سن کے ہو چکے تھے۔ جوان چہیتی بیٹی کی موت، نازبردار و فرشتہ سیرت ماں کی موت، کامریڈ کے مقالہ نگار خصوصی ولایت علی (بمبوق) کی موت، سب اڈیٹر غلام حسین کی موت، شکست خلافت کا جانکاہ غم، غازی عبدالکریم ریفی کی اسیری کا الم۔ سلطان ابن سعود کے نقض عہد کا صدمہ، ایک نہیں متعدد رفیقوں کی بے وفائیوں کا داغ۔ قومی صدمہ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مالی پریشانیاں پیہم و شدید جسم کو گھلا دینے والا مرض، ذیابیطس، تو وہ اگلا سا ہنسوڑ پن بھلا اب کہاں سے لا سکتے تھے۔ پھر بھی کامریڈ ایک زندہ اور زندگی بخش قلم کا پرچہ تھا۔ جب تک خود زندہ رہا، خدا معلوم کتنوں کو زندگی بخشتا رہا۔ ناغہ کر جانے کا معمول تو عین اوج و شباب کے زمانہ میں بھی تھا، اور اب تو ناغوں کی حد ہی نہ رہی تھی۔ قدردان پھر بھی چھوڑنے پر

[1] آئندہ نسلوں میں اس فرق کو سمجھنے والے اور اس تفریق سے لطف اٹھانے والے بھی کم رہ جائیں گے۔

آمادہ نہ تھے۔ جسے ایک دفعہ چسکا پڑ گیا، بس اس کا ہفتہ اور عشرہ اور مہینہ انتظار ہی کرتے گزرتا۔ ۲۰ر جنوری کی تاریخ کا پرچہ جب ۱۰ر دسمبر کے بعد شروع فروری میں نکلا، تو اس وقت کون جان سکتا تھا کس کو یہ علم غیب حاصل تھا کہ کامریڈ کی زندگی کی یہ بالکل آخری سانس ہے، اور اس نمبر کے بعد اس کا کوئی نمبر دیکھنے میں نہ آئے گا! ـــــــــــ رہے نام اللہ کا۔ انسان ضعیف البنیان کی کسی چیز میں ثبات و بقا ہے؟ آج یہ ایک محض قصۂ ماضی اور داستان پارینہ۔ اس وقت یہ قصہ کہانی نہ تھا۔ کامریڈ ایک زبردست، متحرک، زندہ و فعال قوت تھا۔ دنیا کو بھول جانے دیر ہی کیا لگتی ہے ؎

فلک مصروف ہے پیہم نیا نقشہ بچھانے میں
زمیں کو دیر کیا گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں

باب (۶۱)

۱۹۲۶ء (۱۳)

"زرا عمر رفتہ کو آواز دینا"

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے جلد جلد ہوتے اور عموماً دہلی ہی میں، زیادہ تر محمد علی کے ہاں اور کبھی کبھی حکیم صاحب کے ہاں۔ میں اکتوبر ۲۵ء میں نیا نیا ممبر مرکزی کمیٹی کا بنا تھا، کچھ تو تازہ جوش و شوق اور کچھ محمد علی کی ذاتی کشش، ہر بار ۱/۲ ۳ سو میل کے فاصلہ سے دوڑ کر دریاباد سے دہلی آتا۔ محمد علی کام سے پسے ہوئے، مخالفوں سے گھرے ہوئے، قلب رنجور، جسم محنت سے چور چور، میری حاضری سے باغ باغ ہو جاتے، اور کچھ دیر کے لیے گویا چھٹی منانے لگتے ـــــــ ایک قرۃ غالباً آخر ۲۵ء کا دسمبر تھا، جو میں آیا۔ رات کو پہنچا۔ دوسرے دن محمد علی نے دن بھر کی چھٹی اپنے دفتر سے لے لی، سیر و تفریح کو ترسے ہوئے تھے، کسی سے موٹر مانگ (غالباً ڈاکٹر انصاری سے مانگی ہو گی) اپنی برقع پوش بیگم صاحبہ اور مجھ کو اور مولانا عرفان کو ساتھ لے، شہر کے باہر نکل گئے۔ پہلے درگاہ حضرت نظام الدینؒ اور پھر قطب صاحبؒ کے ہاں کچھ وقت گزارا۔ ناشتہ کچھ ساتھ تھا، کچھ وہاں خرید کر کھایا پیا۔ مزارات پہ فاتحہ پڑھی مسجد میں نمازیں پڑھیں۔ لوگ ہر جگہ گھیر لیتے تھے۔ یہ بھی مجاوروں سے اور سب سے گھل مل کر باتیں کرتے۔

محمد علی کے ملنے والے سیکڑوں نہیں، ہزار در ہزار تھے، اور دور بیٹھے ہوئے عقیدتمندوں

شیدائی تو لاکھوں تھے لیکن سابقہ اور تعلق کے بعد مخلص اور راز دار ہو جانے والے دوست بہت ہی کم تھے، اور آخر آخر تو شاید دو ہی چار رہ گئے تھے۔ بہر حال ان چند میں ایک مولانا محمد عرفان تھے، صوبۂ سرحد کے رہنے والے لیکن اب تو دہلی ہی کے ہو گئے تھے۔ جمعیۃ العلماء کے عہدہ دار بھی۔ محمد علی نے ان سے تنہائی میں خود جمعیۃ اور اس کے بعض اونچے عہدہ داروں سے متعلق جس طرح کھل کر باتیں کیں، اس کی تو مجھے توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی ——— بیگم صاحبہ کی معیت و رفاقت کچھ نئی نہ تھی۔ میاں بیوی میں میل محبت شروع ہی سے بہت تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیے کہ عشق کی کیفیت تھی۔ عشق ویسا نہیں جس میں سوزش اور شورش ہو، اور جو تمام تر جوانی کے قویٰ کی پیداوار ہوتا ہے، بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے، اور عربی میں اس کے لئے لفظ "انس" ہے۔ محمد علی کہا کرتے تھے "اب بغیر انھیں ساتھ لیے مجھ سے کہیں جایا نہیں جاتا۔ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے، خواہش نفس عنقا ہوتی جاتی ہے۔ اور بیوی کے ساتھ خالص محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ بیوی سے تمھیں تسکینِ خاطر حاصل ہو گی، اس کے معنی اب جا کر سمجھ میں آئے ہیں"

بیگم محمد علی رہیں ہمیشہ برقع میں، اور پورے شرم و لحاظ کے ساتھ۔ چہرہ نقاب سے چھپا ہوا۔ لیکن رہتیں ہر جلسہ میں، ہر سفر میں، ہر مجمع میں، خلافت کانفرنس میں، برابر ساتھ ساتھ۔ اور جلسوں کی کارروائیوں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لے لیا کرتیں۔ عورتوں کے مجمع میں تقریریں بھی کبھی کبھی کر دیتیں، اور دو ایک بار مردوں کے جلسوں میں بھی بول دیں[1] ——— تجدد کے دور میں بھی ہوئی "روشن خیال" بیویاں کاش بی اماں مرحومہ (مولانا کی والدہ ماجدہ) اور ان امجدی بیگم صاحبہ کی مثالوں سے سبق لیتیں کہ قومی کاموں کے لیے بیحیائی کیا معنی، بے پردگی بھی ہرگز لازمی نہیں۔ آئینِ حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی سارے قومی کام بے تکلف انجام پاتے رہتے۔

[1] انتقال ۵ مارچ ۱۹۴۷ء (ن م)

محمد علی کی مہانداری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا، خاطرداریوں کو حدِ اسراف تک پہنچا دیتے، کھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زاید، اور ان کی جیب کی گنجایش سے بھی زائد۔ حق گوئی و حق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے کھانا تو جانتے ہی نہ تھے، اور پھر کھانا بھی "نانِ جویں" اور "نمک طعام" نہیں، دسترخوان اچھا خاصہ چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں، طرح طرح کے لذیذ پُرتکلف نمکین اور میٹھے کھانے، کبھی مرغ کبھی مچھلی۔ خشک میوے، تازہ پھل، خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کرکرکے کھلاتے۔ اس سب کے باوجود ۱۹۲۵ء میں جب مولانا شوکت علی نے خود ہی یا ان کی تحریک سے "دوشنبہ فنڈ" کھولا، اور یہ قرار دیا کہ ہفتہ میں ایک دن، دوشنبہ کو مسلمان اپنا کھانا صرف چٹنی روٹی رکھیں، اور اس روز کھانے کے خرچ میں جو کچھ بچت ہو اسے جمع کرکے ہر مہینہ یا ہر تیسرے مہینہ خلافت فنڈ کی نذر کرتے رہیں، تو محمد علی نے اس قاعدہ پر سختی سے عمل شروع کردیا۔ کہاں تو روزمرہ شوقینی کا یہ عالم تھا اور کہاں دوشنبہ کے دن واقعی دسترخوان کی حد تک خشک زاہد بن جاتے ——— دوشنبہ کے دن ان کے ہاں کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ داماد، بھتیجے، بھانجے، دفتر کے منشی، یہ، وہ، کھانے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد روزمرہ ان کے دسترخوان پر ہوتی۔ آج کوئی صاحب بیماری کا بہانہ کرکے، کوئی صاحب کوئی اور عذر تراش کے، غرض سب ان کے دسترخوان سے کھسک جاتے، اور ان سے چھپ کر الگ الگ اپنے روزمرہ کے کھانوں کا انتظام کرلیتے۔ محمد علی اکیلے بیچارہ اپنے عہد کی پابندی کرتے۔ اور یہ کوئی معمولی مجاہدہ نہ تھا۔

کھانے میں بے احتیاط و بد پرہیز تھے۔ لیکن آخر میں ذیابطیس سے معذور ہوکر مٹھائی وغیرہ

سے ایک حد تک پرہیز کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کو پرہیزی کھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے لیے وہی ترمال اور "مرغن" غذائیں بدستور۔ جاڑوں میں ماش کی کھچڑی ضرور آتی۔ بہ افراط گھی کے ساتھ۔ میں جب جاتا، ہر مرتبہ اصرار کر کے وقت سے زیادہ روکنے کی کوشش کرتے۔ چلتے وقت ہمیشہ ایک معرکہ پیش آتا۔ ہنسی خوشی کبھی رخصت نہ کرتے۔ ایک دفعہ تو ان کی نظر بچا کر، بھاگ کر آنا پڑا تھا۔ میری ٹوپی اور عینک حضرت نے قرق کرلی۔ سمجھے یہ تھے کہ بغیر ان کے سفر کیسے کرسکوں گا۔ مجھ ضدی کے لیے یہ چیزیں بھی روک نہ بن سکیں۔ جب دوبارہ ملنا ہوا (غالباً لکھنؤ میں) تو لگے معذرت کرنے کہ "تمھیں عینک کے بغیر سخت تکلیف ہوئی ہوگی"۔ ایک بار عاجز آکر میں نے یہ ٹھان لی کہ اب ان کے ہاں ٹھہرا ہی نہ کروں گا، ہر دفعہ مورچہ بندی کون کرے۔ پھر جو دہلی جانا ہوا تو اسٹیشن سے سیدھا خلافت کمیٹی کے دفتر گیا۔ مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی شہر کمیٹی کے سکریٹری تھے، ان سے کہا کہ "ابکی آپ کا مہمان ہوں، آخر جلسۂ خلافت ہی کے لیے تو آیا ہوں"۔ وہ بیچارہ بڑی بدحواسی کے ساتھ بولے "میری مجال ہے جو ٹھہرا سکوں، مولانا محمد علی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ ہار کر اور پچھتا کر پھر وہیں آنا پڑا۔ بہت بگڑے "مجھ سے بھاگنا چاہتے تھے"!

—— اپنے سے چھوٹوں اور نیازمندوں کے ساتھ اس شفقت و محبت، تعلق خاطر کی مثالیں اب کہاں دیکھنے میں آئیں گی۔ محمد علی گاندھی جی نہ طبعاً تھے، نہ عقیدۃً ان کے مسلک عدم تشدد اور اہمسا کے قائل۔ تشدد کے قائل بھی تھے، اور اس پر عامل بھی۔ متشدد غصہ میں بھی تھے اور محبت میں بھی۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس "تشدد" وانہ عدم تشدد" میں کیسی حلاوت کیسی دلآویزی، کیسی محبوبیت تھی!

ڈائری سنہ ۳۲ء اور شروع سنہ ۳۳ء کی لکھی ہوئی اس مقام پر ختم ہوگئی نظر ثانی کے

وقت ۱۶، ۱۷ سال بعد بہت کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا کہیں کہیں ادل بدل کی۔ بہ حیثیت مجموعی اتنے حصہ کا حجم سمجھنا چاہیے کہ پہلے سے ڈیوڑھا بلکہ دونا ہو گیا۔ پھر بھی نقشِ اول تو وہی پرانا تھا جب واقعات حافظہ میں تازہ تھے اور محمد علی کو دنیا سے اٹھے ہوئے سال ہی ڈیڑھ سال ہوا تھا۔ اب آگے سے ڈائری کے اوراق بالکل "نو تصنیف" ہیں ——— اب ۱۹۴۸ء میں نہ شوکت علی زندہ نہ بیگم محمد علی، نہ مولانا کے مخلص دوست مولانا عرفان اور نہ قاسم حسن بدایونی۔ نئے ملک "بھارت" کی فضا بھی ہر مومن کے لیے اتنی ناسازگار اور ماحول بھی اتنا نازک، کہ

بات پر وان زبان کٹتی ہے

اور جی یہی کہنے کو چاہتا ہے کہ

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

باب (۶۲)

۱۹۲۶ء (۱۴)

(مجلس خلافت کی جھلکیاں)

اگست کی کوئی تاریخ تھی جب معلوم ہوا محمد علی بعد حج پہلی بار لکھنؤ آرہے ہیں۔ دوڑا ہوا لکھنؤ پہنچا ــــــــ ایک بار اس سے قبل اخبارات میں یہ پڑھ کر کہ کراچی جہاز فلاں تاریخ کو پہنچے گا، اور اس کے حساب سے وہ فلاں دن دہلی آجائیں گے، فرط شوق میں دہلی بھی جاچکا تھا۔ رات بھر کے سفر کے بعد دہلی پہنچا تھا کہ اسٹیشن ہی پر ہمدرد خرید کر اور اس میں یہ خبر پڑھ کر کہ مولانا کراچی میں رک گئے ہیں، معاً پہلی ہی ٹرین سے واپس ہوگیا۔ اور دن بھر کے سفر کے بعد آدھی رات کو دریاباد واپس پہنچا تھا ــــــــ محمد علی میں کشش یوں ہی میرے لیے کیا کم تھی، اور اب کی تو وہ حاجی و زائر ہوکر اور سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر واپس آرہے تھے۔ بیوی علیل اور زیادہ علیل تھیں، انھیں چھوڑ پچھلی رات ہی کو لکھنؤ چلا، اور دہلی کی ٹرین آنے سے قبل صبح تڑکے لکھنؤ پہنچ گیا۔ اب کی معانقہ حاجی محمد علی سے اور زیادہ طویل اور گرماگرم رہا۔ اسٹیشن سے محمد علی حسب دستور فرنگی محل چلے، وہیں ناشتہ ہوا۔ اور راستہ بھر خوب باتیں رہیں۔ ناشتہ کے بعد ۹½ پر قیصر باغ مہاراجہ محمود آباد کے ہاں آئے۔ مہاراجہ سر علی محمد خاں کی ذات بھی عجب مرکزیت وجاذبیت

رکھے ہوئے تھی۔ بڑے ہمدرد ملت، بڑے فیاض، انتہائی مہمان نواز۔ لیکن بہرحال ایک رئیس اور راجہ، اور مذہباً شیعہ۔ اس وقت تک شاید یو۔ پی گورنمنٹ کے ہوم ممبر بھی تھے۔ مسئلہ حجاز میں چند ماہ قبل تک تو محمد علی کے مسلک کے اچھے خاصے مخالف اور فرنگی محل و خدام الحرمین کے ہمنوا تھے۔ اور اب بھی پوری طرح محمد علی کے ہم مسلک نہ تھے۔ البتہ ذاتی تعلقات محمد علی سے بہت قدیم تھے۔ ہر تولہ کامریڈ کی امداد بھی کرتے رہے تھے۔

اب راجہ صاحب کا ڈرائنگ روم تھا، اور محمد علی۔ سیاسیات حجاز و عالم اسلامی پر جو گفتگو انھوں نے شروع کی، دلچسپ بھی اور بصیرت افروز بھی، وہ جلد کیوں ختم ہونے پر آتی۔ اب یاد بھی کسے۔ صرف ایک دو فقرہ نہ بھولنے والا لوح حافظہ پر نقش رہ گیا۔ محمد علی ذکر سلطان اور اہل نجد کی تنگ ذہنیت اور عدم مسالمت کا کر رہے تھے۔ اس میں بولے کہ "میں نے ابن سعود سے کہا کہ حرم مکہ پر حق ہر کلمہ گو اور اہل قبلہ کا یکساں ہے۔ یہ حق تنہا نجد کے فرقہ بلکہ محض اہل سنت کا بھی نہیں۔ یہاں تو اہل ضلالت کو بھی اپنے اپنے طریق پر عبادت کا حق حاصل ہے۔ شیعوں کو میں ضلالت پر سمجھتا ہوں لیکن انھیں بھی یہاں آکر اپنے طریق پر حج و زیارت کے رسوم ادا کرنے کی آزادی حاصل ہونا چاہیے۔"
شیعہ رئیس سے خود اسی کے مکان پر گفتگو میں شیعیت کو صراحت کے ساتھ "ضلالت" کہہ ڈالنا، یہ حق گوئی اور صاف بیانی محمد علی ہی کا حصہ تھی۔ سامنا لندن میں (وفد خلافت کے موقع پر) برطانیہ کے باجبروت وزیر اعظم لائڈ جارج کا ہو تو، مکہ معظمہ میں سلطان ابن سعود کا ہو تو، ہندوستان میں کسی رئیس کا، کسی حاکم کا، کسی عزیز قریب کا، کسی مخلص دوست کا، کسی محترم لیڈر کا ہو تو، وہ کسی حال میں، دل میں آئی ہوئی زبان پر لانے سے نہ چوکتے، اور جو بات

بھی اندر ہوتا اسے باہر لانے سے نہ رکتے۔ اس ایک زبان نے خدا معلوم کتنوں سے انھیں لڑا دیا، کتنوں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ لوگوں سے اچھی خاصی دوستانہ باتیں خوش مزاجی اور لطائف و ظرائف کے ساتھ کرتے ہوتے، ہنستے جاتے، ہنساتے جاتے، کہ یک بیک جنگ بھی شروع ہو جاتی: یہ منظر ایک دفعہ کا نہیں، بارہا کا دیکھا ہوا ہے ——— ایک حدیث نبویؐ میں حضرت عمرؓ کے فضائل میں ایک جگہ آیا ہے کہ حق گوئی کی عادت نے عمرؓ کا کوئی دوست باقی نہ رکھا۔ اس کی عملی تصدیق، ایک چھوٹے پیمانہ پر، محمد علی کی زندگی سے ہو جاتی تھی!

باتیں راجہ صاحب کے کمرہ میں اسی انہماک کے ساتھ ہو رہی تھیں کہ ایک خبر دینے والے کی اطلاع پر میں باہر نکل آیا۔ دیکھا تو اپنا پرانا ملازم و رفیق ہاتھ میں تار لیے کھڑا ہے۔ تار دریاباد سے تھا۔ ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ بیوی کو بیمار اور زیادہ بیمار چھوڑ کر محض محمد علی کے شوق زیارت میں لکھنؤ چلا آیا تھا۔ تار میں یہ تھا کہ ان کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی ہے، غش پر غش آ رہے ہیں۔ زمین پیروں کے نیچے سے سرکتی معلوم ہوئی۔ "پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا صحیح موقع۔ نہ دل کو یہ گوارا کہ محمد علی کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اور نہ یہی بن پڑتا کہ محبوب بیوی کو اس حال میں اتنی دور پڑا رہنے دوں۔ محمد علی نے تار پر نظر کی، اور معاً بولے "آپ ہرگز نہ رکیے" فوراً روانہ ہو جائیے۔ اللہ بیچاری کو جلد شفا دے۔ یہاں ہم سب لوگ دعا کریں گے ——— میں خود بھی شاید اس سے زیادہ بیتاب نہ ہوا ہوں جتنا بیقرار محمد علی ہو گئے۔ ہمدردی، محبت، غمگساری کا تو یہ شخص پتلا تھا۔ قطب میاں صاحب فرنگی محل (محمد علی کے میزبان) پاس بیٹھے ہی ہوئے تھے۔ ان بیچارہ نے فوراً اپنا موٹر پیش کر دیا، اور میں اسٹیشن کے لیے چل پڑا۔ اور اپنے عقیدہ میں تو ایک بڑی حد تک محمد علی ہی کی مخلصانہ دعاؤں کا اثر سمجھتا ہوں کہ بیوی کی جان بچ گئی اور

چند روز بعد صحت حاصل ہوگئی۔

ستمبر میں خلافت مرکزی کمیٹی کا جلسہ حسب معمول دہلی میں ہوا، اور یہ جلسہ بڑے معرکہ کا تھا۔ محمد علی کی مخالفت پر بزرگان پنجاب تیار ہو کر آئے تھے، اور خبر گرم تھی کہ اسی جلسہ میں محمد علی کے پرزہ اڑا کر رکھ دیئے جائیں گے ـــــــ ب خلافت کا کون سا جلسہ معرکے کا نہیں ہوتا تھا؟ اور کس میں یہ خبریں گرم نہیں ہوتی تھیں؟ ـــــــ جلسہ میں پنجاب کے ایک معزز رکن خلافت نے جو ایک اہل حدیث عالم دین کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے، سوال کیا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آپ کی زمانۂ حج میں مولانا محمد علی نے صحن حرم میں بیٹھ کر سلطان ابن سعود کو گالیاں دیں (یا برا بھلا کہا)؟ سوال سنکر جلسہ بھر کے کان کھڑے ہوگئے۔ اور محمد علی کے ہمدرد و بہوا خواہ دل میں فکرمند ہوگئے، کہ دیکھئے اب کیا جواب ان سے بن پڑتا ہے۔ مگر محمد علی بغیر کسی فکر و اندیشہ کے شائبہ کے برجستہ بولے، کہ جی نہیں، واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود کو گالیاں صحن حرم میں نہ میں نے بیٹھ کر دیں، نہ لیٹ کر، نہ کھڑے ہو کر، نہ اور کسی وضع و ہیئت سے! اس جواب کا ادا ہونا تھا کہ محفل میں قہقہہ پڑ گیا اور معترض صاحب بیچارہ بجھ سے گئے۔

چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر بھی لوہے لگ جاتے تھے۔ ایک مستقل پارٹی تل کر آئی تھی کہ محمد علی کی مخالفت قدم قدم پر کرے گی اور یہی ہوا کرتا۔ بے بات کی بات پیدا ہو جاتی۔ نزاع لفظی شروع ہو جاتی، اور پھر نوبت سخت سے سخت ذاتی حملوں کی آنے لگتی۔ یہ حقیقتہً انتہائی درد انگیز تھی، کہ جو وقت اور جو وقت مفاد ملی کے ٹھوس اور تعمیری کاموں میں صرف ہونا تھا، اس کا بڑا حصہ اس آپس ہی کے سب و شتم، طنز و تعریض کی نذر ہو جاتا ـــــــ یہ اور بات ہے کہ تقریباً ہر معرکہ میں آخری بات مولانا اور ان کے مخصوص اور رفیقوں ہی کی غالب رہتی، اور

عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو مولانا کے مدنظر ہوتا۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں عموماً اس کے صرف ممبر ہی شریک ہوتے لیکن کوئی خاص ممانعت باہر کے لوگوں کے لیے نہ تھی۔ اس لیے کبھی کبھی کچھ غیر لوگ بھی تماشائی کی حیثیت سے آ بیٹھتے۔ آج کے جلسہ میں ممبروں کو ایک دوسرے کی زبان سے اپنی تفضیح کے سننے کا اور زیادہ خیال تھا۔ اس لیے دل سب کا یہی چاہتا تھا کہ آج کی محفل اغیار سے بالکل خالی ہو۔ لیکن خود یہ کہنے کے لیے بھی ذرا ہمت کی ضرورت تھی۔ جو ممبر کہتا اس کی بدنامی رکھی ہوئی تھی۔ ایسی ایسی بدنامیوں کی پروا محمد علی کو کب تھی۔ وہی جلسہ سے اٹھ کر گئے، اور دو زیرک حضرات سے کہا کہ "آپ لوگ براہ کرم باہر تشریف رکھیں، ہم لوگ آج کے جلسہ میں کسی غیر کی موجودگی نہیں چاہتے۔" بیٹھے ہوؤں سے کوئی اٹھ جانے کو کہے تو طبعاً یہ چیز گراں ہی گزرتی ہے، چہ جائے کہ ہم لوگوں کو جو تکلیف کے عادی ہیں اور ایسی فرمائش کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے دو کھدر پوش سب سے قریب بیٹھے ہوئے تھے، اور وہی براہ راست اس حکم کی زد میں آئے۔ ان دو میں سے ایک صاحب جامعی تھے، اور مولانا سے قرب و تخصیص کا تعلق رکھنے والے۔ قدرۃً ان پر اس حکم کی تعمیل گراں گزری۔ اور قریب تھا کہ چہرہ کے آثار انقباض احتجاج کی کوئی عملی شکل اختیار کریں کہ معاً ان کے رفیق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، اور بڑی خندہ جبینی کے ساتھ انھیں لیے باہر چلے گئے ـــــــ ان رفیق صاحب کے چہرہ پر عجیب قسم کی نورانیت برس رہی تھی۔ داڑھی کے بالوں کے سیاہ ہونے کے باوجود نورانیت۔ (نورانیت سفیدی کے مرادف نہیں)، "نورانیت" کا لفظ بے محل و مبالغہ آمیز معلوم ہو رہا ہو تو جانے دیجیے، شرافت دیکھیے۔ خوب سفید براق کھدر کی شیروانی پہنے ہوئے

چہرہ پر نوعمری کے باوجود خاصی اور خوشنما داڑھی۔ دبلے پتلے، کسی قدر کشیدہ قامت، بشرہ پر ذہانت، متانت، انکسار و خودداری کے آثار بہ یک وقت نمایاں۔ میرے باہر نکلتے ہی ان سے تعارف ہوا۔ معلوم ہوا، جامعہ کے نامزد شدہ پرنسپل۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم، اے پی، ایچ، ڈی ہیں۔ جرمنی سے ڈگری لے کر ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ جو شخص آگے چل کر ملک و ملت میں بڑائی اور بڑی بڑائی حاصل کرنے والا تھا، اس میں بڑائی کی صلاحیتیں اس وقت سے نمایاں تھیں ——— کیا ہرج ہے اگر اس ڈائری کے اوراق میں محمد علی ہی کے ضمن اور ذیل میں محمد علی والوں سے بھی بے تکلف تعارف ہو چلے!

* * *

باب (۶۳)

۱۹۲۶ء (۱۵)

(حربِ عقائد کا تماشہ)

محمد علی کی زندگی ہی مخالفتوں میں کٹی تھی۔ آج اس سے جنگ، کل اُس سے جنگ۔ سِن جوں جوں بڑھتا گیا، مخالفتوں کا ہجوم بھی ترقی کرتا رہا۔ سنہ ۲۶ء میں یہ مخالفتیں پورے شباب پر پہنچ گئیں۔ سلطان ابن سعود والیِ حجاز سے حجاز کے معاملہ میں مولانا کو اختلاف ہوا، اور سلطان چونکہ اتفاق سے حنبلی تھے، یعنی عقائد و فقہیات میں بڑی حد تک اہلِ حدیث کے ہم مذہب، اس لیے ہندوستان کے اہلِ حدیث نے سلطان کے مخالف کو اہلِ حدیث کا مخالف سمجھ لیا۔ اور اب صورت یہ ہوئی کہ ہندوستان کے سارے اہلِ حدیث محمد علی کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھنے لگے ——— گویا محمد علی بھی کوئی زبردست "بریلوی" یا کسی حزب الاحناف کے صدر، یا مقلدوں کے کوئی امام و مقتدا تھے! حالانکہ اس غریب کو مذہبیات کے ان جزوی اختلافات کی طرف توجہ کی بھی کہاں فرصت تھی! لیکن یہ الزام ان پر تھوپ گیا تھا۔ اور اب خود ان ہی کے الفاظ میں تمام "غیر مقلد مقلدین ابن سعود" ان پر ہر طرف سے نرغہ کیے ہوئے تھے۔ اخبارات ان کے مخالف، جلسوں میں ان کی مخالفت، فتوے ان کے خلاف نکل رہے ہیں۔ اس مخالفت کی سیاسی امامت پنجاب کے مولوی ظفر علی خان صاحب کے ہاتھ میں، جو خود بھی کوئی

پیشہ ور مولوی نہیں، بلکہ علی گڑھ ہی کے اولڈ بوائے اور گریجویٹ اور مولانا شوکت علی کے ہم سبق تھے! لاہور کا کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار ان ہی کا تھا، اور وہ ہمدرد کو حریف سمجھ کر ہر وقت نیچا دکھانے کی فکر میں۔ اب ہمہ وقت ظفر علی خاں کی آویزش محمد علی سے۔ ہر محفل میں یہی تذکرے ہر جلسہ میں یہی چرچے ——— پچھلے نمبروں میں ان معرکہ آرائیوں کے کچھ نمونے تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب زیادہ سن کر اور دیکھ کر کیا کیجیے گا۔

* * *

اُدھر کے غالیوں کے جواب میں ادھر بھی اہل غلو کی کمی نہ تھی۔ اور بیسیوں جوابی انجمنیں ادھر بھی قائم ہو چکی تھیں۔ لکھنؤ کی انجمن خدام الحرمین نے ایک بڑا سا استفتا مرتب کر کے فتوی بنا دیا تھا کہ جب حالات ایسے پُرخطر اور ناخوشگوار ہو جائیں جیسے کہ سعودی حکومت نے کر رکھے ہیں تو حج کے لیے سفر کر کے جانا بھی درست نہیں رہے گا، اور جن پر حج واجب ہو چکا ہے وہ اپنے فریضہ کو اصلاح حال کے وقت کے لیے ملتوی کر سکتے ہیں ——— فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبدالباری صاحبؒ شروع سال میں انتقال کر چکے تھے، اس لیے اب غالیوں کو قابو میں رکھنے والی کوئی شخصیت رہی بھی نہ تھی۔ جو جس کے قلم نے چاہا بے تحاشا لکھ ڈالا بڑوں کے اٹھ جانے سے چھوٹوں کی یہ حالت ہو ہی جاتی ہے ——— محمد علی ہرگز اس حد تک نہیں گئے تھے۔ ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ اگر سعودی حکومت نے اپنی زیادتیوں کی اصلاح نہ کی اور ہر کوشش ناکام رہی تو بطور آخری چارہ کار کے ایک حربہ یہی ہے کہ عالم اسلامی کو التوائے حج کا مشورہ دیا جائے، اور اس طرح حکومت سعودیہ پر معاشی بار اور مالی دباؤ ڈال کر انہیں راہ راست پر لایا جائے لیکن عام مخلوق احتمال اور وقوع کے ان باریک فرق کو کیا سمجھتی اور کون چاہتا تھا کہ وہ سمجھے۔ ایک شور مچ گیا کہ محمد علی حج کو روک رہے ہیں! اب فتووں کی

کی ویرتھی۔ جو حج سے روکے وہ یصدون عن سبیل اللہ کا مصداق ہے، اور اس کے گنہگار نہیں بکافر ہونے میں کیا شبہ ہے؟ محمد علی اسلام پر مٹنے والا، اور دین کی خاطر زندہ رہنے والا اب مرتد تھا، خارج از ملت تھا، بیگانۂ اسلام تھا۔

اس کشمکش اور چپقلش سے مولانا کے نیازمند بھی کب بچ سکتے تھے، اور پھر یہ نیازمند خصوصی جو اتفاق سے اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ مولوی ظفرالملک علوی (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) بھی ان ہی لوگوں میں تھے جو حمایت ابن سعود میں غلو رکھتے تھے، اور ہماری خلافت کمیٹی کے خاص رکن بھی تھے۔ ان سے آویزش ناگزیر سی ہوگئی اور پھر سچ (صدق کا پرانا نام) کے مہتمم اور عقل کل بھی وہی تھے، مجھ ساعافیت پسند بھلا جھگڑوں کھیڑوں کا کہاں عادی۔ جی میں یہی آیا کہ سچ کی ایڈیٹری اور خلافت کمیٹی کی صدارت دونوں ہی سے استعفاء داخل کر دیا جائے۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں مولانا کو خط لکھا کر ان دونوں باتوں کی اجازت مرحمت ہو۔ اور مسئلہ التوائے حج میں بھی اپنے مسلک کی ذرا وضاحت فرما دی جائے۔ ہمدرد کے اسٹاف کے ایک صاحب کے ہاتھ ۲ نومبر کا لکھا ہوا خط موصول ہوا۔ اس میں یہ الفاظ تھے۔

(۱) التوائے حج کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ حال میں ہمدرد میں جو آرٹیکل لکھا گیا ہے اس کے بعد غالباً اب ان سوالات کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر اب بھی اس مضمون میں کوئی بات رہ گئی ہو تو آپ اپنے سوالات لکھیں، ان کا جواب دیدیا جائے گا۔

(۲) اودھ خلافت کمیٹی کے استعفے پر بہت ناراض ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ وقت نہیں کہ آپ اس طرح علیحدہ ہو جائیں۔ مخلصین کو "دل شکن" اور "حوصلہ فرسا" تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں، تو پھر کیا ان سے گھبرا کر کام چھوڑ دیا جائے؟

(۳) مولانا نے پیچ کے بند کرنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اور اسی مذاقیہ لہجہ میں ذکر فرمایا جو گذشتہ مرتبہ مرکزی کمیٹی کے جلسہ سے واپسی کے وقت تھا۔

(۴) مولانا آج کانپور جا رہے ہیں، ۲۰ نومبر کو واپس آجائیں گے۔"

کانپور میں اس وقت سالانہ جلسہ ندوۃ العلماء کا تھا، مجلس ندوہ کا شمار اس وقت تک ملک کی مشہور مجلسوں میں تھا، اور گو اس کی شہرت کا شباب مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا پھر بھی اس کے نام میں خاصی کشش تھی۔ اور گمنامی سے تو یہ ادارہ اب بھی بہت دور تھا۔ سالانہ جلسہ اسی کا تھا، اور کانپور کے نامی گرامی تاجر چرم حافظ محمد حلیم نے بڑی اولوالعزمی کے ساتھ سب کی مہمانداری کا انتظام کیا تھا۔ جلسۂ ندوہ کی صدارت ایک بڑے امتیاز کی چیز سمجھی جاتی تھی اور اس سال انتخاب کا قرعہ، دہلی کے طبیب نامور، اور وقت کے مشہور سیاسی لیڈر حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب کے نام پڑا تھا۔ مولانا کی شرکت کے بغیر اس وقت مسلمانوں کا ہر جلسہ سونا اور بیکار تھا۔ بڑے اصرار سے مولانا کی طلبی ہوئی، اور مولانا کچھ اپنے اس طبعی تقاضے سے کہ مسلمانوں کے ہر ادارہ، ہر مجمع تک تبلیغ و پیام رسانی کا موقع بہرحال مل جائے، اور کچھ دوستوں کی مروت سے بھی مجبور ہو کر کہ "آزردن دل دوستاں جہل است و کفارۂ یمین سہل" اپنے سو کام ہرج کر کے بہرحال دہلی سے کانپور آگئے، اور جلسہ میں تقریر کی، اور حسب معمول جلسہ بھر پر چھائے رہے۔

مدعو مولوی ظفر علی خاں صاحب بھی تھے۔ اور پبلک کو شوق ان کے اور مولانا کے مقابلہ کے دیکھنے کا ——— قوم میں "تماشہ پسندی" کا ذوق اس قدر رچا ہوا ہے کہ مرغ بازی کی سیر کی، اور بٹیروں کی پالی دیکھیں، لیڈروں کی ٹکر کا تماشہ دیکھ لیا ——— جدھر دیکھیے یہی سرگوشیاں کہ "اب کیا ہوگا، ادھر مولانا آگئے، ادھر ظفر علی خاں بھی تو آرہے ہیں" ندوہ کے

جلسہ کو ظاہر ہے کہ سلطان ابن سعود کی مخالفت یا موافقت سے نفیاً اثباتاً کوئی تعلق نہ تھا لیکن ہم لوگوں کے دماغوں کی رسائی اصولی بحثوں تک کہاں۔ یہاں تو مزہ بس اسی میں آرہا تھا کہ دو مشہور شخصیتوں کی آپس میں ٹکر ہو، اور ہر عامی کو اس پر رائے زنی کا موقع ملے!

مولوی ظفر علی خاں صاحب ہی تک بات رہتی جب بھی غنیمت تھا۔ حرب عقائد تو وہ بلا ہے، اور اپنے جزئیات عقائد میں غلو کا فتنہ تو وہ ابتلاء عظیم کہ جو لوگ بے شک مولانا کے خاص مخلصین میں تھے لیکن ساتھ ہی عقائد میں ہم زبان سلطان کے تھے، وہ تک بھی اب مولانا سے برگشتہ ہوگئے تھے، اور ان ہی مخلصین میں سے دارالمصنفین اعظم گڈھ کے بعض ندوی اکابر بھی تھے۔ مجھ جیسے نیاز مند طرفین کے لیے بڑا سخت وقت یہ تھا۔ سچ بھی چونکہ اپنے نرم انداز میں مولانا کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ حضرات خود سچ اور مدیر سچ سے بھی بدگمان ہو چلے تھے۔ ان اکابر سے اور مولانا سے آج عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور خیال تھا کہ شکایتوں کا دفتر کھلے گا، اور نوبت خاصی تلخیوں کی آجائے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں تک نوبت نہ آنے پائی۔ اور معاملہ معمولی گلے شکووں پر ختم ہو گیا ——

مولوی ظفر علی خاں صاحب کی آمد تو یاد نہیں پڑتی۔ مولانا کے بعد ظہر کے جلسہ میں تقریر کی حسب معمول پر زور اور دلچسپ۔ اور تقریر کے بعد ہی لکھنؤ کے لیے اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ یہ خاکسار بھی ہمرکاب ہوا۔ مولانا کو چلتے چلاتے عموماً دیر ہو ہی جاتی تھی، کچھ ایسی ہی صورت آج بھی پیش آئی۔ اور جب بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچے ہیں تو گاڑی آئے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی۔ اور انجن پانی لے رہا تھا۔

باب (۶۴)

۱۹۲۶ء (۱۷)

(زندہ دلی کا کرشمہ نئی فتنہ سامانیاں)

شروع نومبر کا سہ پہر، وقت آخر عصر کا، کانپور کا لق ودق اسٹیشن۔ جی آئی پی کا جھانسی لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے، کہ دو شخص موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اور اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں (رضاکاروں) کی مدد سے درجہ میں پھینک پھانک ایک سکنڈ کلاس میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آرہے ہیں۔ دونوں نووارد ٹھیٹھ ہندوستانی اسلامی لباس میں ملبوس۔ کھدر پوش، عبا پوش۔ داڑھیاں رکھائے ہوئے، ایک جو مخدوم تھا وجیہ اور جامہ زیب، دوسرا جو کچھ خادم سا تھا، کریہ المنظر اور بدقطع۔ دونوں صاحب بہادر ان نوواردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ سکنڈ کلاس میں بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ یا ریل کے بابو شاہی روزمرہ میں "دو آؤٹ" (Two Out) والے ہیں۔ خوش قطع نووارد نے اس رتبہ پر قبضہ جمایا جس پر "صاحب بہادر" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی اور گنگا کا پل بات کہتے آگیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑگھڑ کی آواز نکلی، ادھر صاحب بہادر دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ، چھیڑ کی ادا سے مسکرائے اور منہ بنا کر بولے (So This is) یہی گنگا مائی ہیں! طنز کا زور لفظ (Mother) پر تھا (Mother Ganges

اور طرز ہند و عقیدہ پر تھا، جو "صاحب" کے خیال میں عام ہندوستانی عقیدہ تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا، اور انگریزی زبان میں، انگریزی کے لب و لہجہ میں بولا "اچھا تو آپ سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟" یہ تڑاق سا جواب پا "صاحب" سناٹے میں آگئے ——— یہ تڑپڑ جواب دینے والا محمد علی تھا، اور اس کا ساتھی کہیئے یا تابع مہمل کہیے یہ ڈائری نویس۔

"صاحب" بیچارہ کو بھی گمان نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پہ پٹے رکھائے ہوئے، اور جسم پر ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائیکہ اتنی انگریزی کہ ایسا شستہ اور برجستہ جواب دے سکے! کچھ دیر غوط میں رہے۔ پھر ادھر سے منہ پھیر اپنے ہم جنس رفیق سفر سے گفتگو کرنے لگے اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ام۔ سی۔ سی نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ایسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محمد علی سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھے "دخل در معقولات معاف۔ آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں" اور لگے تفصیل و تشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی ہے۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا۔ اور گویا انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان ہونے لگی، فلاں سنہ میں گیند پھینکنے کا انداز یہ تھا۔ اور فلاں زمانہ میں بیٹ مارنے کا یہ۔ فلاں شہر کی زمین پر گیند یوں لگا کھاتا ہے اور فلاں شہر کی زمین پر یوں۔ بولنے والا اب گفتگو کیسی کر رہا تھا، یہ کہیے کہ کرکٹ کے فن پر کوئی انسائیکلو پیڈیا کا آرٹیکل فر فر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر حیرت سے دم بخود۔ کہ یہ عبا قبا والا ملا تو کرکٹ بازوں کا بھی استاد نکلا! ایک مرتبہ گھبرا کے بولے "آپ کو بڑے معلومات کرکٹ کے متعلق ہیں"۔

انھوں نے کہا کہ ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڈھی کو ایسے ہی معلومات ہوتے ہیں۔" "اچھا تو آپ علیگڈھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے"۔ "جی نہیں، میں تو معمولی کھلاڑی تھا، کپتان بڑے بھیا (big brother) تھے"۔ یہ 'big brother' کی اصطلاح مولانا شوکت علی کے لیے محمد علی ہی کی چلائی ہوئی تھی، اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب نے اپنے نزدیک بڑی پہیلی بوجھی، اور پکار اٹھے،

You Talk like Mohammad Ali

"یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں"! یہ جھٹ سے بولے

I am Mohamm Ali

"زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں"۔ صاحب کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھیں پھٹے اور نظر اسی کھدر پوش کے چہرہ پر جاتے ہوئے بولے اسے وہی محمد علی، جو مشہور علی برادران میں سے ہیں"۔ انھوں نے جھک کر جواب دیا۔

Yes, The yoanger and more sharp-Tounged of The Tow

"جی ہاں، وہی جو دونوں میں چھوٹا اور زیادہ زبان دراز ہے"۔

صاحب کو ابکی اپنی حیرت کے دور کرنے میں دیر سکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بے چین اور بیقرار، پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں، اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے یہ جو دیکھا، تو صاحب بہادر کو اور چھیڑنا شروع کر دیا۔ بولے، "یہ میرا نام سن کر اتنی گھبراہٹ کیوں، کیا یہ خیال ہے کہ علی برادران جہاں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں، تو بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں، تو اطمینان رکھیے۔ اطمینان دیکھ لیجیے (ہاتھ دکھا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں،

حملہ ومدہ کا تو خیال بھی دل میں نہ لایئے"۔ صاحب کے ہاتھ میں ٹائمس آف انڈیا کا پرچہ تھا جمبئی کا یہ مشہور انگریزی روزنامہ (Sheppard) نامی ایک انگریز کی اڈیٹری میں مولانا کا خاص طور پر مخالف تھا، اور روز کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتا رہتا تھا۔ اسے محمد علی کی طرف بڑھا کر بولے۔

"اچھا ان الزامات کا کیا جواب جو یہ روز آپ پر لگاتا رہتا ہے"۔ محمد علی نے پرچہ کو تو چھوا نہیں۔ بولے "اسے آپ ہی پڑھیے۔ میں پرچہ کو نہیں، پرچہ کے اڈیٹر کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ یہ آکسفرڈ میں میرے زمانہ میں تھا، مجھ سے پیچھے، آ آجاتا، اس کو اس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ (بھیڑیوں کے) گلے تو آپنے بھی بغیر گلہ بان کے دیکھے ہوں گے لیکن گلہ کے بغیر گلہ بان کا نادر وجود انہی حضرت کا ہے" ——— یہ سارا لطیفہ تھا (Shepherds اور Sheppard کی تجنیس لفظی پر! ——— گفتگو اس کے بعد آکسفرڈ پر چلی، پھر عام انگریزی معاشرت، خصوصاً نسوانی بے حجابی پر، یہاں تک کر لکھنؤ اسٹیشن آگیا۔

محمد علی تبلیغ سے کسی وقت بھی چوک جانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ سہی، اس انگریز کے سامنے انگلستان کی معاشری زندگی ہی کے مکروہ پہلو پیش کر دیے

سنہ ۲۶ ختم ہو رہا تھا، اور دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں، اور محمد علی کانگریس میں شرکت کیلیے گوہاٹی (آسام) گئے ہوئے تھے، کہ دہلی میں مشہور آریہ سماجی لیڈر شردھانند جی کو ایک پرجوش دیندار مسلمان قاضی عبدالرشید نامی نے قتل کر دیا۔ شدھی کی تحریک اور مسلمانوں کو مرتد بنانے میں یہ سوامی جی بہت آگے آگے تھے، مسلمان ان سے جلے ہوئے اور ان کے خلاف بھرے ہوئے تھے، یہاں تک کہ ایک نے ان پر ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ شردھانند جی کی حیثیت ایک مذہبی ہی پیشوا کی نہ تھی، وقت کے نامور سیاسی لیڈر بھی تھے۔ انتقام کی آگ جو ہندوؤں میں عموماً اور

آریہ سماجیوں میں خصوصاً بھڑکی، اس سے معلوم یہ ہونے لگا کہ اب کسی چوٹی کے مسلمان لیڈر کی بھی جان گئے بغیر نہ رہے گی۔ اب مسلم لیڈر تھا کون، جسے چھوٹے بڑے سب غیر مسلم بھی مسلم لیڈر سمجھ رہے ہوں؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہ تھا۔ ہر شخص نے محمد علی ہی کو سمجھا۔ اور ایک دو دن نہیں، ہفتوں یہی دھڑکا محمد علی کے سارے نیازمندوں کو لگا رہا کہ دیکھا چاہئے ان کی شہادت کی خبر کب آجاتی ہے۔ جب خاصی مدت گزر لی، تب اطمینان ہوا ——— دسمبر یا جنوری تھا، جب خلافت کی مرکزی کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے جلسے ہوئے، اور یہ طے پایا کہ خلافت کا آئندہ سالانہ اجلاس لکھنؤ میں آخر فروری میں منعقد کیا جائے، انتظامات کی ذمہ داری، کیا بہ حیثیت صدر ادوھ خلافت کمیٹی اور کیا بہ حیثیت صدر مجلس استقبالیہ، اسی ڈائری نویس کے سر پڑی۔ اور اپنے مذاق طبیعت کے بالکل برعکس ان انتظامی ذمہ داریوں کو منظور کرنا پڑا، زیادہ تر محمد علی ہی کی خاطر سے اور ان ہی کی مروت میں! اپنے دنیا کے دوستوں رفیقوں، بزرگوں میں اسوقت محبوب ترین ہستی اگر تھی تو محمد علی ہی کی تھی۔

باب (۶۵)

۱۹۲۶ء (۱۷)

(از مذہب من گبر و مسلمان گلہ دارد)

۱۹۲۶ء۔ آخری سہ ماہی کی کوئی تاریخ۔ مولانا آج سہ پہر کو دہلی سے لکھنؤ آرہے ہیں حسب دستور دریاباد سے چل کر، لکھنؤ اسٹیشن پر ان کے استقبال کو حاضر۔ گاڑی سے اترتے ہی بھرے پلیٹ فارم پر مجھ پر برس پڑے "کیوں صاحب، یہ سچ میں ایسے مضمون آنے لگے جو مجھے اور حسن نظامی کو ایک درجہ پر رکھ رہے ہیں" ـــــــــ خفگی کے پورے الفاظ سننے سے قبل اصل قصہ تو سن لیجئے! عین جس وقت ظفر علی خاں صاحب، اور پنجاب خلافت پارٹی اور ہندوستان کے اہل حدیث کے نرغہ میں مولانا گھرے ہوئے تھے، کہ دوسری جنگ پوری شد و مد اور انتہائی تلخی اور تندی کے ساتھ دہلی کے مشہور و معروف خواجہ حسن نظامی سے چھڑ گئی۔ خواجہ صاحب کے ہاں سے بہت معقول اجرتی کام ہمدرد پریس کو ملتا رہتا تھا۔ مولانا کو اپنے جوش حق گوئی میں مالی نقصانات کی پرواہی کب ہوتی تھی۔ اس جذبۂ حق گوئی کے آگے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو جیسے ہر وقت تلے بیٹھے رہتے تھے۔ محمد علی کے ہاں جوش اور جوش غضب بہت تھا لیکن وہ بہرحال اپنے کو معین حدود کے اندر مقید کیے ہوئے تھے۔ فریق مقابل قیود و حدود سے ہر طرح آزاد تھا۔ علاوہ اور رسالوں اور پرچوں کے ایک مستقل روزنامہ خواجہ صاحب نے

"غریبوں کا اخبار" کے نام سے محمد علی کی مخالفت میں نکال دیا اور چند روز تک خوب اس میں روزانہ ایک نئی پھلجھڑی چھوڑتے رہے۔ مثلاً کبھی یہ کہ میں دہلوی ہوں خالص دہلوی اور یہ محمد علی رامپوری ہیں، بیرونی ہیں، آفاقی ہیں۔ میں سید ہوں، اور فلاں فلاں بزرگ میرے اجداد میں ہیں محمد علی کا نسب نامہ اس کے مقابلہ میں بالکل مجہول ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دنیا کی شاید کوئی بڑی سی بڑی معصیت ایسی نہ ہو جس کا انتساب مولانا کی جانب نہ کیا گیا ہو۔

سچ (صدق کا نقش اول) میری ادارت میں شروع ۲۵ء سے نکل رہا تھا۔ اس کی سچی باتوں کے ذیل میں اس وقت کسی ہفتہ یہ لکھ دیا گیا تھا کہ مسلمان لیڈروں کے درمیان باہمی جنگ کب تک جاری رہے گی؟ اور ایک دوسرے کی کمزوریوں سے قطع نظر کرنا اور آپس میں رواداری و فراخ دلی کا برتاؤ کرنا آخر کب آئے گا؟ ملت کی یکجہتی کے لیے لازم ہے کہ اختلاف خیال و مسلک کے باوجود سب مسلم اکابر آپس میں متحمل ہوں، اور ایک دوسرے پر گند گی اچھالنا چھوڑیں۔ خواجہ صاحب کے حلقہ میں ایک بڑے مخلص و سنجیدہ شخص واحدی صاحب تھے۔ انھوں نے اس مصالحانہ مضمون کو الگ ایک ورق پر چھاپ کر دہلی میں اس کی بہ کثرت اشاعت کی۔ خواجہ حسن نظامی کا نام بھی لکھنے والے کے ذہن میں لکھتے وقت نہ تھا۔ لیکن دلی کی فضا میں اس کا تعلق اسی "عمل ختم خواجگی" سے سمجھا گیا۔ اور خیال یہ پھیلا یا پھیلایا گیا کہ سچ نے نرم و شستہ اور مہذب انداز میں ہمدرد و صاحب ہمدرد کو ٹوکا ہے ——— خفگی اسی سلسلہ میں تھی۔ اور اب وہ ڈانٹ پوری کی پوری بھی سن لیجیے، جو مدیر سچ پر اردو روشن مین لکھنؤ اسٹیشن کے بھرے پلیٹ فارم پر پڑ رہی تھی :۔

"یہ آپ بھی ان ہی لوگوں میں ہو لیے، جو آج تک حضرت علیؓ اور معاویہؓ میں فرق نہ کر سکے

یہ ٹھیک خوارج کی ذہنیت ہے۔ جنھوں نے کبھی تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی کہ حق پر کون اور ناحق پر کون۔ آپ نے بھی ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا شروع کر دیا۔ محض صلح کرو، صلح کرو، کی رٹ لگا دی۔ یہ نہ دیکھا کہ کون کس پر کتنی زیادتی کر رہا ہے۔ مجھے اگر آپ ناحق پر پاتے ہیں تو ضرور ٹوکیے، کھلے اور صاف لفظوں میں ٹوکیے، لیکن پہلے تحقیق کیجیے، میرا جرم بتائیے۔ یہ کیا کہ سب کو ایک درجہ پر رکھ دیا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی تحریر سے وہ گروہ کتنا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ آپ کی نیت جو کچھ بھی ہو، بہرحال آپ نے ایک حربہ تو اپنے سیدھے پن سے ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ لوگ وہ اشتہار ایک ایک کو دکھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ لو، سچ تک نے محمد علی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ سے ہرگز اس کی توقع نہ تھی۔"

محمد علی سے اب ایک عالم سے جنگ تھی۔ حکومت کے باغیوں میں تو وہ تھے ہی، اور یہ جنگ مستقل تھی۔ ہندو لیڈر بھی اب ان سے پھٹے پھٹے نظر آتے تھے۔ مالوی جی وغیرہ اور لبرل پارٹی کے لیڈروں کا ذکر ہی نہیں، پنڈت موتی لال نہرو تک سے اب صفائی نہیں رہی تھی۔ ایک مدراس کے سری نواس آینگر سے بس اخلاص کے تعلقات باقی رہ گئے تھے۔ محمد علی کہتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے پر ایک وہی آمادہ ہے۔ مسلمانوں کے اندر سلطان ابن سعود کے سارے ہمدرد مخالف۔ اور اب آخری اور حدود سے تجاوز کر جانے والی مخالفت خواجہ حسن نظامی کی پارٹی کی طرف سے ـــــــ چند عنوانات محض نمونے کے طور پر اس عدالت کی لگائی ہوئی فرد جرم کے سنیے گا؟

(۱) ایک فرضی اور تمام تر گڑھی ہوئی تصویر جس میں پنڈت مدن موہن مالوی کے آگے "رامپوری" محمد علی کو سجدہ کرتے دکھایا گیا تھا!

(۲) ایک یہ گندہ اتہام کہ "رامپوری" محمد علی اپنے غسل خانہ کو روضۂ رسول (یا مسجد نبویؐ) سے زیادہ پاک وصاف کہتے ہیں۔

(۳) یہ دعویٰ بڑے شد ومد اور اہتمام کے ساتھ کہ "رامپوری" محمد علی چندہ کی بڑی بڑی رقمیں کھا گئے ہیں۔

(۴) یہ الزام بڑے وثوق اور جزم کے ساتھ کہ "رامپوری" محمد علی ہندو کانگریس سے تنخواہ پا رہے ہیں!

محمد علی ایڈیٹر اور جرنلسٹ (صحافی) جس پایہ کے بھی ہوں، ضرور نہ تھا کہ ہر شاطرانہ پروپگنڈا کے بھی مقابل بن سکیں۔ ہفتوں نہیں مہینوں ان کی ہر ممکن سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ تفضیح کا سامان دھوم دھام سے جاری رہا، اور کوئی دقیقہ برسر عام ان کے ساتھ تمسخر واستہزا کا اٹھا نہ رہا ——— داستان بڑی تلخ، لیکن ساتھ ہی بڑی عبرت انگیز اور بصیرت آموز بھی ہے۔ جی میں بار بار آتا ہے کہ اس کی تفصیلات آئندہ نسلوں کے لیے کچھ تو اور درج کر دی جائیں لیکن ایک بار پھر اس حقیقت کو ذہن کے سامنے تازہ کر لیجئے کہ یہ محمد علی کی کوئی سوانح حیات نہیں۔ یہ تو صرف ان نقوش وتاثرات کا مجموعہ ہے جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں پیش آتے رہے۔ اور اس قضیہ سے ڈائری نویس کا تعلق تو بس اتنا ہی ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ صاحب کو نجی کا خط لکھا، اور دو مرتبہ سچ میں نوٹ دیے۔ نوٹوں پر اصل مبحث پر کوئی رائے نہیں ظاہر کی گئی تھی۔ نرم اور مصالحانہ انداز میں خواجہ صاحب سے صرف یہ گزارش کی گئی تھی کہ

تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے!

ذرا اپنے انداز بیان کو دیکھئے، اور خدا کے لیے سوچئے کہ آپ کس پستی پر اترتے آتے ہیں۔ ان نیازمندانہ معروضات کا اثر الٹا پڑا، اور یہ راقم شمار بھی خواجہ صاحب نے اپنے مخالفوں میں کر لیا!

مولانا کے ہاں بھی جوابات کی کیا کمی تھی۔ اُدھر کی پھبتی کا جواب ادھر بھی پھبتی ہی سے دیا جاتا۔ مولانا محمد علی اگر اب "رامپوری کالا لال" تھے تو خواجہ حسن نظامی بھی اب "علی حسن حیات پوری" تھے۔ خواجہ

نے ذہانت کا سارا زور صرف کرکے لکھا کہ محمد علی رامپوری کی بات اب سنتا کون ہے؟ جدھر جاتے ہیں، لوگ چندا ماموں کہہ کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ انھیں اب چندہ دیتا کون ہے؟ مولانا کب چوکنے والے تھے۔ جواب اسی ردیف و قافیہ میں دیا۔ بولے کہ "خواہرزادگی کی بو نہ گئی۔ چندا ماموں ہی یاد رہا۔ چندا ابا کہہ کر پکارا ہوتا تو بات بھی تھی۔"

اہل حدیث جہاں کہیں بھی تھے پنجاب میں ہوں یا بنگال میں مولانا سے کد جاری رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان غریب کو تقلید و عدم تقلید کے مناقشوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہر جلسہ بجائے بزم کے ایک رزمگاہ کا منظر پیش کرتا۔ اور وقت وقت کا بیشتر حصہ ان ہی باہمی الجھاؤوں کی نذر ہو جاتا۔ لکھنؤ میں جو میٹنگ سنہ ء کی آخری سہ ماہی میں ہوئی، اس میں علاوہ پنجابی نمایندوں کے کلکتہ کے ممبر بھی آئے اور اتفاق سے یہ بھی اہل حدیث تھے۔ مولانا نے کہا کہ اب مقابلہ پر پنجابی ٹولی کے ساتھ بنگالی ٹولا بھی آگیا! لکھنؤ کی میٹنگ بڑی ہی پرشور ثابت ہوئی۔ ایک وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب نوبت زبان سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی کی آجائے گی۔ اشتعال کا باعث جو فقرہ ہوا، وہ منسوب مولانا شوکت علی کی جانب تھا، لیکن آ لگی گئی مولانا محمد علی کے سر ہوئی۔ غصہ سے بھرے ہوئے پنجابی ممبروں نے انتقام کی لپیٹ میں مولانا محمد علی کو ہی لیا۔ میں خود بھی بڑا غصہ ور ہوں لیکن اس خاص موقع پر اللہ نے مدد فرمائی میرے ہوش و حواس درست رہے، ایک جوان عمر پنجابی ممبر صاحب کے پیروں پر گر کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر انھیں کسی طرح ٹھنڈا کیا۔ خواجہ حسن نظامی یا ان کی پارٹی کو ان کمیٹیوں سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے ان جلسوں پر تو ان کا کوئی اثر تھا نہیں، البتہ ان کمیٹیوں سے باہر اور اخبار میں محمد علی کو ان کے حملوں کا بھی جواب دیتے رہنا پڑتا تھا۔ عجب لطیفہ تھا، کہ ایک ہی وقت میں ایک طرف تو محمد علی اس لیے بدنام ہو رہے تھے کہ وہ سلطان ابن سعود کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس لیے "اینٹی وہابی" ہیں، یعنی اہل توحید و سنت کے مخالف ہیں، گور پرست ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ اور دوسری طرف اسی زور شور سے

یہ پروپیگنڈا جاری تھا کہ محمد علی بزرگوں کے منکر ہیں۔ مزارات اولیا کے دشمن ہیں، وہابی ہیں، قبہ شکن ہیں!

از مذہب من گبر و مسلمان گلہ دارد!

خواجہ صاحب کے مقابلہ میں محمد علی جو "علاج بالمثل" کر رہے تھے، اس سے ہم نیاز مند حزبز ہو رہے تھے لیکن کہنے کی ہمت کس میں تھی۔ اتفاق سے ایک روز اسی خلافت کمیٹی کے شب کے اجلاس میں چودھری خلیق الزماں آگئے۔ اب تحریک خلافت سے ان کی عملی دلچسپیاں بہت کم ہو گئی تھیں، لیکن بہر حال مرکزی کمیٹی کے ممبر اب بھی تھے۔ اور محمد علی کے ہمپایہ تو نہیں، تاہم ایک چھوٹے لیڈر تو یہ اس وقت بھی تھے۔ اور محمد علی کے مخصوصوں میں اب تک تھے۔ انھوں نے کہا، میں کہہ لوں گا۔ اور کہہ بھی گذرے۔ اس وقت کے مکالمہ کا دھندلا سا نقش آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

چودھری صاحب: یہ آپ حسن نظامی کو کیوں جواب دیے چلے جاتے ہیں۔ آپ اپنی پوزیشن کا خیال کیجیے۔

مولانا: پوزیشن کیسی؟ تمھیں پبلک کے مذاق کا اندازہ نہیں۔ جواب نہ دیا جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ بات سچی ہے۔ اور عوام میں زہر برابر پھیلتا جاتا ہے۔

چ: میں تو بازاری لوگوں کا مقابلہ کبھی نہ کرتا۔ کوئی اگر مجھے نخاس کے چوراہے پر گالی دے تو کیا میں بھی گالی دینے لگوں؟

م: تم مقابلہ اس لیے نہ کرتے کہ تمھیں کرنا نہیں آتا۔ میں تو کر سکتا ہوں۔ میں نخاس کے چوراہے ہی پر اسی زبان میں جواب دوں گا۔

_____ کوئی اور اس سے جو چاہے نتیجہ نکالے۔ میرے دل پر تو محمد علی کی سچائی ہی کا نقش، اور گہرا ہوا۔ ڈپلومیسی اور تصنع کے فن سے کسی درجہ میں بھی آشنا نہ تھے۔ اچھا یا برا جو کچھ بھی دل میں ہوتا، بس ٹھیک وہی زبان پر بھی آتا۔

باب (۲۲)

سنہ ۱۹۲۶ء (۱)

(خلافت کمیٹی کا آخری سنبھالا)

خلافت والون بیچارون کو اب پوچھتا کون تھا۔ سارا جوش و خروش سنہ ۲۱ء و سنہ ۲۲ء مین ختم ہو چکا تھا۔ بچا کھچا اثر سنہ ۲۳ء و سنہ ۲۴ء تک ساتھ دیتا رہا، اب نہ کہین خلافت کانفرنس ہوتی تھی۔ نہ کہین خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ ایک خواب شیرین تھا، جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھلا ہی چکے تھے۔ شوکت علی غریب بمبئی مین مرکزی خلافت کمیٹی کو سینہ سے چمٹائے بیٹھے تھے ——— برسون کے بعد، اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر مد کے بعد جزر، اور عروج و کمال کے بعد زوال شکست کی مثال سنہ ۴۶ء مین آل انڈیا مسلم لیگ کی شکست و ریخت مین دوبارہ نظر آئی ——— بہر حال آخر سنہ ۲۶ء مین مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا۔ کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو، اور اس کے ضمیمہ کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ خلافت کے صدر، کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون طے پائے، اور موتمر کے صدر حکیم اجمل خان۔ مقام اجلاس کے لئے قرعۂ انتخاب لکھنؤ کے نام پڑا۔ اور تاریخین آخر فروری کی قرار پائین۔ جلسہ گاہ کے لئے سٹی اسٹیشن کے سامنے بلند باغ روڈ اور جگت نرائن روڈ کے جنکشن پر رفاہ عام کلب کے نام سے جو عظیم الشان عمارت ہے،

اس کا انتخاب ہوا۔ شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لیے ہمارے والنٹیروں (رضاکاروں) کی ٹولی جب اکّوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی، تو مجھے وزیر گنج کی ایک بڑھیا کا فقرہ نہیں بھولتا۔ سڑک پر یہ مختصر سا جلوس دیکھ، پکار کر بولی "اے لو، خلافت پھر نکلی"! ——— عوام کے دل سے اس کا تصور تک مٹ چکا تھا۔ اب جو نام سنا، تو جیسے بھولا ہوا خواب یک بیک پھر یاد پڑ گیا۔

یاد ہوگا کہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر یہ خاکسار ہی تھا۔ اب جو یہ کانفرنس کا ڈول پڑا، اور اس کی استقبالیہ کمیٹی بنی، یاروں نے اس استقبالیہ کی صدارت بھی اسی خاکسار کے سر منڈھ دی۔ وہی پہلی ہی صدارت میرے لیے مذاق طبیعت کے کب موافق تھی، یہ دوسری تو سرتاسر ایک عملی اور انتظامی قسم کی خدمت تھی، ہر وقت کی دوڑ دھوپ کی طالب۔ اور سب سے بڑھ کر چندہ وصول کرنے کی مہم! اس پر اپنے تجربے قلم بند کرنے بیٹھوں، تو خود ایک مستقل مقالہ تیار ہو جائے۔ بہرحال میں نے یہ ساری ذمہ داریاں اپنے مذاق کے خلاف جو قبول کیں، تو اس کی تہ میں زیادہ تر دخل اسی جذبہ کو تھا کہ محمد علی کی خوشی اسی میں ہے۔ محمد علی ضابطہ سے مرشد نہ تھے، لیکن ان کی رضاجوئی اپنے کو ایسی ہی مقصود و مطلوب رہتی، جیسی مریدوں کو اپنے مرشد کی ہوتی ہے۔ محمد علی آئے حسب دستور بیگم محمد علی بھی ہمراہ تھیں ——— مہمانوں کا قیام اسی باغ گونگے نواب میں مرحوم ممتاز حسین بیرسٹر کی لق و دق کوٹھی میں رکھا گیا۔ اور یہیں مرکزی کمیٹی کے جلسے بھی ہوتے رہے۔ مولانا بھی یہیں رہے۔ یہاں سے رفاہ عام کا فاصلہ قریب کے راستے سے بھی ایک میل سے اوپر ہے۔ مہمانوں کو اتنی دور سواریوں پر وقت سے پہنچانا، مہمانداری کی عام ذمہ داریوں پر ایک اور اضافہ تھا۔ خیر کام تو سارے کے سارے، دوسرے ہی لوگ انجام دیتے رہے، جن میں سے چند کے نام شکر گزاری کے ساتھ آج تک یاد ہیں، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مرحوم، شیخ سعید الرحمن قدوائی، بیرسٹر

معین الدین انصاری (سکریٹری استقبالی کمیٹی) جو بعد کو رام پور ہائی کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس ہوگئے تھے[1]، سید ذاکر علی جو بعد کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آگرہ سے صوبہ اسمبلی کے ممبر ہوئے، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی (سکریٹری خلافت کمیٹی دہلی) جو بعد کو مدتوں حیدر آباد میں شبینہ مدرسوں کا کام کرتے رہے۔ منشی محمود علی (دہلی والے) اور سب سے بڑھ کر خود مولانا شوکت علی۔ لیکن نیکنامی ضابطہ کی تصدارت کی بنا پر خواہ مخواہ اپنے حصہ میں آگئی۔ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے، اور اس فن میں لاثانی۔ بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے یہ خاکسار بھی "تابع مہمل" کی طرح ساتھ لگا رہا۔ فطرت بشری کے تجربے خوب خوب حاصل ہوتے رہے۔

محمد علی کو اپنی بیوی کے ساتھ بڑی ہی محبت تھی۔ اپنی ماں، اپنے بھائی، اپنی بچیاں کس کے ساتھ انھیں محبت کم تھی؟ ہر سفر میں بیگم محمد علی کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے، اور اب کی تو لکھنؤ میں قیام کئی دن کا تھا۔ ایکی تو بہرحال ساتھ آتیں ہی۔ آئیں اور فرنگی محل میں اتریں، جہاں ان کی مہمانداری پردہ کے انتہائی اہتمام کے ساتھ بڑی اولوالعزمی کے ساتھ ہوتی رہتی۔ لکھنؤ میں ایکی ان کی آمد و رفت بھی مختلف گھرانوں میں رہی۔ ہم لوگوں کا جو مکان لکھنؤ میں ہے (خاتون منزل مرزا حیدر۔ مرزا روڈ پر، قیصر باغ بجلی گھر کے قریب) وہاں میری والدہ ماجدہ[2] سے ملنے آئیں (بیوی سے ملاقاتیں تو خلافت کانفرنس کے عین جلسہ میں ہو چکی تھیں، جہاں پردہ کا پورا انتظام تھا) اور ان سے مل کر اپنی خوشدامن بی اماں مرحومہ کو یاد کیا کیں۔ محمد علی خود سب مہمانوں کے ساتھ باغ گونگے نواب میں مقیم تھے۔ ایک روز دوپہر کو جب اجلاس کانفرنس میں دوپہر کی چھٹی ہوئی، تو بیگم صاحبہ بجائے فرنگی محل جانے کے یہیں آگئیں۔ وہ منظر آج تک نظر کے سامنے پھر رہا ہے۔ جاڑوں میں دوپہر کے

۱؎ ان سطور کی نظر ثانی کے وقت (جنوری ۱۹۵۲ء میں) ناؤ میں سشن جج ہیں۔ ۲؎ وفات اپریل ۱۹۲۱ء میں پائی۔

وقت ایک خیمہ کے اندر جس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، محمد علی تھک کر اور چور ہو کر فرش زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ اور ان کے متصل یہ برقع پوش بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ لتسکنوا الیھا کی زندہ تفسیر، ازدواجی لطف، محبت، غم گساری و رفاقت کا جیتا جاگتا نمونہ ——— لوگ اپنے لیڈروں کی زندگی کو صرف ان کی پبلک زندگی کے جلسوں، جلوسوں، تقریروں، نعروں تک محدود دیکھتے ہیں، اور شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ان بڑوں کے پہلو میں دل ہوتا ہی نہیں ہے۔ کسی اور بڑے کا حال جو کچھ ہو، لیکن محمد علی تو اپنے آقا و سردار کی سچی پیروی میں ایک شفیق بھائی، ایک سعید فرزند، ایک نرم دل پڑوسی، ایک محبت کرنے والے باپ، ایک محبت کرنے والے شوہر تھے۔ ذکر بیچ میں ان کی شخصی اور خانگی زندگی کا آ گیا۔ اور پھر اسی خلافت کانفرنس کے مجمع اور بھرے ہوئے جلسہ کی طرف واپس آیئے۔

بارات کے دولھا ایکی بھی یہی دونوں بھائی رہے۔ تحریک خلافت کا اب دم واپسیں تھا۔ خلافت خود بھی اب مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی زندہ لاش کا سہارا یہی دونوں بھائی تھے۔ اتفاق سے نہ خلافت کانفرنس کے صدر منتخب آ سکے اور نہ موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب سیٹھ صاحب کی قائم مقامی بہار کے مولوی حاجی محمد شفیع داؤدی مظفر پوری نے کی۔ یہ علی برادران ہی کی طرح کے ایک بڑے پرجوش دیندار مسلمان تھے۔ ایک زمانہ میں اپنے صوبہ کے نامور ایڈوکیٹ تھے۔ اب وہ کامیاب وکالت چھوڑ چھاڑ، نیم فقیرانہ لباس اختیار کر کے اپنے کو خلافت کمیٹی اور دوسری ملی تحریکوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے، اور علی برادران کے خاص الخاص مخلصوں میں تھے[1]۔ حکیم صاحب کی جانشینی ڈاکٹر انصاری صاحب کے حصہ میں آئی۔

[1] انتقال غالباً ۱۹۴۹ء میں فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب پر نیشنلزم کا رنگ بہت گہرا چڑھ گیا تھا، اور اسی نسبت سے اب ان کو ملی برادران کے ساتھ خلوص بھی اس درجہ کا باقی نہیں رہا تھا جو کسی زمانہ میں تھا ——— ڈاکٹر انصاری کو قومیات و سیاسیات کے میدان میں لانے والے ۱۹۱۳ء میں ان کی قیادت میں طبی مشن ترکی بھجوانے والے محمد علی ہی تھے۔ لیکن سیاسیات میں کون پچھلی رفاقتوں کو اتنا یاد رکھتا ہے؟ ——— خلافت کے جلسے دو ڈھائی دن زور شور سے رہے، اور ایک دن موتمر کا بھی جلسہ رہا۔ رنگ محمد علی کے سامنے کسی کا بھی نہیں جمتا تھا۔ دونوں صدر محترم بھی محمد علی کے آگے پھیکے ہی رہے۔ خلافت کے جلسہ میں کچھ ہند و حضرات بھی اس خاکسار کی دعوت پر شریک ہوئے۔ ایک نام پنڈت کشن پرشاد کول (ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی و ایڈیٹر "ہندوستانی") کا اب تک یاد ہے۔ ان کو شریک دیکھ کے مولانا سے عرض کیا، کہ "آج تقریر مذہبی سے زیادہ سیاسی رہے، جلسہ میں کچھ ایسے لوگ شریک ہیں جو آپ کے صرف مذہبی جوش کے قائل ہیں۔ مجھے یہ دکھانا ہے کہ آپ سیاسی تقریریں بھی کس معیار کی کر سکتے ہیں"۔ اس فرمایش پر خوب ہنسے۔ اور بولے "خوب خوب فرمائشیں آئی رہتی ہیں۔ ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ محمد علی مذہب کیا جانیں ایک سیاسی آدمی ہیں۔ دوسرے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ مذہبی قسم کے ملا آدمی ہیں، سیاست سے انھیں کیا واسطہ۔ اب میں کس کس کو خوش کیا کروں"؟ بہرحال تقریریں حسب توقع سب سے زیادہ پر زور، پر مغز اور جاندار محمد علی ہی کی رہیں۔

وہ تقریریں، اور اس وقت کی تجویزیں، تحریکیں، اب حافظہ میں کہاں۔ اگر ہوں بھی تو آج کی دنیا کو ان سے دلچسپی ہی کیا۔ وہ دور اپنی زندگی، اپنے تمام جزئیات کے ساتھ ختم ہو چکا۔ اب ذیل میں اپنا پورا خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ درج کیے دیتا ہوں۔ اس سے ایک

اجمالی نقشہ اس وقت کی سیا ت کا، اس وقت کے مسائل کا، نظر کے سامنے آجائیگا ــــــ
خطبہ کے پڑھتے وقت، اور اس کے خاتمہ پر لوگوں نے حوصلہ افزائی کے خیال سے داد خوب
دل کھول کر دی۔ لیکن سب سے بڑی اور سب سے قیمتی داد یہ تھی کر ایڈریس کے خاتمہ پر مسٹر
محمد علی نے لپک کر گلے لگا لیا۔ اور پیشانی پر بوسہ دے دے کر داد کے بڑے فیاضانہ الفاظ
صرف کر ڈالے۔

ــــــــــــ ❋ ــــــــــــ

ضمیمہ باب (۶۶)

(بازگو از نجد و ز یاران نجد)

خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ، جو ۲۶ فروری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ (عمارت رفاہ عام) کے چودھویں اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس میں پڑھا گیا۔

قوم اور ملک کے خدمت گزارو! دین و ملت کے سرفروش سپاہیو! دور دراز سے زحمتِ سفر اٹھا کر آنے والے جلیل القدر رہنماؤ![1]

ایک نامور مگر اجڑے ہوئے شہر کے باشندوں کی طرف سے، اپنے تہی مایہ اور بے مقدرت میزبانوں کی جانب سے، ایک بے بضاعت اور نا اہل فرد کی زبان سے تحیۃ و سلام اور برکت و رحمت کی دعاؤں کا تحفہ قبول کرو!

جس سرزمین پر ہم سب اس وقت جمع ہیں اس کی قسمت بھی قسّامِ ازل نے کچھ عجیب رکھی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پرقوت حکومت سیکڑوں برس تک قائم رہی، لیکن لکھنؤ کو دارالسلطنت بننا کب نصیب ہوا؟ اس وقت جبکہ خود سلطنت میں انتشار و اختلال پوری طرح پیدا ہو چکا تھا؛ مسلمانوں کی مرکزیت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور بابر و اکبر، شاہ جہان و اورنگ زیب کے محض افسانے رہ گئے تھے۔ ملک ہند میں مسلمانوں کے علوم اور شعر و ادب

[1] جلسہ میں نمائندے دہلی، پنجاب، بہار اور مدراس تک کے موجود تھے۔

کا نقارہ صدیوں تک بجتا رہا لیکن فرنگی محل کے علم و فضل اور لکھنؤ کی شاعری کا آفتاب کب چمکا؟ اس وقت جبکہ خود مسلمانوں کے علم و ادب کا آفتاب ہندوستان میں لب بام آچکا تھا۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس سالہا سال سے ملک کے مختلف گوشوں میں ہو رہے ہیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی وغیرہ کا ذکر نہیں۔ بلگام و کوکناڈا جیسے دور افتادہ مقامات تک یہ فخر حاصل کر چکے لیکن اب تک اس شرف سے اگر کوئی محروم رہا تھا تو وہ یہی شہر لکھنؤ تھا[1]۔ آج جب یہ سعادت اس کی قسمت میں آرہی ہے تو ہر شخص خود دیکھ رہا ہے کہ روز عید کی شام کے آثار نمایاں ہیں، سرور شب کے اتار کا وقت ہی! اور اہل بزم تھک تھکا کر انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں! خیر یہ اپنا اپنا ظرف ہے اور اپنا اپنا نصیب! کسی کو شب کے بناؤ سنگار دیکھنا مبارک اور کسی کے نصیب میں سحر کی بگڑی اداؤں کا آنا مبارک! ؎

ہر کسے خمے کشیدہ در مجلس وصالش

چوں دور خسرو آمد جام و سبو نماندہ:

لیکن ساقی سے بدگمانی کی مجال نہیں۔ طبیعت میں کیف اور قلب میں ذوق اگر موجود ہے تو بڑے سے بڑا خم اور چھوٹے سے چھوٹا جام سب برابر ہیں۔

یہ پہلو لکھنؤ کی بدقسمتی کا تھا، لیکن خوش قسمتی کا پہلو لیجیے تو انجمن خدام کعبہ جسے خلافت کمیٹی کا نقش اول کہنا چاہیے، اسی سرزمین پر گنتی کے چند آدمیوں اور برائے نام سرمایہ کے ساتھ قائم ہوئی تھی اور اسی کے کارناموں نے آج سے چودہ پندرہ سال قبل ملک کے طول و عرض میں غلغلہ ڈال دیا تھا۔ پھر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے جو عظیم الشان کانفرنس منعقد

[1] لکھنؤ میں خلافت کے اور جلسے تو اس سے بیشتر بارہا ہو چکے تھے۔ "آل انڈیا کانفرنس" کے انعقاد کا اس شہر میں یہ پہلا موقع تھا۔

ہوئی تھی اور جس نے خلافت کمیٹی کی باضابطہ بنیاد رکھی تھی وہ نہ صرف اسی شہر میں بلکہ ٹھیک اسی عمارت[1] کے اندر منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں جناب مولانا محمد علی صاحب[2] کے زیر صدارت اودھ خلافت کانفرنس کا جو اجتماع عظیم ہوا تھا وہ بھی اسی شہر میں، اسی عمارت کے احاطہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس بنا پر صوبہ اودھ کا اجرا ہوا دار السلطنت اگر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ الخلافۃ کے وطن ہونے کا فخر اپنے لیے حاصل کرنا چاہے تو شاید یہ فخر بیجا نہ ہو۔ چودھویں رات کا چاند بدر کامل ہوتا ہے، خدائے پاک ہماری کانفرنس کے اس چودھویں اجلاس کو بھی ماہ شب چہار دہم کا حسن وجمال، نور کمال نصیب کرے اور وہ جمال وکمال جو مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے اسے ماہ شب چہار دہم بنائے رہے۔

لکھنؤ کی پچھلی خدمات کے سلسلہ میں اودھ کی اس ممتاز ہستی کا نام بھی حسرت وماتم کے ساتھ آنا ناگزیر ہے جو خلافت کانفرنس کانپور کے اجلاس کے چند ہی روز کے بعد عالم عنصری سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی یعنی مرحوم ومغفور مولانا عبد الباریؒ فرنگی محلی۔ ان کے قومی کارنامے آج کسی یاددہانی کے محتاج نہیں۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کی ذات ایک مرکز کا مرتبہ رکھتی تھی۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے ہی شہر میں پروان چڑھتے دیکھ کر کس قدر مسرور ہوتے اور ان کی ذات گرامی سے ارکان مجلس استقبالیہ کو آج ہر قسم کی کس درجہ اعانت ملتی! کارساز حقیقی کے لطف وکرم سے کیا عجب ہے کہ اس وقت بھی اس کے فرشتہ خدائی لاسلکی (وائرلیس) کی مدد ان کی روح کی آنکھوں اور کانوں کو یہ سب کچھ دکھا اور یہ سب کچھ سنا رہے ہوں۔ خدائے آمرزگار ٹھنڈی رکھے اس خادم دین کی تربت کو اور

[1] عمارت موسوم بہ رفاہ عام کلب وجلسۂ تہذیب لائبریری، سٹی اسٹیشن کے مقابل۔

[2] مولانا محمد علی کے مرشد، مشاہیر وقت میں ممتاز

رحمتیں نازل کرے اس کی روح پر!

بزرگو، دوستو اور عزیزو! آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ "اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور اگر کچھ ضرورت ہو بھی تو کیا یہ ضرور ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے"؟ حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں! اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دماغ میں پیدا کیونکر ہوئے! جس انسان کو خلافت سے عار آتا ہے درحقیقت اسے خود اپنے وجود سے عار آنا چاہیے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات ارض میں بجز خلیفہ کے اور کچھ نہیں۔ یہ کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں، کسی مورخ کی رائے نہیں، کسی بشر کا قول نہیں بلکہ اس وقت جب نہ آدم کا وجود تھا اور نہ بنی آدم کا۔ نہ بشر کا نہ ابوالبشر کا، اس وقت سب کے پیدا کرنے والے، سب کو نیست سے ہست کرنے والے نے صاف صریح اور غیر مشتبہ الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اِنّی جَاعِلٌ فِی الارضِ خلیفۃ۔ یہ نہیں ارشاد ہوتا کہ انسان کو حاکم پیدا کیا جائے گا، عالم پیدا کیا جائے گا، شاعر پیدا کیا جائے گا، فقیہ پیدا کیا جائے گا، مجاہد پیدا کیا جائے گا، بلکہ یہ اور صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اسے روئے زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا جائے گا۔ انسانوں کے مختلف طبقے اور گروہ شروع سے قائم ہیں اور آخر تک قائم رہیں گے۔ کوئی شاہ ہوگا کوئی گدا کوئی امیر ہوگا کوئی فقیر، کوئی حاکم ہوگا کوئی محکوم، کوئی ذہین ہوگا کوئی غبی، کوئی صحیح ہوگا اور کوئی مریض، کوئی بڑا ہوگا کوئی چھوٹا، یہ سارے اختلافات ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، لیکن منصب خلافت سے دست برداری کسی لمحہ اور کسی آن ممکن نہیں۔ ہر انسان اول میں بھی خلیفہ ہے اور آخر میں بھی، جسد خاکی میں جس وقت روح داخل ہوتی ہے اپنے ہمراہ منصب خلافت لیکر داخل ہوتی ہے اور جب تک خود روح نہ نکل جائے کوئی قوت اس منصب سے انسان کو بے دخل نہیں

کرسکتی۔ یہ لقب ہندوستان کی مرکزی خلافت کمیٹی کا گڑھا ہوا نہیں، مولانا شوکت علی کا ایجاد کیا ہوا نہیں، بلکہ اس بڑی سرکار کا بخشا ہوا ہے جس کے یہاں سے ہمیں خود جامۂ انسانیت اور خلعت وجود عطا ہوا ہے۔ طبیعتیں اگر اس خطاب سے اکتا گئی ہوں تو اس خطاب کی واپسی اسی سرکار میں کرنی چاہیے جہاں سے یہ مرحمت ہوا تھا۔

خلافت اس وسیع معنی میں انسانیت کے ہم معنی ہیں لیکن یہی دو مخصوص مفہوم میں اس کا اطلاق خاص محل نعمت پر ہوتا ہے، قرآن پاک کی آیات کریمہ میں استخلاف، خلفا، خلائف وغیرہ کا استعمال ایسے ہی مواقع مدح پر ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نبی جلیل القدر حضرت داؤدؑ کو جو نبوت کے حلہ نورانی کے ساتھ ہی حکومت کے خلعت مادی سے بھی سرفراز تھے اور نظام حکومت منشائے ربانی کے مطابق قائم کیے ہوئے تھے خطاب کرکے ارشاد فرماتا ہے۔

(یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض) اے داؤد ہم نے تمھیں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا! اللہ اکبر! مرتبہ خلافت کی بلندی دیکھنا! منصب نبوت پر سرفرازی کے بعد بھی خلعت امتیاز ملتا ہے تو خلافت کا!

اس بڑی خلافت کو انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد جن بزرگوں نے زندہ رکھا اور جو سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک نیز جمہور امت کے متفقہ فیصلہ کے مطابق افضل ترین بشر گزرے ہیں، ان کے لیے سب سے بڑا تعظیمی لفظ جو استعمال ہو سکتا ہے وہ "خلیفۃ الرسول" اور بعد ختم نبوت جو سب سے بڑا مرتبہ کسی باخدا انسان کو مل سکتا تھا اس کا نام شریعت کی زبان میں خلافت ہی ہے۔

ہم اہل سنت اس سب سے بڑی فضیلت میں چار ہستیاں شریک سمجھتے ہیں، ان چاروں کو "خلفائے راشدین" کہتے ہیں۔ فرقہ شیعہ کے نزدیک اس کے حقدار صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے لیکن وہ بھی سب سے زیادہ زور ان کی "خلافت بلافصل" ہی پر دیتا ہے۔

ایک طرف یہ منصوصات ہیں، تصریحات ہیں، کتاب اللہ ہے، سنت انبیائے کرام ہے، اسوۂ صحابہ ہے،" اور دوسری طرف لے دے کے یہ دلیل ہے کہ چونکہ "ترکوں نے اپنے سر خلافت کی ذمہ داریاں لینے سے انکار کر دیا ہے اس لیے سرے سے تحریک خلافت ہی کو فنا کر دینا چاہیے"۔ گویا اگر کل ترک خدانخواستہ اپنے دین سے مرتد ہو جائیں تو ہم سب کے ارتداد کے لیے بھی یہ دلیل کافی ہو جائے گی کہ جب اتنی بڑی محافظ اسلام قوم نے اپنا دین بدل دیا تو ہم کب تک اس کے دین کی حفاظت کر سکتے ہیں اب دونوں پہلو آپ کے سامنے ہیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے جو پہلو زیادہ قوی، زیادہ معقول اور زیادہ تشفی بخش معلوم ہو، انتخاب کرے۔

پوچھا جاتا ہے اور طنز و بیدردی کے لہجے میں پوچھا جاتا ہے کہ اب تک خلافت کمیٹی نے کام کیا کیا ہے؟ یہ سوال ہم سے کیا جاتا ہے! اس کا جواب ہم دیں! اس کا جواب اگر لینا ہے تو انگریزی عدالتوں کے در و دیوار سے پوچھو، پولیس کے رجسٹروں سے پوچھو، جیلخانوں کے دروازوں اور پھاٹکوں سے پوچھو، لوہے کی بنی ہوئی ہتھکڑیوں اور ڈاکوؤں اور خونیوں کے سروں میں پڑنے والی بھاری بھاری بیڑیوں سے پوچھو، اس کا جواب مصر سے لو، فلسطین سے لو، حجاز سے لو، ترکی سے لو، افغانستان سے لو، جاوا سے لو، ہر آزاد اور نیم آزاد اسلامی ملک سے لو، ساری دنیائے اسلام سے لو اور اس پر بھی تشفی نہ ہو تو اللہ کے پاک فرشتوں کی زبان سے سنو۔ اور انھیں آپس میں یہ چرچا کرتے ہوئے سنو کہ جب آزمائش کا وقت آیا اور جب خلافت اسلامیہ کے لیے خطرہ کی گھڑی آئی، جب اسلام کی زیست و موت کا سوال درپیش ہوا تو اس وقت اللہ کے نام پر اس کے آخری رسول کے پیام پر، اس کی شریعت کے احترام پر، اپنے مال لٹا دینے والے، اپنی عزتیں اور شہرتیں قربان کر دینے والے، اپنا عیش و آرام نثار کر دینے والے، اپنی دنیا تاراج و برباد کر دینے والے، اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ رکھ کر لبیک کہنے والے، بیڑیاں پہننے کے شوق میں

طوق وزنجیر کے ذوق میں، ننگے اور بھوکے رہنے کے اشتیاق میں، پھانسی کے تختہ پر چڑھنے کی تمنا میں، سینہ پر گولیاں کھانے کی طلب میں، میدان میں اپنی تڑپتی ہوئی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانے کے ارمان میں جو خاک کے پتلے سب سے پہلے آگے بڑھے، وہ غلام ہندوستان کے غلام مسلمان، وہ مجبور ہندوستان کے مجبور امتیان رسول، وہ اسی ظلمتکدہ کے بسنے والے خدمت گزاران خلافت ہی تھے! زود فراموش انسان، حیلہ باز انسان اور صبر و انتظار سے گھبرا جانے والا انسان ممکن ہے ان واقعات کو آج بھول جائے یا قصداً بھلا دے لیکن اوراق لیل و نہار پر، روئے زمین کے ذرات پر، صحیفۂ کائنات کے ایک ایک صفحہ پر جس وقت تک ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فداکاری، ابراہیم ذبیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے ذوق شہادت کے واقعات ثبت ہیں، اس وقت تک ان نامور سرداروں کے ادنیٰ سپاہیوں، خلافت اسلامیہ کے خدمت گزاروں اور تحریک خلافت کے علمبرداروں کی حقیر و ناچیز کوششوں کا نقش بھی صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا! انسان اگر آج بھلانا چاہتا ہے تو بھلا دے لیکن وہ علیم و خبیر، وہ لطیف و بصیر جس کی ذات سہو و نسیان سے منزہ ہے اور جو انسانی نگاہوں سے اوجھل، پتھروں کے اندر رہنے والے کیڑوں تک کی خبر گیری کرتا رہتا ہے، اپنے عاجز و درماندہ، بے کس و بے بس بندوں کی اس فداکاری کو بھول نہیں سکتا، اور ہمارے لیے اسی کا یاد رکھنا بس ہے۔

بزرگو اور عزیزو! خلافت کمیٹی گو اپنی بساط و مقدرت کے موافق آج خلافت راشدہ کی جانشینی کرتا ہے، اس لیے اس کے پھیلاؤ میں ساری دنیائے اسلام آجاتی ہے، ہندوستان بھی اور ہندوستان کا باہر بھی۔ لیکن اس کا اصلی اور مرکزی تعلق قدرتاً اسلام کے مرکز ارضی سے ہے۔ اس ارض فلک مرتبہ سے جس پر اللہ کے سب سے اچھے اور سب سے سچے بندے کو قدم

ثبت ہیں، اس رشکِ عرش سرزمین سے جو تئیس ۲۳ سال تک خدا معلوم کن کن قابلِ بیان اور ناقابلِ بیان تجلیات کی جلوہ گاہ رہی ہے۔ اس خطۂ پاک سے جو آج بھی اللہ کے سب سے زیادہ پیارے اور چہیتے، سب سے زیادہ دلارے اور لاڈلے کا آخری آرام گاہ ہے۔ وہاں کی ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت ہماری سب سے بڑی سعادت اور اس کے مرکز کے ساتھ ہمارا خفیف سا لگاؤ بھی ہماری سب سے بڑی عبادت ہے۔ وہاں کے حالات کی معمولی ناخوشگواری سن کر بھی ہمارا دل اگر قابو میں نہ رہے ہمارے ہوش و حواس اگر درست نہ رہیں، فرطِ اضطرار و اضطراب سے اگر ہم مجذوب ہو جائیں تو خدارا ہم پر بے عقلی و بے دانشی کا الزام نہ لگایئے اور اگر لگایئے بھی، تو کم از کم ہم سے یہ توقع تو نہ کیجیے کہ اس الزام کے دفع کرنے کے لیے ہم اپنے اس قدرتی اور قلبی تعلق میں ایک ذرہ برابر بھی کمی نہ آنے دیں گے۔ ہندوستان پر اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ یقیناً ہماری مصیبت ہوگی۔ ترکی و مصر، افغانستان و مراکش میں ہمارے بھائیوں کو کوئی دکھ پہنچا تو وہ دکھ بھی عین ہمارا دکھ ہوگا۔ لیکن خدانخواستہ اگر اس مرکزِ اسلام، قبلۂ دین، مرکزِ ایمان کو ادنیٰ سا بھی گزند پہنچا تو یہ ہمارے جسم کا صدمہ نہ ہوگا بلکہ خطرہ ہوگا ہماری جان کا، پامالی ہوگی ہماری روح کی، حملہ ہوگا ہمارے ایمان پر۔ سیکڑوں ہندوستان اور ہزارہا افغانستان، صدہا مصر اور بے شمار ترکی قربان ہیں اس ارضِ پاک کے چپہ چپہ پر، نثار ہیں اس دیارِ حبیب کے ذرہ ذرہ پر! کارلائل کا شمار اگر یہ کہہ کر بھی کہ "برطانوی قوم کو برطانیہ کی سلطنت چھن جانا قبول ہے لیکن شیکسپیر سے دست بردار ہو جانا قبول نہیں"۔ داناؤں میں باقی رہ سکتا ہے تو ایک مسلمان بھی ارضِ حجاز کے متعلق اس والہانہ عقیدت کو بیان کرنے سے نادانوں کے زمرہ میں نہیں آجاتا۔ لیکن اگر یہ نادانی ہے تو اس نادانی پر ہزاروں دانائیاں قربان اور اگر جنون ہے تو اس جنون پر ہزاروں خردمندیاں تصدق! اللہ سے بصد عجز و تضرع دعا ہے کہ وہ ہماری اس

نادانی، بے عقلی اور جنون کو بجائے دور کرنے کے اور ترقی دینا ہے۔ ؎

من لذت درد تو بدرماں نہ فروشم   وشوار بدست آید وازاں نہ فروشم

آج اس ارض نور کے مطلع پر ملکیت واستبداد کا جو سیاہ بادل چھایا ہوا ہے اس کو جائز و مناسب تدبیروں سے دور کرنا اور سرزمین قبلہ کو پھر تمام اہل قبلہ کے سپرد کر دینا خادمان خلافت کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے۔ یہ جائز و مناسب تدبیریں کیا اور کیونکر اختیار کی جائیں اس کا فیصلہ کرنا قوم کے اہل حل وعقد کا فرض ہے۔ ان طریقوں کے اختیار کرنے میں اختلاف رائے وخیال کی پوری گنجائش ہے۔ لیکن نفس اس فریضہ کی اہمیت سے انکار یا اس میں تردد و تامل تصور میں نہیں آتا کہ کلمہ گویان اسلام کا کوئی بھی فرد کر سکتا ہے! کہا جاتا ہے کہ "اصلاح مفاسد کے لیے صرف حجاز کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے، بے شمار مفاسد دوسرے ممالک اسلامیہ میں بھی تو آخر موجود ہیں"

میرے بھائیو اور بزرگو! کاش ان الفاظ کو زبان سے نکالنے کے قبل ان کے معنے کو سوچ لیا جاتا! جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگ جائے تو تکلیف واذیت کس کو نہ محسوس ہو گی لیکن اگر خدانخواستہ قلب میں نشتر گھسا جا رہا ہے تو کیا اس غریب اور بدنصیب سے یہ سوال کیا جائے گا اور اس کے جواب پر اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہاتھ پیر کی پھانسوں کو چھوڑ کر قلب کے نشتر سے کیوں اسقدر بیقرار ہوا جا رہا ہے! محبت وعقیدت ہم کو دنیا کے ہر نیک اور خدا پرست انسان سے ہے، خواہ وہ کسی زمانہ اور کسی قوم کا ہو کر اسلام کی یہی تعلیم ہے لیکن قلب کو جو تعلق جگر گوشۂ عبد اللہ اور نور دیدۂ آمنہ (روحی فداہ) کے ساتھ ہے وہ کسی بزرگ، کسی ولی، کسی نبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کیا قیامت ہے کہ ہم کو مشورہ یہ دیا جا رہا ہے کہ حجاز کے مفاسد موجودہ کو ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اس وقت تک انتظار کرتے رہو جب تک سارے عالم اسلام کی اصلاح نہ ہو جائے۔ دوستو اور عزیزو! ان گذارشات اور معروضات کا یہ مطلب نہیں کہ حجاز کی موجودہ حکومت کے خلاف فوراً اعلان جنگ

کر دیا جائے، وہ حکومت تو بہر حال مسلمان ہے فوری اعلان جنگ تو ہم کا فراور غاصب حکومتوں تک کے خلاف نہیں کرتے۔ فریضہ ہمیشہ بطور نصب العین (آئیڈیل) کے ہوتا ہے، اور اس نصب العین کے حصول کے ذرائع کا دار و مدار ہمیشہ اپنی صلاحیت و استعداد اور حالات گرد و پیش کی موافقت اور عدم موافقت پر ہوتا ہے۔ مقصد گزارش صرف اس قدر ہے کہ اس فریضہ کو بطور نصب العین کے سامنے رکھ کر تمام امور متعلقہ پر سنجیدگی دخلوص اور محبت برادرانہ کے ساتھ غور کر کے فیصلہ متفقہ یا بڑی اکثریت کے ساتھ صادر ہو۔ اس پر پوری قوت و دیانت کے ساتھ عمل کیا جائے۔ خدا کے فضل سے موتمر کا ایک بہت موثر آلہ ہمارے ہاتھ میں آگیا ہے۔ اس سے پورا فائدہ نہ اٹھانا ایک بہترین خداداد موقع کو ہاتھ سے ضائع کر دینا ہوگا!

ارض حجاز کی اس خدمت کے ساتھ ہی ساتھ خود اپنے وطن میں کام کرنے کے نہایت وسیع میدان موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "خلافت کمیٹی کو اب باہر کا خیال چھوڑ کر گھر کی خبر لینا چاہیے اور سارا کام اب ہندوستان ہی میں کرنا چاہیے" سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ دونوں کام ایک دوسرے کے منافی کیوں قرار دے لیے گئے ہیں؟ کیا حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اللہ کے لیے نمازیں بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے کنبہ والوں اپنے ہمسایوں کی خدمت بھی کرتا ہے، اور یہ دونوں قسم کے کام اسی چوبیس گھنٹہ والے دن رات کے اندر ہی انجام پاتے رہیں؟ توفیق الٰہی اگر یاوری کرے اور ہم خلوص و نیک نفسی کے ساتھ تھوڑی سی ہمت بھی اپنے اندر اور پیدا کر لیں تو یہ مشکل کیا ہے کہ ایک طرف موتمر کے ذریعہ سے ہم خدمت حجاز میں بھی لگے رہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف اپنے ملک میں، اپنی تعلیمی، تنظیمی، معاشرتی، سیاسی، دینی ہر قسم کی کوششوں کو بھی جاری رکھیں، ہر ہر مقام پر لڑکوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے رہیں، بے روزگاروں کو روزگار سے لگا

رہیں، دوکانیں کھلوائیں، چرخہ اور کھدر کی ترویج کرتے رہیں، اپنے ہم قوموں کو مختلف حرفوں اور پیشوں کی جانب مائل کریں، شریفوں کے دماغ سے محنت اور چھوٹی قسم کی دکانداری کے ذلیل سمجھنے کا خیال نکلوائیں۔ ہر ہر بستی کے مسلمانوں کی مردم شماری کرا کے معذوروں اور اپاہجوں کو مالی امداد دیتے رہیں اور کاہلوں کو کسی کام سے لگائیں۔ اس قسم کے تعمیری کام سیکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کے اندر کرنے کے موجود ہیں۔ ملک کی آزادی کے لیے جد وجہد کرنا ان سب سے اہم ہے۔ ہندوستان کے ۳۰ کروڑ باشندوں کا ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہنا کا واقعہ ہمیشہ تاریخ عالم کے نادر واقعات میں درج رہے گا، لیکن اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور شرمناک یاد اس واقعہ کی رہے گی کہ ان ۳۲ کروڑ میں سے ۷ کروڑ وہ نفوس تھے جن کا دین دایمان یہ تھا کہ (ان الحکم الا للہ) حکومت بجز خدا کے اور کسی کی نہیں۔ جن کی کتاب میں صاف صاف یہ ہدایت موجود تھی کہ (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون) جو خدائی قانون کو چھوڑ کر کسی اور قانون کو مانتے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ کافر ہوجاتے ہیں اور جنھیں شروع سے یہ بتادیا جاتا تھا کہ (ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا) اللہ کی رسی مضبوط تھامنے کے لیے اللہ سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کے لیے لازمی ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے کے ساتھ غیر خدائی حکومتوں سے سرکشی، طاغوتی سلطنتوں سے بغاوت اور شیطانی قوتوں سے یکسر بیزاری اختیار کرلی جائے۔

ملک میں آج بہت سی انجمنیں مفید مقاصد واغراض کے ساتھ قائم ہیں، جمعیۃ خلافت ان میں سے کسی کی بھی رقیب، حریف نہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلموں کی بھی ہر مفید دکار گذار انجمن کی جانب اتحاد واشتراک کا ہاتھ بڑھانے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ وہ مسلم جو دنیا میں دوسروں کی رہنمائی اور رہبری کے لیے آیا تھا جس کا

مقصد آفرینش یہ تھا کہ بھٹکی ہوئی دنیا کو اپنی روشنی میں چلائے۔ آج وہ اس کو غنیمت سمجھ رہا ہے کہ دوسروں کے دوش بدوش کام کر سکے! اسے تو وہ بصارت و بصیرت عنایت کی گئی تھی کہ وہ دنیا کو راہ دکھائے، آج وہ خود دوسروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے! کاش آج آزادی کی جنگ نیز اپنی قوم کی شیرازہ بندی میں ہم دوسروں کے لیے چراغ ہدایت ثابت ہوں۔

لیکن یہ ساری تعمیری و تخریبی، ملکی و سیاسی، تعلیمی و تنظیمی کوششیں اسی وقت اور صرف اسی وقت بارآور ہو سکتی ہیں جب پہلے ہم خود شخصاً و جماعتہً مسلمان بن جائیں۔ نماز باجماعت جو ہمارے تمام امراض کا علاج وحید تھی اس کی طرف سے ہم یکسر غافل و بے پروا ہیں اور پھر چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح ہماری بگڑی بن جائے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ مصلحین کا ذکر ہے اور وہاں عمل میں ان کی شناخت ارشاد ہوئی ہے (وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ) کہ وہ نماز باجماعت پابندی سے ادا کرتے ہیں، وقت نہیں ہے ورنہ نماز باجماعت کے فضائل و مصالح، قومی و اجتماعی نقطۂ نظر سے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کیے جاتے۔ باقی اگر ذاتی رائے دریافت کی جائے، تو جی یہ چاہتا ہے کہ خلافت کمیٹی کی ممبری کی شرط ہی نماز باجماعت رکھ دی جائے یعنی آیندہ سے ارکان صرف وہی مسلمان ہو سکیں جو نماز باجماعت کے پابند ہوں۔ آج سیکڑوں اسکیمیں اور تجویزیں قوم کے سامنے پیش ہیں، لیکن اگر آج سے ہر مسلمان مرد نماز باجماعت کا عہد کر لے اور ہر مسلمان عورت پنج وقتہ کو اپنے لیے لازمی سمجھ لے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر دو برس اس پر عمل رہے تو خدائے قادر و توانا کے فضل و کرم پر اعتماد کر کے دعوے کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس دو برس کی مدت میں اسلامی ہند کی کایا کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ یہ نماز باجماعت ہی ہمارے دلوں میں اتحاد پیدا کر سکتی ہے جس کے فقدان نے آج ہر قسم کی ابتری

اور بدنظمی پیدا کر رکھی ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جزئی اختلاف رائے و عقیدہ ایک مستقل بالشان مخالفت بن جاتا ہے۔

کام کرنے والوں کی کثرت و فراوانی پہلے بھی نہ تھی لیکن اب تو یکسر قحط ہو گیا ہے۔ کام اپنی جگہ پر بدستور، لیکن کام کرنے والے عنقا، ہر شخص دوسرے پر معترض، ہر فریق دوسرے سے بدگمان، جو بچے کھچے اللہ کے بندے ابھی تک کام میں لگے ہوئے، خدا ان کی ہمت میں برکت و ترقی دے۔ بڑے سے بڑے کام ہمیشہ قلیل و مختصر ہی جماعتوں ہی نے انجام دیے ہیں۔ تعداد کی کثرت اور سامان کی زیادتی خدا سے اعتماد ہٹا کر تعداد و سامان پر کر دیتی ہے، اسی لیے اس کا انجام اکثر ناکامی پر ہوا ہے۔ میدان بدر میں تین سو مومنین صادقین نے اس فوج پر فتح پائی ہے جو تعداد میں ان کی تین گنی اور سامان جنگ کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ ایران اور روم اپنے زمانہ کی متمدن ترین اور زبردست ترین سلطنتیں تھیں، مسلمانوں نے جب انھیں فتح کیا ہے تو اپنی تعداد، سامان جنگ، قواعد دانی کسی اعتبار سے بھی ان کے ہمسر نہ تھے صرف قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ بھی اپنے دل میں یہی قوت ایمانی پیدا کر کے دیکھیے اور پھر ہمیشہ کے لیے دوسروں کی کثرت تعداد وغیرہ کے خوف سے امن ہو جائے گا۔ حضرت جگر جو ہیں آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں انھوں نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

توطیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور | بیچارگی پر اپنی نہ جا شان خدا دیکھ

جس خدائے قدوس و توانا نے ایک مشت پرندوں میں یہ قوت دے دی تھی کہ وہ ایک زبردست بادشاہ کی زبردست فوج کو دم کے دم میں ملیا میٹ کر دے۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ آج ہم ناتوانوں اور بے کسوں کے ذریعہ سے اپنے بڑے سے بڑے کام لے! اور دنیا کی بڑی بڑی گردن کش قوموں کا سر غرور ہمارے ہی دست ناتواں سے نیچا کرا کے چھوڑ سکے!

محترم بزرگو! اس طویل سمع خراشی کو ختم کرکے اب آپ ان کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے لیے جو مہمانداری کے سلسلہ میں یقیناً ہوئی ہیں، آپ ہی کے الطاف کریمانہ کو آپ کے سامنے شفیع بناتا ہوں۔ اپنی ذات کے متعلق مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ آپ حضرات کی خدمت گذاری کی سرے سے اہلیت وصلاحیت ہی مجھ میں نہ تھی اور نہ ہے۔ زمانہ کی نیرنگی اور عبرت اندوزی کا یہ بھی ایک نمونہ ہے کہ مجلس استقبالیہ کی صدارت جیسی اہم اور جلیل القدر خدمت کے لیے قرعۂ انتخاب مجھ جیسے نااہل شخص پر پڑا۔ آج جو کچھ بھی آپ دیکھتے ہیں، یہ سب دفتر مرکزی کے کارکنوں اور مجلس استقبالیہ کے بعض مستعد کارگزاروں کی محنت وسعی کا نتیجہ ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

اے دلوں کے پھیر دینے والے پروردگار! تو نے عرب کے شدید کینہ پرور و نفاق پسند سینوں میں ایمان کی حلاوت اور دین کی لذت ڈال کر سب کو ایک کر دیا تھا۔ تو نے اوس وخزرج کی لڑائیوں کی آگ کو جو پشتہا پشت سے بھڑکتی چلی آرہی تھی محبت اسلام کے پانی سے دم کے دم میں فرو کر دیا تھا تو آج بھی وہی جو پہلے تھا، آج اپنے نام کا کلمہ پڑھنے والوں کو توفیق دے کہ خلوص ومحبت کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر تیرے دین کی خدمت پر آمادہ ہوجائیں! ان کے سینوں کو نفاق سے پاک کردے اور ان کے دماغوں اور عقلوں سے مادی قوتوں اور طاغوتی حکومتوں کی مرعوبیت اور ہیبت دور کردے!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

باب (٦٧)

۱۹۲۷ء (۲)

(جوش کے ساتھ ہوش۔ جنون کے ساتھ تدبّر)

قانون فوجداری کی مشہور و معروف کتاب، ضابطۂ تعزیرات ہند کھولیے، تو دفعہ ۲۹۵ الف آپ کو حسب ذیل الفاظ میں ملے گی:-

"جو کوئی جان بوجھ کر اور بدنیتی سے ملک معظم کی رعایا کے کسی طبقہ کے مذہبی احساسات کو الفاظ کے ذریعہ سے زبانی ہوں یا تحریری، یا نقوش مرئی کے ذریعہ سے ٹھیس پہنچانے کی غرض سے اس کے مذہب یا مذہبی معتقدات کی توہین کرے گا یا توہین کرنے کی کوشش کرے گا، وہ دو سال کی سزائے قید کا خواہ وہ قید کسی قسم کی ہو، یا جرمانہ یا دونوں (سزاؤں) کا مستوجب ہوگا۔"

آپ کہیں گے کہ محمد علی کی زندگی خصوصاً اس کے متعلق ڈائری کو آخر تعزیرات ہند سے کیا تعلق؟ ـــــــ تعلق ہے، اور ابھی چند سطروں میں ظاہر ہوا جاتا ہے۔

سنہ ۲۷ء ابھی چل ہی رہا تھا کہ پنجاب کے کسی بدزبان بے لگام آریہ سماجی نے ایک کتاب نہایت گستاخانہ بلکہ "باجیانہ" ذات رسالت مآب سے متعلق لکھ ماری۔ دو ایک اور کتابیں اسی زمانہ میں ایسی ہی اشتعال انگیز اور صبر آزما اس موضوع پر نکل چکی تھیں۔ مسلمان اب غصہ سے بے خود اور بالکل بپھرے ہوئے تھے۔ اتفاق وقت کہ اس گندی کتاب کے متعلق مقدمہ

جب پنجاب ہائی کورٹ میں گیا تو دوسرے ججوں کی رائے جو کچھ بھی رہی ہو جسٹس دلیپ سنگھ نے اپنے فیصلہ میں یہ لکھ دیا کہ کتاب کی عبارتیں کیسی ہی ناخوش گوار ہوں بہرحال کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہیں، اور اس لیے حدود قانون کے اندر ہیں۔ اس فیصلہ کا شائع ہونا تھا کہ پنجاب ہی میں نہیں، سارے اسلامی ہند میں ایک آگ لگ گئی، اور جسٹس دلیپ سنگھ چونکہ نام سے ہندو یا سکھ معلوم ہو رہے تھے (حالانکہ واقعۃً مسیحی تھے) اس لیے قوم کے سارے غصہ کا مرکز و محور ان ہی کی ذات کو بننا پڑا ــــــ سارے مسلمان جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اخبارات خصوصاً پنجاب کے اخبارات، ایک سے بڑھ کر ایک تیز مضمون لکھ رہے تھے، تقریریں شعلہ برسا رہی تھیں۔ لیکن خاموش تھے تو ایک مولانا! ساکت تھا تو ان ہی کا اخبار ہمدرد۔

ان کا سکوت معاصرین کو انتہائی بے محل نظر آیا۔ اور جن کے سینوں میں رقابت کی آگ مدت سے دبی ہوئی تھی، انھیں تو کھل کھیلنے کا جیسے خداداد موقع ہاتھ آگیا ــــــ یاد کر لیجیے کہ کتنی پارٹیاں کسی نہ کسی سبب سے مولانا سے جلی ہوئی بیٹھی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی اور ان کے ساتھ کے سارے "خوش عقیدہ" صوفیہ و مشائخ۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اور ان کے ساتھ کے سارے اہل حدیث اور غالی "غیر مقلدین"۔ سرکار انگریزی کے وفادار و خیر خواہ سارے "خان بہادر" رئیس اور امیر وغیرہا ــــــ اب سب کے سب مل کر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے شور بلند ہو گیا کہ "دیکھ لی محمد علی کی ہندو پرستی، ناموس رسولؐ پر اتنا بڑا حملہ ہو گیا اور ٹس سے مس نہ ہوئے، بولیں کیسے، ہندو کانگرس سے تنخواہ پا رہے ہیں۔ گاندھی جی اور موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی اور سیٹھ برلا کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں نا! وقس علی ہذا۔

محمد علی انتہائی جوشیلے ہونے کے باوجود بہرحال ہوش بھی ذمہ دارترین لیڈر کا رکھتے تھے۔

اور اپنا کام ہر تیز دھارے کے ساتھ بہنا نہیں، بلکہ عوام کو سیدھی راہ دکھانا، ملت کی صحیح رہنمائی کرنا جانتے تھے۔ ہفتوں بلکہ شاید مہینوں تک صبر و تحمل کے ساتھ گالیاں کھانے، آوازے سننے کے بعد بالآخر بولے۔ اور وہ بول بولے جسے سب کو سننا، سب کو ماننا پڑا، اور بالآخر اسی کے آگے سب کو جھکنا پڑا۔ جون کی ۲۰ تھی جب مولانا کا پہلا مضمون اس بحث پر ہمدرد میں نکلا، اور پھر ۱۰ اگست کو۔ اور بھی ان کے مضامین نکلے ہوں گے۔ لیکن اس ڈائری کو تعلق ان کے مضامین سے نہیں، اس کا تعلق تو ان کی زندگی سے متعلق ڈائری نگار کے صرف ذاتی مشاہدات سے ہے۔

جولائی کی ۱۵ تھی، کہ لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ کے مسلمانوں نے ایک بڑا ہی زبردست احتجاجی جلسہ لکھنؤ میں کیا، اور صدارت کے لیے مولانا کو دہلی سے بلایا۔ اتنا بڑا اور پُرشوکت جلسہ مسلمانوں کا لکھنؤ میں کمتر ہی ہوا ہوگا۔ تحفظ ناموس رسولؐ کے نام میں کشش ہی ایسی تھی شیعہ سنیوں میں چلی ہوئی تھی لیکن آج کلمہ کی وحدت نے سب کو گلے ملا دیا تھا۔ نقیب اہل سنت النجم کے مدیر، اور شیعہ کانفرنس کے سکریٹری دونوں صدر محترم کے پہلو میں ایک ہی تخت پر بیٹھے ہوئے امیر، غریب، عوام، خواص، وہابی، بدعتی، قادیانی، اہل قرآن، سب کے سب آج صرف کلمہ گو تھے، اور ناموس رسولؐ کے محافظ۔ تحریک خلافت کے عین شباب کے زمانہ کی طرح آج چھوٹا اور بڑا مسلمان ہی ہر طرف سے ابلا پڑ رہا تھا —— یہ دریابادی، محمد علی کی آمد سن حسب معمول لکھنؤ پہلے سے آگیا، اور پیشوائی کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا ہی۔

جلسہ بعد عصر رفاہ عام حال کے عقبی میدان میں ہوا، اس وقت تک پبلک جلسے عموماً یہیں ہوا کرتے تھے، امین الدولہ پارک کا نام بطور جلسہ گاہ کے اب دو ہی چار سال سے آنا شروع ہوا تھا۔ عبرت اور بصیرت کی آنکھ یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ یہی جگہ جہاں ابھی کل دو برس پہلے مسئلہ حجاز

پر محمد علی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تھے، اور شور و غل کر کے انھیں بولنے ہی سے روک دیا گیا تھا اور کہاں اب اس عقیدت و محبت کے ساتھ سب کی نظروں کے مرکز وہی بنے ہوئے ہیں، اور ان کے ایک ایک فقرہ پر تحسین کے نعرے بلند ہو رہے ہیں!

مولوی ظفر الملک علوی (اڈیٹر الناظر مرحوم) بڑے پرجوش لوگوں میں تھے، کہنا چاہیے کہ جوش مجسم تھے۔ شروع میں تقریر ان ہی کی ہوئی، اور اس نے مجمع میں ہلچل سی ڈال دی مجمع اشتعال پذیر پہلے ہی سے تھا، اب یہی معلوم ہوتا تھا کہ جما جمایا جلسہ اکھڑ جائے گا، اور مجمع خود قانون کو ہاتھ میں لے کر کچھ نہ کچھ کر ہی گزرے گا۔ لیکن واہ رے محمد علی۔ جلسہ کو اب سنبھالنا ان ہی کا کام تھا۔ آج کی تقریر نرم و گرم، جوش و ہوش کا ایک عجیب و دلچسپ اور اثر آفریں مجموعہ تھا پہلے تو انھوں نے جلسہ کو خوب گرمایا، اور پھر ٹھنڈا بھی خوب ہی کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ

"ایسی کتابیں اور مضامین یقیناً ہر مسلمان کا خون کھولا دینے کے لیے کافی ہیں۔ جتنا بھی جوش و خروش آپ میں پیدا ہو، سب بجا ہے۔ لیکن اصل کوشش فتنہ کے سرچشمہ کو بند کرنے کی ہونی چاہیے نہ کہ فلاں جج کو ہٹا دینے کی۔ قصور قاضی کا نہیں، قصور خود قانون کا ہے۔ میں کوئی وکیل نہیں، بیرسٹر نہیں۔ قانون میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو ہو کر سیکھا ہے۔ تو مجھ عامی کا پرزور مشورہ یہی ہے کہ آئندہ سدباب فتنہ کے لیے قانون ہی کو بدلوائیے، اور تعزیرات ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیان مذاہب کو جرم قرار دیجئے۔ اب تک یہ کوئی مستقل جرم ہی آپ کے ملکی قانون میں نہیں۔ رعایا کے فرقوں کی دلآزاری کے تحت میں لا کر بعض عدالتیں ایسے مجرموں کو سزا دے دیتی ہیں۔ لیکن یہ تو حاکم کی رائے ہوئی۔ کوئی مستقل قانون تو نہ ہوا۔ میں اسمبلی کا ممبر نہیں، دفعہ کا مسودہ میں تیار کیے دیتا ہوں، کوئی ممبر صاحب اس میں مناسب لفظی ترمیم کر کے اسے اسمبلی میں پیش کریں

اور منظور کرائیں، تاکہ ہمارے آقا و ہادیؐ اور ان کے ساتھ تمام دوسرے مذہبوں کے محترم بانیوں کی بھی شخصیتیں بدزبان و بے لگام لکھنے والوں کے حملہ سے محفوظ رہیں۔ علمی رنگ میں کسی مذہب پر یا تاریخی حیثیت سے کسی مذہب کے بانی پر سنجیدہ تنقید کرنا بالکل دوسری شے ہے، اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے، لیکن جو طعن و تعریض، توہین اور سب و شتم جو کسی مذہب کے بھی پیمبر یا دوسرے بزرگانِ دین کے حق میں ہو آج سے اسے ہندوستان کے قانون میں قطعی جرم قرار دیا جانا چاہیے

یہ تقریر محمد علی کی صحیح اور تاریخی رہنمائی کی ایک مثال تھی، شروع شروع اقبالؒ تک اس کے موئد نہ تھے۔ رفتہ رفتہ سارا ملک تائید کرنے لگا۔ اور کہاں تو قوم ایک بہت ہی محدود اور شخصی مقصد (جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے ہٹائے جانے) کے پیچھے مٹی ہوئی تھی۔ کہاں اس بلند اور اصولی مقصد کو اس نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کامریڈ تو بند ہی ہو چکا تھا۔ اب لے دے کے ہمدرد بچا تھا جس کی اشاعت خود ہی بہت محدود تھی، اور اشاعت زائد ہوتی بھی کیسے محمد علی کی تاکید شدید رہتی تھی کہ "اخباری سنسنی خیزی" سے ہمدرد اپنا دامن برابر بچائے رکھے۔ بہرحال کچھ اس کے سہارے، اور کچھ زبانی تقریروں سے، اللہ نے برکت یہ دے دی کہ یہی تحریک مقبول ہو گئی۔ اور چند ہفتوں کے اندر ایک ممبر نے اسمبلی میں تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۵ میں اضافہ کرا کے، دفعہ ۲۹۵ الف کے نام سے یہ دفعہ بھی منظور کرا دی جس کے الفاظ تک اصلاً محمد علی ہی کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ دفعہ جب تک بھی ملک کے قانون میں موجود رہے گی اس کا اجر ان کے نامۂ عمل میں ثبت ہوتا رہے گا ———— خدمت دین و ملت کے جو مستقل کام محمد علی اپنی مختصر سی زندگی میں انجام دے گئے، یہ اس کی کوئی منفرد مثا

پتہ

(۱)

صدق بک ایجنسی، کچہری روڈ (لکھنؤ)

(۲)

دارالمصنفین اعظم گڈھ

قیمت........ ے۸/

"ترکشِ مارا خدنگِ آخرین"!

محمد علیؒ

ذاتی ڈائری کے چند ورق

حصّۂ دوم

از

عبدالماجد دریابادی

صاحبِ تفسیر القرآن، مؤلف حکیم الامّت، مُدیر صدق جدید (لکھنؤ)

باہتمام

مولوی مسعود علی ندوی

مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ

قیمت :- صہ (اقبال احمد تحریر نمود) ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

محمد علی

حصۂ دوم

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب (۶۸)

۱۹۲۷ء (۳)

بیباکی، شوخی، فراخ دلی

اسی ۲۷ء کا جون یا جولائی ہے۔ اور محمد علی لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ شہر کے ایک معزز گھرانے میں تقریب ہے۔ مولوی عبد الغنی پنشنر ڈسٹرکٹ وسشن جج[1] ہیں تو پنجابی، مگر لکھنؤ ہو چکے ہیں۔ اُن ہی کی تیسری لڑکی کی شادی مشہور اسلامی مشنری خواجہ کمال الدین احمدی لاہوری (دوکنگ مشن والے) کے لڑکے کے ساتھ ہے۔ اور بارات لاہور سے آئی ہوئی ہے۔ محمد علی کے تعلقات دلہن کے گھرانے سے بڑے پرانے اور گہرے ہیں۔ بڑی لڑکی کے شوہر حسن محمد حیات ہیں۔ محمد علی کے رفیق قدیم اور ان کے سنہ ۲۰ء والے یورپی وفد خلافت کے سکریٹری۔ محمد علی اسی خصوصیت سے وہاں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے ہیں، اور حیات صاحب کے بچوں اور بچیوں سے کھیل رہے ہیں —— ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ مولانا بچوں بچیوں کے ساتھ کھیلنے کے حریص تھے ——

بعد مغرب بزم عقد آراستہ ہوئی۔ عین اس زمانہ میں مصر کی ایک بڑی "روشن خیال" خاتون ہندستان آئی ہوئی تھیں اور اس وقت لکھنؤ کے اونچے حلقوں میں شمع بزم بنی ہوئی تھیں، کیسے ممکن تھا کہ یہ

[1] اودھ چیف کورٹ کے چیف جج اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج جسٹس غلام حسن بٹ کے ماموں اور خسر اور اب مرحوم (۱۹۵۱ء)

جلسہ ان سے محروم رہتا۔ اودھ چیف کورٹ کے ایک مشہور جج (غالباً اُس وقت چیف جسٹس) معزز ترین مہمان تھے، ان ہی کے پہلو میں اپنے برہنہ بازوؤں اور گوری پنڈلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی۔ خواجہ صاحب ایجاب و قبول سے قبل تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، اور سورۂ نسا کی جو آیتیں نکاح کے خطبۂ مسنون کا جز ہیں، انھیں پڑھ کر ان کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ فرنگی تہذیب کی بے اعتدالیوں اور بےحیائیوں کا ذکر یوں بھی لانا ضروری تھا، اور پھر اب تو سامنے فرنگیت کا ایک مجسم نمونہ بھی موجود تھا، تقریر کا رُخ ابھی یورپی مشاہدات کی طرف مڑا ہی تھا کہ ان چیف جسٹس صاحب نے اپنے عہدہ و رتبہ کی بڑائی سے فائدہ اٹھا کر، اور عام آداب محفل کو ٹھکرا کر، متقربت ارشاد فرمایا "بس ان حملوں کو ختم کیجئے۔ یورپ کی زندگی کا تجربہ رکھنے والے دوسرے بھی ہیں" ——— خواجہ صاحب ایک مشہور مقرر، مبلغ و مناظر ہی نہ تھے۔ اس محفل میں تو سمدھی کی اور نوشہ کے باپ کی حیثیت سے بھی ہر لحاظ و احترام کے مستحق تھے۔ کوئی دوسرا انھیں یوں ٹوکنے کی جرأت کرتا، تو شاید اس کا منہ نوچ لیا جاتا۔ اور عجب نہیں جو صاحب خانہ اسے اپنی ذاتی توہین سمجھ کر ایسے مہمان کو محفل ہی میں موجود رہنے کی تکلیف نہ دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اودھ کے سب سے بڑے عدالتی حاکم کا تھا۔ حاضرالوقت وکیلوں، بیرسٹروں، ڈپٹیوں، منصفوں، سب ججوں میں سے کسی کی مجال تھی، "چوں" بھی کرسکے!

جسٹس موصوف کے فقرہ کی گونج ابھی فضا میں ختم ہوئی تھی کہ بجلی کی سی تیزی سے ایک آواز بلند ہوئی: "اور آپ کے ان یورپی تجربوں میں شریک رہنے والا اور ان کا گواہ کوئی اور بھی ہے"! آواز صدر محفل سے نہیں، دور سے ایک گوشہ سے آئی تھی، معاً سیکڑوں گردنیں اُدھر مڑ گئیں، صدہا آنکھیں اُدھر اٹھ گئیں، کہ ایسا بیباک اور سر پھرا ہو کون سکتا ہے! ——— دیکھنے والوں نے دیکھا، تو یہ نقرہ دینے والا، داڑھی رکھے ہوئے اور کھدر کی عبا پہنے ہوئے، آکسفورڈ کا گریجویٹ

محمد علی تھا! محمد علی، نوشہ کا تخت، اور صدر مجلس کے صوفے اور کوچ چھوڑ عام حاضرین میں ملے جلے کھڑے ہوئے تھے، اور وہیں سے یہ فقرہ بول اٹھے تھے ——— جاننے والوں پر روشن تھا کہ اس وقت کے جسٹس صاحب ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے ایک ایڈوکیٹ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔ اور اسی سکریٹری کی حیثیت سے ان ہی محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی رفاقت میں بہ سلسلۂ ہنگامۂ مسجد کانپور[1] وفد لندن روانہ ہوگئے تھے، اور وہاں ان کی زندگی کا کوئی سا بھی گوشہ محمد علی سے مخفی نہیں رہا تھا، تلمیح بہت بلیغ اور معنی خیز تھی۔ لیکن بجز اس کے کہ اس تلخ گھونٹ کو خاموشی سے اتار لیا جائے، کوئی اور چارہ ہی کیا تھا؟

محمد علی کے لیے خلوت و جلوت یکساں تھی۔ اور جہاں تک مذہب و اخلاق کی نصرت و حمایت کا تعلق تھا، وہ ان کے لیے ہر جگہ ہر وقت شمشیر برہنہ ہی تھے۔

یہی محفل عقد جمی ہوئی ہے۔ مخصوص معززین صدر میں صوفوں اور کوچوں پر بیٹھے ہوئے ہیں باقی ادھر ادھر ٹھٹ لگائے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں علی گڈھ کے اولڈ بوائے ایک ڈپٹی صاحب بھی ہیں۔ جو غالباً اس وقت لکھنؤ ہی میں مجسٹریٹ ہیں۔ خواجہ صاحب کی تقریر ہو رہی ہے، اور لوگ سننے میں منہمک ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب دبے پاؤں ان مجسٹریٹ صاحب تک ان کی پشت کی طرف سے پہنچتے ہیں، اور سر پر ایک چپت جما دیتے ہیں! ڈپٹی صاحب، شہر کے حاکم اور پھر اتفاق سے خان صاحب بھی۔ قدرۃً دنگ اور حیران، غصہ سے بھرے ہوئے منہ پھیر کر دیکھنے لگے کہ بھری محفل میں ایسی حرکت ناشائستہ کر کون سکتا ہے ——— دیکھتے کیا ہیں کہ یہ حضرت پیشوائے ملک و قوم، صدر کانگریس، صدر خلافت مولانا محمد علی ہیں!

[1] اسی مسجد کا ہنگامہ ذکر جلد اول باب ۴ نمبر (۱) میں آچکا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو آگے کا باب ۳۰ - قریب وسط۔

محمد علی کے زمانہ میں یہ صاحب بھی علی گڈھ میں تھے، گو ان سے جونیر۔ وہی بے تکلفی، یگانگت محمد علی کی طرف سے آج تک قائم تھی۔ حالانکہ اب سالہا سال سے ان سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا، بلکہ اس وقت تو محمد علی بہرحال سرکار برطانیہ کے مجرم ہی تھے، اور وہ ڈپٹی صاحب حاکم شہر! ——

تصنع و تکلف محمد علی جانتے ہی نہ تھے جس کسی سے ان سے راہ و رسم زندگی کے کسی دور میں بھی ہو گیا بس وہ، اپنی طرف سے اسے آخر دم تک نباہنے کو تیار۔ اور اس میں نہ وہ اپنے مرتبہ کو دیکھیں نہ اس کے مرتبہ کو۔ ہاں بجز اس صورت کے کہ وہ کوئی دینی، ملی، قومی جرم کر کے انھیں ناخوش کر دے۔ بس پھر تو وہ اس کی شکل تک سے بیزار ہو جاتے، اور اس سے بات تک کرنے کے روادار نہ رہتے۔

محمد علی کے لیے کوئی سال اب صدموں اور سخت صدموں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ناموس رسول پر بعض گندہ دہنوں کی طرف سے حملے ہوتے رہتے تھے، ان کا اثر قلب پر ان سے بڑھ کر لینے والا اور کون تھا۔ پھر اپنی ہی قوم کی طرف سے شدید مخالفت اور مسلسل بغاوت۔ اس پر مستزاد روزافزوں ہندو مسلم مناقشات اور اندرون ملک قومی انتشار۔ گاندھی جی اور علی برادران کی کوششیں برابر ناکام ہوتی جاتی تھیں۔ ایک رخنہ کو بند کرتے تھے، تو چار رخنے نو سرے پیدا ہو جاتے تھے۔ اور سال کے خاتمہ پر دلی کے مشہور و معروف طبیب اعظم اور خادم خلق حکیم محمد اجمل خان کی یک بیک موت نے تو محمد علی کا دل ہی بالکل بجھا دیا۔ حکیم صاحب نے عمر کل ۶۰، ۶۲ سال کی پائی، اور موت اتفاق سے خاص محمد علی کے وطن رامپور ہی میں ہوئی۔ گو وہ وطن ایسا تھا کہ اس سے بحکم ہز ہائینس نواب حامد علی خاں، والی رامپور، علی برادران مدت سے جلاوطن تھے، اور سخت سے سخت خانگی ضرورت کے وقت بھی اس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔

یہ سب سیاسی اور ذاتی فکریں، اور پریشانیاں تو تھیں ہی، گھلا دینے والا ایک بڑا غم یہ تھا کہ

ان کا نقیب و ترجمان ہمدرد مالی اعتبار سے برابر گرتا جا رہا تھا، اور اسی نسبت سے محمد علی کی مالی حالت بھی، روز بروز زبوں سے زبوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ دلی ہر دفعہ جا کر یہی تاسف انگیز منظر دیکھنا پڑتا تھا کہ خرچ سب وہی، وہی حوصلہ مندیاں، وہی مہمان داریاں، اور آمدنی جو کل تھی، آج اتنی بھی نہیں۔ عادت موٹر پر سوار ہونے کی تھی۔ وہ اب کہاں نصیب۔ نماز جمعہ کے لیے التزام جامع مسجد کی کیے ہوئے تھے۔ وہاں کے لیے تانگہ ہی سے کام لیتے تھے[1]۔ اور کبھی جب تانگہ کا بھی کرایہ جیب میں نہ ہوا، تو پیدل ہی چل کھڑے ہوتے۔ ایک روز شام کو ڈاکٹر انصاری کے ہاں جانا تھا، پیدل ہی گئے، پیدل ہی آئے۔ راستہ میں کہیں میری زبان سے نکل گیا کہ "کیا عرض کروں، میں تو دلی بار بار آنے کے لیے تیار رہتا ہوں، آپ کو کبھی دوبارہ حکم دینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اگر ریلوے کمپنی کہیں اپنی معتقد ہوتی، تو یہ مسئلہ بھی حل تھا۔" معاً ان کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو گیا، بولے کہ "دفتر ہمدرد بڑی خوشی سے مصارف آمد و رفت پیش کر دیا کریگا"۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، فوراً بات بدلی۔ یہاں لکھنے سے مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ محمد علی مفلسی میں بھی ہمت وہی رکھتے تھے۔ خود اچھا کھانا یقیناً چاہتے تھے لیکن اس سے بھی مقدم دوسروں کو کھلانا رکھتے۔

---

[1] اور ستم یہ کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر فقیروں اور فقیرنیوں کا غول جمع رہتا، انھیں دینے کے لیے جیب میں دو چار روپیہ کی ریزگاری ضرور رکھتے۔

باب (۶۹)

۱۹۲۸ء (۱)

(غیروں کی محفل میں ۔ تنگدستی)

۲۸ء کا آخر تھا کہ لکھنؤ میں سکھوں کے ہاں کوئی بڑی تقریب ہوئی جس میں شرکت کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے سکھ لیڈر لکھنؤ آئے۔ ایک دن اعلان ہوا کہ شام کو چراغ جلے گنگا پرشاد میموریل ہال میں پبلک جلسہ میں سردار منگل سنگھ اور بابا کھڑک سنگھ تقریر کریں گے۔ منگل سنگھ اس وقت کانگریس میں بہت پیش پیش تھے، غالباً ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی۔ بابا کھڑک سنگھ کا اثر و اقتدار کانگریسی حلقہ کے علاوہ بھی بہت تھا۔ اور اس وقت چوٹی کے سکھ لیڈر شاید یہی کہے جا سکتے تھے۔ اتفاق سے مولانا بھی اسی دن لکھنؤ آ گئے۔ اور وہ کانگرس کے تازہ سابق صدر تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ جلسہ میں مدعو نہ کیے جاتے۔ جلسہ ایک مسلمان (اس وقت کے نیک نام اور بعد کے "بدنام") مقامی لیڈر چودھری خلیق الزمان کی صدارت میں شروع ہوا ——— [illegible] و [illegible] کے دور خلیق سے قبل خالص سکھوں کے جلسہ بھی مسلمان کی صدارت میں ہو سکتے تھے، اور چودھری صاحب اس وقت ہند و مسلمان دونوں کے لیڈر تھے ——— اور ڈائس پر مولانا بھی دونوں سکھ لیڈروں کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ پہلے سردار منگل سنگھ بولے۔ اور وقت کی سیاست کی ترجمانی کرتے رہے۔ اور پھر بابا کھڑک سنگھ کھڑے ہوئے۔ چہرہ پر درویشانہ اشراقیت کی جھلک۔ تقریر شروع کی تو سیاست

سے کہیں زیادہ مذہب اور روحانیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی، کہیں شیخ سعدی کے اشعار، اور کہیں دوسرے مسلمان صوفیوں کے حوالے۔ ان کی تقریر جاری تھی کہ صدر جلسہ کو کہیں اور جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ میری طرف اشارہ کیا، اور ڈائیس پر بلایا۔ میں سمجھا کہ کوئی ضروری بات کہنا ہوگی۔ پہنچا، تو جھٹ اپنی کرسی خالی کر کے مجھے بٹھا دیا، اور کان میں چپکے سے یہ کہتے ہوئے چل کھڑے ہوئے کہ "میری جگہ تم ہی اب صدارت کر لو، مجھے جانا ہے"۔ انکار و گفتگو کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اب یہ خاکسار تھا اور کرسیٔ صدارت۔ کھڑک سنگھ کا دو دیشانہ وعظ کچھ دیر بعد ختم ہوا۔ اور مولانا کی باری آئی۔

محمد علی کی تقریر مذہب اور سیاست کا "آمیزہ" تو ہمیشہ ہی ہوتی تھی، اور پھر آج تو جلسہ کہنا چاہیے کہ غیر مسلموں ہی کا تھا۔ آج سے بڑھ کر تبلیغ کا موقع اور کب ملتا۔ پوری تقریر اب کہاں! ایک ذرا سا ٹکڑا حافظہ میں رہ گیا۔ خرمن کا اندازہ ان ہی چند دانوں سے کیجیے:

"میرا مذہب عدل کا مذہب ہے۔ میں تو اپنے مذہب کے لحاظ سے کسی پر ظلم زیادتی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مسلمان کے ساتھ مسلمان کے خلوص کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو ناانصافی سے روکیں، عدل و خوش خلقی کی تلقین و تبلیغ کرتے رہیں "my country, right or wrong" (حق ہو یا ناحق، بہرحال ہمیں تو اپنے وطن کا ساتھ دینا ہی ہے) اور جس کسی کا بھی اصول ہو، مسلمان کا یہ مسلک نہیں ہو سکتا۔ ہمارے رسولؐ نے ایک بار فرمایا

انصر اخاک ظالما او مظلوماً — اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو،

صحابہؓ نے عرض کیا، کہ حضرت مظلوم بھائی کی مدد تو سمجھ میں آگئی، وہ تو بیشک ہمارا فرض ہے لیکن ظالم مسلمان کی مدد سمجھ میں نہ آئی۔ وہ اگر ظالم ہے تو کیا اس کے ظلم پر ہم اعانت کریں؟ ارشاد ہوا کہ ظلم پر اعانت ہرگز نہیں۔ ظالم بھائی کی مدد یہی ہے کہ اسے ظلم سے روکو، باز رکھو۔ یہی اس کی تھی

سچی دوستی اور یہی اس کی حقیقی خیر خواہی ہے۔ تو حضرات میرا کام تو اللہ کی سرزمین کو عدل سے بھر دینا ہے میرا مذہب ساری دنیا کے لیے رحمت ہے مسلمان تو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ عدل کی حکومت پھیلائے۔"

یہ تقریر کانگریس کے سابق صدر کی تھی! ——— ۸، ۱۰ سال قبل عین نظر بندی کے زمانہ میں، ریل پر دوران سفر میں محمد علی نے اپنے اس نیاز مند سے جوش و خروش کے لہجہ میں کہا تھا کہ اب دھن ہے تو اس کی کہ نظر بندی سے چھوٹوں، تو یورپ پہنچوں اور وہاں گلی گلی اسلام کی تبلیغ کرتا پھروں[1] ——— دیوانہ اپنی وہی صدا اب لگاتا پھر رہا تھا!

۲۸ء کی پہلی سہ ماہی تھی کہ سرکار برطانیہ نے ہندوستان کی آئینی آزادیوں کی تحقیق اور ہندوستانیوں میں خود مختاری کی جانچ کے لیے ایک کمیشن سر جان سائمن کی صدارت میں بڑی دھوم دھام سے ہندوستان بھیجا۔ یہاں مخالفت بھی اس کی اسی زور شور سے ہوئی۔ اور شہر شہر سائمن گو بیک" (سائمن واپس جاؤ) کے کرخت نعرے سیاہ جھنڈیوں کے جلوس کے ساتھ لگنے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت، برادرانِ وطن کی تنگ نظری سے تنگ آکر اس کمیشن کے ساتھ اتحاد کو تیار ہو گئی۔ لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ ایک سہ پہر کو امین الدولہ پارک میں کمیشن کی مخالفت و مقاطعہ کے لیے منعقد ہوا۔ اتفاق سے محمد علی بھی لکھنؤ میں موجود تھے، اور مولانا ابو الکلام اور حسرت موہانی بھی۔ جلسہ میں ان تینوں کا موجود ہونا لازمی۔ خبر یہ گرم تھی کہ مسلمانوں کا ایک بڑا جتھا، شہر کے ایک ذی اثر عوامی لیڈر (مولوی حکیم وزیر حسن مرحوم[2]) کی قیادت

[1] ملاحظہ ہو جلد اول، باب ۱۱- نمبر ۱ (۱) [2] ایک زبردست و پرجوش عوامی لیڈر تھے۔ پاکستان بنتے ہی کراچی منتقل ہو گئے۔ اور چند ہی ماہ بعد وہیں انتقال فرمایا۔

میں آئے گا، اور جلسہ میں آکر بولنے والوں کا ناطقہ بند کرے گا۔ اور مشہور یہ تھا کہ حسرت موہانی بھی اسی گروہ کے پشت پناہ ہیں۔ فضا ہو بھی ایسی چکی تھی کہ ہندوؤں کے مسلسل متعصبانہ طرزِ عمل کے باعث مسلم عوام کے دل ان سے ہٹ چکے تھے، اور اب وہ کسی حد وجہ میں بھی ان سے اشتراک نہیں چاہتے تھے۔ خیر وہ لوگ آئے۔ اور اب منظر قابلِ دید تھا اس جتھے کے منہ لگنا اپنی عزت و وقار بلکہ اپنی جسم و جان سب کو خطرہ میں ڈالنے کے مرادف تھا۔ اس لیے اب کسی بڑی سی بڑی شہرت رکھنے والے مسلم لیڈر میں تقریر کرنے کی ہمت کہاں تھی۔ یہ ہمت صرف محمد علی نے کی۔ کھڑے ہوئے، اور کچھ دیر بولنے کے بعد سوال حسرت موہانی سے کیا۔

"حسرت صاحب، آپ کمیشن کے ساتھ موافقت کے حق میں ہیں یا مخالفت کے؟"

"جی میں نہ موافق ہوں نہ مخالف۔"

"اچھا، تو یہ کہیے، کہ آپ نہ "کوآپریشن" کرنا چاہتے ہیں نہ "نان کوآپریشن"۔ بلکہ صرف آپریشن چاہتے ہیں۔"

جلسہ اس پر خوب ہنسا، اور خوب کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کے بعد مولانا، مخالفین کے لیڈر حکیم صاحب سے مخاطب ہوئے، اور ذیل کے فقرے ان سے کہے:۔

"حکیم صاحب۔ آپ میری تقریر سن چکے، اب بھی آپ ان لوگوں کے رویہ کو پسند کرتے ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں! اگر نہیں، تو ابھی اور یہیں ان لوگوں کے سامنے امر بالمعروف کیجیے۔"

حکیم صاحب بیچارہ کو اب تقریر کرتے ہی بنی کمیشن کی موافقت میں نہیں، مخالفت میں!

مخالفین کی کثرت و شوکت سے محمد علی مرعوب و متاثر ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ کہا کرتے تھے کہ "تبلیغ کا حق تو ابوجہل کے سامنے تقریر کرنے سے ادا ہوتا ہے، ابوبکر صدیقؓ کو کوئی کیا تبلیغ کریگا۔"

محمد علی کی مالی اور خانگی پریشانیاں اب حد کمال کو پہنچ رہی تھیں۔ قرضہ سے لدے ہوئے
تھے۔ ہمدرد سے زیر باری اور بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مخلصوں اور نیازمندوں کی سمجھ میں نہیں آتا
تھا کہ آخر اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ مارچ و اپریل میں ہم نیازمندوں نے ان ہی مسائل سے
متعلق لکھے۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ دل کو ڈھارس دیے رہیے۔ اپنی طرف سے تقویٰ الٰہی پر قائم رہیے۔
کشایش رزق کی، بالکل غیر متوقع سمتوں سے، بشارت بلکہ وعدہ تک موجود ہے۔ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ
یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ شوقینی کے ساتھ تو نہیں،
البتہ بالکل سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی کھدر scale کے مطابق یعنی سادی زندگی کو
کھدری لباس کے پیمانہ پر لا کر یہ بتائیے کہ گزر بسر کتنے ماہوار میں ہو سکے گی، تاکہ ہم نیازمند کچھ اس کی
فکر کر کے دیکھیں۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ ہمدرد اگر بند ہی کر دینے کا تہیہ آپ فرما چکے ہیں، تو پھر اور
کیا کرتے رہنے کا ارادہ ہے؟ مختلف انگریزی ولایتی پرچوں میں اگر مہینہ میں آپ چند ہی مضامین
لکھ دیا کریں، تو بآسانی معقول معاوضہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر سینٹ نہال سنگھ[1] وغیرہ کا یہی ذریعۂ
معاش ہے۔ ایک خط میں یہ بھی عرض کر دیا کہ خود آپ کی مالی حالت تو ظاہر ہی ہے، شوکت صاحب
کا خدا معلوم کیا حال ہے، عجب نہیں جو آپ سے تو بہتر ہی ہو۔ وقس علیٰ ہٰذا
شروع اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ اور ڈاکٹر سید محمود[2] (سابق سکریٹری مرکزی خلافت کمیٹی جو
جواب بھی علی برادران کے خاص مخصوصوں میں تھے) بھی کسی تقریب سے لکھنؤ آئے ہوئے۔ محل سرائے
فرنگی محل میں ہم دونوں قطب میاں صاحب کے ہاں یکجا ہوئے۔ اور ہم تینوں کی زبان پر بیک وقت
یہی مسئلہ محمد علی کی معاشیات کا آیا۔ تینوں یکساں مخلص اور اس وقت تک محمد علی کی محبت و عقیدت
میں غرق ——— قطب میاں کے لیے یاد کر لیجیے کہ علی برادران کے شیخ و مرشد مولانا عبدالباری

[1] اپنے زمانہ کے ایک مشہور انگریزی مضمون نگار کا نام، ہندوستانی عیسائی تھے [2] موجودہ وزیر صوبہ بہار (جنوری ۱۹۵۲ء)

فرنگی محلیؒ کے بھتیجے، اور اُن کے جانشین تھے، مولاناؒ کے صاحبزادہ جمال میاں صاحب (جو آگے چل کر
ایم۔ اے، اور مالک و ایڈیٹر ہمدم ہوئے) اس وقت تک بہت چھوٹے تھے، اور اس لیے
اس وقت مولانا کے جانشین اور خلیفہ قطب میاں صاحب ہی بلاشرکت غیرے تھے ——— دیر کی
رد و قدح کے بعد آخر یہ طے پایا کہ محمد علی کے خوش حال مداحوں اور معتقدوں میں سے ۱۰، ۱۲ ایسے
لوگ انتخاب کر لیے جائیں، جو ہر حال میں نذرانہ پیش کرتے رہنا اپنا فریضۂ اخلاص سمجھیں، اور سیاسیات
کے اتار چڑھاؤ سے غیر متاثر رہ کر اپنا تعلق محمد علی کی ذات سے وابستہ رکھیں، اور نذرانہ فی کس کم از کم
عـــہ ۲۵ ماہوار تجویز ہوا۔ گویا اس طرح کاغذ پر ماصہ ۲۵۰ یا ۳۰۰ ماہوار کی آمدنی کا انتظام کر لیا گیا۔
اور تلاش و واقفیت کی دنیا میں ان دس بارہ ناموں کی شروع ہوئی۔ قطب میاں اور ڈاکٹر محمود
یہ دونوں تو تھے ہی، باقی ۱۳ نام اور خیال میں رکھ لیے گئے۔ عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی،
نواب محمد اسمٰعیل خاں، شاہ مصطفیٰ احمد ردولوی، سیٹھ عبداللہ ہارون، وغیرہم۔ کہ ان میں سے کٹ چھنٹ کر
۱۰، ۱۲ نام تو بہرحال یقینی نکل آئیں گے۔ ڈاکٹر محمود صاحب کو اخلاص خصوصی شوکت علی کی ذات سے
تھا، انھوں نے زور دیا کہ ان کی معاش کا بھی انتظام ضروری ہے۔ رقم کی میزان اس لیے دوگنی کرنی
پڑی۔ خطوط زیادہ تر اس خاکسار ہی نے لکھے۔ کراچی کے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کا جواب بڑی
مستعدی سے اور ہمت افزا آیا۔ حسن اتفاق سے ایک اس طرح کے خط کا مسودہ اتنے دنوں کے
بعد ہمیں ان سطروں کی تحریر کے وقت اپنے کاغذات میں محفوظ نکل آیا۔ باب کے آخر میں بہ طور
ضمیمہ کے ملاحظہ فرمائیے۔ خط کے مکتوب الیہ کا نام اب پوری طرح ذہن میں نہیں۔ عجب نہیں
جو قاسم حسن بدایونی مرحوم ہوں۔ جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور علی برادران ہی کی محبت کے جرم
میں سرکاری ملازمت سے علٰحدہ کر دیے گئے تھے۔ حیدرآباد چلے گئے تھے اور وہاں کسی عہدہ
پر مامور تھے۔ سیٹھ صاحب مرحوم کا جواب بھی محفوظ رہ گیا۔ ضمیمہ میں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

(۱)

دفتر صدر اودھ خلافت کمیٹی — ۱۵ر اپریل ۲۶ء

دریاباد۔ بارہ بنکی

مخدوم و مکرم — السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ غالباً مجھ سے واقف ہی نہ ہونگے۔ لیکن آپ سے مجھے مولانا محمد علی نے ناواقف نہیں رکھا ہے۔ آپ کے ان کے جو گہرے مخلصانہ تعلقات ہیں، ان ہی نے اس نیاز نامہ کی تحریر کی مجھے جرأت دلائی ہے۔

مولانا کی مالی حالت جس قدر زبون و ابتر ہو رہی ہے۔ اس کا حال آپ کو شاید مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہو۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اگر حیدرآباد، یا بھوپال، یا کم از کم محمود آباد ہی سے کسی معقول وظیفہ کی توقع ہوتی، تو پھر کوئی دقت ہی نہ تھی لیکن مسلمان قوم کی قسمت ایسی کہاں اب اگر کچھ کرنا ہے تو ہم ہی غریبوں اور تہی دستوں کو کرنا ہے۔ اور اس میں بھی ہر شخص کو نہیں، بلکہ پورا اعتماد اور کامل خلوص رکھنے والے معدودے چند ہی افراد کو شریک کرنا ہے۔

مالوی جی کو سنا ہے کہ ان کی قوم ۵ ہزار ماہوار پیش کرکے ہر طرف سے بے فکر کیے ہوئے ہے۔ اتنی بڑی رقم تو ہمارے لیے خواب و خیال ہے۔ ہم اگر ۵، ۴ سو ماہوار کا بھی انتظام کر لے جائیں تو بڑی بات ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ۔۔۴ سو ماہوار کا انتظام ہم چند نیازمند آپس میں کرلیں، اور ایک سال

کی رقم ڈاکٹر انصاری صاحب یا دہلی کے کسی اور معتبر شخص کے پاس جمع کرادیں۔

کراچی کے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب نے سو ماہوار کا عطیہ منظور کر لیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود (بیرسٹر چھپرا) اور قطب میاں صاحب (فرنگی محل) اپنی اپنی حسب حیثیت پوری شرکت کریں گے۔ دونوں صاحب بہ خوشی وعدہ فرما چکے ہیں۔ میرٹھ کے نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کو آج ہی خط لکھ رہا ہوں عبدالمجید خواجہ[1] اور تصدق احمد خان شروانی سے اسی ہفتہ ان شاء اللہ آباد میں مل کر بات کہنا ہے۔ میری ذاتی رائے تو صرف مولانا محمد علی صاحب کے لیے اس انتظام کی تھی لیکن ڈاکٹر محمود صاحب کا اصرار ہے کہ "بڑے بھائی" کو بھی ضرور شامل رکھا جائے، اور اس لیے رقم دونی رکھنی پڑی۔

ضرورت و اہمیت پر آپ کو کچھ لکھنا میرے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔ آپ بطور خود جو کچھ بھی شرکت فرما سکتے ہوں، اس کے علاوہ حیدرآباد کے کسی اور صاحب کو بھی اگر شریک کر سکتے ہوں تو براہ کرم ضرور اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ آپ کے جواب کا انتظار ڈاک کی واپسی سے رہے گا۔ خدا کرے یہ نیاز نامہ آپ کو ٹھیک پہنچ جائے۔ اس لیے کہ آپ کے صحیح پتہ کا بھی مجھے علم نہیں۔ والسلام

عبدالماجد

(۳)

جواب مکتوب از حاجی عبداللہ ہارون صاحب

نیپیر روڈ، کراچی

۱۳ اپریل ۳۵ء

بہ ملاحظہ اقدس مولانا عبدالماجد صاحب

دریاباد

محترمی، السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۷ اپریل موصول ہوکر کاشفِ حالات ہوا۔

---

[1] یہ دونوں صاحب اس وقت الٰہ آباد کے نامور بیرسٹر تھے۔

میں نے مبلغ ایک ہزار روپیہ جو مولانا محمد علی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اس کا اعلان اخبار میں بھی کر دیا۔ میں نے ہمدرد کا وہ پرچہ ابھی تک نہیں دیکھا ہے۔ آپکے خط سے یہ معلوم ہوا۔ بہرحال مجھے اس قسم کا اعلان بہت ناپسند ہے۔ میرے جو تعلقات علی برادران سے ہیں، وہ اس طرح کے نہیں کہ اخبارات میں اس حقیر رقم کا اعلان کیا جاتا۔

آپ نے جو تجویز پیش فرمائی ہے وہ بہت مناسب ہے۔ علی برادران کے دوست و احباب کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ ہر ایک کچھ تھوڑی سی رقم بھی ان کے ذاتی اخراجات کے لیے مستقل طور پر مقرر کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ان کو نہایت آسانی سے ذاتی اخراجات کی طرف سے بے فکری رہ سکتی ہے۔

علی برادران نے جس ایثار اور قربانیوں کے ساتھ مسلمانوں اور اسلام کی خدمت کی ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ وہ اگرچہ اپنے مقاصد اور امیدوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تاہم ان کی حق گوئی، اور اسلام پرستی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور مستقبل میں ان کی مساعی کو ضرور سراہا جائے گا۔

میں دو سال تک مبلغ ایک سو روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ رہا خزانچی[1] ہونا تو بہتر ہو کہ آپ دہلی میں کسی کو مقرر فرما دیں۔ میں دور دراز جگہ پر رہتا ہوں، اور اس کے علاوہ مجھ پر اس قسم کی اور بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔

ہمدرد کے متعلق میں نے دہلی میں مولانا سے باتیں کی تھیں۔ موجودہ فضا میں ہمدرد کا چلنا دشوار ہے[2]۔ ہندوؤں کے طرز عمل نے مسلمانوں کو اس طرف سے بہت بدگمان کر دیا ہے۔

---

[1] ابتدائی تجویز سیٹھ صاحب کے خزانچی بنائے جانے کی تھی۔ [2] مولانا ابتک ہندوؤں کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے تھے، اور ہمدرد برابر ہندو مسلم اتحاد کی پالیسی کی علمبرداری کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی عام ہوا اب اس مسلک سے اکتا چکی تھی۔

اور وہ موجودہ حالت میں ہمدرد کی پوری قدر و قیمت نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں مولانا یا تو ہمدرد کو بند کر دیں[1] اور اپنے خیالات دوسرے اخبارات میں شائع کرتے رہیں۔ یا ہمدرد کو ہفتہ وار کر دیں، اور اس میں اپنے مضامین لکھا کریں۔ اس طرح سے ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی رہے گی۔ اگر فضا بدلی اور حالات موافق نظر آئے، تو اس کو پھر ترقی دی جا سکتی ہے،

مولانا کی صحت پر ہمدرد کے خسارہ کی وجہ سے برا اثر پڑ رہا ہے اور ایک آدمی اتنے افکار برداشت نہیں کر سکتا۔

مولانا جیسے قوی کام کرنے والے آدمی کو جسے دن رات کانفرنسوں اور جلسوں سے فرصت نہ ملتی ہو، روزانہ اخبار کا بوجھ اپنے سر پر لینا ہی نہیں چاہیے تھا، اور نہ وہ تجارتی اصولوں پر اخبار کو چلا سکتے ہیں۔ اپنے خیالات کی اشاعت ضروری سمجھتے ہیں[1]، تو ہفتہ وار اخبار سے یہ غرض پوری ہو سکتی ہے۔

مولانا کے ذاتی اخراجات کا اہتمام نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس کام کو شروع کیا ہے، خدا اسے پورا کرے۔ والسلام

نیازمند

حاجی عبداللہ ہارون

---

[1] یہ فقرہ اندازہ اور قرینہ سے لکھ دیا گیا، اصل خط کا کاغذ بہت بوسیدہ ہو گیا ہے، اور یہاں کے کئی لفظ اڑ گئے ہیں۔

باب (۶۰)

۱۹۲۸ء (۲)

"الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا"

ضمیمہ تو درمیان میں حائل ہو گیا تھا، اب اصل سرگذشت پھر ملاحظہ ہو، اور پہلے میرے عریضون کا جواب مولانا کے قلم سے :

۴ ہمدرد، کوچہ چیلان، دہلی ۲۴ر اپریل ۱۹۲۸ء

برادرم محترم و مکرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ۔ مدتوں سے آپ کے محبت نامے سینے کی جیب مین دل کے قریب ہی ڈالے ہوئے پھرتا ہون، تاکہ ذرا وقت ملے اور جواب تحریر کرون، مگر اب تک موقع نہ مل سکا جس طرح رام پور گیا، جس طرح خلاف توقع واپس آیا اور جس طرح دو والیانِ ریاست[1] کے درمیان کم از کم عارضی طور پر ناچاقی کا سبب بنا۔ اس کی داستان طولانی ہے۔ اگر گھر مین طبیعت درست ہو گئی اور آپ ایک ہی دو دن کے لیے آسکیں تو تشریف لائیں اور اس داستان کو سنیں اور ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب کی تفسیر و تعبیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جن باتوں کا جواب آپ مانگتے ہیں وہ بھی آپ کے تشریف لانے پر ہی

---

[1] یعنی نواب صاحب رام پور، و مہاراجہ الور [2] مکتوب الیہ کے گھر میں اس وقت زرا زیادہ علیل تھیں اور لکھنؤ مین زیر علاج۔

دیا جا سکتا ہے۔ میں نے برادرم ظفر الملک صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ میرے ذاتی مصارف اس سے زیادہ نہ ہوں گے جو جیل خانہ میں تھے۔ جس طرح وہاں گذرتا تھا یہاں بھی گذر کر دونگا۔ اور میری بیوی بیچاری مجھ سے کم کھاتی ہے، اس لیے اس کے واسطے بھی یہی اسکیل کافی ہوگی لیکن میں اس اسکیل پر اسی وقت رہنا شروع کروں گا جب ہمدرد کو بند کر دوں گا۔ میری صحت میرے بال بچوں کی صحت بالکل خراب ہے۔ میں اب مالی تفکرات سے بالکل بچنا چاہتا ہوں تاکہ کچھ عرصہ تک آرام کر سکوں۔ گوشہ نشینی کو حرام سمجھتا ہوں، مگر اب قدمے اور قلمے مدد کرنے کے لیے سامان فراہم نہیں جس قدر ہو سکے گا جتنے بھی مدد کروں گا ورمے مدد کرنے کے قابل پہلے بھی نہ تھا۔ جس قدر تھا کرتا تھا جسقدر اب بھی ہو سکتا کروں گا۔ میں اس فکر میں ہوں کہ کیا کام کر کے ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار تین گھنٹے محنت کر کے معاوضہ کے طور پر کما سکوں۔ "ہمدرد" کی اڈیٹری اب نہ کروں گا۔ میں مضمون لکھ کر ہی اگر روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں مگر مجھے اڈیٹری کرنا نہیں ہے۔ تبلیغ مدنظر تھی[1]۔ مگر لوگ بظاہر سننا نہیں چاہتے چند دنوں کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جب انھیں تجربہ سے معلوم ہوگا کہ جس طرح ہمارے علی گڈھ چھوڑ دینے سے ان کو فائدہ نہیں پہنچا، اسی طرح ہمدرد کے بند ہو جانے سے بھی کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ تب وہ شاید پھر ہماری طرف متوجہ ہوں۔ میں ملت اسلامیہ کا بیحد مشکور ہوں۔ اب تک کریڈ و ہمدرد پریس کے ڈبنچرز کا روپیہ سوائے ایک دو کے کسی نے نہیں مانگا۔ حالانکہ میں انکے نزدیک ایک چوتھے درجہ کے ڈپٹی کلکٹر کی تنخواہ کا بھی مستحق ہوں۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شوکت صاحب کی مالی حالت بھی وہی ہے لیکن ان کی ہمدرد کی طرح خلافت اپنے صرف سے شائع نہیں کرنا پڑتا۔ دوسرے ان کی بیوی نہیں۔

[1] جنھوں نے محمد علی کی اس روح کو نہ جانا، انھوں نے محمد علی کو کچھ بھی نہ پہچانا۔

ایک لڑکی کے پورے مصارف ادا کرنے پڑتے ہیں (گو شادی اس کی بھی ہو گئی ہے) اور ایک لڑکے کے[۱]۔ زاہد[۲] خود تنخواہ پاتا ہے۔ دوسری لڑکی کی شادی عثمان[۳] سے ہو گئی ہے۔ البتہ کچھ رقم ماہوار اسے بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ خود کھدر بکیل پر رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بیمہ غالباً دس ہزار روپیہ کا ہوا تھا۔ وہ رقم غالباً ابھی ملی ہے۔ رام پور میں ان کی ایک بنگلیہ ہے جس کے باغ کی کوئی چار سو روپے سالانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے، میرا کوئی گھر نہیں نہ کسی باغ کی آمدنی ہے میری حالت اگر ہمدردوں سے اب کچھ نہ ملے تو ان سے کسی قدر خراب تر ہے ورنہ یقیناً اس میں بھی وہ "بڑے بھائی" ہی تھے۔ میں قرض لے رہا تھا اور کھا رہا تھا۔ وہ اس "فاقہ مستی" سے بچے ہوئے تھے۔

آپ کے لڑکے کی ولادت سے جس قدر جی خوش ہوا تھا، اسی قدر اس امانت کے چھن جانے سے صدمہ ہوا[۴] اور آپ سے کہیں زیادہ بہن سے ہمدردی ہے[۵]۔ میری بیوی بچے سب اس غم میں شریک ہیں بہن تک اس پیغام کو پہنچا دیجئے۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ مگر کوئی لڑکی بھی مری نہیں الا ماشاء اللہ۔ صرف آمنہ نے داغ جدائی دیا[۶]۔ البتہ زہرا[۷] کا دوسرا لڑکا جو نہایت ہی خوش اور ہنس مکھ تھا، ۱۰ ماہ کی عمر میں رخصت ہو گیا[۸]۔ اس کا اسی طرح صدمہ ہوا جس طرح خود اپنے لڑکے کے اس عمر میں گذر جانے کا ہوتا ہے۔ پھر بھی سمجھتا ہوں کہ خداوند کریم نے مجھ پر بہت رحم فرمایا۔

حمیدہ[۹] کا نکاح شروع جنوری میں ہو رہا تھا، مگر کچھ تو حکیم صاحب[۱۰] رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات

---

[۱] عابد علی خان مولانا شوکت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ۔ انجینیری کی تعلیم پائی۔ اب شاید کسی کارخانہ میں ہیں [۲] زاہد علی خاں مولانا شوکت علی کے بڑے صاحبزادہ اور مولانا محمد علی کے داماد۔ بمبئی میں روزنامہ خلافت اور خلافت پریس کو اب تک ہی چلا رہے ہیں (۱۹۵۲ء)

[۳] علی برادران کے بھانجے عثمان علی خاں [۴] شروع رمضان ۱۳۴۶ھ اپریل ۱۹۲۸ء میں اس بچہ کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اور آخر رمضان میں دبیہ جاتا رہا [۵] یعنی بچہ کی ماں، مولانا بجائے بھابھی کے اپنی ہمشیرہ کا رشتہ لیتے ہیں۔ لڑکا سلسل کئی لڑکیوں کے بعد ہوا تھا، اس لیے اس کے مرنے کا صدمہ بھی ماں کو بہت زیادہ ہوا تھا [۶] ۱۹۲۲ء کے حالات میں یہ ذکر آ چکا ہے [۷] مولانا کی سب سے بڑی صاحبزادی [۸] عارف نام۔ اس کا ذکر بھی کئی باب قبل گذر چکا ہے [۹] حمیدہ بی، مولانا کی تیسری صاحبزادی [۱۰] یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم (متوفی دسمبر ۱۹۲۷ء)

کچھ ماجد[1] کی پریشانیوں نے دیر لگا دی۔ اب دو تین دن میں ہو ہی رہا تھا کہ ایسے شخص کی طرف سے دیا ہوا کہ نومبر میں کر دو۔ میں خود شریک ہونا چاہتا ہوں۔ بار بار کہا کہ اس کی ماں سخت پریشان ہوگی اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ سامان کیا ہے خود اس کی ماں نے اپنی ۲۰ روپئے ماہوار کی آمدنی سے کیا ہے۔ جو ۱۲ برس سے جمع ہو رہی تھی۔ اب تک صرف حج میں کام آئی تھی یا اب کام آئی ہے اور وہ ڈرتی ہیں کہ کہیں خانگی مصارف میں ان کی یہ قلیل پونجی بھی نہ اٹھ جائے لیکن برابر اصرار ہے شوکت صاحب کے آنے پر اس کا فیصلہ ہوگا اور اس سے ایک اہم تر فیصلہ بھی جس کے لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی تشریف لائیں۔[2] عجب کشمکش و پیچ میں گرفتار رہوں۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔

دعاگو اور آپ سے کہیں زیادہ محتاجِ دعا

محمد علی

قطب میاں صاحب اور ظفر الملک صاحب کو بھی خط سنا دیجئے گا۔ قطب میاں کے عنایت نامے کا جواب جلد دوں گا

---

[1] یعنی ماجد علی خاں، رام پوری مولانا کے ہونے والے داماد و [2] مولانا ذیابطیس میں سخت علیل تھے۔ اتفاق کی بات کہ مہاراجہ الور دہلی میں ایک ایٹ ہوم میں مولانا سے مل کر ان پر خاص طور پر مہربان ہو گئے تھے۔ اور اپنے صرف پر علاج کے لیے مولانا کو یورپ بھیجنے پر اصرار کر رہے تھے۔ مولانا اس امداد کو قبول کرنے میں بہت پس و پیش کر رہے تھے۔ آخر میں فیصلہ ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی کے مشورہ پر اٹھا رکھا تھا۔

باب (۶۱)

۱۹۲۸ء (۳)

(رزق تو بر تو ز تو عاشق ترست۔ صاحبزادی کی شادی)

مہاراجہ الور اس وقت ایک عجیب و غریب انسان تھے، بڑے قابل، فاضل، اپنے ہندو علوم کے علاوہ اردو، فارسی میں بھی برق، اور انگریزی میں بڑے خوش تقریر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے بڑی دلچسپی اور محبت رکھنے والے۔ ساتھ ہی ان کے ذاتی چال چلن سے متعلق بھی حیرت انگیز روایتیں مشہور تھیں۔ خیر ان قصوں کی صحت و عدم صحت سے پبلک کو کیا غرض، اور اس ڈائری کو تو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ کالج کی جوبلی کے موقع پر آئے، تو ایک بڑی گراں قدر رقم خاص عربی تعلیم کے لیے دے گئے۔ مارچ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے کہ دہلی میں کوئی بڑا ایٹ ہوم تھا جس میں اتفاق سے مہاراجہ کی نظر مولانا پر پڑ گئی۔ ملتے ہی مہربان ہو گئے، اور بڑے اصرار سے اپنے ہاں بلایا۔ اتفاق دیکھئے کہ ان سے اور نواب صاحب رام پور سے بھائی چارہ اور بقول شخصے دانت کاٹی روٹی تھی۔ مہاراجہ نے یہ جو سنا کہ مولانا کو رام پور جانے کی اجازت نہیں، تو سر ہو گئے کہ "میرے ساتھ چلیے، دیکھوں آپ کو کون رام پور جانے اور رہنے نہیں دیتا ہے۔ نواب سے تو میں بات کہتے وہ حکم منسوخ کرا دوں گا، میرے لنگوٹیے یار ہیں"۔ مہاراجہ نے کچھ ایسی زبردستی کی کہ مولانا کو ان کے ساتھ جاتے ہی بن پڑی۔ وہاں پہنچ، مہاراجہ نے اپنی طرف سے

دبیا دندہ پورا کیا۔ نواب سے بہت کچھ کہہ سن ڈالا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ کون مٹا سکتا ہے۔ کچھ ایسے الجھادے پڑ گئے کہ نواب نے ان کی بات بالکل رد کر دی، اور دونوں رئیسوں کے درمیان خود ہی رنجش و ملال کی نوبت آگئی۔ مہاراجہ واپس ہوئے تو اس کے بعد سے انہیں مولانا کے ساتھ اور خصوصیت بڑھ گئی۔ مولانا کو انھوں نے باصرار الور بلایا۔ اور وہاں ان سے بڑی پر لطف ملاقاتیں رہیں۔ مہاراجہ اپنا تخلص وحشی کرتے تھے۔ اپنی ایک کتاب مولانا کی نذر کی، اور اس پر اپنے قلم سے یہ دلچسپ فقرہ لکھا۔ To my - Maulana from his Wahshi

(وحشی کا نذرانہ اپنے مولانا کی خدمت میں)۔ یہ حضرت بھی جواب میں کب چوکنے والے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو اور کچھ تو نکلا نہیں، جامعہ ملیہ کی انگریزی اسکیم اپنی ہی مرتب کی ہوئی موجود تھی، چٹ اسی کو نکال کر پیش کر دیا۔ اس چٹ پٹے فقرہ کے ساتھ:۔

From a bogus Maulana to a real Maharaja

(ایک بنے ہوئے مولانا کا نذرانہ، ایک اصلی مہاراجہ کی خدمت میں)

مولانا کی صحت خراب مدت سے چلی آ رہی تھی، اب خراب تر ہو گئی تھی۔ اصل مرض ذیابطیس کا تھا۔ شکر پیشاب سے بکثرت خارج ہو رہی تھی۔ اور اب البومن وغیرہ بھی خارج ہونے لگے تھے۔ راتوں کی نیند گویا اڑ گئی تھی۔ ہر وقت تلووں کی سوزش بیتاب رکھتی تھی۔ پرہیز کے معاملہ میں مولانا طبعاً ہی کچھ محتاط واقع ہوئے تھے، پھر کثرت کار اور ہجوم افکار، جو ذیابطیس میں تو زہر ہی ہیں۔ ۳۸ء میں اصل عمر ۵۰ سے زائد نہ تھی لیکن چہرہ و بشرہ سے ۱۰، ۱۲ سال زائد کے معلوم ہونے لگے تھے۔ حالت خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ مہاراجہ الور کی نظر اس پہلو پر خاص طور پر گئی۔ وہ خود بھی ڈاکٹری کے بعض شعبوں سے واقف تھے، اور ذیابطیس کے مریضوں کا علاج تدریجی

اور مسلسل فاقوں کے ذریعہ سے کرنے کا فن یورپ سے سیکھ کر آئے تھے۔ وہ اب مولانا کے سر ہوئے "کہ جس طرح بھی ممکن ہو، یہاں کے کام کاج چھوڑ یورپ روانہ ہوجائیے۔ میں اپنے استادوں کے نام تعارف نامے لکھ دوں گا، وہ اور زیادہ توجہ سے آپ کا علاج کریں گے۔ آپ کی زندگی ملک کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی حفاظت میں مدد دینا آپ کی ذات کی امداد کرنا نہیں، عین ملک کی خدمت میں حصہ لینا ہے۔ آمد و رفت، قیام، علاج کے سارے مصارف میرے ذمہ۔ آپ وعدہ کیجئے کہ جلد سے جلد آپ روانہ ہوجائیں گے" ــــــــ مولانا کے لیے وعدہ کرلینا آسان نہ تھا۔ کشمکش میں پڑے۔ ایک طرف مہاراجہ کا اخلاص بالکل صریح اور نمایاں تھا، اور علاج کی واقعی شدید اور فوری ضرورت۔ لیکن دوسری طرف ایک رئیس و والی ملک سے ہزارہا کی امداد قبول کرنے کا طبیعت پر بار۔ آخر میں یہ وعدہ کیا کہ شوکت صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کرلوں، جب کوئی قطعی جواب دے سکوں گا۔ اس پر بڑی مشکل سے چند روز کی مہلت ملی۔ مولانا دہلی آئے۔ دونوں صاحبوں سے مشورہ کیا، اور دونوں نے اپنی منظوری دیدی۔ یہ سارے واقعات وسط اپریل میں پیش آئے۔

ادھر مولانا کی تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کے عقد کا وقت بھی ٹلتا چلا جا رہا تھا۔ دامادی کے لیے رام پور ہی کے ایک عزیز ماجد علی خاں طے ہوگئے تھے، جو الیکٹرک انجینیرنگ کے کام سے واقف تھے، اور اپنا بجلی کا کاروبار شاید رام پور اور کلکتہ میں رکھتے تھے۔ مولانا کے سفر یورپ پر روانہ ہونے سے قبل عقد سے فراغت ہوجانا ضروری تھی۔

ہمدرد کا مسئلہ بجائے خود اہم و مقدم تھا۔ مولانا تو اسے بند کردینے کی ٹھان چکے تھے۔ اور ارادہ یہی تھا کہ جانے سے قبل اس کا کاروبار بالکل سمیٹ لیں۔ اس نیاز مند کو یہ کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ اپنے رفیق قدیم مولوی ظفر الملک علوی (مہتمم سچ) سے مشورہ کیا۔ انھوں نے

کہا کہ "ہمدرد کی مالی و انتظامی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ ہر مہینہ دو ایک بار دہلی جاکر دیکھ بھال کر لیا کروں گا۔ خرچ میں ابھی خاصی کفایت کی گنجائش ہے، اور معقول انتظام کے بعد پرچہ پر خسارہ آنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایڈیٹوریل کی ذمہ داری تم لے لو، اور انتظامی صیغہ میرے اوپر چھوڑ دو۔" بڑی تقویت ان کی اس گفتگو سے حاصل ہوگئی، اور دل میں ٹھن گئی کہ جو کچھ بھی ہو، انشاءاللہ ہمدرد کو بند نہیں ہونے دیا جائے گا۔ خط کے ذریعہ سے اجمالاً تو مولانا کو یہ اطلاعیں دے ہی دی تھیں، لیکن اصل ضرورت زبانی گفتگو کی تھی، اور پھر صاحبزادی کے عقد میں شرکت کے لیے تو دہلی یوں بھی جانا تھا۔

اپریل کی ۳۰ ریا مئی کی پہلی تھی کہ ذیل کا مکرمت نامہ صادر ہوا:

"۲۹ر اپریل ۲۸ء۔ دہلی۔

برادر محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

حمیدہ کی شادی ۹ر مئی کو رکھی گئی ہے۔ مگر ابھی آخری اور قطعی طور پر تاریخ اس وقت مقرر ہوگی جب مظہر صاحب[1] کے پاس سے آج کے ارجنٹ تار کا جواب آجائے گا کہ انھیں اس تاریخ کے لیے رخصت مل جائے گی۔

ظفر الملک صاحب کا محبت نامہ شوکت صاحب کے واسطہ سے جو میری اہلیہ کے نام آیا تھا ابھی دیکھنے میں آیا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ہمدرد بند کردینے کے سوا چارہ کار نظر نہیں آتا، بہر حال میں تو چند ماہ کے لیے تمام کام بند کرکے اپنا علاج کرانے انگلستان جاؤں گا۔ غیب سے مدد مل گئی تو

[1] مظہر علی خان مرحوم (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ لڑکی کے حقیقی ماموں۔ اس وقت ریاست اندور میں ہائی کورٹ کے جج یا چیف جج تھے۔

اور مشورہ کرنے کے بعد امداد قبول کر لی گئی ہے۔ سوائے علاج کے اور کوئی غرض اس سفر کی نہیں ہے۔ اور فاقہ کرا کے علاج کیا جائے گا۔ کوئی اور کام کروں گا بھی نہیں۔

براہ کرم مشورہ کے لیے فوراً تشریف لے آئیے اور حمیدہ کے نکاح میں بھی شریک ہو جائیے سوائے قطب میاں صاحب اور احباب فرنگی محل کے اور آپ کے اور ظفر الملک صاحب کے کسی کو نہیں بلا رہا ہوں۔

بہن کی طبیعت کیسی ہے۔[1] میری بہن اور بچیاں سب صحت کامل کے لیے دعاگو ہیں۔ اور خیریت معلوم ہونے کے لیے سخت منتظر ہیں۔ براہ کرم فوراً چلے آئیے، تاکہ آخری فیصلہ دو تین دن میں کر دیا جائے اور اخبار کو بند کر دیا جائے۔

میں انشاء اللہ آخر مئی میں ہندوستان سے روانہ ہو جاؤں گا۔ کیا لکھوں دل کی کیا کیفیت ہے۔

آپ کا بھائی محمد علی"

جانے پر تیار تھا ہی کہ ۲۰ مئی (چہارشنبہ) کو تار بھی اس مضمون کا پہنچا کہ "دہلی جمعہ کی صبح (۲۲) تک ضرور پہنچ جائیے۔ اخبار کی بابت آخری فیصلہ بہت ضروری ہے۔"

اب کی ظفر الملک صاحب کے ساتھ مجھ کو دو چار دن رہنا ہوا۔ محمد علی کے ہاں کی ذاتی تقریب میں پہلی بار شرکت کا اتفاق ہوا۔ محمد علی، میاں بیوی دونوں بڑے دل والے۔ بڑے حوصلہ والے تھے، خوب جی کھول کر خرچ کرنا، پورے ارمان اور حوصلہ نکالنا چاہتے تھے۔ اور کھانا کھلانے کے تو بادشاہ تھے لیکن حالات اس کی اجازت کہاں دے رہے تھے۔ بہرحال تقریب ایک

[1] میری بیوی مراد ہیں۔ تازہ زچگی کے بعد زیادہ علیل ہو گئی تھیں۔ محمد علی فرط اخلاص سے ان سے بہن ہی کا رشتہ لیتے تھے۔

بڑی حد تک سادہ ہی انجام پائی گو سادگی کی ابھی اور گنجایش اچھی خاصی باقی تھی۔ باہر کے مہمانوں میں کچھ زیادہ لوگ نہ تھے۔ فرنگی محلی پارٹی (فرنگی محل محمد علی کے شیخ و مرشد ہی کا گھر نہ تھا، اس سارے گھرانے سے ان کے بالکل عزیزانہ تعلقات بھی قائم تھے) کے علاوہ، محمد علی کے خاص خاص عزیز تھے، اور باہر کے دوستوں میں شاید صرف نواب محمد اسمٰعیل خاں، جو اس وقت تو صرف میرٹھ کے رئیس اور بیرسٹر تھے (مسلم لیگی لیڈر، اور علی گڈھ کے وائس چانسلر وغیرہ بعد کو ہوئے)۔ اور محمد علی کے بہت قدیم اور بے تکلف ملنے والوں میں تھے۔ رئیسانہ زندگی کے عادی تھے، محمد علی کے ہاں انھیں رہنے سہنے کی تکلیف ہوئی لیکن ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔

مولانا کے سب سے بڑے بھائی (مولانا شوکت علی سے بھی بڑے) ذوالفقار علی خاں صاحب بی، اے گوہر قادیانی (احمدی) ہو گئے تھے۔ اور قادیان ہی میں خلیفہ قادیان کے ہاں کسی اونچی خدمت پر تھے۔ ان سے بھی ملاقات اب کی ہوئی۔ محمد علی کے ماتحتوں میں تھے شوکت صاحب سے ذرا ان بن رہتی تھی، باتوں باتوں میں جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بعض قادیانیوں کے مجھے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں، بات بات پر کٹھ حجتی پر آمادہ، اور اشتعال انگیز بحثیں چھیڑ چھیڑ کر نکالنے والے۔ یہ ذوالفقار علی خاں صاحب اس کے بالکل برعکس نکلے، اور (ایک دوسرے قادیانی اکبر یار جنگ حیدرآبادی ہی کی طرح) خوش مزاج، بذلہ سنج، منکسر و متواضع اور بڑے پختہ و سنجیدہ۔

غیرت اسلام کے پتلے ــــــــــــ مولانا مودودی، جو اس وقت تک صرف مولوی ابوالاعلیٰ تھے اور الجمعیۃ کے ایڈیٹر، ان سے بھی پہلی علیک سلیک اسی موقع پر ہوئی۔ وضع قطع انگریزی خوانوں سے ملتی ہوئی۔ چہرہ صفاچٹ، لیکن اسلامی عنوانات پر اس وقت بھی خوب لکھتے تھے، اور دین کی حمایت و نصرت پر ہر وقت قلم آمادہ۔

دعوتیں اور کھانے بہت اعلیٰ پیمانہ پر تو نہیں، لیکن کچھ ایسے ہلکے پھلکے بھی نہ تھے۔ بہر حال نہیں

کے ہزار کا بندھا۔ نکاح غالباً قطب میاں صاحب نے پڑھایا، یا شاید مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ خوب یاد نہیں۔ ایک دن بغیر اجازت و اطلاع جامعہ ملیہ ظفر الملک صاحب کے ساتھ چلا گیا، اور وہاں اتنی دیر ہوگئی کہ کھانا بھی وہیں کھالینا پڑا۔ یہاں جب دسترخوان بچھنے کا وقت آیا، تو مولانا کو سخت فکر پیدا ہوئی، اور انتظار میں بڑی دیر تک کھانا ملتوی رکھا۔ بیشک یہ ہم لوگوں کی بالکل بیجا حرکت تھی، مولانا کو بلا وجہ فکر و تشویش میں ڈالنے کا خیال آج تک جب آجاتا ہے دل ندامت سے لبریز ہوجاتا ہے ——— میزبانی کرکر کے، دوسروں کو کھلا پلا کر، اتنا خوش ہونے والا میزبان کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

باب (۶۲)

سنہ ۱۹۲۸ء (۴)

(بیمار کا سفر یورپ)

مولانا کے معاشی مسئلہ کے حل کی جو اسکیم ہم نیازمندوں نے مل کر بنائی تھی، اس پر تفصیل گفتگو کا اب موقع ملا۔ اس درمیان میں نواب محمد اسمٰعیل خاں نے خط کے ذریعہ سے ٹوکا بھی تھا کہ "آپ لوگ یہ خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ پہلے خود مولانا کی رضامندی تو حاصل کیجئے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں کہ ان کی خودداری اس صورت کو گوارا کرے گی۔" اس پر دل نے الٹے نواب صاحب کی رائے کی تضحیک کی تھی، اور کہا تھا کہ "یہ نواب صاحب بھی خوب چیز ہیں۔ اختیار اور پسند کا اب سوال ہی کب ہے۔ اب صورت اضطرار کی سی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا اسے بھی نہ گوارا کریں گے تو آخر کریں گے کیا۔ دوسری صورت کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اور یہاں تو مخلصوں اور نیازمندوں کی طرف سے بطیب خاطر نذرانہ پیش ہو رہا ہے۔ اس میں تامل و تردد کی بات ہی کیا ہو سکتی ہے۔"

بہر حال مولانا سے اب اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، اور پہلے ہی منٹ پر نظر آ گیا کہ رائے نواب صاحب ہی کی ٹھیک تھی۔ اور ہم تینوں نیازمند بلکہ مولانا شوکت علی تک کے اندازے تمامتر غلط! بولے۔ اور ہمت، صبر، استقلال کی پوری قوت کے ساتھ بولے "ہرگز نہیں۔ ایسا کوئی بھی انتظام نہیں قبول کر سکتا ہوں، جب تک اپنی قوت بازو سے

کما سکتا ہوں، کماؤں گا۔ قوم میری خدمات اگر نہیں چاہتی تو ہٹا جاتا ہوں۔ پبلک زندگی سے ریٹائر ہو کر بس کوئی ٹیوشن کر کے کسی رئیس زادہ کو دو تین گھنٹہ پڑھا کر ڈیڑھ سو ماہوار میں اپنی گزر بسر کر لوں گا۔ مضمون فروشی کر کے روٹی کمانا دوسروں کو مبارک رہے۔ میں ان کی تقلید نہیں کر سکتا۔ اخبار نویسی میرا پیشہ نہیں، میں تو اسے صرف ذریعۂ تبلیغ سمجھ کر کرتا رہا۔ آپ لوگ قطعی اور ہرگز اس قسم کے انتظام کے پھیر میں نہ پڑیں۔"

اللہ اللہ! قرضداری اور زیرباری کے اس ہجوم میں بھی یہ ظرف اور یہ ضبط۔ بس محمد علی ہی کا کام تھا! ہم لوگ تو اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر محمود کے تعلقات ہندو لیڈروں سے بھی بڑے گہرے تھے۔ انھوں نے ایک بڑے نامور اور مقبول ہندو لیڈر کے نیے تفصیل سے بتایا تھا کہ انھیں فلاں ہندو ریاست سے اتنا ملتا ہے، اور فلاں سے اتنا۔ اور نہ وہ خود اور نہ ان کی قوم اسے ذرا بھی خودداری کے منافی سمجھتی ہے۔ اور تو اور، خود مولانا شوکت علی تک اس اسکیم کو اپنے اور محمد علی دونوں کے لیے منظور کر چکے تھے! ــــــــ شوکت علی بھی اپنی جگہ ایک بڑے آدمی تھے۔ لیکن محمد علی کے ظرف کو کہاں پہنچتے تھے، محمد علی تو چیز ہی کچھ اور تھے۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

بڑی رد و قدح ہمدرد کے جاری رکھنے اور بند کرنے پر رہی۔ مولانا بند کر دینے پر بالکل تلے ہوئے تھے، اور وزن کا وزن ان ہی کے ساتھ تھا۔ ادھر سے یہ نیاز مند اور مولوی ظفر الملک جاری رکھنے پر اڑے ہوئے تھے، اور اس پارٹی کی کمک پر شوکت علی صاحب مع اپنے بھاری بھرکم تن و توش کے تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ مولانا خود تو اس کی ادارت سے ہٹ جائیں اور انتظامی

مالی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش ہوجائیں لیکن روزنامہ بدستور جاری رہے، ایڈیٹوریل پالیسی کی نگرانی اس خاکسار کے سپرد، اور انتظامی پہلو مولوی ظفر الملک کے ذمہ۔ اور اس جدید اسکیم کا نفاذ ۲۰ مئی سے ہو جائے۔ تاکہ مولانا اپنی روانگی سے دو چار روز قبل پرچہ کا نیا رنگ ڈھنگ بھی دیکھ لیں۔ ان کا جہاز بمبئی سے ۲ جون کو چھوٹنے والا تھا، اور وہ ایک ہفتہ قبل دلی سے براہ جمبئی روانہ ہو جانے کو تھے ——— ۲۰ مئی کے آنے میں دیر کیا لگتی۔ اس پرچہ میں تو الوداع مولانا نے اپنے نام اور اپنے قلم سے لکھی بڑی پر اثر تھی، ابتدائی حصہ درج ذیل ہے:۔

"حقیقۃً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ عوام کو اس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ کافی تعداد میں اسے خریدیں۔ آج عوام کو ہمدرد کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شعر کو دہراتا ہوں ؎

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رویئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

عوام کی آج پھر یقیناً وہی حالت ہے کہ

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لیے بہتر ہے کہ انھیں دو ایک سال کے لیے ان کے حال پر چھوڑا جائے اور خدا ذکریم سے دعا کی جائے کہ وہ انھیں راہبر کی پہچان عطا فرمائے، اور بیشتر اس کے کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک بھاگتے بھاگتے وہ بالکل خستہ اور چور ہو جائیں انھیں منزل مقصود کا پتہ لگ جائے، اور اس کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ میں پہلے ہی "درمے" ان کی امداد کر سکتا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ چند کسی نذر میں دے دیا اور بس۔" تلخ"

اور "قدمے" "البتہ" میں نے عجوزوں کی طرح ان کی امداد کی، اور قرض میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔ اور صحت کو بھی خیرباد کہہ چکا۔ ذیابیطس کے مرض کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی، مگر اسمال چربی (البیومن) بھی آرہی ہے۔ اور ایسیٹون (زہر) بھی آرہا ہے۔ اور اعصابی سوزش نے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے۔ اب ہمدرد کو بھی بند کرتا ہوں، اور باہر کی طلب پر کہیں جا بھی نہ سکوں گا۔ قلمے اور قدمے جو ملک و قوم کی خدمت کرتا تھا، مجبور ہوں کہ اسے بند کر دوں۔ البتہ سخنے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کے لیے ہر روز دو تین گھنٹے یا ہر ہفتہ دو تین روز کسی کی خدمت کر کے جو کچھ بطور اکل حلال کے مل سکے گا، اس کے کمانے کی کوشش کروں گا۔ اور باقی وقت میں خود پڑھوں گا اور اپنے بچوں کو بھی کچھ پڑھاؤں گا۔ اور مسجد جامع میں یا کسی تفریح کی جگہ پر اس بھائی کی خدمت کے لیے حاضر ہوں گا جو مفاد عام کے کسی کام کے متعلق میری رائے دریافت کرنا پسند فرمائیں گے۔ کانگرس میں، خلافت میں، جمعیتہ علماء وغیرہ میں اس طرح برابر شریک ہونے کی کوشش کروں گا جس طرح ایک مفلس و نادار ہندوستانی اور مسلمان شریک ہو سکتا ہے۔ یہ گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ یہ ہجرت ہے۔ خدا کرے جلد فتح مکہ نصیب ہو۔ جو بھائی مجھے اور میرے اہل و عیال کو اکل حلال کی کوئی صورت بتا سکیں، ان کا نہایت ممنون ہوں گا۔ لیکن اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کسی سے کوئی مدد نہیں قبول کر سکتا۔ سال گذشتہ بھی جب اس قسم کی مدد کے لیے چند بھائیوں نے آمادگی ظاہر فرمائی تھی میں نے دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے مستفید ہونے سے بمجبوری انکار کر دیا تھا۔ اور اسی پر آج بھی قائم ہوں۔"

اللہ اللہ! یہ مسلمانان ہند کا لیڈر، اور وقت کا سب سے بڑا لیڈر، یوں پبلک زندگی سے ہٹنے پر مجبور ہو رہا ہے! آیندہ نسلیں یقیناً اس واقعہ پر حیرت کریں گی۔ اور اس کے اسباب ان کی سمجھ میں اسی طرح نہ آئیں گے جس طرح آج ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تیرہ سو سال قبل سیدنا حسینؓ کو

باایں عظمت وجلالت قدر میدانِ کربلا میں تنہا اور بے یار و مددگار کیسے چھوڑ دیا گیا تھا! —— ذمہ داری سے خود مولانا کی ذات بھی بری نہیں کی جاسکتی لیکن بڑا دخل اس ملت کے بے حسی اور بد ذوقی ہی کو تھا۔ اور تفصیلی بحث کی اس "ڈائری" کے ہلکے پھلکے نقوش و تاثرات میں گنجائش نہیں۔

مئی کی ۲۱ رہے، اور ۱۰، ۱۲ دن کے لیے وطن جاکر میں پھر دلی آگیا ہوں۔ اور آج کا ہمدرد میری نگرانی میں نکلا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک روزنامہ بالکل اپنے چارج میں پا رہا ہوں۔ محض ایڈیٹری اور شے ہے۔ اور مولانا کی جانشینی کرنا کچھ اور۔ سوال محض سلیقۂ تحریر و حسن انشاء کا نہ تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر صحیح بصیرت اور صحیح ملی رہنمائی کا تھا۔ اور مولانا کے یہی وہ جوہر تھے جن میں اس خاکسار کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس لیے طبعی طور پر جہاں فخر و مسرت محسوس ہو رہی ہو وہاں دل دھڑکتا بھی جاتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ مولانا ابھی یہیں موجود ہیں، آج کا پرچہ میرے سامنے ان کی نظر سے گزرے گا۔ دیکھیے اس میں کیا کیا خامیاں نکلتی ہیں اور کیسی کیسی ڈانٹ سننا پڑتی ہو۔

رات کا وقت ہے، اور مولانا مردانہ مکان کے صحن میں سہری پر آرام کے لیے آگئے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ ہاتھ میں تازہ ہمدرد لیے ہوئے ہیں۔ (ہمدرد صبح کو نہیں، شام کو نکلتا تھا) اب یہ بستر پر لیٹ کر میرے سامنے ہی پرچہ پڑھیں گے۔ اسی وقت ان کا ہمدرد پڑھنے کا معمول تھا۔ میرا پلنگ بھی قریب ہی ہے۔ کاش اس وقت میں موجود نہ ہوتا! فوری خفگی سے تو بچ جاتا۔ مولانا نے میرا ایڈیٹوریل ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ عنوان ہے "شیر کی گرج"۔ اور یہ ڈیلی میل (لندن) کے ایک افتتاحیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ (شیر سے مراد شیر برطانیہ تھی)۔ خدا خیر کرے۔ چپکے چپکے دعائیں مانگتا جا رہا ہوں —— خیر اللہ نے خیریت رکھی اور میں ڈانٹ پھٹکار سے بچ گیا۔

زندگی میں سب سے زیادہ عقیدت اور عقلی محبت ان دو آدمیوں سے ہوئی۔ ایک حضرت

علامۂ تھانوی اور دوسرے مولانا محمد علی۔ اور یہ بات گو عجیب معلوم ہو لیکن ہے واقعہ کہ ڈرہی سب سے زیادہ ان ہی دونوں کا غالب رہا۔ سچ یا صدق کبھی ان صاحبوں کے نام (اور محمد علی کے تو بار بار کے تقاضے کے باوجود) جاری نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اپنی کوئی اور تحریر ان صاحبوں کی خدمت میں از خود پیش کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ وہ خود سے پڑھ لیں، یا کوئی خاص ضرورت ہی ان کے سامنے پیش کر دینے کی ہوئی، تو اور بات ہے ورنہ خود سے ان کے سامنے لانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ——— محبت کی دنیا کے بھی عجائب کاروبار ہیں!

لرز رہا ہوں میں جس سے اسی پہ ناز بھی ہے!

یہ ۵، ۶ دن کی مدت کہنا چاہیے کہ مولانا کی ہمہ وقتی رفاقت میں گزری۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے "تابع مہمل" کی حیثیت سے ساتھ ساتھ رہا۔ بحری سیاحت کی مشہور عالم کمپنی "ٹامس کُک" کا دہلی والا آفس پہلی بار دیکھا۔ اور وہاں جا کر آنکھیں کھل گئیں۔ چیف کمشنر وغیرہ کے دفتروں میں بھی پاسپورٹ کے سلسلہ میں دو ایک بار جانا ہوا۔ اور نماز جمعہ کے لیے تو جامع مسجد کی حاضری مولانا کے مستقل پروگرام میں داخل تھی ——— مہمان بھرے ہوئے ہیں، سب کو جامع مسجد لے جانے کے لیے کئی کئی تانگے آرہے ہیں۔ پھر وہاں پہنچ کر مولانا کا ایک ایک مسلمان سے ملنا، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے محتاجوں اور گداگروں کو ریزگاری اور پیسوں سے نوازنا، یہ سب ان کے معمولات کا جزو تھا۔

۲۵ مئی کا دن گزار کر شب کی ٹرین سے مولانا بمبئی روانہ ہوئے۔ سیدھے نہیں، بلکہ بی، بی، سی، آئی ریلوے سے اجمیر، آبو، احمد آباد ہوتے ہوئے۔ حضرات صوفیہ سے عموماً اور خواجہ اجمیری سے خاص تعلق قلب رکھتے تھے۔ البتہ اس عقیدت کو درگاہوں کی مروجہ بدعات اور خرافات سے

کوئی تعلق نہ تھا۔ رشک کے ساتھ خواجہ اجمیری کے جذبۂ تبلیغ اسلام کا ذکر کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ان مزارات پر جا کر میں مراقبہ ان بزرگوں کی خدمات دینی اور جوشِ ایمانی ہی کا کرتا رہتا ہوں۔ اسٹیشن میں حسب معمول ساتھ آیا۔ درجہ میں ساتھ ہینڈ کے نواب نصیر حسن خان خیال کا ہو گیا۔

بمبئی سے جہاز پر سوار ہوتے وقت ہر جون کو حسب ذیل تار روانہ کیا:

"اللہ آپ کو اور ظفر الملک کو اپنے فضل میں رکھے۔ یہ دعا جہاز پر سوار ہوتے وقت کر رہا ہوں۔"

اور پھر ہر جون کو جہاز (مقدونیہ نامے) سے ذیل کا مفصل مکتوب روانہ فرمایا ــــــــــ

خط لکھتے کم تھے، مگر جب لکھنے کا موقع پاتے، تو بس لکھتے ہی چلے جاتے۔

باب (۷۳)

۱۹۲۸ء (۵)

(مکتوب مسافر یورپ)

۱۶ رجون ۲۸ء۔ جہاز "مقدونیہ"

پیارے ماجد میاں وظفر الملک صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ۲۵ رکو آپ لوگوں سے رخصت ہو کر ۲۶ رمئی کی صبح کو اجمیر شریف پہنچا۔ تاکہ جسمانی علاج سے پیشتر کچھ روحانی علاج بھی کرسکوں۔ نہ معلوم ظفر الملک صاحب کی "وہابیت"[1] زیارت قبور کو کہاں تک روحانی علاج سمجھے اور کہاں تک خود اسے مرض تصور کرے۔ حقیقتاً جو کچھ ان مزارات کے گرد و پیش دیکھنے میں آتا ہے وہ مجھ جیسے "بدعتی" کو اس قدر صدمہ پہنچاتا ہے کہ عرض نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ان عام بدعات میں جو وہاں کی جاتی ہیں اور نہایت بدتمیزی سے کی جاتی ہیں۔ میں جب کبھی اجمیر شریف آتا ہوں اور میری نظر اس مزار شریف پر پڑتی ہے تو میرا خیال اس زمانہ کی طرف جاتا ہے جب سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی مسلمان نظر آتا ہوگا۔ مشکل ہی سے کسی جگہ کوئی شخص ایک ان دیکھے خدا کو سجدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہوگا۔ اور اذان کی آواز تو یقیناً کہیں بھی نہ آتی ہوگی اور پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ ایک ایسے زمانہ میں ایک سنجر کا رہنے والا سرکار مدینہ کے حکم سے

[1] حاجی ظفر الملک علوی کاکوروی (ایڈیٹر ماہنامہ "الناظر") تھے تو حنفی ہی لیکن اپنے تشدد و تقشف کے لیے بدنام تھے۔

غریب نوازی کو اپنا شعار بنا کر سلطان الہند بننے کے لیے ایک ایسے ملک میں آتا ہے، اور کسی گوشہ کو اپنے لیے تلاش نہیں کرتا، بلکہ راجپوتانہ کے وسط میں ہندوستان کے سب سے بڑے راجہ کی[1] راجدھانی میں داخل ہوتا ہے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اپنی پاک و صاف زندگی کے ذریعے اسلام کا اعلان کرتا ہے اور جس وقت ساری جنگی اور مادی قوتیں اسلام کے خلاف ہوتی ہیں اعلاء کلمۃ الحق کرتا ہے اور ہزاروں لاکھوں کو مشرف باسلام کرتا ہے۔ آج کل جب کہ ہزاروں لاکھوں نام کے مسلمان ہر وقت غیر مسلم اکثریت کا رونا رویا کرتے ہیں۔ اس مزار پر جا کر اگر ہم اسی سبق کا آموختہ پھیریں کہ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ تو مجھے یقین ہے کہ ہم پر بھی آج سکینہ نازل ہونے لگے اور ہماری مدد کے لیے جنوداً لم تروہا اتریں۔

جاتے ہی درگاہ شریف پر حاضر ہوا، پھر مولانا معین الدین صاحب کے بھائی حکیم نظام الدین صاحب کے ہاں جا کر فروکش ہوا۔ اپنے آکسفورڈ کے رفیق صاحبزادہ عبد الواحد خاں سے جا کر ملا۔ اور شب کو پھر درگاہ شریف جانے کے بعد رخصت ہوا

میرے جن نے کرم فرمانے[2] مجھے علاج کے لیے اس بار ولایت بھیجا ہے۔ ان سے دوسرے دن آبو جا کر ملا۔ ۲۸ر کو ان سے بھی رخصت ہوا اور اس بار بھی انھوں نے شکریہ کے الفاظ کو زبان پر آنے سے روک دیا۔ اس لیے اس صحبت کو دعا پر ختم کیا اور بادیدۂ تر روانہ ہوا۔ ۲۸ر کی شب کو احمد آباد پہنچا۔ انسویا بہن اپنے بھائی امبالال سارا بھائی اور ان کے بال بچوں کے ہمراہ ولایت گئی ہوئی ہیں۔ اور شنکر لال بینکر[3] علیل تھے لیکن انھوں نے انسویا بہن کی موٹر روانہ کر دی تھی

---

[1] یعنی وہی مہاراجہ الور [2] یہ سب اس زمانہ کی مشہور کانگرسی شخصیت تھیں۔ اور جمنا لال بجاج تو مدتوں کانگرس کے خزانچی رہے۔ آگے چل کر لفظ باپو ملے گا۔ اس سے مراد گاندھی جی کی اہلیہ ہیں۔

اور آشرم سے ایک مدراسی نوجوان مجھے لینے آگئے تھے۔ اسی وقت سابرمتی گیا اور غسل کرکے سونے لیٹا مگر مگن لال بھائی کی جوان موت اور ان کی پیاری بچی رادھا کے رنج و غم نے نیند کو بھگا دیا۔ تاہم صبح کو خاصی نیند آگئی۔ نماز فجر کے بعد پہلے رادھا اور اس کی والدہ کے پاس گیا۔ پھر باادر نہا تما جی سے ملا۔ اپنے ولایت جانے کا سارا قصہ سنایا اور ان کو اپنا ہم خیال پایا۔ دوپہر کو جمنالال جی بزاز کی فرودگاہ پر آرام کیا اور شام کو کھانا کرشنگ لال بینکر کے ساتھ ان کی اور انسوئیا بہن کی قیام گاہ پر گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر اسٹیشن کو روانہ ہوا۔ تاکہ گجرات میل ہی میں روانہ ہو جاؤں اور نماز عیدالاضحیٰ سے پہلے ہی بمبئی پہنچ جاؤں۔ بمبئی میں عیدین کی نمازیں سورج نکلتے ہی ہو جایا کرتی ہیں اس لیے ریل ہی میں غسل کرکے اور کپڑے بدل کر اور سامان اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر شوکت صاحب اور مولانا عرفان وغیرہ کے ساتھ ہی دفتر خلافت کے پاس والی چھوٹی مسجد کا رخ کیا۔ جہاں نماز اچھی طرح مل گئی۔ مگر اس قدر مختصر جماعت میں یقیناً وہ غرض پوری نہیں ہوئی جو مساجد جامع میں بھی بمشکل پوری ہوتی ہے اور جس کو پورا کرنے کے لیے شہر کے باہر عیدگاہ بنائی جاتی ہے۔ اس عید کی نمازیں اصفہانی صاحب نے الہ مکبر الصوت لگانے سے احتراز کیا اور میرے نزدیک سخت غلطی کی اور کٹ ملاؤں سے ڈر گئے۔ میں ان کا استفتاء ہی پڑھ کر بھانپ گیا تھا کہ ان بزرگ پر ملاؤں کا خوف غالب ہے۔ جو جماعت گرامو فون کو باجا کہتی ہے اور اس میں قرآن کریم کی قراءت سننے کو لہو و لعب سمجھتی ہے، اس سے لاؤڈ اسپیکر کے لیے فتویٰ طلب کرنا ہی حماقت ہے۔ عید کا دن اور دوسرا دن حاجی اسمٰعیل صاحب خلافت کے پیچھے اور ایک دوست کے ہاں دعوتوں میں گذرا۔ یا مسز نائیڈو کے ہاں کی دعوت میں۔ یکم جون کو کچھ کھدر اور اون کی جرابیں کرافٹ صاحب کے کارخانے میں جاکر بنوائیں۔ ٹکٹ ۱۳ مئی ہی کو لے لیا تھا۔ ۲ کو سب سامان بٹورا۔ اور باندھا اور کمپنی کے سپرد کیا۔ اور پھر کچھ آم لے کر اور کچھ ہار پھول ہٹور کر بندرگاہ پر گیا۔ کمپنی کی

نوازش سے چھ ٹکٹ جہاز پر جا کر رخصت کرنے کے لیے دوستوں کے واسطے مفت مل گئے تھے۔ حالانکہ فی ٹکٹ تین روپیہ قیمت دینا پڑتی ہے۔ بندر پر ڈاکٹر کو نبض دکھائی۔ انھوں نے پوچھا اچھے ہو۔ میں نے کہا اچھا ہوتا تو ولایت ہی کیوں جاتا۔ باردولی[1] نہ گیا ہوتا۔ مگر ان کا اطمینان کر دیا کہ میرا مرض متعدی نہیں ہے اور اب تو میری سیاست بھی متعدی نہیں ہے۔ نہ بظاہر میرا مذہب بھی متعدی۔ ایک پولیس کے انگریز افسر صاحب نے طارق[2] تک سے ٹکٹ مانگا۔ اور شوکت صاحب غصہ کے مارے اسی وقت اپنے ٹکٹ کو پھینک کر واپس جا رہے تھے، مگر ڈاکٹر نے طارق صاحب کو بھی اسی ٹکٹ میں شامل ہونے اور جہاز پر جانے کی اجازت دیدی۔ روانگی کا وقت سنا ہے کہ ایک بجے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے سب رخصت کرنے والے رخصت کر دیے گئے۔ مگر ڈاک ڈیڑھ بجے تک بارکی جاتی رہی اور ڈیڑھ بجے ہم ہندوستان کے ساحل سے رخصت ہوئے۔

کیا کہوں کن افکار اور کن خیالات کا اس وقت دل اور دماغ میں ہجوم تھا۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک اکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ پیہ عنقا کا حکم رکھتا تھا سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا۔ جب کہ سول سروس میں ناکام ہو چکا تھا۔ شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر "پانیر" میں پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے۔ مگر ایک بڑھیا[3] نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اسقدر

---

[1] باردولی گجرات کا وہ مقام ہے، جہاں اس وقت ستیاگرہ اور ترک موالات کی عملی تحریک زور شور سے جاری تھی۔ اور سارے ہندوستان کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں [2] زاہد علی خان کا بچہ، مولانا کا نواسہ، اور مولانا شوکت علی کا پوتا [3] مولانا کی والدہ ماجدہ مراد ہیں، جو ۱۹۰۲ء میں "بڑھیا" کہی جانے کے قابل ہرگز نہیں تھیں۔

مایوس ہوتے ہو۔ اگر اس نے چوری کی ہوتی یا مرتد ہوگیا ہوتا تب تمہاری کیا حالت ہوتی۔ محمد علی کو لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی منگیتر بھی ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے۔ اب اسے بلا لو اور اس کی شادی کر دو۔ میں بلایا گیا تھا۔ شادی بھی ہوئی تھی۔ رام پور میں محکمۂ تعلیم کا افسر بھی مقرر ہو چکا تھا اور اب صرف آکسفورڈ بی اے کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ رام پور میں جو واقعات گزر چکے تھے، وہ بے حد پریشان کن۔ اور بالآخر میرے استعفیٰ کا پیش خیمہ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا حشر ہوگا۔ جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ تیسرا سفر سید وزیر حسن صاحب کی معیت میں ۱۹۱۲ء میں چھپ چھپا کر ہوا تھا[1] کہ کہیں میرے کرم فرما سٹن صاحب[2] جن سے دو ہفتے پیشتر ہم سدھار رہے تھے، سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں۔ "ایم علی" اور "ڈبلیو حسن" کے نام سے دہلی سے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے کے پیشتر شوکت صاحب کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن سے عید الفطر کے دوسرے ہی دن اس طرح، روانہ ہوا تھا کہ گویا شوکت صاحب کو صرف پہنچانے آیا ہوں۔ گھر میں نہ بچیوں کو خبر تھی نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہہ کر بندھوایا تھا کہ شملے جا رہا ہوں، وہاں سردی پڑتی ہے گرم کپڑے زیادہ رکھنا۔ کان پور کی مسجد شہید ہو چکی تھی۔ سو سے زیادہ مسلمان جن میں بچے بھی تھے اور بڈھے بھی اس وقت قید تھے۔ ایڈریانوپل کے فاتح ترکوں سے اسکوئتھ صاحب اور سر ایڈورڈ گرے سختی کے ساتھ مطالبہ فرما رہے تھے "کامریڈ" کے ایڈیٹر نے پریس ایکٹ کے خلاف ایک بے نظیر فیصلہ سر لارنس جنکنس کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور دوسرے سینیر ججوں کا حاصل کر لیا تھا۔ گو "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" والا پمفلٹ جس میں بلقانی حلیفوں کے مظالم کی داستان غم نصاریٰ ہی کو سنائی گئی تھی، پھر بھی دا

[1] کان پور کے انہدام مسجد کے سلسلہ میں۔ سید وزیر حسن اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے
[2] یعنی سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ۔

نہ مل سکا تھا۔ انگلستان کی لبرل حکومت کے پاس جاکر منت سماجت کرنا تھی۔ اس کا بھی جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔

چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت کی قوت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے اور ترکوں کو اس غلامی سے محفوظ و مصئون رکھا جائے جس میں ہم خود ڈیڑھ پونے دو برس سے گرفتار تھے۔ اور اس قبضہ کو قسطنطنیہ پر سے اٹھوا دیا جائے جو تقریباً ۴۰ برس سے مصر پر چلا آرہا تھا۔ گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا مگر۔ ع "رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں" کے خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔

اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے۔ مگر الحمدللہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ سرڈینس برے فارن سکریٹری صاحب کو پاسپورٹ کے لیے شملہ ٹیلیفون کیا تو ان کے سوال کا جواب میں صاف کہہ دیا کہ اب نہ مجھے برطانیہ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد ہے نہ یورپ کی کسی حکومت پر کہ کسی سیاسی کام کی غرض سے یورپ کو جاؤں اور آج مسٹر واٹسن پولیٹکل سکریٹری صاحب سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو ان کی غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ میں ٹیلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا ہوں بلکہ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بصرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جاکر فاقہ کرکے اپنا علاج کرائے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں۔ مگر سوائے

مسز بیسنٹ کے اخبار نیو انڈیا[1] کے اڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آزار جامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں۔ ۲ر جون کا دن اچھا گذرا مگر ۳، ۴ اور ۵ کو ہوا تیز رہی اور تیز تر ہوتی گئی۔ یہ موسمی ہوا ہے جس کا نام بگاڑ کر "مون سون" کرلیا گیا ہے اور جو ہندوستان کے لیے بارش لا رہی ہے۔ دہلی کی گرمی کا خیال کر کے دعا نکلتی ہے کہ یہ جلد بمبئی پہنچے اور سب طرف یہ جل تھل کر دے۔ لیکن جہاز والوں کا خیال کرتا ہوں اور بالخصوص عورتوں کا تو جی یہ چاہتا ہے کہ دعا کروں کہ بند ہو جائے اور سمندر کی یہ طغیانی باقی نہ رہے۔ تاہم خلاف توقع میں بالکل اچھا رہا۔ اور ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ آدھے سے زیادہ مسافر اور تین چوتھائی سے زیادہ عورتیں کھانے کے کمرے سے غیر حاضر رہنے لگی تھیں۔ البتہ آج صبح کے بعد سے تموج میں بہت کمی ہو گئی اور آج شب کے ساڑھے گیارہ بجے سے جب یہ خط شروع کیا گیا ہے جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش پڑے تھے اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا ہو رہا تھا۔ علاوہ مہاراجہ صاحب الور کے وزیر اعظم کے جو میرے ہم سفر ہیں اور چند ہندوستانیوں کے میری کسی سے گفتگو نہیں ہوئی۔ اور اس فرصت کو غنیمت جان کر میں نے یا تو اپنی نیند کا قرضہ جو مدتوں سے چڑھا ہوا تھا وصول کیا یا کچھ فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے مرحوم سابق طالب علم محمد داؤد صاحب کی نظموں کو ان کے چھوٹے بھائی محمود احمد عباسی پھر شائع کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے تقریظ لکھنے کا وعدہ لے چکے ہیں۔ ان کا خط جہاز پر بھی ملا۔ اس لیے خطوں سے بھی پہلے اسے لکھنا شروع کیا اور الحمد للہ آج ختم کر دیا شوکت صاحب سے بھی پہلے آپ کے نام یہ خط شروع ہو گیا۔ اور اب اگر آپ اجازت دیں تو اسے ختم کر دوں۔

[1] اپنے زمانہ کا مشہور انگریزی روزنامہ۔ مدراس سے مسز اینی بیسنٹ کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

ڈیک پر میرے نزدیک ہی تین انگریزوں کے بچے دو لڑکیاں اور لڑکا کھیلا کرتے ہیں۔ ان سے یا ان کے والدین ہی سے کبھی کبھی دو چار باتیں ہو جایا کرتی تھیں یا بیاد کئے دو انگریزی زمینداروں سے جو نیل تیار کراتے ہیں۔ لیکن میرے قریب ہی ایک خوش رو وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر بھی بیٹھے رہتے تھے اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو ہوتی رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سن کر اور کچھ دلچسپ پا کر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے گمر پرلطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی۔ جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد و تحسین بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بزرگ میرے دادا کے ۱۸۵۷ء کے دوست تھے۔ اب تک کی ساری داستان میں نے آپ کو سنا دی۔ اب دیکھیے کہ میں نے خاموشی سے کام لیا ہے کل سے انشاءاللہ حدیث شریف بھی شروع ہو جائے گی۔ اور چونکہ حجاج کے جہازوں کی واپسی کا وقت ہے، راستہ میں آنکھیں ان کو بھی ڈھونڈھیں گی۔ ہائے ؎

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول
گہے ببیت خدا و گہے ببیت رسول

مگر خدا بھلا کرے سلطان ابن سعود کا۔ اب وہاں کا راستہ بھی ہم بدبختوں کے لیے بند ہے۔ جہاز ہی پر یہ خبر پڑھی کہ ہم سے بھی زیادہ بدبخت شامی جنھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت میں سب سے بڑا حصہ لیا تھا اور اس کے صلہ میں فرانس کی غلامی اور ۴۸ گھنٹہ کی مسلسل گولہ باری حاصل کی تھی، انھوں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ ان کی نجات کے لیے ایک بادشاہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فیصل ابن سلطان ابن سعود پر ان کی نظر انتخاب پڑی ہے۔ سچ ہے ملوکیت کی بدعت

کی ابتدا شام ہی سے ہوئی تھی۔ اب زید کی ملکیت کی جگہ نجدیوں کی ملکیت کی طلب ہے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تعجب ہے کہ اعصابی سوزش جہاز پر آتے ہی بند ہو گئی۔ مگر کل دوپہر کو اور آج صبح کو تھوڑی دیر تک محسوس ہوئی لیکن یقیناً یہ آموں کا پھل ہے سو ہندرگاہ سعید تک وہ بھی ختم ہو جائیں گے اور طبیعت ان جاتے ہی فاقہ ہی فاقہ ہے۔ [illegible]

[illegible] قطب میاں صاحب کو اور الطاف بھائی کو، سعید کو اور تمام فرنگی محل کو سلام شوق۔ بالخصوص جمال میاں[1] اور محمد میاں اور نور میاں کو۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کی خیریت تحریر فرمائیے۔ دہلی میں جعفری کو پیار اور سب کو سلام شوق۔ بالخصوص مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں آداب۔ مولانا احمد سعید صاحب کو سلام شوق اور ان کی صحت کے متعلق اطلاع دیجیے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب اور احمد علی صاحب، راشد الخیری صاحب کو بھی سلام شوق۔ اب غالباً ناچ بھی ختم ہو گیا اور میرا سر بھی گھومنے لگا اس لیے اب رخصت ہوتا ہوں۔ [illegible]

[illegible] آپ کی عالی ہمتی کا قدردان اور ہمدرد و دعا گو [illegible]

آپ کا بھائی محمد علی [illegible]

---

[1] یہ سب فرنگی محلوں اور ان کے نواحی لوگوں کے نام ہیں۔ مولوی سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی مولانا کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ [illegible]

باب (۴۷)

۱۹۲۹ء (۶)

(سراپا - مشاہداتِ فرنگستان)

محمد علی کے دیکھنے والے اس ڈائری کے ناظرین میں آج (نومبر ۴۹ء میں) بھی کچھ بہت زیادہ موجود نہ ہوں گے۔ اور پھر دیکھئے، کب اس مسودہ کی تکمیل ہو پاتی ہے، اور کتنی مدت اس کی صفائی میں لگتی ہے۔ اور پھر کتاب کب پریس سے باہر آتی ہے۔ اتنی منزلوں کے طے ہوتے ہوتے تو (جس میں ۴، ۵ سال کی مدت تو یقیناً لگ جائے گی) محمد علی کے دیکھنے والوں کی تعداد اور بھی کم رہ جائے گی —— جوانی میں بڑے خوش رو، وجیہ، تندرست توانا، کھلے منھ کے تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے تو بہرحال کم، لیکن پھر بھی اچھے خاصے تنومند، چہرہ ہشاش بشاش۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ آنکھیں بڑی چمکدار۔ بڑے خوش وضع و خوش لباس۔ پوشاک زیادہ تر انگریزی سوٹ۔ لیکن کبھی کبھی ٹھیٹھ ہندوستانی اور مشرقی بھی۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی۔ مونچھیں کسی قدر چڑھی ہوئی۔ جنگ بلقان (۱۲ء) اور پھر انجمن خدام کعبہ (۱۳ء) کے زمانہ سے وضع و لباس سب میں تبدیلی شروع ہوئی۔ سن اس وقت ۳۴، ۳۵ کا ہوگا۔ مونچھیں کتری گئیں۔ ڈاڑھی رکھائی گئی، اور پھر بڑھائی گئی۔ لباس رفتہ رفتہ سادہ، اور خالص مسلمانوں کا سا ہوگیا۔ جاڑوں میں سیاہ رنگ کی بالدار، اور گرمیوں میں سفید کھدر کی، اونچی

کشتی نما ٹوپی (جس کا نام ہی محمد علی کیپ مشہور ہو گیا) گاندھی کیپ کی دو گنی۔ کھدر کا سادہ جیب دار کرتا اور پاجامہ۔ اوپر سے ڈھیلی ڈھالی رنگین عبا۔[1] بلا کے جامہ زیب تھے۔ جو بھی کپڑا پہن لیا، بس وہی پھب گیا۔ آخر میں عینک کی بھی مستقل حاجت ہو گئی تھی۔ بال بہت جلد سفید ہونے لگے، سر کے بال بڑے اور پٹوں کی شکل میں تھے۔ ذیابیطس اور فکروں سے گھل گھل کر دبلے ہو جانے کے باوجود بھی چہرہ کی وجاہت آخر دم تک قائم رہی۔ تقویٰ و عبادت الٰہی سے چہرہ پر جو خاص قسم کی نورانیت آجاتی ہے، وہ اس کے علاوہ۔ آواز بلند۔ جب محفل میں ہوتے، سب پر چھا جاتے۔ حد درجہ بذلہ سنج حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ۔ ہنسنے ہنسانے میں برق۔ ساتھ ہی رونے رلانے میں بھی فرد۔ ہنسی اور آنسو دونوں معلوم تھا کہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوئے ہیں ——— محبت کی آنکھ اندھی ہی کیوں نہ کہی جائے، بہرحال اپنا حال تو یہ تھا کہ صورت بھی محبوبیت میں سیرت سے کچھ کم نہ تھی ؎

ترکِ من ہاین مہ غلام روئے تو
جملہ ترکان جہان ہندوئے تو

اور محمد علی کا کمال اگر دل میں رچا ہوا تھا تو محمد علی کا جمال بھی آنکھوں میں بسا ہوا۔ آہ! وہ گزرا ہوا زمانہ کس طرح پھیر لایا جائے، اور کس طرح آج محمد علی کو زندہ سلامت، چلتا پھرتا، ہنستا بولتا سب کو دکھا دیا جائے؟ آہ! وہ زمانہ جب اپنا قال نہیں حال تھا ع

[1] یہی وہ لباس تھا جس پر پنڈت مدن موہن مالوی نے دونستہ یا نادانستہ بھیتی بیگم صاحبہ بھوپال کے لباس کی کہی تھی ——— ہوا یہ تھا کہ ایک دن غالباً ۲۲ء میں محمد علی بطور اخبار کے ایڈیٹر یا، یونہ کے اسمبلی ہال گئے ہوئے تھے۔ پریس گیلری سے ابھی نکلے ہی تھے کہ پشت کی طرف سے مالوی جی آنکلے۔ محمد علی نے جب منہ پھیرا تو مالوی جی حیرت کے ساتھ بولے "ارے آپ! میں سمجھا ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال برقع پہن کر اسمبلی ہال تشریف لائی ہیں!" محمد علی برجستہ بولے "جی ہاں، اس زنانی محفل میں مردوں کا کیا کام ہو سکتا تھا؟"

ابنسا تا عید دیدن روئے تو

اور کہاں سے لے آئے جائیں وہ دن جب یہ شاعری نہیں حقیقت بیانی تھی، ع

اے ہلالِ ناخم ابروئے تو

یاد ہے : کہ محمد علی ابھی یورپ میں زیر علاج ہیں - اور جلد ان سے ملاقات اور گفتگو کی کوئی صورت نہیں۔ خط جب آئے گا، آئے گا۔ جبھی تو اتنا موقع مل گیا کہ درمیان میں ذکر ان کے وضع و لباس وغیرہ کا چھڑ گیا۔ خط کے انتظار میں ہم لوگ مضمون صرف کرتے تھے تو کیا ڈاڑھی کے ناظرین چند منٹ کا بھی انتظار برداشت کرنے سے رہے ؟

دہلی تو اب ہمدرد کے نگراں کی حیثیت سے اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک روز دہلی میں ہمدرد آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ولایتی ڈاک آئی۔ ڈیلی اکسپرس تھا یا کوئی اور لندنی روزنامہ، اس میں خبر پر نظر پڑی کہ آج پارلیمنٹ کی گیلری میں ایک عبا پوش شخص نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا ——— برطانیہ کے لیے خبر بالکل نئی تھی، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ جب سے پارلیمنٹ کی عمارت قائم ہے۔ کیوں کبھی کسی کو اس کے حدود کے اندر نماز پڑھنے کا خیال بھی آیا ہوگا ! ———

جعفری جو ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے۔ (ہمدرد کے بند ہو جانے پر ان ہی نے روزنامہ ملت نکالا تھا) قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ خبر سنتے ہی بول اٹھے کہ "یہ سوا مولانا کے اور کوئی نہیں ہوسکتا"۔ اور بالکل سچ کہا۔ ادھر سوا محمد علی کے اور خیال بھی کسی کا جا سکتا تھا ؟ وہی یہ لکھ کر گئے تھے کہ جی میں آتا ہے کہ وہاں کے چپہ چپہ پر نماز پڑھوں، پارک کو، ریلوے پلیٹ فارم کو، ہر چیز کو مصلی بنا دوں۔ اور جب چیز سے وہاں والے بدکتے ہیں، اسی سے انھیں خوب مانوس کر دوں۔ شعر جس نے بھی کہا ہو اس شاعری کو واقعہ بنانا محمد علی ہی کا کام تھا۔

اذان حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لیجیے۔ محمد علی کا دوسرا خط بھی موصول ہوگیا۔ اور اب شروع ستمبر ہے۔ اس کے پڑھنے کے لیے وقت نکالیے۔ خط کیوں ہے؟ یہ کہیے کہ ایک پمفلٹ کی ضخامت رکھتا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ مختصر خط لکھنے کے لیے زیادہ فرصت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مجھے کہاں نصیب۔ بس جو کچھ بھی لکھتا ہوں بالکل قلم برداشتہ لکھتا ہوں، اس میں طوالت سے چارہ نہیں۔ بہرحال اب ۵۴ مکتوب حاضر ہے۔

---

۹ راگست ۲۰ء۔ لندن۔

پیارے ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری۔

گذشتہ ہفتہ میں جو ہمدرد کے پرچے آئے، ان میں میرے کسی خط کا کوئی ذکر نہ تھا جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ خط جو یورپ پہنچ کر میں نے لکھا تھا اور ۱۲ر جون کو ڈوور کے اسٹیشن پر ڈالا تھا۔ وہ ۱۱ر ۱۲ر جولائی تک آپ حضرات کی نظر سے نہیں گذرا، اور اگر ماجد علی صاحب کے خط میں صاف تصریح نہ ہوتی کہ انھوں نے حیات صاحب کو اس تاکید کے ساتھ روانہ کر دیا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ لینے کے بعد فوراً جعفری کو بھیج دیں تو میرے دل میں ضرور یہ خوف پیدا ہو جاتا کہ بیگم صاحبہ نے حیات صاحب کو وہ خط تو بھیج دیا مگر یہ لکھنا بھول گئیں کہ پڑھنے کے بعد وہ خط جعفری صاحب کو بھیج دیا جائے تاکہ بہت سے مندرجہ حالات سے قارئین "ہمدرد" بھی واقف

لہ ماجد علی خاں رامپوری۔ مولانا کی تیسری صاحبزادی کے شوہر تھے۔ تہ حسن محمد حیات صاحب پنجابی۔ مولانا کے مخلص اور سابق پرائیویٹ سکریٹری۔ ان کا ذکر کئی بار آچکا ہے۔ تہ محمد جعفری صاحب مچھلی شہری جامعی جو اس وقت ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر تھے۔

ہوجائیں۔ جب تفصیل کے ساتھ کسی چیز کے متعلق لکھنا پڑتا ہے تو پھر ناممکن ہوجاتا ہے کہ اس کو ہر خط میں دہرایا جائے۔ اس لیے میں نے یہ انتظام کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی کو ہر ہفتے مفصل خط لکھ دیا جائے اور وہ اسے آپ حضرات تک پہنچا دیا کریں۔

۱۴ جون کا خط اس قدر طویل تھا اور اس مصروفیت کی حالت میں لکھا گیا تھا کہ اس کے بعد کسی اور کو دو سطریں لکھنا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ بیچاری بیگم صاحبہ تک کو اس ڈاک سے علیحدہ خط نہ روانہ کیا جا سکا لیکن چونکہ ان کی اور بچوں کی پریشانی کا سب سے زیادہ خیال تھا۔ اس لیے میں نے حیات صاحب کا خط بجائے مکتوب الیہ کو بھیجنے کے بیگم صاحبہ کے پتہ سے بھیج دیا۔ چونکہ اس ہفتہ کی ڈاک کے ہمدرد میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید حیات صاحب اسے دہلی بھیجنا ہی بھول گئے۔ اور چونکہ بظاہر اس خط کا علم آپ کو نہیں اس لیے آپ غالباً ان کو بھی نہ لکھیں گے۔ کہ آپ کی یاد دہانی پر وہ اس خط کو آپ کے پاس بھیج دیں۔ اس لیے مجبوراً میں خود آپ کو لکھ رہا ہوں کہ ان سے وہ خط ضرور منگا لیں۔ وہ پہلی ستمبر کو غالباً بمبئی سے نواب صاحب بھوپال کے ہمرکاب لاہور واپس ہوں گے۔ اس لیے اس خط کے ملتے ہی ان کو لکھ دیجیے کہ وہ اپنے خط میں آپ حضرات کو بھی شریک کر لیں۔ مجھے خوف ہے کہ میں نے لندن سے جو ڈاک پہلی بار ارسال کی اس میں کوئی خط آپ حضرات کے نام نہیں ارسال کیا بلکہ بیگم صاحبہ اور بچوں کو اور نا جد علی صاحب کو خطوط لکھ دیئے تھے۔ اور نیز شوکت صاحب کو اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ جو کہ بیگم صاحبہ ہی کو لکھا گیا تھا۔ اس لیے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے خط کا ایک حصہ شوکت صاحب یا جعفری صاحب کو بھجوا دیں مگر وہ اس شرکت کو گوارا نہیں کرتیں اور ان کے مجھے خط میں لکھا ہوا ہے کہ آپ میرے خط میں کسی کو شریک نہ کیجیے خواہ کتنا ہی مختصر ہو وہ میرے مخصوص ہوا چاہیے مجھے کاٹ چھانٹنے کی فرصت نہیں معلوم نہیں اس کے بعد انھوں نے ان

خط کی نقل جعفری کو بھیجی یا نہیں۔ بہرحال ہمدرد میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اگر نہ بھیجی گئی ہے تو غالباً جمعرات تک آپ حضرات کو مل گئی ہوگی۔ خیر اب یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مفصل خط بالعموم آپ ہی کے نام جایا کرے گا اور جو دوسرے خطوط لکھے جایا کریں گے، ان میں سب کا حوالہ دے دیا جایا کرے گا اور انھیں صرف اس قدر لکھ دیا جائے گا کہ بعد ادائے آداب کے عرض پرداز ہوں کہ یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت درگاہ خداوندی سے نیک مطلوب ہے۔ بڑوں کو سلام اور چھوٹوں کو دعا۔ تمت تمام شد۔

پہلے اپنی صحت کے متعلق عرض کر دوں کہ اس بار چھ دن کے فاقے سے جس میں نارنگی اور انگور کا عرق پینے کی اجازت تھی، میری طبیعت بہت اچھی ہو گئی۔ اور یہی نہیں کہ شکر نہیں آئی بلکہ باوجود چربی کے تقریباً اسی مقدار میں پائے جانے کے جو گذشتہ ہفتہ میں تھی میرے پاؤں کے تلووں میں اعصابی سوزش بالکل نہیں ہوئی۔ البتہ گذشتہ ہفتہ کے دن چند نوجوان طلبہ کے ساتھ ہینٹس پارک میں چڑیا گھر (Zoological gardens) دیکھنے کے لیے جانا ہوا اور چونکہ اس دن صبح کو بہت ہی کم پھل کھائے تھے، اس لیے ان طلبہ کے ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ افسوس ہے کہ یہاں شہد نہ مل سکا اور شکر کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دن میں نے خوب ہی بد پرہیزی کر ڈالی، اور مکھن اور روٹی اور جیم کا بھی استعمال کیا اور کیک کے بھی دو ایک ٹکڑے کھائے، یہ میری بد پرہیزی تھی۔ ورنہ نہ کبھی شکر کا استعمال کیا اور نہ کبھی جیم کا اور نہ کبھی کیک کا۔ یہاں تک کہ روٹی بھی تقریباً ڈیڑھ مہینے سے نہیں کھائی۔ گو میرے دوست احباب کو شاید اس کا یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بد پرہیزی کرنا پڑی تو میں نے عمداً پیٹ بھر کر بد پرہیزی کی تاکہ دیکھوں اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ چند ہی گھنٹوں کے بعد مزا بھی پائی۔ پورے ایک ہفتہ کے بعد تلووں میں اعصابی سوزش پھر شروع ہوئی۔ اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر کل تک رہا۔ البتہ

ایک وقت کا فاقہ کرنے کے بعد الحمدللہ وہ کیفیت بالکل دور ہوگئی اور اس شیریں تجربہ نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کہ میرے معالج غذا کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس ہفتے سوائے اس بدپرہیزی کے میں نے ان کے کہنے پر اسی قدر اور بھی عمل کیا کہ گوشت مطلق نہیں کھایا بلکہ سوائے تھوڑی سی اُبلی ہوئی مٹر کے اور کوئی پکی ہوئی ترکاری نہیں کھائی اور صرف پھلوں پر گذر کیا۔ مگر پھلوں میں علاوہ نارنگیوں کے اور ناشپاتیوں کے اور خوبانیوں وغیرہ کے کچھ گریاں بھی کھائی گئیں (بادام اخروٹ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ کھجوریں بھی روزانہ ۲۰-۲۵ کھائی گئیں۔ اس لیے اس پرہیز میں شکایت کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ ارادہ ہے کہ کل پھر قارورہ کیمیاوی تجربہ کے لیے بھیجوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ فاقہ نہ کرنے کے بعد بھی شکر مفقود رہتی ہے یا نہیں۔ ورزش کے معاملہ میں البتہ بہت کچھ فروگذاشت ہوئی ہے۔ لیکن آج سے ارادہ کر لیا ہے کہ دن میں کم سے کم دو تین بار ورزش ضرور کر لیا کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ صحیح غذا سے زیادہ صحیح ہوا کی ضرورت ہے اور جب تک اندر کی ہوا پوری طرح باہر نہ نکالی جائے گی جسم کا اندرونی حصہ صاف نہ ہوگا۔ اور تمام ورزشیں اسی غرض سے کرائی جاتی ہیں کہ میں صحیح طریقہ سے سانس لے سکوں۔ چربی پوری طرح سانس لینے میں مانع ہوتی رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہوگی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جا سکے گی۔ اور تھوڑی بہت بدپرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ بہرحال یقیناً اس ڈیڑھ مہینے کے علاج میں اتنا افاقہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور میں شوکت صاحب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر گذارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانس لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے کمر چار انچ کم ہوگئی ہے اور سانس ایک سو ستر سے ترقی کرکے دو سو تک پہنچ گئی ہے، ان کا

وزن تو یقیناً ۲۰-۲۵ سیر گھٹ جائے گا۔ بلکہ اس سے بھی زائد اور تھوڑے ہی عرصہ میں مصرعہ "کر تپلی صراحی دار گردن" کے مصداق ہو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ بچاری مدت سے دبلا ہونا چاہتی ہیں۔ ان کے لیے بھی یہی علاج مفید ہوگا۔ اور چونکہ وہ نقرس کے مرض میں مبتلا بھی ہیں اس لیے یہ طریق علاج اس مرض کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔ میں بار بار زور دے رہا ہوں کہ لڑکیوں کو لے کر وہ بھی یہیں چلی آئیں۔ اور ابھی اس مضمون کا انھیں تار بھی دے چکا ہوں۔ حمیدہ بی کی بیماری نے بے حد پریشان کر دیا ہے۔ اگر وہ یہاں آگئیں تو حمیدہ بی کا بھی اسی طریقہ پر یہاں علاج شروع کرا دیا جائے گا۔ لیکن دیکھیے وہ آتی بھی ہیں یا نہیں؟ جہاں تک اپنی صحت یابی کے متعلق لکھ چکا ہوں وہاں چند سطریں ایک بزرگ قوم کی وفات کے متعلق لکھنا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ دو دن اور فاقہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ میں امام سے وعدہ کر چکا تھا کہ ناٹینگیل گیٹ کے دار الصلوٰۃ میں نماز کے بعد مصلیوں سے اسلام کے متعلق ایک مختصر سے مکالے کی بھی ابتدا کروں اور خوف تھا کہ اگر اس دن افطار نہیں کیا گیا تو شاید کمزوری زیادہ محسوس ہو لیکن جو حالت جمعرات کو تھی۔ اگر اس کا پہلے ذرا بھی گمان ہوتا تو میں ہرگز جمعہ کو نہ افطار کرتا۔ اور دو چار دن اور فاقہ کرتا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا، اسی وقت سید امیر علی[1] صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ لندن سے کچھ دور سکس کاونٹی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں اس زمانہ میں آرام فرما رہے تھے۔ اور مسز امیر علی صاحبہ کے

---

[1] رائٹ آنریبل سید امیر علی پیلے جج ہائی کورٹ کلکتہ اور پھر کو پریوی کونسل۔ مصنف اسپرٹ آف اسلام وغیرہ۔ جن کی ایک عمر انگریزی میں خدمت اسلام کرنے میں صرف ہوئی۔ انگریزی اہل زبان کی سی لکھتے تھے۔ اور بجز مذہب کے اور ہر حیثیت سے انگریز ہو بھی گئے تھے۔

قول کے مطابق وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے۔ تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعیٔ اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے، اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جس دن امیر علی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے۔ اس لیے گذشتہ پیر کے دن بینکوں کی چھٹی تھی۔ چنانچہ تجہیز و تکفین کا سامان منگل تک نہ ہو سکا۔ تجہیز و تکفین کے پیشے کی یہاں ایک کمپنی ہے۔ چنانچہ اس نے مرحوم کی میت کو وڈ ج سے ویسٹ منسٹر تک پہنچایا ہوگا۔ اور منگل کے دن تعطیل ختم ہونے پر تابوت بنانے کا انتظام کیا۔ اس کمپنی کی ایک اسپیشل ٹرین واٹرلو اسٹیشن سے منگل کے دن بارہ بجے کے قریب (Brook Wood) بروک وڈ کو جو وو کنگ (Wooking) اور ایلڈرشاٹ (Aldershot) کے درمیان واقع ہے، روانہ ہوئی اور اس میں جنازہ اور اس کو کاندھا دینے والے روانہ ہوئے۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا۔ اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چند طالب علموں کے ساتھ موٹر میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا کہ لوگ اسپیشل میں قبرستان جانے والے ہیں۔ اتوار کی شب کو سر محمد رفیق صاحب[1] سے ملا۔ تب اس کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اس سے پہلے ہی موٹر کا انتظام کر چکا تھا۔ احتیاطاً ہم لوگ اسپیشل سے بھی پہلے موٹر میں لندن سے روانہ ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے ادھ بیچ میں موٹر رک گئی۔ اور اس کے صاف کرنے میں موٹر کے مالک کو کچھ غلط فہمی ہوئی جس کے باعث گھنٹہ بھر راستے میں رکنا پڑا۔ بالآخر گذرتی ہوئی ایک موٹر کے چلانے والے سے درخواست کی گئی کہ

[1] محمد رفیق صاحب دہلوی، بیرسٹر ایٹ لا۔ مدتوں اودھ میں جج رہے، اور پھر الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہوگئے تھے۔ اس وقت انڈیا کونسل کے ممبر کی حیثیت سے لندن میں رہ رہے تھے۔

آٹو موبائل ایسوسی ایشن کے سپاہی کو آگے چل کر بھجوادیں۔ یہ مالکانِ موٹر کی ایک جمعیت ہے
جس کا چندہ دو پونڈ سالانہ ہے اور اس کی طرف سے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر عمدہ وردی پہنے
ہوئے سپاہی بٹھلا دیے گئے ہیں۔ جو موٹر والوں کو راستہ بھی بتاتے ہیں اور اگر کوئی حادثہ واقع
ہو جاتا ہے تو موٹر والوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ان کے پاس موٹر بائسکلیں بھی ہیں، جن میں سائڈ کار
کی جگہ ایک چلتی پھرتی موٹر والوں کی ڈسپنسری ہے۔ اس سپاہی کے آتے ہی سب کچھ ٹھیک
ہو گیا، اور بیس منٹ میں ہم بروک ووڈ (Brook Wood) کے
قبرستان جا پہنچے۔ ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نمازِ جنازہ پڑھا چکے تھے۔ البتہ ان کے صاحبزادے
وارث امیر علی صاحب معہ اپنی والدہ ماجدہ کے اس وقت تک وہاں موجود تھے۔ چنانچہ قبر
پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور تعزیت کی۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں
ہیں اور اس شہر خموشاں کا نام بھی (Necropolis) ہے۔ ریل کی پٹری اس کے
اندر تک آتی ہے۔ نہایت وسیع میدان میں باغ لگا گیا ہے جس کے چاروں طرف پختہ
احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنادی گئی ہیں۔
بلکہ گھر آنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہم کو لنچ نہ ملنے کے باعث جو چاء کے وقت ووکنگ جا کر
انڈے وغیرہ تلوانا پڑے تھے، اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس شہر خموشاں کے اندر ایک اچھی خاصی
رسٹوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں
کے لیے ہی ہے۔ اور ایک حصہ پارسیوں کی قبروں کے لیے اور اسی طرح ایک حصہ ہندوؤں
کی قبروں کے لیے ہے۔ مگر سید امیر علی صاحب نے صینِ حیات ہی ایک قطعہ اپنے اور اپنے
خاندان والوں کے لیے اس طرف خرید لیا تھا۔ جہاں متمول عیسائی دفن ہوتے ہیں۔ یوں تو
تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر لیا ہے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر

غلط تھا لیکن الحمد للہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ دفن کرتے وقت قطب نما تلاش کی گئی، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ قبر کی سمت میں صرف تھوڑی سی کجی تھی، زیادہ نہ تھی اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس ہی آدمی رہ گئے تھے۔ جن میں ایک لارڈ ہیڈلے[1] اور پنجاب کے سابق لفٹنٹ گورنر سر لوئی ڈین تھے۔ لارڈ ہیڈلے کے پاس ہی ایک اور بزرگ بھی تھے۔ جن کا اسم گرامی انگلستان کے اخبارات اور رسالوں میں یا تو جنگ افغانستان کے بعد یکایک نظر آنا شروع ہوا تھا یا اب پھر دو سال سے مکہ معظمہ کی موتمر عالم اسلام کے بعد سے زیادہ تر اسی سلسلے میں پھر نظر آنے لگا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ یہ سردار" اقبال علی شاہ صاحب تھے۔ چونکہ اس سے ایک ہی روز پیشتر مجھ سے ان بزرگ سے ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی جس کے متعلق ابھی کچھ عرض کروں گا۔ اور مجھ سے مایوس ہو چکے تھے، اس لیے اس بار علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ سر لوئی ڈین صاحب[2] نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہکر میرا حال دریافت فرمایا اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمد للہ کہہ کر اور ان سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا۔ مجھے امیر علی صاحب کی قبر کا اور مسلمانوں کی قبروں کا اتنے فاصلہ پر ہونا اور متمول انگریزوں کی قبروں سے اس قدر متصل ہونا کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے، ان سب کو میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صنیفہ احمد فارسی کی ہے۔ جس وقت یہ بیچاری دفن ہوئی تھیں اس وقت شاید کسی کے پاس قطب نما بھی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ قبر کی سمت صحیح نہیں ہے۔

---

[1] برطانیہ کا وہ امیر جو اس وقت تک باضابطہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اسلامی نام "فاروق" تھا۔

[2] سابق گورنر پنجاب۔ اردو و فارسی سے بھی واقف تھے۔

اس کے پاس ہی بمبئی کے مشہور و معروف اور نہایت قابل مسلمان ڈاکٹر حبیب جان محمد صاحب کی قبر ہے، جن کا یکایک ذیابطیس کے عارضہ میں نیشنل لبرل کلب میں انتقال ہوگیا تھا۔ اسی قبرستان میں حیدر آباد کے خطیب امجد حسین کھوکھو ضلع جھیلم کے شیخ عبد الحمید اور راندھیر کے داؤد ابراہیم مونا لالا کی بھی قبریں ہیں۔ جن میں سے موخر الذکر کا موٹر کے تصادم سے اسی سال انتقال ہوا ہے۔ اور ان کے ایک رفیق جو اسی تصادم میں زخمی ہوئے تھے، اس بار ہمارے شریک سفر تھے۔ ان ہی قبروں میں ایک قبر مصطفےٰ صبحی منزدی کی ہے، جو مصری تھے۔ اس کے نزدیک قبر آغا خاں صاحب کے چچا زاد بھائی اور حاجی بی بی صاحبہ کے بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے۔ اس قبر پر غالباً آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے

برادر عزیزم

ز رفتنِ تو من از عمر بے نصیب شدم

سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

آغا خاں صاحب کو کون غریب کہے گا لیکن ان کی "غریب الوطنی" اب ایک ضرب المثل ہے۔ نہ معلوم اس شعر میں کس وطن کی غربت کی طرف اشارہ ہے۔ ان بڑی بڑی پختہ قبروں کے علاوہ کتنی ہی کچی قبریں بھی ہیں۔ اور چند پر بظاہر حکومت کی طرف سے دوران جنگ میں لوحِ مزار بھی لگا دی ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل فوجی یہاں دفن ہیں۔ ....

میں ان سب کے لیے فاتحہ پڑھ کے آیا ہوں، اور ان کے نام اس لیے لکھ لایا ہوں کہ اگر "ہمدرد" کے ذریعہ سے ان کے دور افتادہ پسماندوں کو جن میں سے شاید ہی کوئی ادھر آنکلے اطلاع مل جائے کہ ایک مسلمان ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آیا ہے۔ تو غالباً انھیں خوشی ہوگی۔[1]

---

[1] اتنی محنت و زحمت جس نے محض قلوب سیلمین کی تطیب کے لیے برداشت کیا، اسکے اجر کا کیا ٹھکانا! —— ہمدرد میں بوجہ بیمار ہے نام چھپنے سے یہاں معذرت کر دیے گئے۔

ان مسلمانوں کی قبروں میں ایک عجیب قبر بھی نظر پڑی وہ ایک ہندو سپاہی کی تھی جس پر
اناللہ وانا الیہ راجعون کی جگہ .... کھدا ہوا تھا۔ نہ معلوم پرادم بھگوتی نام تو نہیں
اور ادم کی جگہ غلطی سے فقط ...... کھد گیا۔

مجھے اس وقت اس کی اطلاع نہ تھی کہ یہاں ہنود کا بھی کوئی قبرستان ہے۔ اور قیاس بھی اس کے
خلاف تھا۔ اس لیے کہ ہنود کے مردے تو جلا دیے جاتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک ہندو کی
قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس کا نام موتی رام ۱۱۲۔ انفنٹری .... کھدا ہوا تھا جب
ہم وہاں سے چل دیے تو معلوم ہوا کہ ایک حصہ ہنود کی قبروں کے لیے بھی ہے۔ اور وہاں ہنود
کی قبریں بھی موجود ہیں۔

مسلمانوں سے کچھ ہی فاصلہ پر پارسیوں کی متعدد قبریں ہیں۔ اور یہ حصہ بہت ہی زیادہ
شاندار ہے۔ سب سے زیادہ عظیم الشان قبر تو داڈیا صاحب کی ہے جس کے متعلق ابھی عرض کرونگا۔
اس کے علاوہ ایک مسقف حجرہ کے اندر سر رتن ٹاٹا کی قبر ہے اور دوسرے میں ان کے والد ماجد
جمشید جی نوشیروان جی ٹاٹا کی قبر ہے۔ اس کے سامنے جمشید جی کی ہمشیرہ مسز دادا بھائی سکلا توالہ
کی قبر ہے جس پر ان کا مجسمہ (صرف سر اور گردن وغیرہ) پتھر کا کھدا ہوا الٹ دیا گیا ہے۔ دادا بھائی
صاحب کی بھی وہیں قبر ہے۔ غالباً یہ شاپور جی کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کی قبریں ہیں،
مسز دادا بھائی جی کے چہرہ پر اور بالخصوص آنکھ کے پاس کسی پرند کی بیٹ پڑی ہوئی تھی۔ جسے میں نے
وہاں سے علیحدہ کر کے صاف کر دیا۔ اور شاپور جی کے لیے دعا مانگی کہ یہ بہادر اور سچا ہمدرد نوع انسان
اور محب وطن انسانوں اور ہندوستانیوں کی کامیابی کے ساتھ خدمت کرتا رہا۔

مگر دیکھنے کے قابل داڈیا صاحب کی عالیشان قبر ہے۔ اس شہر خموشاں میں آنسو گرانا
تعجب کی بات نہیں، مگر ہنسی آنا ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن ہم میں سے ایک بھی اپنی ہنسی کو ضبط

نہ کر سکا جب کہ ہم نے ایک جانب اس کتبہ کو پڑھا :

I am Nowrosji Noshirwanji Wadia of The ancient Aryan race of Persia. A citizen of The loyal town of Bombay, who lies here peacefully under The far off sky of wide famed Britain.

(اس کا ترجمہ آپ ہی فرمائیں) نہ معلوم وہ بمبئی جس میں نریمان اور بحروچہ جیسے پارسی آج بھی ہیں جس میں دادا بھائی نوروزجی اور فیروز شاہ مہتا اور جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا اور رتن ٹاٹا جیسے پارسی گذر چکے ہیں، وہ واڈیا صاحب کے اظہار وفاداری اور اس پر اس قدر اصرار کے متعلق کیا کہے گا۔ کیا بمبئی میں صرف جنس وفاداری ہی ملتی ہے۔ حق پرستی، حب وطن اور حریت کی جنسوں کا وہاں کال ہے؟ برطانیہ کی شہرت یقیناً "دور دور تک" پھیلی ہوئی ہے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے آسمان کو کیوں "دور" کہا گیا ہے۔ ہر جگہ کا آسمان وہاں کی زمین سے یکساں فاصلہ پر ہوگا، یہ برطانیہ کا آسمان اس قدر دور کیوں ظاہر کیا گیا؟ اس کتبہ کو جس نے پڑھا وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ مگر آنجہانی واڈیا صاحب کا اس میں قصور نہیں ہے۔ "مردہ بدست زندہ" بظاہر ان کے کسی "وفادار" پسماندہ نے ان توقعات کی بنا پر جو انھیں "دور دور مشہور برطانیہ" سے ہیں، برطانیہ کے آسمان اور "وفادار" بمبئی کی زمین کی اس طرح مٹی پلید کی ہوگی۔ لیکن یہ عبارت بظاہر کسی پارسی کی بھی تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ باقی تین جانب جو اور ہیں ان کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو ژند داد سے کہیں زیادہ بائبل پر عبور ہے۔ "سروژ" کا نام تو صرف ایک جگہ آیا ہے۔ لیکن

Rodumous اور Serious fother of his children کی بار بار تکرار کی گئی ہے۔ اور اسی طرح Lord God کی۔ اور ذیل کی عبارت کو پڑھیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کسی عیسائی کی تصنیف کردہ ہے:

Those who opened the gate of the morning
Often some of the righteous
with hearig in thy wings and lift up the
light of thy countenance on us that in thy
light we may see the light of life everlasting

ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لیے وولنگ میں داخل ہوتے ہی کار رج ہوٹل لا۔ وہاں موٹر رکی۔ اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا "خانم ساماں" کی تلاش کی۔ ایک میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں، نکل آئیں اور پہلے تو چائے پینے کا وعدہ فرمایا لیکن جب میں آگے بڑھا، اور میں نے پوچھا کہ کچھ اور بھی ہمت ہوگی یہ لڑکے بھوکے ہیں۔ لنچ ابتک نہیں کھایا ہے۔ تو انھوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار کر فرمادیا۔ ہم سب کا قیاس ہے کہ انھیں شیخ سے خوف آیا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لے جائے یا کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے، میں نے دو تین دن ہوئے اپنے مکان کے قریب ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا "The Shaikh's Son" عنوان ہے اور جس میں رولف ولینٹینو آنجہانی مراقش کے ایک نوجوان "شیخ زادہ" کا پارٹ کرتا تھا۔ ان فلموں کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں۔ اگر ان ممالک والے اس اندیشہ سے متردد ہوں کہ اگر شیخ زادہ دن دراز دستیاں یہ ہیں، تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی۔ جی میں آیا کہ ہوٹل

کی مالکہ صاحب کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی رو سے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن ان کی سراسیمگی پر رحم آیا، اور قصبے میں آگے جاکر ریسٹوران میں چائے پی گئی۔ سلاد کھایا گیا اور انڈیلٹ کے آملیٹ (جسکو خانساماں "آملیٹ" کہتے ہیں) لڑکوں کو کھلائے گئے۔ چکھ میں نے بھی لیا۔

اب ذرا "سردار" اقبال علی شاہ صاحب کا حال سنیئے۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ان "خوردو" نے علی برادران کے خلاف کیا کیا زہر اُگلا ہے۔ یہ افغانوں کے اس مشہور خاندان کے ایک سپوت ہیں، جو غالباً حکومت افغانستان کے خلاف کچھ کارروائی کرکے ہندوستان کو بھاگ آیا تھا۔ اور یہاں سردھنہ ضلع میرٹھ میں آکر پناہ گزین ہوا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سے مجھے نیاز حاصل ہے۔ اور بعض تو علی گڈھ میں ہمارے ساتھ پڑھے بھی ہیں۔ "سردار" اقبال علی شاہ صاحب بھی علی گڈھ کے پرانے طالب علم ہیں۔ اور جب میں ۱۳ئہ میں یہاں سید وزیر حسن صاحب کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت آپ ایڈنبرا میں تعلیم پاتے تھے۔ امتحان تو شاید یہاں ایک بھی پاس نہ کیا، مگر ایک میم صاحبہ سے شادی ضرور کرلی۔ سنا ہے کہ ایک عرصے تک تو انکے والد ماجد نے جو تحصیلدار تھے کچھ روپیہ بھیجا لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے علی گڈھ کے ایک رفیق کے پاس ان کا ایک طول طویل خط آیا ہے جس میں انھوں نے اپنی اقتصادی مشکلات کی داستان کو دہرایا ہے۔ اور پھر بتایا ہے کہ کس طرح غازی امان اللہ خان کے اعلان جنگ کے بعد ان مشکلات کا حل اس طرح نکل آیا کہ انھوں نے یہاں کے اخبارات کو برطانیہ کی تائید میں مضامین بھیجے۔ جو پہلے تو مسترد ہوتے رہے لیکن بعد کو انڈیا آفس کے ایما سے (اور مجھے یقین ہے کہ "اصلاح" کے بعد) شائع ہونے لگے۔ جب میں ۱۹۲۰ئہ میں پھر یہاں آیا تو یہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ مگر میں نے التفات نہیں کیا، البتہ حیات صاحب کی مروت سے[1]

[1] "بزرگوار" کے مقابل کا لفظ۔ مولانا کو اپنے "منفا بلات" کے گڑھنے میں ملکہ تھا۔

انھیں مجبور کیا کہ ملاقات سے انکار نہ کردیں۔ اس لیے دو ایک بار آپ ہمارے مکان پر تشریف لائے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں آپ مجھ سے دہلی میں ملے اور کامریڈ کے اسٹاف میں نوکری کی خواہش کی، اور نمونۃً ایک مضمون بھی لکھ دیا۔ میں اگر ان پر اعتماد کر بھی سکتا تب بھی اس مضمون نے ان کی قابلیت کی ایسی قلعی کھول دی کہ ان کو نوکری دینا میرے لیے ناممکن ہوگیا اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکا کہ ان کے سخت اصرار پر ان کے مضمون کی عبارت کو بار بار اصلاح دیکر اسے کامریڈ میں چھاپ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے خود "New Spectator" نام کا ایک ہفتہ وار نکالنا شروع کیا جس کو یہ میرے نام بھی بھیجتے رہے، پہلا پرچہ بھیجتے وقت جو خط میرے نام ارسال فرمایا تھا اس میں میرے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا بہت کچھ اظہار فرمایا گیا ہے لیکن اس پرچے کے پہلے ہی صفحہ پر آپ کا پہلا ہی نوٹ شوکت صاحب کی مذمت میں تھا۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس پرچے کی اشاعت کی غرض کیا تھی۔ نواب صاحب بھوپال کے خلاف ہر پرچے میں زہر اگلا جاتا تھا۔ اور ان کے بھتیجے کو ریاست کا حقدار بتایا جاتا تھا۔ چند ماہ بعد آپ نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کا یہ پرچہ میں اپنے پریس میں شائع کیا کروں۔ جس سے میں نے فوراً ہی انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ پرچہ شائع ہونا بند ہوگیا۔ اگر کسی شخص کو حسن ظن ہو کر جو مضامین آپ کے نام نامی سے یہاں کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ دفتر "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے "New Spectator" کی فائل منگاکر اپنی ضعیف الاعتقادی کی اصلاح کر سکتا ہے۔ خیالات پریشان اور رکیک، عبارت بے ربط اور ناقص، یہ آپ کی حقیقی قابلیت کے ثبوت میں موجود ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی کسی کو مزید ثبوت درکار ہو تو وہ مئی یا جون سنہ ۲۰ء کی پایونیر کی فائل اٹھا کر دیکھ لے جس میں ایک پرچہ کے پڑھنے والے کو پہلے ہی صفحہ پر ایک

ایڈیٹوریل نوٹ ہے گا جس میں میرے ایک خط کا جو میں نے یہاں سے شوکت صاحب کے نام لکھا تھا، مذاق اڑایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرچہ میری نظر سے گذرا تھا لیکن اسی نوٹ کے بعد ایک اور نوٹ بھی ہے جس میں "سردار" اقبال علی شاہ وسط ایشیا کے [illegible] کے ایک مضمون کے متعلق جو یہاں ایک مصور پرچہ میں مع چند تصاویر کے شائع ہو چکا تھا، درج ہے کہ اس میں جو تصویر دی گئی ہے وہ یقیناً سردار صاحب نے اپنے سفر کے ایام میں ہرگز نہیں کھینچی تھی، نہ اس مقام کی تصویر ہے جس کا سردار صاحب نے ذکر فرمایا ہے۔ بلکہ اس سے بہت دور ایک اور مقام کی تصویر ہے۔ اور ایک انگریز فوجی افسر کی کھینچی ہوئی ہے، جو اس کی ایک تصنیف کردہ کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔ اور اس کے فلاں صفحہ پر موجود ہے۔ اور ہمارے وسط ایشیا کے محقق ایک سارق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ آپ کے اخبار بند ہونے کے بعد آپ کی میم صاحبہ ہندوستان سے ولایت چل دیں اور اس "جنوری" کے "دسمبر" کی طرح سے

سالہاسال پیچھے ہیں ترے پیچھے پھرتے   جنوری تو ہے اب ماہ دسمبر میں ہوں

آپ نے تعاقب کی ٹھانی۔ سنا گیا ہے کہ والد صاحب سے روپیہ کا پھر مطالبہ کیا گیا، اور جب ان بیچارے نے کہا کہ میرے پاس روپیہ کہاں، تو ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر روپیہ نہیں دیا گیا تو ایک دیوانی کے مقدمے میں فریق ثانی کی طرف ان کے خلاف گواہی دے دی جائے گی۔ اس پر ان کے دوستوں نے کہا بھائی کہیں سے قرض دام لے کر دے دو، ورنہ مقدمہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ کچھ روپیہ اس طرح ملا۔ اس کے بعد بمبئی تشریف لائے۔ تو حبیب الرحمن خاں صاحب (نواب صدر یار جنگ بہادر) جو یقیناً ان کے والد ماجد کو ان کی علی گڈھ کی تحصیلداری کے زمانہ سے جانتے تھے، عازم حج نظر آئے۔ پھر کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت عجیب بات ہے میں بھی احرام سفر باندھ کر آیا ہوں مگر جدہ کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا بھائی ایک ٹکٹ تو میرے پاس ہے۔ چنانچہ اس ٹکٹ کو

لے کر آپ نے مکہ معظمہ کا قصد فرمایا اور ان ہی کے طفیلیوں میں آپ جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود ملک الحجاز والنجد وملحقاتہا کے "مہمان" بنے اور ان سے مکہ معظمہ میں ملاقات کی۔ اور ایک دن جو غالباً پہلا ہی دن تھا ان کے ہمرکاب آپ موتمر عالم اسلام میں بطور وزیٹر کے شریک ہوئے۔ یہ باتیں میں نے مکہ معظمہ ہی میں سنی تھیں۔ مگر چونکہ میں نے خود تحقیقات نہیں کی ہے اس لیے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کہاں تک صحیح ہیں۔ مکہ معظمہ پہنچ کر آپ ہم سے بھی ملنے آئے۔ وہاں پہلے ہی سے متعدد جواسیس دور دور مشہور برطانیہ کے موجود تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم سب بول اٹھے۔ آہا آپ بھی تشریف لائے۔ آپ ہی کی کسر تھی۔ کم از کم مکہ معظمہ میں تو نہ انگریزی ٹوپی "ہیٹ" تھے اور نہ لباس انگریزی "در بر" غالباً ٹوپی تو ترکی تھی۔ اور ریشم کا لانبا کوٹ تھا اور ٹانگوں میں شلوار لیکن اس بدبخت کی کم نصیبی کو کیا کہا جائے گا جو اس طرح مصنت سفر کر کے بھی حج سے دو دن پہلے جدہ کو چل دے اور وہاں سے عازم یورپ ہو جائے۔

جو "ٹائمز" کے مضامین ماہد میاں نے مجھے ارسال فرمائے تھے ان میں سے ایک مضمون میں ایک عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موتمر عالم اسلام کے جلسے اس ترکی قلعے میں منعقد ہوئے تھے جو پہاڑ پر واقع ہے۔ حالانکہ سارے جلسے جیاد کے میدان والی کشلہ یا ترکی فوجی بارک میں ہوئے تھے جو اس پہاڑ اور قلعے کے نیچے واقع ہے۔ اس عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مضمون کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے جس نے اس قلعے کی تصویر ہی دیکھی ہے اور غلطی سے ترکی کشلہ کو ترکی قلعہ سمجھ گیا ہے اور خود موتمر میں ہرگز موجود نہ تھا۔ حالانکہ "مردود" صاحب ایک دن ضرور وزیٹر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے یعنی نام تو آپ کا تھا مگر کام کسی انگریز کا تھا۔ آپ کا کام صرف اس قدر تھا کہ شوکت علی محمد علی کے خلاف چند جھوٹی باتیں دل سے گڑھ کر دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ ہندوستان کے ہاں فروخت فرما دیں۔ اس موتمر کے بعد آپ کے نام سے ۲۰-۲۵

مضامین شائع کر دیے ہوں گے۔ اور اس کے بعد آپ کا ایک لکچر ساؤتھ فیلڈ کی اس تاد یانی مسجد میں زیر صدارت سر مائیکل اوڈائر سابق لفٹننٹ گورنر پنجاب دلوایا گیا تھا جس کے افتتاح کا وعدہ کر کے شہزادہ فیصل ابن عبد العزیز آل سعود نے بالآخر انکار کر دیا تھا اور جس کے لیے قادیان سے میرے پاس ایک تار آیا تھا کہ میں سلطان ابن سعود کو مجبور آمادہ کروں کہ وہ اپنے صاحبزادہ کو اس مسجد کے افتتاح کی اجازت دے دیں۔ مضامین اور لکچر دونوں ملی برادران کی مذمت سے بھرے ہوئے تھے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس مکان کی مالکہ صاحبہ نے سب سے اوپر کی منزل سے سب سے نیچے کی منزل میں یہ کہلوا کر طلب فرمایا کہ ایک صاحب آپ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور ان صاحب نے فرمایا کہ میرا نام اقبال علی شاہ ہے ٹیلیفون پر جو مکالمہ ہوا، اب اسے سنیے:

سردار اقبال علی شاہ۔ مولانا السلام علیکم۔ معاف فرمائیے گا۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔

محمد علی وعلیکم السلام۔

س۔ا۔ع۔ش۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرے میں ہے۔

م۔ع۔ ارشاد فرمائیے۔

س۔ا۔ع۔ش۔ فرمائیے آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔

م۔ع۔ جی نہیں۔

س۔ا۔ع۔ش۔ امید ہے آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م۔ع۔ جی نہیں۔

س۔ا۔ع۔ش۔ آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے۔

م۔ع ۔ مگر میرا دماغ بالکل تنگ نہیں ہے۔

س۔ا۔ع۔ش ۔ کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔

م۔ع ۔ جی نہیں۔

س۔ا۔ع ش ۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م۔ع ۔ اور میں بھی پہلے عرض کر چکا ہوں، جی نہیں۔

اس کے بعد میں نے ان ذات شریف کو ان کے تمام مضامین یاد دلائے اور ان کا لکچر یاد دلایا اور کہا کہ میں تنگ دل نہیں ہوں لیکن اس قدر ضعیف الدماغ بھی نہیں ہوں کہ ایسے پاجیوں سے دھوکا کھا جاؤں۔ مجھے تعجب ہے کہ برطانیہ کے ایسے گرگوں کو جو اس کی طرف سے ایسے گندے کام اور جاسوسی کرتے پھرتے ہیں، کیسے ہمت ہوئی کہ مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں۔ میں نے کہا کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے اور میں نے ٹیلیفون کو فوراً منقطع کر دیا۔

اب اس خط کو بھی اسی خاتمہ بالخیر پر ختم کرنا چاہتا ہوں، ورنہ بیچاری بیگم صاحبہ کے نام دو سطریں نہ لکھ سکوں گا۔ مہاراجہ پٹیالہ کا لکچر اور ٹیکسی والے کی میرے ساتھ گستاخی اور اس کا ثمرہ اور اس ثمرے کا جو ثمرہ بنگالی طالب علم اور مجھے چکھنا پڑا وہ داستان اس ہفتہ بھی ملتوی رہی۔ انشاء اللہ کل پرسوں اسے لکھ رکھونگا تاکہ اگلے ہفتہ ضرور آپ تک جا سکے۔

"ہمدرد" کی اشاعت کے متعلق کوئی صاحب کچھ تحریر نہیں فرماتے۔ پرچہ ماشاء اللہ خوب نکل رہا ہے۔ خرچ ظفر الملک صاحب کی ہمت سے گھٹ گیا ہے اور اس پر بھی دس صفحے نکل رہے ہیں۔ اور بارہ کا ارادہ ہے۔ خدا اجر خیر عطا فرمائے مگر یہ تو بتائیے کہ "ہمدرد" کی آمدنی میں کس قدر اضافہ ہوا۔ اب آپ صاحبوں اور "ہمدرد" اور اسلام اور ہندوستان کے لئے دعا

پر اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا بھائی محمد علی

گذشتہ جمعرات یعنی ۱۴ راگست کو میں دارالعوام گیا تھا۔ جمعہ کو دارالعوام کا آخری اجلاس تھا۔ اور سکلات والا[1] کے مبہم اعتراضوں اور سوالوں پر لیبرٹی نے محض نام کے واسطے بجٹ کے سلسلہ میں ہندوستان کا مسئلہ بھی چھیڑا۔ صرف دو گھنٹے ایک شب ہندوستان کے ۳۲ کروڑ انسانوں کے لیے بھی وقف کیے گئے۔ مگر وہ بھی آخری اجلاس میں اور کنزرویٹو فرقہ والوں نے عمداً گینڈا کو انگریزی مرد وز بھیجنے کے سلسلہ میں فضول تقریریں کر کے اور وزیر محکمہ کے جواب کے بعد بھی تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھ کر اور خلاف انتظام طے شدہ یہاں کے سابق سپاہیوں کی سول سروس میں نوکری کے مسئلہ کو بھی اٹھا کر اتنی دیر لگادی کہ ہندوستان کا ذکر خیر بجائے ۹ بجے شب کے ساڑھے دس بجے شروع ہوا اور ساڑھے بارہ بجے ختم ہوگیا۔ رات کے بارہ بجے تک کی کارروائی اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" کی فائل کے ساتھ بھیجدی ہے اور باقی کارروائی یوسف حسین خاں صاحب[2] (برادر ذاکر صاحب جو آجکل میرے ہمراہ اسی مکان میں مقیم ہیں) خرید کر کے غالباً آج ہی آپ کو روانہ کر دیں گے۔ سکلات والے کی تقریر بے مثل تھی۔ اور ارل ونٹرٹن نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اس کا مطلق جواب نہ دیں۔ کل مباحثہ کا حال انشاءاللہ اگلے ہفتہ ارسال کروں گا۔

محمد علی۔

---

[1] بمبئی کے ایک پارسی، جو مدت سے انگلستان میں قیام پذیر تھے، اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی منتخب ہوگئے تھے۔ سوشلسٹ خیال کے تھے [2] یہ بعد کو فرانس کی کسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر آئے۔ اور اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ و سیاسیات کے استاد ہیں۔ (۱۹۵۲ء)

باب (۷۵)

سنہ ۱۹۳۶ء (۷)

(دیارِ فرنگ سے)

خط میں حشو و زوائد آج یقیناً بہت سے معلوم ہوں گے، لیکن اب اسے کیا کیجیے کہ زمانہ کا امتداد ہر لمحہ اور ہر آن۔ ہر "تازگی" کو "باسی پن" میں، ہر شادابی کو پژمردگی میں تبدیل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ زمانہ کی گردش اور وقت کے چکر کو کون روک سکا ہے؟ اس وقت یہی چیزیں نہایت دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اور ان خطوں کی ایک ایک سطر دلکشی اور جاذبیت رکھتی تھی ——— یہ خط موصول ہو ہی چکا تھا کہ اسی کے دو چار روز بعد یہ دوسرا مکتوب بھی وصول ہوا۔ دلکشی و گہرائی میں اپنے پیش رو کے نقش قدم پر۔ پڑھنے والے بھی اس سے لطف و نفع حاصل کریں گے، اب یہ تو اللہ جانے۔ ڈائری نویس سے تو بہر حال یہ ممکن نہیں کہ اسے بے درج کیے گزر جائے۔ حاضر ہے، اور حسب معمول ضروری توضیحی حاشیوں کے ساتھ حاضر ہے۔ گو خود ان ضروری توضیحات کا معیار بھی گردش لیل و نہار کے ساتھ ساتھ بدل گیا ہے۔

راہی ملک جرمنی

۱۶ راگست ۱۹۲۸ء ۔

پیارے ماجد میاں ۔ ظفر الملک صاحب اور جعفری ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ۱۳ راگست کی شب کو لندن سے نکلا ہوں اور دو دن پیرس قیام کرکے تین "بھانجے" کے ساتھ جرمنی جارہا ہوں جن میں سے دو وہ صاحبین ہیں جن کے ساتھ میں لندن کے مکان میں رہا کرتا تھا ، اور ایک عبدالرحمٰن صاحب صدیقیؒ کے بھانجے محمد امین فقیر صاحب صاحبزادے جو ہمارے فرانس کے حدود میں ترجمان اور سارے عالم میں ہمارے خزانچی ہیں ۔ خالد صاحب اور جولائی سے اپنے والد کے ایک دوست کے ترجمان اور رفیق سفر بنکر لندن سے نکلے تھے اور ان "چچا جان" کو مارسیلز تک پہنچا آئے تھے ۔ اس کے بعد جب شوکت عمر صاحب "بڑسی پالٹکناک" سے جہاں وہ سات آٹھ ماہ سے پڑھ رہے تھے کامیاب ہوکر لندن یونیورسٹی کے سکنڈ ایر میں داخل ہوگئے اور ان کے ساتھی اشرف صاحب کو لندن کاٹنے لگا ، اور یہیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی یوسف کے ساتھ چھوڑ جو پیرس کی سار بون یونیورسٹی سے دفتر وزیر ہند اور برٹش میوزیم میں مطالعہ کرنے آئے ہیں ۔ پہلی اگست کو پیرس چلے آئے تھے ۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلی ستمبر تک لندن رہ کر کرنل آسٹن سے علاج کراتا رہوں اور اس کے بعد فرانس آجاؤں اور بالآخر ایک ہفتہ اٹلی رہ کر عازم ہندوستان ہو جاؤں ، البتہ راستہ میں ایک ہفتہ شہر مصر میں بھی قیام کروں اور اگر کچھ پیسے بچ سکیں تو فلسطین بھی ہوتا آؤں لیکن اگست کا مہینہ لندن والوں کے لیے چھٹی کا مہینہ ہوتا ہے ۔ اور غریب اور امیر ، مرد

نہ علی گڈھ کے مشہور اولڈ بوائے ۔ ایک زمانہ میں مولانا کے ذیتی خصوصی تھے ۔ دنوں کلکتہ میں ہے ۔ صدر کلکتہ کارپوریشن ، ایم ۔ ایل ۔ اے ۔ ڈویژنل ٹنگ نیوز وغیرہ ۔ اس وقت غالباً کراچی میں ہیں (۱۹۵۲ء)

اور عورت اور بچے دو تین دن سے لے کر دو ماہ تک کے لیے لندن سے باہر سمندر کے کنارے یا کسی اور تفریح گاہ کو چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ کرنل آسٹن صاحب بھی ۱۷ اگست سے ۱۰ دن کے لیے انگلستان کے مشہور اور قدیم جنگل "نیو فارسٹ" میں چلے گئے ہیں۔ یہاں ووکنگ کے امام صاحب نے اصرار فرمایا کہ عید میلاد کے جلسہ تک جو ۸ ستمبر کو ہونے والا ہے لندن میں قیام کر دوں اور اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کے بعد انگلستان سے رخصت ہوں۔ جب میں قاہرہ گیا تھا تو ڈاکٹر احمد فواد نے سخت اصرار کیا تھا کہ یورپ چھوڑنے سے پیشتر جرمنی کے مشہور فرینکفرٹ کے ذیابیطس کے ماہر ڈاکٹر پروفیسر فان نارڈن کو بھی اپنا حال سنا آؤں اور گو میں کہہ چکا تھا کہ میں علاج صرف کرنل آسٹن کا کروں گا لیکن ان کے اصرار پر اس کا وعدہ کر چکا تھا کہ ان سے اپنا طبی معائنہ ضرور کرالوں گا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کرنل آسٹن کے علاج کے بعد اب حالت کیسی ہے۔ اس لیے گذشتہ ہفتہ میں ایک دن جا کر اپنے پاسپورٹ کی بلجیم، جرمنی اور ہالینڈ کے لیے بھی توسیع کرالی۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ دوسرے ہی دن جرمنی سے چھوٹے ضیا صاحب مسز نائیڈو کے بھائی کی دعوت بھی آئی۔ میں ان کا دعوت نامہ اور اس پر میں نے جو جواب لکھا تھا دونوں ملفوف کیے دیتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دعوت کس قسم کی تھی اور میں نے اس کا کیا جواب دیا۔ مجھے اس وقت ترجمہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ آپ حضرات خود ترجمہ کر سکتے ہیں ورنہ میں نے اس کا خلاصہ اس خط میں دے دیا ہوتا۔ میں ان ہی کو روانہ ہو گیا ہوتا مگر بیگم صاحبہ کو جو تار گذشتہ بدھ کو دیا تھا اس کے جواب کا پیر تک انتظار تھا۔ گو گذشتہ ہفتہ کے تار کا جواب نہ آنے سے تقریباً مایوسی ہو چکی تھی اور میں نے یقین کر لیا تھا کہ وہ میجر سعید محمد خاں[1] کے ساتھ جو بھوپال سے ۲۴ اگست کے جہاز سے روانہ

[1] علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے۔ بھوپال کے رہنے والے۔

ہو رہے ہیں، مع لڑکیوں کے نہیں آرہی ہیں۔ ۱۳ راگست کو ان کا جواب بھی آگیا کہ روپیہ کا کوئی بند وبست نہیں ہوسکا اور میں نے حمیدہ بی کو خدا پر چھوڑ خود جرمنی جانے کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں چٹو پدھیا صاحب کا تار بھی برلن سے آگیا کہ سب انتظامات کردیے گئے، چنانچہ وقت بچانے کے لیے اسی شب کی گاڑی میں یوسف صاحب سے رخصت ہوکر روانہ ہوگیا۔ یہ راستہ ساؤتھمپٹن اور اوسٹے ہوکر آتا ہے۔ اور چینل (رود بار انگلستان) کے عبور کرنے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں۔ یہ عام طور پر لوگ اس سے گھبراتے ہیں لیکن وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ رات کو ڈوور کے لیے ہوکر اور فاک اسٹون بولون ہوکر سفر کیا جاسکتا ہے۔ راستہ میں بڑی خیر ہوگئی۔ ساؤتھمپٹن کے اسٹیشن پر کوئی قلی نہ ملا، اس لیے اپنے ہینڈ بیگ وغیرہ اور سوٹ اٹھاکر میں بھی اور مسافروں کے پیچھے ہولیا اور ان ہی کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہوگیا۔ اگر جاتے ہی سونے کے لیے کیبن نہ مانگا جاتا تو بجائے فرانس کے ہیں جزائر چینل پہنچ گیا ہوتا۔ جب میں نے کشتی پر سوار ہوجانے کے بعد اپنا ٹکٹ کرہ لینے کے لیے دکھایا تو پتہ چلا کہ

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی   کین رہ کہ تو میروی بترکستان است

فوراً اتر کر اس طرف گیا جہاں ایک دوسری کشتی فرانس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ غریب فرانسیسی مزدور کو تو دو فرانک مزدوری کے مل جاتے ہیں۔ اسے غنیمت سمجھتے ہیں، لیکن یہاں کے قلیوں کے لیے دو شلنگ بھی مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ اور استغنا کا یہ عالم ہے کہ مسافروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ رہے ٹیکسی والے تو اس جماعت میں تو ایسے خبیث بھرے ہوئے ہیں کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ ساری دنیا سے زیادہ بھاری سستا اور سڑیل ٹیکسیاں لندن کی ہیں۔ لیکن کرایہ پیرس کی عمدہ ترین ٹیکسیوں سے چوگنا ہوگنا ہے اور انعام بطور انعام کے

قبول نہیں کیا جاتا بلکہ حق سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر خورده لینا پڑتا ہے تو بڑے اصرار کے بعد ملتا ہے، ورنہ ایک شلنگ کا ڈیڑھ شلنگ کرایہ ہوا اور ڈھائی شلنگ دیا جائے تو ٹوپی چھو کر جیب میں رکھ لیتے ہیں اور نہایت اطمینان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ ان ٹیکسی والوں کے متعلق انشاء اللہ آئندہ کسی خط میں تفصیل سے لکھوں گا اور وہ سارا قصہ دہراؤں گا جو مجھے پیش آیا، اور جس کی بدولت لندن کے ایک پرجوش بنگالی طالبعلم کو ٹیکسی والے کو ۵ پاؤنڈ بطور خرچہ دینے کے پڑے تھے اور مجھے ان کی حمایت کرنے والے سالسٹر اور بیرسٹروں کو ان کے گھنٹہ بھر کی محنت کے لیے پانچ پاؤنڈ سات شلنگ چھ پنس دینا پڑے تھے۔ ۲۸ ار کو پیرس پہنچ کر اسی وقت راہی فرانکفرٹ ہوگیا ہوتا مگر چھوٹے بدھیا صاحب کا جن کے متعلق انکا تار آیا تھا کہ اس میں ہدایات سفر ارسال کیے گئے ہیں۔ مجھے اس دن ٹامس کک کے یہاں سے نہ مل سکا۔ اس کے علاوہ "بچا چیچ" کو سین ژرمین کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ واپسی میں یکایک داہنے پاؤں میں درد شروع ہوا اور اس کے باعث شب کو حرارت ہوگئی۔ درد کل بھی رہا اور آج بھی باقی ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ سب ذیابیطس اور نیورائٹس کی علامت، چنانچہ آج شب کو فرانکفرٹ پہنچ کر کل صبح کو پیر کو بھی دکھاؤں گا۔ میری صحت کی عام حالت اچھی ہے۔ پچھلے فاقہ کے بعد ایک ہفتہ تک میں نے گوشت نہیں کھایا۔ بلکہ محض پھلوں اور ابلی ہوئی ترکاریوں پر یعنی کھیرا، ککڑی، ولایتی بیگن اور کاہو پر گذر کیا۔ قارورہ کا امتحان کرایا تو شکر نصف فیصدی تھی اور چربی ۲/۱۰۰ فیصدی تھی۔ فاقہ کرنے کے بعد شکر بالکل نہ تھی، اور چربی ۳/۱۰۰ فیصدی تھی، وزن مخصوص ۱۰۳۴ سے بڑھ کر ۱۰۴۰ ہوگیا۔ وزن تو نہیں بڑھا صرف چھٹانک کی زیادتی ہوئی تھی، مگر توقع کے خلاف کمر اور پنج بڑھ گئی تھی، اور پاؤں کے تلوؤں میں اعصابی سوزش پھر کسی قدر شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے پھر ڈاکٹر گالیا کے دستور کے مطابق سفر میں فا

شروع کر دیا اور آج فاقہ کا چوتھا دن ہے۔ البتہ جس شب کو بخار آیا تھا اور سردی محسوس ہونے کے باعث ترکاری کا شوربا "بچاچیچ" تیار کرا لائے تھے۔ وہ پی لیا تھا مگر صبح ہی کو فروٹ سالٹ کا ایک مسہل اور لے لیا۔ رات اور پرسوں رات بھی بائیں پاؤں میں اعصابی سوزش ہوئی تھی۔ اس سے کچھ امید بھی بندھتی ہے کہ مرض کا فاقوں سے مقابلہ ہو رہا ہے اور ہزیمت اٹھانے سے پہلے مرض زور دکھا رہا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ کل آپ کو خط لکھتا مگر اس درد کے باعث نہ لکھ سکا اور بجائے اس کے خالد کو ساتھ لے کر نیلیس نامے میوزک ہال دیکھنے چلا گیا۔ برادران من اب تو مدت سے کسی محفل رقص و سرود میں شریک نہیں ہوتا ہوں اور باوجود نفس امارہ کے بہت سے مطالبات کے انھیں پورا کرنے سے باز رہتا ہوں۔ ان ہی کیفیات قلبی کو ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا ؎

یکبارگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
اے دل نگاہ یار بھی کیا سحر کر گئی

ہندوستانی گانا سننے کو البتہ دل تڑپا کرتا ہے اور شوکت صاحب[1] تو ایک دو بار نفس کو بہت ہی لالچ دلایا۔ اس لیے کہ گوہر جان[1] کی طرف سے وہ دعوت لائے تھے کہ کبھی تو گھر آ کر دیکھ سن لیا کیجیے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ سوائے اقبال کے اشعار کے اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو کچھ اور نہ سناؤں گی۔ لیکن میں نے ضبط و صبر سے کام لیا اور کہلا بھیجا کہ اب معذور ہوں۔ البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب[2] کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں اور

[1] کلکتہ کی بہت مشہور مغنیہ۔ مولانا یہ ذکر اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ کا کر رہے ہیں یعنی ۱۹۱۱ء کا، نہ کہ اگست ۱۹۴۲ء کا، جو اس خط کی تحریر کا زمانہ ہے [2] کلکتہ کے مشہور قوال

"جنت نگاہ" و "مسمیٰ فردوس گوش" تو ضرور نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ مہاراجہ الور کے ہمرکاب رامپور گیا تھا تو پہلی شب کو جب میں محفل رقص و سرود میں حاضر نہ ہوا تھا تو بلوایا گیا تھا۔ لیکن جب میں نے عذر پیش کر دیا تو مہاراجہ صاحب نے اسے قبول فرمایا۔ بلکہ خود بھی اس کے بعد محفل رقص و سرود میں شریک نہ ہوئے اور اس کے عوض قوالی کی محفل اپنی قیام گاہ کے پاس ہی ہر شب کو منعقد کرائی۔ ہندوستان میں جو تھیٹروں کی حالت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ سینما میں بھی اکثر سوائے بوس و کنار کی تصاویر کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں سینما میں نہیں جایا کرتا۔ اور "بجا پیچ" کو یہ سنکر سخت تعجب ہوا کہ میں نے آج تک چارلی چیپلن[1] کو سینما میں نہیں دیکھا تھا۔ اور گزشتہ ہفتہ ہی میں اپنے محلہ کے ایک سینما میں ان کے فلم پروگرام میں دیکھتے ہی بس پر سے اتر پڑا۔ حالانکہ ٹکٹ پکاڈلی کے لیے تھا۔ تاکہ وہاں جا کر ایک تھیٹر میں سینما دیکھیں۔ البتہ میں سنجیدہ ڈرامے کا عاشق ہوں۔ اور ایلن ٹیری جو ابھی انتقال کر گئی ہے اور ارونگ بیر بوہوم اور مسز پٹرک کیمبل فاربس رابرٹس اور مسز پٹرک اور پھر ان کی بیوی گرٹروڈ ایلیٹ ولسن بیرٹ اور نامد جیفریز اور پھر لیلا میک کارتھی وغیرہ کو آکسفرڈ کی تعطیلات میں دیکھنے کے لیے بار بار تھیٹر جایا کرتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں جب لندن آیا تھا تو مطلق فرصت نہ تھی۔ پھر بھی برنارڈ شا صاحب کے ایک تماشہ کو دوبارہ جا کر دیکھا لیکن اب وہ بڑے بڑے ایکٹر باقی نہ رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تو اتنی بھی فرصت نہ تھی جتنی کہ ۱۹۱۳ء میں تھی، اور حقیقت میں دل بھی اب اس ڈرامے میں لگا ہوا تھا جس میں مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھی اناطولیہ میں ایکٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بار ذرا فرصت تھی اور ہنڈن میں طیاروں کے کرتب دیکھنے کے بعد شفیع کی رسٹوران میں ہندوستانی کھانا کھا کر تھیٹروں کی طرف رخ کیا۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ "بجا پیچ" کے اصرار سے ہوبرن کے

[1] انگلستان کا مشہور ترین طربیہ فلم ایکٹر۔

امپائر نامی میوزک ہال میں گیا اور بالکل خیال نہ رہا کہ یہاں تو محفل رقص و سرود گرم ہوتی ہوگی۔ جب وہاں پہنچ چکا تھا تو میری آنکھوں نے پہلی بار تھیٹر میں وہ نظارہ دیکھا جو کبھی جوانی میں بھی نہ دیکھا تھا یعنی چند عورتیں ٹخنوں سے لے کر رانوں تک برہنہ ہمارے یہاں کی کبوتریوں کی طرح کرتب دکھا رہی ہیں۔ جب میں تیس برس پیشتر انگلستان آیا تھا تو میوزک ہال میں ہر رقاصہ ریشم کے ٹایٹ یعنی رانوں تک موزے پہنے ہوتی تھی۔ پھر بھی ایسے رقص گاہوں میں جانا "رنگیلے پن" کی علامت تھی لیکن اب تھیٹروں میں برہنگی کیوں نہ آئے جب سمندر کے کنارے کے ہر تفریح گاہ میں ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح سے بنیان جانگیا پہنے ان ہی کے ساتھ تیرتی پھرتی ہیں، اور اس کا نظارہ گو ابتک کسی بندرگاہ پر جاکر نہیں کیا ہے تاہم اپنے جہاز ہی پر ولایت آتے وقت دو تین میم صاحبان کو ڈک پر کرپچ کی حوض میں کودتے پھاندتے اور مردوں کی گردنوں پر سوار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آج کل ہر مصور اخبار میں ان ہزارہا غسالجات کے حسن کی نمائش اور اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں ہر ہفتے چند پرچے مولانا عرفان کی خدمت میں بھیج دیا کرتا ہوں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اب نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

برادران من! حقیقت میں اب پردہ یہاں تک اٹھ چکا ہے کہ شب عروسی بھی بے نقاب نظر آتی ہے۔ جب انگلستان کا یہ حال ہو، جہاں میری طالب علمی کے زمانے میں عورتوں اور مردوں کا ساتھ ساتھ نہانا قطعاً ممنوع تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں عورتوں کا سارا جسم ڈھکا ہوتا تھا، تو پھر آج پیرس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جب میں نے بچا چیچ سے سنا کہ وہ مولانا اور آنوفی بر ٹیر جاکر اس عریانی کا نظارہ کر چکے ہیں تو میں نے بھی اس خیال کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

فیصلہ کیا کہ سیلس جاکر دیکھوں تو کیا کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے "پارسی بلزیز" نامی ایک رسالہ میں متعدد تصاویر دیکھ چکا تھا جس میں دو مسماتیں "وحید" اور "دبلی" نامی بھی تھیں۔ ان کا لباس دیکھ کر مجھے اس امریکن عورت کا قول یاد آیا جس نے لکھا تھا کہ "ہاں میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کا قومی لباس کیا ہے۔ ہندوستان کا قومی لباس ایک ٹپکا اور ایک جیبی رومال ہے"۔ ان غیر مستورات کے سر پر بھی ایک ٹپکا تھا اور باقی جسم کے لیے ایک نہایت مختصر سا جیبی رومال رہ گیا تھا۔ اس رومال کو رومالی کی جگہ دیکھ کر بے اختیار غالب کے اس شعر میں تصرف کرنے کا جی چاہتا تھا ؎

ہائے اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو معشوق کی خشتت ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ "خشتت" کے ہجے کیا ہیں۔ آج تک کبھی لکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے رہیلکھنڈ والوں کی پشتو کا ایک لفظ ہے۔ اور خ ق اور ش ت کا اجتماع یقیناً "پختو" پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن "سچا سچ" نے تصدیق کر دی کہ یہ لفظ مستعمل عام ہے۔ بلکہ مبتٰی پا افتادہ ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ شاید یہ ہوگا *Worn Thread Bare*۔ جو کچھ میں نے دیکھا، اس کے صرف ایک حصہ کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ اگر ان کے بلاک بھی مل جاتے تب بھی "ہمدرد" میں یہ تصاویر شائع نہ ہوسکتیں، گو ایک بار شائع ہو جائیں تو یقیناً "ہمدرد" کی اشاعت "زمیندار" اور "انقلاب" سے بڑھ جائے اور ایک مجروح بیٹے مولفؒ کے تجربات شب عروسی وغیرہ کو بھی مات کر دے۔

لہ دہلی کے ایک خاص مولف کی طرف اشارہ ہے جو اسوقت اسی قسم کی کتابیں لکھ کر اور فروخت کر کے نام پیدا کر چکے تھے۔

اب میں اس خط کا بھی خاتمہ بالخیر کرتا ہوں. ہم سیلان سے جو فرانس کا ایلمڈ شاٹ یا راولینڈی ہے گذر چکے ہیں، اور اب تبلیسی سے گذر رہے ہیں. جو وائے نز سے پہاڑوں کے سلسلہ کے پیچھے فرانس کے دفتی خط کے وسط میں ہے۔ ممکن ہے کہ اگلا خط اتنا لمبا بھی نہ ہو سکے اس لیے کہ اس دن انگلستان کو واپس ہو رہا ہوں گا۔ گذشتہ ہفتہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ جمعہ کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا شروع کر دوں گا لیکن نماز جمعہ کے بعد نماز گاہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جماعت سے مذہبی مکالمہ کیا کرتا ہوں اور اس کے بعد آزنلڈ[1] سے ملنے گیا۔ اور وہاں سے قادیانی جماعت کے ساتھ شب کا کھانا کھانے گیا۔ مگر صرف دعوت ہی نہیں تھی بلکہ ایک پورا استقبال ہو گیا۔ ایک نو مسلم انگریز نے ایڈریس پڑھکر سنایا۔ اور مجھے بھی تقریر کرنا پڑی اور وہاں کے امام ساتھی درد صاحب نے بھی تقریر کی اور دوسرے دن ان ہی نو مسلم انگریز مین صاحب انکی موٹر میں لندن سے ۳۰-۴۰ میل باہر ان کے دوست اور اپنے واقف کار ایک انگریز نو مسلم صاحب سے ملنے جانا پڑا جو نیاسالینڈ (افریقہ) میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔ انکا نام سانڈرسن ہے اور حج بیت اللہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، ان کو ہم نے تار دیدیا تھا مگر افسوس کہ وہ تار ملنے سے پہلے ہی کہیں باہر جا چکے تھے۔ یہ نیاسالینڈ کی زبان کے حروف تیار کر رہے ہیں تاکہ عربی رسم الخط میں حروف کا اضافہ کر کے قرآن کریم کا اس زبان میں ترجمہ اب ہی شائع کر دیا جائے۔ انشاءاللہ واپسی پر ان سے پھر ملنے ضرور جاؤنگا۔ اس سفر کے باعث خط جمعرات سے پیشتر اس بار بھی شروع نہ کیا جا سکا اور جتنا لکھا گیا ہے اس کیلئے آپ کو اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنھوں نے ابتک سوکھی روٹی بھی نہیں کھائی ہے۔ چونکہ بیچارے "کو سیر و تفریح کیلئے علیحدہ روپیہ نہیں ملا ہے، اسلیے میرے طریقہ علاج پر عمل کرکے وہ صرف ایک وقت سوکھی کھاتے ہیں اور پیٹ کاٹ کر سفر کرتے ہیں اور نپولین کے مشہور مقولہ پر کہ "فوج پیٹ کے بل پر چلا کرتی ہے" ایک دوسرے معنی میں عمل کر رہے ہیں۔ فی امان اللہ

آپ کا بھائی محمد علی

---

[1] مشہور ماہر ترقیات و اسلامیات سرٹامس آرنلڈ سابق استاد علی گڑھ کالج [2] کنور محمد اشرف۔ بعد کو ڈاکٹر اشرف پہلے کانگرس کے اور بعد کے کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر۔

باب (۴۷)

سنہ ۱۹۲۸ء (۸)

(ایک بے نوشہ کی بارات ۔ مفلس کی آن)

اگست کا مہینہ تھا کہ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے نہرو کمیٹی کی رپورٹ بحث و منظوری کے لیے پیش ہوئی کمیٹی ہندوستان کے دستور اساسی کے اصول مرتب کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی ۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کے صدر، تھے ممبروں میں دو مسلمان بھی تھے، ایک شعیب قریشی، دوسرے سرعلی امام ۔ سر موصوف کو تو غالباً غور و توجہ کی فرصت ہی نہ ملی، اور شعیب قریشی صاحب بھی شاید اپنے کو کمزور پاکر دھیمی ہی آواز میں کچھ بولے ۔ کمیٹی نے بہرصورت ایک اصولی مسودہ مرتب کر دیا جس میں مسلم حقوق بڑی حد تک پامال ہو رہے تھے ۔ جلسہ کے صدر، سال رواں کے صدر کانگریس، ڈاکٹر انصاری صاحب تھے ۔ مسلم اور غیر مسلم اکابر، کانگریسی اور نیشلسٹ خیال کے کہنا چاہیے کہ سب ہی جمع تھے ۔ عجب پر بہار مجمع تھا ۔ خوب خوب تقریریں ہوئیں ۔ ہند ممبر خوب خوب بولے ۔ مولانا شوکت علی شریک ضرور ہوئے، لیکن ایک گوشہ میں، کس مپرسی کے عالم میں بیٹھے رہے ۔ سامنے آکر، کھل کر، مخالفت نہ کی ۔ یہ حصہ تو محمد علی ہی کا تھا ۔ وہ ابھی یورپ سے کہاں واپس آئے تھے ۔ جلسہ ساری سہا بھی، ساری گرماگرمی کے باوجود ایک محمد علی

کے وجود کے بغیر سونا سونا رہا۔ ع

بزم میں سب ہی مگر تم جو نہیں، کوئی نہیں!

ہیملٹ کا تماشا گھنٹوں بغیر ہیملٹ کے پارٹ کے ہوتا رہا ـــــــــ بعد کو مسلمان بہت پیچھے پیٹے، کون سنتا تھا۔ فیصلہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ الٹے شوکت علی بدنام ہوتے اور گالیاں کھاتے رہے کہ گورنمنٹ کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ ملک کی ترقی اور آزادی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ برطانیہ کی غلامی پر قانع رہنا چاہتے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

محمد علی دیر میں یورپ سے واپس پہنچے۔ ٹرکی، فلسطین، عراق وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے۔ ان ملکوں میں انھیں داخلہ کی اجازت ہی سرکار برطانیہ کی طرف سے نہیں مل رہی تھی، بمشکل تمام ملی۔ ابھی کراچی پہنچے ہی تھے کہ پٹنہ میں بہار مسلم کانفرنس کی صدارت کی دعوت پہنچ گئی، اور اس کے معاً بعد کلکتہ میں خلافت کانفرنس کی بھی صدارت کرنا تھی۔ خلافت کانفرنس کا یہ شاید سب سے آخری اجلاس تھا، اس کے بعد پھر کوئی سالانہ جلسہ نہ ہو سکا۔ ع

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

محمد علی اب اپنے قدیم دوستوں اور عمر بھر کے رفیقوں ہی کے ہدف ملامت بن رہے تھے، ڈاکٹر سید محمود، چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں شروانی، عبد المجید خواجہ، جو کل تک محمد علی کے دست و بازو تھے، آج سو فی صدی نیشنلسٹ کی حیثیت سے موتی لال نہرو کے کیمپ میں تھے۔ اور سب سے بڑھکر ڈاکٹر انصاری، جن کی رفاقت محمد علی کے ساتھ ایک ضرب المثل تھی، آج مخالفین کے ساتھ تھے۔ اور اردو پریس میں تو بد زبانی اور سب و شتم کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ زمیندار اور مہاراجہ محمود آباد میں ایکا تھا۔ مہاراجہ کی مدح و منقبت سرائی

ہو رہی تھی۔ اور محمد علی کا نام ہر قسم کے تبرا کے لیے وقف تھا ———— ایک خبر دو تین ہفتہ قبل یہ آئی تھی کہ مولانا جب کربلا پہنچے ہیں تو وہاں ان پر رقت طاری ہوئی اور کچھ دیر تک روتے رہے۔ مولانا کے سے رقیق القلب شخص کے لیے اس میں کوئی انوکھی بات تھی ہی نہیں، تاہم خبر رساں ایجنسی نے مولانا کی شخصیت کے عظمت کے اعتراف میں اس خبر کو بھی روانہ کرنا ضروری سمجھا۔ ہندوستان ٹائمز نے اس خبر کا عنوان دیا:

"محمد علی کربلائی رو پڑے!"

جب مولانا دلی پہنچے ہیں، اور میں حسب دستور فوراً دریا باد سے چل کر دلی آیا تو یہ خبر بھی ان کے گوش گذار کی۔ معاً اور بلا چند سکنڈ تامل کے بولے" یہ نہ لکھا کہ ظفر علی کرم بلائی ہنس دیئے![1]"

———— اس برجستگی اور حاضر جوابی کے تو وہ بادشاہ ہی تھے۔ غصہ سے بھرے ہوئے ہوں یا رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں، یہ زندہ دلی ہر حال میں قائم رہتی۔

ماش کی دھوئی ہوئی دال گھی پڑی ہوئی اور ماش کی کھچڑی خوب گھی کے ساتھ، جاڑوں

[1] "کرم بلائی" میں اشارہ ہے "کرم آباد" کی طرف۔ مولانا ظفر علی خاں مالک "زمیندار" کا وطن ———— مشہور شاعر کے ظفر علی خاں کو ان ظفر علی خاں سے کوئی مناسبت نہیں جو شروع ۳۱ء میں محمد علی کی موت پر یوں روئے ؎

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی | رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی
زنداں کو جس نے مطلع انوار کر دیا | تابانی اس کرن کی محمد علی سے تھی
سر پر لپیٹ لیتے ہیں جس کو غزا کے وقت | آرائش اس کفن کی محمد علی سے تھی
توحید کے اصول کی جو حریف ساتھ تھی | ذلت ہر اک وثن کی محمد علی سے تھی

میں محمد علی کی محبوب غذا تھی۔ اب کی بھی قیام دہلی میں کھانے میں آئی محمد علی اپنی خرابیِ صحت کے زمانہ میں بھی پرہیز کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے، اور اب تو یورپ سے صحت ایک حد تک ٹھیک کر کے لائے تھے۔ آپ کھانے پینے میں پرہیز و احتیاط کیا کرتے۔ خوب آزادی سے ہر چیز کھاتے اور کھلاتے۔ پنجاب کے کوئی اڈیٹر صاحب (خیال ایسا پڑتا ہے کہ مہر صاحب تھے، جو زمیندار سے الگ ہو کر اپنا روزنامہ انقلاب نکال رہے تھے، اور انقلاب اس وقت ان گنے چنے اخباروں میں تھا، جو مولانا کا ساتھ اب تک دیے جا رہے تھے۔) مہمان آئے ہوئے تھے۔ مولانا پنجابی صحافت سے عاجز آ چکے تھے۔ کھانے کی میز پر ان سے کہنے لگے کہ یہ پنجاب کے اخبارات اپنے الگ الگ نام کیوں رکھتے ہیں بس ایک نام ہر اخبار کے لیے کافی ہے۔ "پیسہ اخبار"[1]۔ ہر اخبار پیسہ اخبار ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس پر نمبر ڈال دیا کریں۔ پیسہ اخبار نمبر (۱)، پیسہ اخبار نمبر (۲) اس پر ان اڈیٹر صاحب نے بھی خوب لطف لیا۔ اور ہنس ہنس کر تائید کرتے رہے ——

شوکت علی بیچارے تنہا اُس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے، جو ہندوؤں میں تو تمام تر اور مسلمانوں کے بھی ایک بہت بڑے حلقہ میں خلافت کمیٹی کے لیڈروں کی مخالفت میں برپا ہو چکا تھا۔ محمد علی کا آ جانا انھیں غنیمت کیا، ایک نعمت معلوم ہوا۔ ایک دنیا شوکت علی کی مخالف تھی۔ حد یہ ہے کہ خاص محمد علی کے اخبار ہمدرد کا بھی، رویہ تمام تر ان کی موافقت و مدافعت میں نہ تھا۔ میں خود تو شوکت علی کا ساتھ دے رہا تھا لیکن ہمارے نئے منیجر حاجی ظفر الملک علوی صاحب تمام تر نیشنلسٹ خیال کے تھے۔ اور انچارج اڈیٹر جعفری صاحب کا کچھ تو ذاتی میلان بھی اُسی طرف رکھتے تھے اور پھر ڈاکٹر انصاری وغیرہ بھی کا دباؤ محسوس کرتے تھے

[1] لاہور کے ایک مشہور اخبار کا نام بھی "پیسہ اخبار" تھا، پہلے ہفتہ وار تھا، پھر سالہا سال، روزانہ اڈیشن بھی نکلتا رہا، اور پنجاب میں مدتوں بہت مقبول رہا۔ حاجی محبوب عالم مرحوم اس کے اڈیٹر اپنے زمانہ کے بڑے کامیاب لوگوں میں تھے۔

ایک محمد علی ہی کی ذات ایسی تھی جسے حق کے آگے دنیا کی کسی مخالفت، موافقت کی پروا نہیں رہتی تھی۔

محمد علی ہندوستان آگئے لیکن ہمدرد بدستور میرے ہی چارج میں رہا۔ پرچہ کی چلتا نی بحیثیت بانی ان کا نام ہوتا تھا، اور بحیثیت نگراں میرا۔ پرچہ کی روش و مسلک سے مولانا بحمد اللہ خوش رہے اور یہی مجھے بڑا صلہ اپنی توقع سے زیادہ مل گیا۔ ورنہ دھڑکا برابر لگا ہوا تھا کہ ان کی کڑی نکتہ چینی سے ہم لوگ کیسے بچ سکتے ہیں۔ فرصت و آرام محمد علی کی قسمت میں کہاں تھی۔ یہاں آتے ہی پھر کام میں جُت گئے یا جوت دیے گئے۔ اور کام لینے والے سب سے بڑھ کر ان ہی کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی تھے۔ کوئی کام کسی درجہ کا بھی ہو، سب محمد علی کے سپرد۔ حکم نامہ ان کے لیے موجود۔ بگڑتے، جھنجھلاتے، بلکہ بعض وقت واقعۃً آنسوؤں سے رونے تک لگتے۔ لیکن تعمیل بہرحال کرنی پڑتی۔ شوکت صاحب کے خیال میں محمد علی کبھی تھک سکتے تھے۔ کبھی بیمار یا اور کسی سبب سے معذور ہو سکتے تھے۔ اور اسی حسن ظن میں شوکت صاحب کے ساتھ ساری قوم مبتلا تھی!

دسمبر میں صحت درست کر کرا کے ابھی آئے تھے کہ کام کا سارا بوجھ پھر سر پر آپڑا۔ ابھی پٹنہ، ابھی کلکتہ، ابھی پھر دہلی۔ یہاں صدارت، وہاں تقریر، اس سے جھگڑا، اس سے معرکہ۔ آج اس کا جواب لکھنا، کل اس کے مقابلہ میں بیان دینا۔ اور اب طرہ یہ ہوا کہ منجھلی صاحبزادی جن کی شادی ابھی چند ہی مہینے ہوئے مئی ۲۳ء میں ماجد علی خان کے ساتھ ہوئی تھی، وہ بیمار رہنے لگیں اور اندیشہ دق کا پیدا ہو چلا۔ (یاد ہو گا کہ منجھلی صاحبزادی ۲۵ء میں اسی مرض میں گزر چکی تھیں) تشویش ہر باپ کے لیے قدرتی تھی، اور پھر محمد علی جیسے سراپا محبت باپ کے لیے اس پر بھی شوکت صاحب کا، اور ان کی تائید میں صدر خلافت شفیع داؤدی صاحب کا حکم پہنچا کہ کمبئی میں جو ہندو مسلمانوں میں سخت اور خوں ریز بلوہ ہوا ہے، اس کی پیروی

کے لیے فوراً بمبئی آؤ!

شروع مارچ میں میرا جانا دہلی ہوا تو دیکھا کہ محمد علی ایک طرف تو سرمایۂ خلافت کمیٹی و جامعہ ملیہ کی خاطر اور کسی قدر آرام و تبدیلی آب و ہوا کے خیال سے بھی سفر برما کی تیاریوں میں مصروف، اور دوسری طرف خاص دہلی میں ایک عظیم الشان آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کے اہتمام میں لگے ہوئے ہیں۔ میں وسط مارچ میں حج پر روانہ ہو رہا تھا، اسلیے خصوصی ملاقات بھی کرنا تھی۔ محمد علی کے ساتھ ساتھ شریف منزل گیا (اب حکیم اجمل خاں مرحوم کی جانشینی ان کے صاحبزادہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب کر رہے تھے) یہیں ابتدائی کمیٹیاں مشورہ وغیرہ کی ہو رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ اس وقت تک جمعیۃ العلماء مولانا کے ساتھ تھی۔ مولوی احمد سعید صاحب وغیرہ جلسہ میں موجود تھے۔ ورنہ تو رفاقت میں ہم ہی چند قدیم نیازمند باقی رہ گئے تھے۔ ۳ یا ۴ مارچ کو میں ادھر واپس آیا اور ادھر مولانا سفر رنگون کے لیے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ ساتھ میں بطور سکریٹری کے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (جامعہ والے) گئے۔

مولانا کا کہنا تھا کہ الور راج سے مہاراجہ کے بھیجے ہوئے ایجنٹ دہلی وارد ہوئے۔ مہاراج کے راج کی جوبلی منائی جا رہی تھی، اور خواہش قدرۃً یہ تھی کہ ہمدرد اس موقع پر الور جوبلی نمبر شائع کرے۔ جس میں مہاراجہ کی تصویریں ہوں، حالات ہوں، وقس ہذا۔ یہ مہاراجہ وہی تھے جو ابھی ابھی ہزارہا ہزار کے مصارف، مولانا کے سفر یورپ اور صحت کے لیے برداشت کر چکے تھے۔ اور مولانا سے گہرا اور خصوصی تعلق خاطر رکھنے لگے تھے۔ ان کے ہاں سے آئی ہوئی فرمائش کو رد کرنا کس کے بس کی بات تھی۔ خصوصاً جب کہ اس اسپیشل نمبر کے مصارف طبع وغیرہ بھی ان کے ہاں سے مل رہے ہوں! جعفری صاحب ایڈیٹر کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو بیچارے دلی سے دوڑے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ پرچہ کا باضابطہ نگران ابتک میں ہی بنا ہوا تھا۔

ایک بیک بے شان و گمان انھیں دریاباد میں دیکھ میں دنگ ہوا۔ جلدی جلدی انھوں نے صورت حال سے باخبر کیا۔ میں کیا مشورہ دیتا۔ خود ہی حیران رہ گیا۔ نہ قبول کرتے بنتا تھا نہ انکار ہی کرتے۔ آخر میں رائے یہ قرار پائی کہ خود مولانا ہی سے رنگون تار بھیجکر دریافت کیا جائے جعفری صاحب تو گھڑی سواری آئے ہی تھے۔ پہلی ٹرین سے واپس گئے۔ مارچ کی ، ا یا ۱۱ تھی ۱۳ کو مولانا کا ایک طویل تار جواب میں موصول ہوا :۔

۱۳ مارچ ۔ رنگون ۔ باتصویر جوبلی نامہ کی طبع و اشاعت میں مضائقہ نہیں ۔ ہمدرد کے خریداروں کے پاس بھیجدیا جائے ۔ لیکن خود ہمدرد نے کبھی کوئی خصوصی نمبر شائع نہیں کیا ہے۔ اس لیے ہمدرد کا جوبلی نمبر مجھے پسند نہیں "۔

یہ ظرف بھی محمد علی ہی کا تھا ۔ ظاہر ہے کہ ہمدرد کو مالی اعانت کی ضرورت قدم قدم پر تھی ادھر مہاراجہ جیسے محسن کی طرف سے فرمایش ۔ اس پر بھی ہمدرد کا جوبلی نمبر نکالنا منظور نہیں ؛ زیادہ سے زیادہ اجازت اس کی کہ ایک الگ رسالہ چھاپ کر اس کی تقسیم اشاعت ہمدرد کے حلقہ میں کردی جائے ـــــــــ افلاس و احتیاج کے وقت خودداری کو قائم رکھنا محمد علی کا جوہر خصوصی تھا ، اور یہ واقعہ اس کی صرف ایک نظیر ہے ۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ تو خیر غالب کی شاعری تھی ۔ باقی اس شاعری کو حقیقت میں تبدیل کر کے رکھنا محمد علی جوہر ہی کا کام تھا ۔

(ہمدرد مرحوم۔ روزافزوں معذوریاں)

مولانا غریب زکموں میں، بہ قول شخصے ابھی بستر بھی کھولنے نہیں پائے تھے کہ قومی کاموں کے سلسلے میں دہلی اور بمبئی سے طلبی کے حکم نامے پہنچنے لگے، اور برما کی سرزمین پر پورے دو ہفتے بھی بسر کرنے نہ پائے تھے کہ انھیں دہلی واپس ہونا پڑا ——— اس دوڑ دھوپ میں آرام جیسا ملا ہوگا، ظاہر ہی ہے۔ حالانکہ زیادہ تر اسی آرام وسکون ہی کے خیال سے ڈاکٹری مشورہ سے مجبور ہوکر مولانا نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ قوم وملت کی خدمت کی خاطر ان گنت ذاتی تکلیفیں اٹھاتے رہنا مولانا کے لیے مقدر ہو چکا تھا!

وسط مارچ سنہ ۲۹ء میں میں وطن سے حج کے لیے بمبئی روانہ ہوگیا اور مئی میں مدینہ منورہ میں تھا کہ مدینہ (بجنور) کے ایک پرچہ سے ہمدرد کے بند ہو جانے کی نہایت درجہ اندوہناک خبر ملی۔ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کرتا کیا۔ اور خود مولانا بیچارہ بھی کیا کرتے مسلسل مالی خسارہ کب تک اٹھاتے رہتے ——— کامریڈ، انگریزی ہفتہ وار فروری سنہ ۲۹ء میں بند ہو چکا تھا، ہمدرد، اردو روزنامہ اپریل سنہ ۲۹ء میں بند کرنا پڑا! یہ تھا قوم کی طرف سے قوم کے سب سے بڑے خادم اور سب سے بڑے مخدوم کو عملی صلہ! کوئی دوسرا ہوتا تو تعجب نہیں

جو اتنی ہمت شکنیوں اور حوصلہ فرسائیوں کے بعد اس کا جگر شق ہوجاتا۔ یا کم از کم قومی خدمات کا تو ان کے بعد نام بھی نہ لیتا۔

جون کی ۹ رتھی۔ جب میرا جہاز ساحل بمبئی سے آ لگا۔ مولانا شوکت علی، مولوی شفیع داؤدی مولانا عرفان، سب سے گودی ہی پر ملاقات ہوگئی۔ مولانا عرفان سے ملتے ہی میں نے محمد علی کی خیریت دریافت کی۔ (یہ مولانا عرفان اب تک محمد علی کے مخصوص مخلصین میں سے تھے) سفر یورپ سے واپسی وغیرہ کا حال اجمالاً ان سے وہیں معلوم ہوگیا۔ اپنی خیریت سے بھی مولانا کو فوری اطلاع دے دینی ضروری تھی۔ اسی دن تار دے دیا۔ مصارف سفر حج سے بچی بچائی ایک مختصر سی رقم پڑی رہ گئی تھی۔ اسی وقت بمبئی سے مولانا کے نام روانہ کردی۔ اور خط بڑی لجاجت سے لکھ دیا کہ اس مخلص نیازمند کی اس نذر حقیر کو رد ہرگز نہ کیجئے گا۔ ورنہ بڑی دلشکنی ہوگی۔
________ محمد علی کی خدمت کرنا وقت کے سب سے بڑے مجاہد ملت کی خدمت کرنا تھی۔

ڈیڑھ دو دن کے قیام بمبئی میں بہت سی کام کی باتیں (گو بڑی ہی تکلیف دہ) معلوم ہوگئیں۔ ڈاکٹر انصاری (اللہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے) اب علی برادران سے بالکل الگ ہوچکے تھے۔ بیچارہ پر قومیت اسلامیت سے کہیں زیادہ سوار تھی۔ آخر تک ان بھائیوں کا ساتھ دے ہی نہیں سکتے تھے، جو اول بھی مسلمان تھے، اور آخر بھی مسلمان۔ محمد علی کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک طویل شکایتی و اعتراضی خط انگریزی میں مولانا شوکت علی کے نام آیا تھا۔ جس کا جواب بھی شوکت صاحب نے بڑا مدلل و معقول۔ انگریزی ہی میں انھیں دیدیا تھا اتنے سنجیدہ اور پر مغز جواب کی شوکت صاحب سے توقع بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ بہر حال وہ پوری خط و کتابت نظر سے گزر گئی۔ مولانا کی بیمار صاحبزادی حمیدہ بی کی طبیعت میں بھی دل لگا ہوا تھا۔ یہ سن لیا تھا کہ حالت اور گرتی ہی جاتی ہے۔ مولانا اب دہلی میں بے گھر تھے۔ کوچہ چیلان

کا قدیم، وسیع و شاندار مکان جس میں ہمدرد و کامریڈ کا دفتر، پریس وغیرہ سب کچھ تھا، وہ اب ہاتھ سے نکل چکا تھا، شاید اس کا کچھ کرایہ بھی مولانا کے ذمہ باقی رہ گیا تھا، اور مولانا اب وہاں سے بہت دور اپنے داماد حامد علی خاں کے مکان، مقام راجپور روڈ پر مقیم تھے۔ یونانی جنیرل کا کچھ کاروبار کسی کی شرکت میں کرتے تھے۔ اور اب ان کا کارخانہ بھی بگڑا جاتا تھا۔ بیوی کے علاج میں خاطر خواہ صرف کرنے سے معذور تھے۔ اور اس کا بار بھی ایک حد تک مولانا ہی پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کی بینائی مولانا کی اور زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی۔ حالانکہ سن ابھی ۵۰۔۵۱ سے زیادہ نہ تھا۔

بمبئی سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دریاباد پہنچتے ہی فکر یہ ہوئی کہ ایک احرام سفر ہجاز اور معذور، مظلوم اور دکھیا رے مولانا کی عیادت و مزاج پرسی کی خاطر دہلی کے لیے جلد سے جلد بندھے۔ عین اسی وقت یہ والا نامہ صادر ہوا جو ابھی آرہا ہے۔ ایک قرن گزر جانے کے بعد آج یہ خشک اور بے جان سا معلوم ہوگا، جس وقت اس میں جان تھی۔ اور ایک ایک فقرہ میں سوز تھا، درد تھا، تڑپ تھی۔ اور بے کسی کی پوری پوری داستان تھی۔

" ۱۲ر جون ۱۹۲۹ء   ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی۔

پیارے ماجد میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول

گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

الحمد للہ کہ آپ بھی اس سعادت کو حاصل فرماکر اعزا و احباب میں آکر شامل ہوگئے۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ گیا ہوتا۔ مگر دیکھیے اب یہ سعادت کب نصیب ہوتی ہے۔

۱۳۴۵ھ[1] سے اس وقت تک ہزاروں لاکھوں گناہوں کا بوجھ اور اپنے سر لے چکا ہوں، اور اب بے حد شقی القلب ہو چکا ہوں، کاش پھر میدان عرفات میں سہ پہر کو بیٹھ کر دل کو بخشش کی امید دلاسے بھرتا۔ اور کاش پھر دیارِ حبیب پہنچکر مولد سے مدفنِ مبارک کی طرف روانہ ہوتا اور روضۂ پاک پر ندامت کے آنسو بہاتا، اور پھر گھنٹوں وہاں بیٹھ کر آپ کی مدینہ منورہ کی ساری زندگی کا تصور کرتا اور قلبِ مضطر کو مسرور کرتا اور بعض وقت باوجود اس ادب کے جس نے مزار مبارک کے پردے کو بھی اپنے گندے ہاتھ نہ لگانے دیے۔ پھر یہ عرض کرتا کہ ؎

دیکھیے گا آج بھی دیدار سے محروم ہیں | تھی جو ایک حسرت پابوس بدستور ہے آج
رقص بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجئے | حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج
عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے | رحم کر رحم کر عاشق ترا معذور ہے آج

اپنے والدین، بھائیوں اور بہن اور آمنہ[2] کے لیے اور دوسرے اعزا و احباب نیز اپنے پیر و مرشد[3] کے لیے دعائے مغفرت کرتا۔ حمیدہ[4] کی صحت کا سوال کرتا۔ نیز اپنی صحت کے لیے بھی عرض کرتا اور ان سب سے پہلے اور سب کے بعد بھی مسلمانانِ عالم اور بالخصوص ہندوستان کے اس مہلک انتشار اور ان کی بے فکری کو دور کرنے کے لیے گڑگڑاتا۔ مگر یہ نصیب کہاں۔ نہ معلوم اب کب جانا ہوتا ہے۔ شریف حسین ہی کے قبضہ کو میں قبضۂ دشمن سمجھتا تھا اور جب موسم حج آتا تھا یہ کہہ کر دل کو سنبھالا کرتا تھا کہ ؎

کیا جاؤں کوئے یار میں یوں اذنِ غیر سے
ہے انتظار دیکھیے کب تک بلائے دوست

---

[1] مولانا کا سال حج [2] مولانا کی محبوب لڑکی متوفیہ ۱۳۲۳ھ۔ مولانا کی ہمشیرہ کا انتقال بھی حال ہی میں ہوا تھا۔

[3] یعنی مولانا عبدالباری فرنگی محلی [4] مولانا کی منجھلی لڑکی اس وقت بیمار و صاحب فراش۔

دیارِ حبیبؐ کے متعلق ہزاروں سوال کرنا ہیں۔ مگر اس کے لیے تحریر بے فائدہ ہے جب وطن تشریف لایئے اور سب کچھ سنایئے۔ افسوس کہ نہ آپ کے جاتے وقت بمبئی پہنچ سکا نہ آپ کی واپسی پر آپ کا خیر مقدم کر سکا۔ جو حالات ہیں ان کو بالتفصیل شوکت صاحب کو لکھ چکا ہوں اس لیے کہ بظاہر وہ اب تک ان سے بے خبر تھے۔ دو دن صرف کر کے اہم صفحے کا خط لکھا نہ معلوم وہ آپ کو دکھایا گیا یا نہیں۔ یا عرفان صاحب سے آپ کو یہاں کے حالات کا پتہ چلا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اہم صفحے کا خط بھی بیکار گیا۔ اس لیے کہ شفیع داؤدی صاحب کا عجیب و غریب خط آیا ہے کہ آپ کی پریشانی سے سخت تشویش ہے کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔ یہاں آیئے تو سوچیں۔ وہاں گرمی بھی سخت ہے۔ یہاں بارش ہو گئی ہے۔ اگر حمیدہ اور بیگم صاحبہ نہ آ سکیں تو آپ ہی چلے آیئے۔ شوکت صاحب سخت پریشان ہیں۔ میں نے انھیں کہتے سنا ہے کہ I am collapsing now. جو اس سے پہلے کبھی ان کی زبان سے کسی نے نہیں سنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ فسادات بمبئی کی کمیٹی شہادت لے رہی ہے میں سب سے کہتا تھا کہ ایک محمد علی ان سب کے لیے کافی ہے۔ وغیرہ وغیرہ جس کے معنی یہی ہیں کہ بمبئی آ کر فسادات بمبئی کی کمیٹی کے سامنے شہادت دو، اور شہادتیں دلواؤ۔ لیکن کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ میں بھی کبھی معذور ہو سکتا ہوں اور آج اپنی علالت نہ سہی حمیدہ کی علالت کے باعث معذور ہوں۔ آمنہ مرحومہ کی علالت کی تشخیص ہو چکی تھی۔ علاج تجویز ہو چکا تھا۔ تبادلۂ [illegible] کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کہاں نہیں گیا؟ جب اس کی آخری گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ اس وقت بھی مصطفےٰ کمال کو بھیجنے کے لیے ایک طول طویل تار کا مسودہ تیار کر رہا تھا۔ اور الغائے خلافت کو لڑکی کی موت سے کہیں زیادہ اہم شے سمجھتا تھا۔ مگر یہاں تو عالت یہ ہے کہ اب تک مرض ہی کوئی تشخیص نہ کر سکا تھا۔ اس لیے کوئی علاج مفید ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ اب

بخار روز ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵ اور اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت متلی ہوتی ہے۔ نہ غذا لگتی ہے نہ دوا۔ نقاہت کا یہ حال ہے کہ دوا پینے کے لیے اٹھنا بھی محال ہے۔ آج اس ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کل دوسرے سے، پرسوں تیسرے سے۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر، حکیم، وید کوئی نہیں چھوٹا۔ ملیریا، دق Baccillus coli نسوانی امراض ہر ایک کے متعلق امتحان ہو چکا، اور ایک چیز نہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری اور مولوی عبدالقادر قصوری (کار فرما پنجابی ٹولی و سرگروہ وہابیان) کے بھتیجے ڈاکٹر محمد جنید قریشی نے سب جتن کر دیکھے اور مجبور ہو کر کہا کہ اب سول سرجن سے آزاد رائے طلب کرو۔ چنانچہ ان کو دکھایا گیا اور صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی۔ سو انھوں نے احتیاطاً اس کی بھی فرمائش کی یعنی x Ray سے آنتوں کا امتحان۔ لیڈی ہارڈنگ زنانہ اسپتال میں بھی اس کا سامان موجود تھا مگر سنا گیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر جو تصاویر لیتی ہیں، گرمیوں میں رخصت پر چلی گئی ہیں۔ اس لیے مجبوراً سول اسپتال میں حمیدہ کو لے جا کر تصاویر کھنچیں۔ ہسپتال نہایت ہی گندہ اور تکلیف دہ مقام ہے۔ کوئی کمرہ ایکس رے کے کمرے کے پاس ایسا نہ تھا جہاں مریضہ بارہ تیرہ گھنٹے رکھی جا سکے۔ خوشامد اور کسی قدر سختی دونوں کے استعمال سے ایک کمرہ Nurses quarters میں سول سرجن سے کہہ کر لیا۔ اور ۸ بجے صبح کو ایمبولنس کار میں ڈال کر حمیدہ کو سول ہسپتال لے گیا۔ خود نماز فجر کے بعد ہی سے گیا ہوا تھا۔ تب جا کر اس کمرے کو صاف کرایا، دھلوایا خس کی ٹٹی وغیرہ کا انتظام کروایا۔ (پہلے Lumber room کا کام دیتا تھا) پنکھا لگوایا۔ دودھ، ڈبل روٹی میں Bismuth ملا کر ہزاروں دقتوں سے حمیدہ کو کھلایا گیا۔ ہر وقت متلی کا خوف تھا۔ ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی وقت سب کچھ نہ ڈال دیا گیا۔ اس لیے کہ جو غذا مرغوب ترین ہوتی تھی وہ تک اسی طرح ڈال دی جاتی تھی

مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس دن اس وقت نہ ڈالا۔ ایک تصویر اس وقت لی گئی۔ دوسری ایک بجے دوپہر کو۔ تیسری پانچ بجے اور چوتھی رات کے آٹھ بجے۔ اس کے بعد حمیدہ کو لے کر ہم لوگ اس کوٹھی پر جو ماجد[1] نے ارمئی سے ڈاکٹر اشرف کے ولایت جانے پر ان سے پانچ ماہ کے لیے کرایہ پر لی ہے، چلے آئے۔ دوسرے دن صبح کو ۸ بجے پھر ہسپتال گئے۔ اور پانچویں تصویر کھنچوائی۔ ان تصاویر سے پتہ چلتا ہے کہ غذا کتنی دیر تک آنتوں میں گھومتی ہے۔ پانچ بجے کے بعد دودھ کی برف دی گئی تھی۔ وہ آدھ گھنٹے کے بعد ڈال دی گئی اور متلی پھر ہر روز کی طرح ہوتی رہی۔ ڈاکٹر نعیم انصاری[2] نے جو ابھی ڈیڑھ دو دن میں ایکسرے کا کام سیکھ رہے تھے کہا کہ یہ تصاویر اچھی نہیں ہیں، اور تقریباً سو روپیہ بیکار ضائع ہوا۔ سول سرجن ان کو ناقص تو نہیں بتاتے، مگر ان سے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ البتہ گمان کرتے تھے کہ آنتوں میں دق ہے۔ نعیم انصاری کی صلاح تھی کہ ڈیڑھ دو دن میں پھر تصاویر لیجائیں۔ مگر جب دن یہ تصاویر لی گئیں۔ اسی دن سول سرجن نے احتیاطاً Baccilus coli کے امتحان کے لیے پھر قارورہ بھجوایا تھا اور گورنمنٹ کے Analyst کی رائے ہے کہ Baccilus coli کی Cullural Growth ہوئی حالانکہ اواخر مارچ میں ڈاکٹر مبین نے قارورہ کا امتحان کیا تھا تو باوجود ڈاکٹر انصاری کے گمان کے رپورٹ کی تھی کہ Cullural Growth نہیں ہوئی اور یہ بیسی لس موجود نہیں ہے۔ اس رپورٹ کے بعد علاج میں بالکل کا پلٹ ہوگئی ہے اور اب پھر Baccilus coli کا علاج جاری کیا گیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر انصاری اور قریشی اس علاج کو چھوڑ چکے تھے،

---

[1] ماجد علی خاں حمیدہ بی کے شوہر[3] مولانا کے ایک مخلص ساکن انبہٹہ (ضلع سہارنپور) مدتوں لکھنؤ میں مطب جاری کیا پھر خدا معلوم کہاں کہاں گھومے۔ آخر میں کئی سال حیدرآباد میں گذارے۔ اس وقت غالباً پاکستان میں ہیں۔ ۱۹۵۳ء

اب اسی قارورہ سے Vaccine تیار ہو رہا ہے۔ اور چار پانچ روز کے بعد مل جائیگا۔ تو ٹیکے لگوانے شروع کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری نے پہلے پہاڑ پر جانے سے روک دیا ورنہ اپریل ہی میں منصوری بھیج دیا ہوتا۔ مگر اب تاکید ہے اور سول سرجن زور دے رہا ہے۔ ماجد بیچارہ صفدر علی صاحب قدوائی کے .... کے باعث سخت پریشان ہو حکیم کے سامنے مقدمہ ہو رہا ہے اور کوئی امید تصفیہ کی نہیں۔ اور انھوں نے سب ریاستوں کو لکھ کر بلوں کی ادائیگی رکوا دی ہے۔ خود وقتاً فوقتاً اپنے لیے، اپنی بیوی بچوں کے لیے اور نیز اپنی ایک .... تک کے لیے رقمیں لیتے رہے مگر اب Material suppliers کی Bills ماجد کی فرم کے نام آ رہی ہیں۔ اور چار پانچ روز سے سخت تقاضے ہو رہے ہیں اور روپیہ ہر جگہ بند پڑا ہے۔ وہ مارا مارا پھرتا ہے اور میں بھی کوچہ چیلان میں اپنا بندھا بندھایا سامان چھوڑے ہوئے یہاں تیمار داری کرتا ہوں اور رات کو پہرہ دیتا ہوں۔ اب پہاڑ بھی مجھ ہی کو جانا پڑے گا۔ یہاں میں مکان تبدیل کرنا چاہتا تھا مگر پریس کو اکھڑوانا ناممکن ہے۔ اس کی فروخت کی اجازت ڈپٹی کمشنر سے لینا ہے اور پھر فروخت کرانا ہے۔ مگر مالک مکان صرف پریس کا حصہ کرایہ پر پہلے کی طرح نہیں دیتے اور وہابیت میں مست مجھے گھر سے نکال رہے ہیں[1]۔ مگر میرا نکلنا آسان نہیں۔ پریس کو کہاں لے جاؤں؟ کل وکیل کی معرفت ان کا نوٹس آیا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں خالی کر دو۔ یہ تو تھا ہی۔ اب منصوری میں مکان کی تلاش ہے اور اگر وہاں گیا تو پریس کو فروخت کون کرے گا؟ ان حالات کو پیش نظر رکھیے اور شفیع داؤدی صاحب کی اس تدبیر کو سوچیے کہ

---

[1] کوچہ چیلان کے اس مکان میں ہمدرد کا فرمدینہ کا وسیع پریس ابتک موجود تھا۔ اس کے مالک ایک اہلحدیث صاحب تھے۔ اور او پر گزر چکا ہے کہ مولانا ۱۹۲۲ء سے اہل حدیث جماعت میں مبغوض ہو گئے تھے۔

اس لڑکی کو یوں ہی چھوڑ کر بمبئی چلے آؤ اور فسادات بمبئی کی شہادتیں دلواؤ۔

میری صحت اب ایسی ہے کہ مجھ کو بھی اب زندوں میں نہ سمجھیے۔ اس پر بھی آریہ سماج راجپال[ل]
کے قتل کے بدلہ میں مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور ابھی لاہور سے اس Red Latter
کے لونڈے یہاں نے ایک Carbon Paper Copy ارسال فرمائی ہے کہ چونکہ تم نے علم دین[۱]
کی مدد نہیں کی ہے اس لیے ہم تمھیں قتل کر ڈالیں گے۔ دونوں پاؤں بیکار ہیں اور روز
حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ بائیں آنکھ پر پانی آ رہا ہے اور Catract[۲] بن رہا ہے۔
ہاتھوں میں لکھتے وقت اور یوں بھی احساس کی کمی ذرا ذرا سی معلوم ہوتی ہے۔

سب سے آخر میں رزق کا سوال ہے اور نہیں جانتا کہ جو روپیہ آج ہے اس کے ختم ہونے
پر کہاں سے آئے گا۔ چاہتا تھا کہ ایک سال کے لیے قوت لایموت کا سامان ہو جائے تو
ایک کتاب انگریزی میں اور ایک اردو میں اسلام پر لکھوں[۳]۔ پچھلے سفر کے حالات اس سے
پہلے لکھ ڈالوں اور کچھ روپیہ سال بھر کے لیے کما لوں مگر ....

برما سے واپسی پر مولانا........ صاحب ایک........ پر لٹو ہو گئے۔ رنگون ہی
میں جھیل کے کنارے بیٹھ کر حسن پرستی اور غزل گوئی کیا کرتے تھے۔ اب تو جذبۂ تغزل کا زور شور
تھا۔ ان ہی کی طرح میں مجھ سے دو شعر زبردستی نکل آئے۔ ان ہی سے میری حالت کا اندازہ

---

[۱] لاہور کے ایک آریہ سماجی کتب فروش راجپال نامی نے رسول کریم کی شان میں ایک نہایت گستاخانہ کتاب لکھ ماری تھی۔ مسلمان تدرۃً سخت مشتعل ہوئے، اور ایک پرجوش پنجابی علم الدین نے جا کر اس گندہ دہن کو قتل کر ڈالا۔ مقدمہ چلا اور فیصلہ وہی ہوا جو غیر اسلامی قانون اور غیر اسلامی عدالت کو کرنا ہی تھا۔ اب مولانا کی قوم کے لوگ اپنے مولانا ہی سے بیزار ہونے لگے کہ انھوں نے علم الدین کو بچانے کی کوشش کیوں نہ کی۔ [۲] موتیا بند [۳] انگریزی میں مسودہ گو بہت ہی ناقص صورت میں بعد کو نکل آیا۔ My Life: A Fragment کے نام سے جو بعد میں شائع بھی ہو گئی۔ لاہور کے شیخ محمد اشرف کے ہاں سے۔

کر لیجیے۔ وہ یہ ہیں:

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی ۔۔۔ نہ اپنی موت موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے ۔۔۔ اسے بے چارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

آپ کا تار آتے ہی گمان ہوا کہ آپ اسی دن یا دوسرے تیسرے دن بچیوں کو لینے حیدرآباد جا رہے ہوں گے۔ اس لیے تار کا جواب نہ دیا۔ اب بیمہ کے ساتھ .... اور خط ملا۔ حیران ہوں کہ رسید کہاں بھیجوں اور اس عطیہ کی شکایت اور پھر شکریہ کس پتہ پر ارسال کروں۔ جب ہمدرد[1] کے آخری پرچہ کی طلبی کا کارڈ لکھنؤ سے آیا تو معلوم ہوا کہ آپ دریاباد جا رہے ہیں۔ آج .... وقت نکال کر بڑی مشکل سے یہ خط لکھا ہے اور دریاباد بھیج رہا ہوں۔ کارڈ جعفری کو بھجوا دیا۔ اور تاکید کر دی کہ اس کی تعمیل کر دو۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ دفتر کا سارا سامان پریس کے حصہ میں بند پڑا ہے۔ کل نماز جمعہ کے لیے شہر جاؤں گا تو کوشش کر کے اپنے فائل میں دیکھوں گا کہ شاید اسی میں اوپر وہ پرچہ مل جائے مگر ؎

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

آپ نے روپیہ کیوں بھیجا؟ خدا گواہ ہے کہ صرف اس خیال سے کہ آپ برا مانیں گے۔ آ ہے واپس نہیں کیا۔ حمیدہ بی کو اسی وقت دے دیا۔ مگر وہ اور ان کے شوہر بھی واپس کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے روکا ہے۔ اگر آپ مجھ سے دوستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا را یہ ہرگز نہ کیجئے۔ ہاں جب ضرورت ہوگی اور میرے مصارف آپ سے کم ہوں گے تو ضرور منگوا لیا کروں گا۔

---

[1] ہمدرد میری اس سفر حج کی غیر حاضری ہی کے زمانہ میں بند ہوا تھا۔ ۱۱

شکایت کے بعد شکریہ بھی قبول ہو۔ جمن بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔ بچیوں کو پیار۔
خدارا جلد آؤ۔ اگر منصوری گیا تو وہاں بلاؤں گا۔ جس میں اور زحمت ہوگی۔ اگر یہیں آجاؤ
تو کیا اچھا ہو۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور سننے کو کان۔

لیجئے ابھی خط ختم کیا تو صفحات بے ترتیب ہوگئے اور پاؤ گھنٹہ میں ترتیب دے سکا۔
اور ابھی اطلاع ملی کہ حمیدہ کا بخار بہت بڑھ گیا اور جاڑا آگیا۔ دعا کیجئے خدا رحم کرے۔

آپ کا دلدادہ محمد علی

باب (۷۸)

۱۹۲۹ء (۲)

بہ کوے عاشقی از عافیت نشاں نہ دہند

بآں کسے کہ براہ ایں دہند آں نہ دہند

جون کی کوئی تاریخ، وسط ماہ کے بعد کی ہے، اور میں دلی براہ مرادآباد پہنچا ہوں، اتفاق سے لکھنؤ سے ریل پر ساتھ اپنے ایک نامور ہمنام اور محمد علی کے مخلص مولانا عبد الماجد بدایونی[لہ] کا ہوگیا۔ اور بریلی تک رہا۔ وہ بدایوں جا رہے تھے۔ خوب باتیں رہیں۔ اب وقت وہ ہے کر جمعیۃ العلماء والے بھی ایک ایک کرکے مولانا کی رفاقت سے کٹ رہے ہیں۔ یہی ایک پارٹی رہ گئی تھی۔ جو اب تک ساتھ دیے جا رہی تھی۔ لیجئے اب وہ بھی الگ ہوگئی۔ اور محمد علی حق کی خاطر ایک ایک سے کٹ کر، ایک ایک سے لڑکر، اکیلے اپنے اللہ کے ہوچکے تھے ــــــ جس نے یہ شعر کبھی تخیل کی دنیا میں کہا تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اس کی شاعری واقعات کی دنیا، اور عمل کے عالم میں جانچی، پرکھی جا رہی تھی!

لہ بڑے خوش تقریر اور ایک زبردست خطیب تھے۔ انتقال اواخر ۱۹۳۱ء میں فرمایا۔

صبح کاذب کے وقت دہلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ کوچہ چیلان کا مکان ہی نہیں، راستہ تک مانوس و محبوب تھا۔ بارہا پیدل بھی آجا چکا تھا۔ آج ایک نا مانوس و غیر معروف مکان تک راستہ پوچھتے پاچھتے پہنچنا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک صاحب اسٹیشن پر واقف کار مل گئے ان کی رہنمائی سے نمبر ۲۵۔ راجپور روڈ پر پہنچا ——— یہ کوٹھی مسلمانوں کے محبوب لیڈر اور نامور ایڈیٹر کی نہیں، ایک معمولی شہری کی ہے، اور محمد علی اس کے ہاں بطور مہمان کے ٹھہرے ہوئے ہیں! رام پور کے گلی کوچوں کو، اپنے مکان کے در و دیوار کے دیدار کو تو برسوں سے ترسے ہوئے تھے ہی، اب دہلی میں بھی کوئی ٹھکانا رہنے کو نہ رہ گیا! غریب الوطنی در غریب الوطنی!

اب سویرا ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ ابھی پلنگ ہی پر تھے۔ محمد علی غریب میرے انتظار میں تصویر اشتیاق بنے ہوئے۔ بڑھ کر لپٹ گئے۔ خوب لپٹائے رہے ——— آہ، وہ ان کے معانقہ کی گرمجوشی جس کی گرمی کی یاد آج تک تازہ ہے!

اتفاق سے آج ہی محمد علی کے مقدمہ کی پیشی ہے، عدالت دیوانی میں، سب جج کے ہاں! مقدمہ کیسا؟ مقدمہ گورنمنٹ کی طرف سے نہیں، کسی ہندو یا آریہ سماجی کی طرف سے نہیں ۔ اپنے ہی ایک اہل حدیث بھائی کی طرف سے، تخلیۂ مکان کی بابت[1] عدالت کا وقت آیا۔ اور مولانا چلے۔ کوئی وکیل اور پیروکار بھی نہیں۔ صرف یہ خاکسار ساتھ، اور ایک نوجوان اور جوشیلے الامان (مرحوم) کے رپورٹر تھے۔ نیشلسٹ پریس تو اس وقت تک مولانا کا بائیکاٹ کر ہی چکا تھا۔ ساتھ دینے والے اخبار دو ہی چار رہ گئے تھے۔ انقلاب (لاہور)، الامان (دہلی)، وغیرہ۔ پہلی بار دہلی کی عدالتِ دیوانی کا منظر دیکھنے

---

[1] اس کا ذکر ابھی پچھلے ہی باب میں گزر چکا ہے۔

میں آیا۔ گواہوں، مدعیوں، مدعاعلیہوں، پیروکاروں کے اس انبوہ عام کے درمیان عام مقدمہ والوں کی طرح گھستا اور پلتا ہوا، یہ مسلمانانِ ہند کا سردار و پیشوا! ——— وقت یہ تھا کہ عبرت کو خود اس پر رحم آجاتا!

ہجوم سے نکل کر ایک مردِ مسلمان قریب آئے۔ اخلاص کے پتلے۔ دہلی کے عام مسلمانوں کے جان نثار اور مولانا کے خاص نیاز مند۔ نام مولوی عبداللہ تھا ("آٹے والے" بھی غالباً جزو نام تھا) جھک کر اور کمال نیاز کے ساتھ صلح و مصالحت کے راستے سمجھاتے رہے۔ لیکن مصیبت پر مصیبت یہی تھی کہ مولانا اپنے کو مظلوم و قابل ہمدردی سمجھتے کب تھے! اسوقت بھی یہی فرماتے رہے کہ "میں کسی سے رحم کا طالب نہیں، میں ان کٹر غیر مقلدوں کی قلعی پوری طرح عدالت میں کھول کر رہوں گا۔ اور دکھاؤں گا کہ دعویٰ دائر کرنے میں کتنا دخل اس کینہ کو ہے جو ابن سعود کی حمایت میں میرے ساتھ برتا جا رہا ہے"۔ وہ مردِ مسلمان بیچارا سر پٹختا رہا، اور عدالت میں پکار ہوگئی۔ اجلاس کے اندر فریق مخالف کے وکیل مولانا کے ساتھ عزت سے پیش آئے، اور مصالحت کی گفتگو کرتے رہے۔ حاکم عدالت (مسلمان ہی معلوم ہوتے تھے) نے بھی خاصی توجہ و التفات مولانا کے ساتھ صرف فرمایا۔ اور مولانا تقریر وہی چارمنٹ کرنے پائے تھے کہ پیشی آئندہ کے لیے ملتوی ہوگئی ——— کوئی ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے، شدید قرضداری، شدید جسمانی بیماریاں، شدید ذہنی افکار، محبوب لڑکی کی علالت، ذاتی مصیبتوں سے لے کر قومی و ملی مصیبتوں تک، کون سی بلا تھی جس کی شکار یہ ایک ذات نہیں ہو رہی تھی! ؎

ہو رہے تھے جو رہفت افلاک کے   امتحاں تھے ایک مشت خاک کے

گھنٹوں اپنا درد دل سناتے رہے۔ مجھ سے سوالات جو کیے، وہ زیادہ تر حج وزیارت ہی کے سلسلہ کے تھے۔ مکہ، مدینہ، عرفات، جدہ، جہاز وغیرہ کے ایک ایک حال اور انتظام کو پوچھتے رہے۔ حجاز کی فلاح وبہبود ان سے زیادہ کس کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ اور ستم یہ تھا کہ سلطان حجاز کی مخالفت کی بنا پر خود حجاز کے مخالف سمجھے جا رہے تھے! رات کو میرے ہزار نہیں نہیں کہنے پر بھی، خود ہی پہنچانے اسٹیشن تک آئے! ــــــــــــ

کون جان سکتا تھا کہ یہ اسٹیشن تک کی ہم سفری، موٹر کی حد تک انکی آخری ہم سفری ہوگی!

گھر پہنچا ہی تھا کہ کسی ذریعہ سے خبر ملی، کہ حمیدہ بی کی علالت بہت زیادہ شدت پکڑ گئی۔ اور مولانا کو جس طرح بھی بن پڑا، سب کو لے لوا کر منصوری جانا پڑا۔ خبر سنکر سناٹے میں آگیا۔ یا الٰہی کیسی کچھ زحمت ہوئی ہوگی۔ کوچۂ چیلان والے مکان میں برسوں سے سکونت تھی۔ اتنا پڑا اسی دوق مکان خالی کرنا، اس سے سارا سامان اٹھوا کر کئی میل کے فاصلہ پر قرول باغ کے نئے مکان میں لے جانا، مولانا جیسے شخص کے لیے کس قدر مصیبت کا باعث ہوا ہوگا، خصوصاً جب کہ وہ خود بیمار، زار ونزار، اور لڑکی اتنی شدت سے علیل۔ پھر نہ کوئی ملازم وخدمت گار، نہ بھانجوں بھتیجوں میں سے کوئی موجود، اور دفتر کے اہلکاروں میں سے کوئی کیوں ہونے لگا تھا، جب سرے سے اب ان کے کسی دفتر ہی کا وجود نہ تھا۔ منصوری پہاڑ کے سفر کا مرحلہ، ایسے نازک مریض کو ساتھ لیے ہوئے اس سے بھی سخت تر! سہارنپور میں گاڑی الگ بدلی جاتی ہے۔ شاید پورا درجہ رزرو کرا لیا ہو، جو دیرہ دون ٹرین میں کاٹ کر لگا دیا جائے گا، لیکن اس کے لیے مصارف کس کے گھر سے بہم پہنچے ہوں گے۔ بہرصورت کتنی طوالت کتنی مشقت، تعب اور کتنی زیر باری کا سامنا کرنا پڑا ہوگا! ان ہی خیالات سے متاثر ہو، منصوری خط لکھا، اور دوبارہ لکھا، سہ بارہ لکھا۔ سب سے زیادہ دل حمیدہ بی

کی صحت ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ خدا معلوم کیا حال ہو، اور محبت کے مارے بوڑھے باپ پہ کیا گزر رہی ہو۔

آخر خدا خدا کرکے وسط جولائی کے بعد جواب آیا۔ خیریت نامہ نہ تھا۔ مکتوب پریشانیوں کی ایک پوٹ تھا۔ پڑھ کر حسرت میں اور اضافہ ہی ہوا۔ بہرحال جیسا بھی تھا، درج ذیل ہوتا ہے۔

۲۵ جولائی ۱۹۲۹ء۔ البرٹ لاج منصوری۔

برادر محترم مکرم حاجی الحرمین الشریفین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپکے خط پیہم آرہے ہیں۔ کارڈ آرہے ہیں اور یہاں سے ایک حرف بھی جواب میں نہیں جاتا۔ پہلے آخری بات سنیے۔ پھر ابتدائی مراحل طے کروں گا۔ ڈاکٹر انصاری و سول سرجن اور ڈاکٹر بجرا اور ایک لیڈی ڈاکٹر مسز ڈالٹن نے خوب دیکھ لیا۔ اور آخری جواب دے دیا۔ صرف مجیب الدعوات کے جواب کا انتظار ہے۔ اس لیے نہ بمبئی جا سکا نہ اس وقت تک دہلی جا سکوں گا جب تک مجھے اپنے "حکیم" سے جواب نہ مل جائے۔ دن رات ہم لوگوں کو مریضہ کی چارپائی کے پاس ہی گذر رہے ہیں۔ جس کو جس وقت کچھ سونے کو مل جاتا ہے سو لیتا ہے۔ ایک انگریزی نرس دن بھر رہتی ہے مگر "باہر" نہیں۔ مجھی کو اصرار کرکے دوا (حقیقتاً دوا نہیں بلکہ غذا، اس لیے کہ اب یہی دوا رہ گئی ہے) پلانا پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ ایک طرف سے شوکت صاحب بمبئی کسی ملکی یا ملی کام کیلیے بلاتے ہیں، دوسری طرف شفیع داؤدی صاحب سے تقاضا کرایا جاتا ہے۔ تیسری طرف سیٹھ سلیمان مٹھا[1] اسی پر اصرار کرتے ہیں اور مجھے میرے اسلامی فرائض یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس وقت

[1] مسلمانان بمبئی کے ایک عوامی لیڈر

بظاہر میرا اسلامی فرض یہی ہے کہ مریضہ کی پٹی کے پاس بیٹھوں۔ برا درم کیا کہوں بعض وقت نماز تک قضا ہو جاتی ہے۔ اس لیے براہ کرم آپ منصوری تشریف لائیے۔ میرے وہاں جانے کا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے میں سہارنپور[1] کو لکھنے والا ہی تھا کہ کارڈ ملا کہ دریاباد ہی کو خط لکھو چنانچہ دریاباد کو لکھ رہا ہوں۔

اب ابتدائی مراحل سنیے۔ ڈاکٹر انصاری اور قریشی کے علاج سے فائدہ نہ ہوا (پہلے Boccilus coli کا پھر آنتوں کی دق کا علاج کیا تھا) تو انھوں نے کہا کہ اب سول سرجن سے رجوع کرو اور اس کو آزادانہ رائے قائم کرنے دو۔ اس نے بھی کوئی رائے نہ قائم کی بلکہ کہا کہ ہر چیز کا تو تم امتحان کرا چکے ہو۔ آنتوں کی تصویریں بھی لوا لو۔ اس لیے بڑی سخت محنت اور گفت و شنید بلکہ تہدید کے بعد نیم انگریز نرسوں کے کمروں میں ایک کمرہ گودام کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ وہ ملا۔ دھوپ اور لو میں پچاس گز اسٹریچر پر لے ایک نہایت ہی تنگ مردوں سے گھرے ہوئے Private Room سے اسے x-ray کے کمرے میں لانا پڑتا۔ سخت محنت کے بعد اس کو صاف کرایا۔ اس میں پنکھے اور خس کی ٹٹی کا انتظام کرایا گیا۔ سب سے مشکل مریضہ کو دودھ ڈبل روٹی کھلانا تھی۔ جس میں Bismuth بہت سا ملایا گیا تھا۔ تاکہ تصاویر میں دیکھا جا سکے کہ چار چار گھنٹے کے بعد کھانا کس کس جگہ نظر آتا ہے۔ رو رو کر مریضہ نے کھانا کھایا۔ خدا کا بڑا شکر تھا کہ کھاتے ہی ڈال نہ دیا۔ اس لیے کہ روز یہی ہو رہا تھا۔ بہرحال تصاویر اس دن صبح کو آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک لی گئیں۔ اور ان تمام پریشانیوں اور دقتوں کے بعد نعیم انصاری نے ان کو

---

[1] سہارنپور میں میرے بھائی صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ والدہ ماجدہ مرحوم بھی زیادہ تر ان ہی کے ساتھ رہتی تھیں اور میرا بھی جانا آنا وہاں اکثر ہوتا رہتا تھا۔

دیکھ کر کہا کہ بیکار ہیں سول سرجن نے تو کوئی خرابی ان میں نہ بتائی۔ مگر مرض کے متعلق مذبذب تھے *Baccilus Coli* کے لیے قارورہ کا امتحان اواخر مارچ میں ہو چکا تھا، مگر کچھ نہ نکلا تھا۔ احتیاطاً سول سرجن نے سرکاری *Laboratory* میں امتحان کرایا۔ اور اور میجر تلسی رام آئی۔ ایم۔ ایس نے فرمایا کہ ہے اور اسی بنا پر *Auto Vaccine* تیار ہوا اور ٹیکے لگوانا پھر شروع کیے۔ اور یہی تشخیص قرار پائی کہ *B. Coli* ہے جو پہلے انصاری صاحب کا قیاس تھا۔ جس کی بنا پر انھوں نے *Stock Vaccine* سے ٹیکے لگوائے تھے اور بے نتیجہ دیکھ کر قیاس کیا تھا کہ آنتوں کی دق ہوگی۔ سول سرجن کا اصرار تھا کہ دہلی کی لو سخت مضر ہے۔ پہاڑ جاؤ۔ پہاڑ جاؤ۔ ماجد[1] کا روپیہ الور میں پھنسا ہوا تھا اور صفدر علی صاحب کی عنایت سے ان کا دیوالہ نکلا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دو ہزار روپیہ (چالیس پچاس ہزار میں سے) ملے تو منصوری میں مکان کے لیے انتظام کیا جانے لگا۔ میں پہلے ہی سے نصف مصارف ادا کرنا طے کر چکا تھا۔ سول سرجن نے اس قدر اصرار کیا کہ دیرہ دون تو فوراً لے جاؤ۔ وہاں جا کر مکان کا انتظار کرنا۔ چنانچہ یکایک ۱۹ر جون کو فیصلہ ہوا کہ ۲۰ر کی شب کو چل دیں گے۔ میں نے ۱۹ر ہی کو کہ عشرہ محرم تھا، قرول باغ میں مکان تلاش کر کے مغرب کے وقت مالک سے کرایہ وغیرہ طے کیا اور ۲۰ر کی صبح کو خود ہی جا کر ۵ موٹر لاریوں اور ۲ ٹھیلوں میں سب سامان دہلی سے قرول باغ ڈھلوایا۔ اسی دن رخت سفر باندھا۔ اسی دن اور گزشتہ شب میں *Through Carriage* میں ایک درجہ *Reserve* کرایا (جو ہو نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ گاڑی دہلی سے نہیں لگتی بلکہ جھانسی سے لگتی ہے) اور اسی شب کو مریضہ، ماجد کے بچوں[2] اور اپنے اہل و عیال کو لے کر دہلی سے روانہ ہو گیا۔ پانچ دن دہرہ دون

[1] وہی مولانا کے داماد جن کی بیوی بستر مرگ پر ہیں [2] یہ بچے پہلی بیوی سے تھے۔

پڑا رہنا پڑا۔ اور سخت تکلیف رہی۔ اس لیے کہ گرمی تھی اور اس مکان میں پنکھے نہ تھے۔ مریضہ کے سر پر رکھنے کے لیے برف مشکل سے ملتا تھا۔ ماجد کو معمولی کرایہ کا مکان نہ مل سکا۔ مگر ایک بیش کرایہ مکان والی کو کرایہ دار نہ مل سکا تھا۔ اس لیے اس کی دو منزلہ کوٹھی جو ڈیڑھ دو ہزار کو جاتی تھی۔ سات سو میں مل گئی۔ مگر ہمارے لیے تو یہ بھی ہزاروں تھے۔ ۲۰ کو مریضہ کو لیکر میں یہاں آیا۔ سول سرجن کا علاج شروع ہوا۔ یکم جولائی کو ڈاکٹر انصاری ہمارے گورنر نائنۃ مصراؔ[1] کو دیکھنے یہاں آئے تھے۔ چونکہ اصلاح مرض مطلق نہ ہوئی تھی۔ اس لیے سول سرجن نے انھیں بھی دکھایا۔ اور دونوں کی رائے ہوئی کہ Baccilus Coli نہیں ہے۔ اور غالباً آنتوں کی دق ہے۔ اب اس کا علاج پھر شروع ہوا۔ اور جب افاقہ نہ ہوا تو لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھایا گیا۔ اور اب قطعی رائے ہوئی کہ آنتوں کی دق ہے۔ اور ڈاکٹروں کے تیور بدلے۔ اور امید کم نظر آنے لگی۔ جب اس کے بعد بھی حالت خراب ہوتی گئی تو سول سرجن سے کہہ کر ڈاکٹر بجرجی سے بھی مشورہ لیا گیا۔ گذشتہ جمعہ کو یعنی پرسوں انھوں نے کہا کہ کوئی امید نہیں ہے۔ ایک ہی موقع اصلاح کا ہے کہ پیٹ چیر پھاڑ کر دیکھیں کہ وہ کیا چیز ہے جو حائل ہو گئی ہے اور کھانے کو آنتوں میں نہیں جانے دیتی۔ ہر چیز جو کھائی جاتی ہے ڈال دیجاتی ہے۔ مگر مریضہ میں اب اتنی جان باقی نہیں ہے کہ یقیناً اس کی متحمل ہو سکے۔ غالباً صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ اس وقت شوکت صاحب کو تار دیا گیا کہ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا ہے کہ امید باقی نہیں ہے۔ ہماری امید خدا پر ہے۔ ہفتہ کو حالت کسی قدر اچھی رہی۔ اور مریضہ نے اتوار کو ہوا خوری کے لیے علی الصباح ڈانڈی اور رکشے میں جانے کے لیے اصرار کیا۔ اور کپڑے بدلے کر دفعۃً Hysteria کا سخت دورہ پڑا۔ اور حالت اتنی خراب رہی کہ

---

[1] ملکتوں چیف کورٹ کے جج تھے۔ مختصر سی بیماری کے بعد بیس دہرہ دون میں وفات پائی

رات کو ہم لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔ عجیب بات یہ ہے کہ کل ہی ماجد کی پہلی اہلیہ مرحومہ کی برسی تھی۔ اور مجھے یہ خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں اس طرح نہ ہو کر میرے سسر عظمت خاں صاحب نے اسی شب میں انتقال کیا جس کی مغرب کے وقت میرے والد مرحوم کی برسی کا ماتم تھا۔

حکیم محمد احمد صاحب[1] کو دہلی سے بلایا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں غالباً آئیں۔ دیکھیے اس وقت تک کیا ہوتا ہے۔ آپ آنے میں تکلف نہ کریں۔ آپ گھر والے ہیں۔ مہمان نہیں ہیں۔ پوری ایک منزل مکان کے لیے خالی ہے اور آپ تسلی و تسکین دے سکیں گے۔

میں آپ سے ناراض ہوں کہ باوجود میرے لکھنے کے آپ نے .... کا ہدیہ اپنی خوش دامن صاحبہ کے نام سے بھجوا دیا۔ آدھ گھنٹہ کھولے بغیر سوچتا رہا کہ واپس کروں یا نہیں۔ وہ آپ کی امانت رکھی ہے۔ مختصر اُسب کو سلام و دعا پیار۔

آپ کا پریشان حال گرصابر و شاکر بھائی

محمد علی

---

[1] دہلی کے نامور طبیب حاذق، حاذق الملک اول، حکیم عبد المجید خاں کے لڑکے۔ اور حاذق الملک ثانی حکیم محمد اجمل خاں کے بھتیجے۔

باب (۷۹)

۱۹۳۹ء (۳)

(زخمی شیر بپھرا ہوا)

حمیدہ بیچاری کی طرف سے اب مایوسی ہو چلی ــــــــــــــ محمد علی غریب اب کیا کریں گے؟ ایک جوان لڑکی ۱۹۲۴ء میں، اپنے ہاتھ سے علی گڑھ میں دفن کر چکے ہیں۔ یہ دوسری بھی اگر خدانخواستہ چلی، تو ان پر کیا گزر کر رہے گی، خاص کر جب خود بھی ذیابیطس کے شکار ہیں، اور جسمانی قوت اور ایک آنکھ کی بینائی بڑی حد تک جواب دے چکی ہے، پیسہ پیسہ کو محتاج الگ ہو رہے ہیں، جتنا زیادہ سوچتا تھا، دل کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا، گھبرا کر جوابی تار دریافت خیریت کا دیا، ۲۰ر جولائی کی صبح کو جواب موصول ہوا :۔

"منصوری، ۲۰ر جولائی، ۱۰ بجکر ۲ منٹ۔

حکیم محمد احمد خاں کو دلی سے دوبارہ بلوایا، نسوانی شکایات تشخیص کیں۔ علاج نابلد کے ذریعہ سے بتایا۔ بچ جانے کی امید تو دلا رہے ہیں لیکن حالت ہے بدستور نازک "!

اب زندگی کا جو سال بھی گزرتا تھا، مصیبتوں اور دکھ درد کا دور محمد علی کے لیے پچھلے سال سے زیادہ ہی لاتا تھا۔ ہر دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سال بہت سخت گزرا، دوسرا سال اس سے بھی سخت تر نکلتا تھا۔ محمد علی جیسا شخص مجسم زندہ دلی تھا، اور اب اس کی ساری زندگی

ایک مسلسل ٹریجڈی (المیہ) تھی۔ صدمات پیہم اور دل شکستگی کی تصویر ——— حکیم محمد احمد خاں دہلوی بڑے حاذق طبیب تھے۔ ان کے آجانے سے تھوڑی بہت امید پڑ چلی تھی۔ کچھ دن اسی امید و بیم میں گزرے۔ آخر ہوا وہی جو تقدیر میں لکھا لائے تھے۔ جولائی ہی کی کوئی آخر تاریخ تھی کہ یہ دوسری جوان لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہوگئی!

منصوری پر دفن کہاں کرتے۔ رائے یہ ٹھیری کہ دہلی لاکر دفن کیا جائے۔ نعش کو پہاڑ سے اتار کر دہرہ دون تک لانا، پھر وہاں سے ریل پر سہارنپور تک لانا، وہاں سے دہلی کے لیے دوسری ٹرین میں لگانا، ان میں سے ہر مرحلہ وقت طلب، دقت طلب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خرچ طلب تھا۔ محمد علی غریب کے پاس تھا ہی کیا۔ جو کچھ بھی تھا سب پہاڑ کے قیام اور ڈاکٹری اور پھر یونانی علاج میں بے دریغ اٹھا چکے تھے۔ اب مفلس قلاش کے حکم میں تھے۔ ریل کے کرایہ تک کا کام کسی نہ کسی طرح قرض ہی سے چلا۔ جوں توں دہلی پہنچے۔ اور جوان جہاں لڑکی کو قبر میں خود ہی اتارا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ فرط غم سے بیخود ہو رہے تھے۔ لیکن اس بیخودی میں بھی اتنے حواس باقی تھے کہ کفن اور دفن وغیرہ کے ایک ایک جزئیہ سے متعلق احکام شریعت مفتی کفایت اللہ صاحب سے دریافت کرتے جاتے تھے۔ اور جہاں مفتی صاحب نرم پڑ جاتے تھے، خود ہی اصرار کر کے مستحسن جزئیات کی ہدایات ان سے حاصل کرتے تھے ———

ہمت کر کے قبر میں اتر تو گئے۔ لیکن وہیں سر میں چکر آیا۔ دنیا نظر میں تیرہ و تار ہوگئی، اور بینائی گویا یک بیک جاتی رہی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ کر اور سہارا دیکر قبر سے باہر نکالا۔ نور نظر کو کھو کر، دفن کر کے، دل شکستہ باپ کی بصارت صحیح و سالم رہ بھی کیسے سکتی تھی!

مولانا کے اس صدمۂ عظیم کے وقت عملی ہمدردی میں سب سے آگے قدم جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کا رہا۔ ہندی مسلمانوں (خصوصاً بمبئی، گجرات وغیرہ کے باشندوں) کی خاصی بڑی تعداد یہاں عرصہ سے آباد ہے۔ اور یہ لوگ مدت سے مولانا کی زیارت کے مشتاق تھے۔ اب انھوں نے باقاعدہ دعوت نامہ بھی بھیجا۔ اور شاید تار سے اصرار جاری رکھا۔ یہاں بھی مولانا کے ہوا خواہوں کا مشورہ یہی ہوا کہ بہتر ہے بحری سفر کر آئیں۔ دل بہل جانے سے غم و صدمہ بھی ذرا ہلکا ہو جائیگا۔ اور عجب نہیں کہ صحت بھی درست ہو جائے۔ مولانا جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تاریخ تک طے ہو گئی کہ ۲۳ اگست کو دہلی سے بمبئی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس نامہ سیاہ کو تار پر طلب فرمایا:-

"دہلی۔ ۲۱ اگست۔ ۸ بجکر ۳۵ منٹ

کیا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جنوبی افریقہ کی روانگی سے پہلے ملاقات ہو سکے؟ روانگی ۲۳ کو ہے"

تقدیر الٰہی میں سفر درج نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایسی ایسی شرطیں مولانا کے داخلہ پر لگائیں کہ ان کا قبول کرنا کسی بھی خوددار ہندوستانی کے لیے ممکن نہ تھا۔ جنوبی افریقہ کی حکومت تو عجب برخود غلط اور فرعون بے سامان قسم کے "گوروں" کے ہاتھ میں تھی۔ "کالوں" کی کوئی عزت تک خیال میں تھی ہی نہیں۔ انڈین گورنمنٹ بھی "گوروں" ہی کی تھی۔ لیکن یہاں کے گورے بہر حال نسبتہً شریف تھے۔ انھوں نے بڑا زور لگایا، بار بار لکھا پڑھی کی، تاروں پر سفارش کی۔ کچھ پیش نہ گئی۔ افریقہ کا ہود لہول اپنی بات پر اڑا رہا۔ سفر کی تاریخیں پہلے تو بڑھتی رہیں۔ اور بالآخر سفر ہی منسوخ کرنا پڑا۔ جنرل ہرزگ (وزیر داخلہ جنوبی افریقہ) کا آخری اور انقطاعی تار پاکر مولانا نے جو تار بطور رسید بھیجا، اس زمانہ میں اور اس ماحول میں تو خیر دل دہلا دینے والا تھا ہی باقی قابل دید آج بھی ہے:

"آپ نے سرکار ہند کو اس کا سبق دے دیا کہ دوستانہ معروضات کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے

اس کا شکریہ۔ اب ہم اسی وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سبق دے لیں گے کہ اسلام اور ہندوستان کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔ محمد علی۔ صدر جمعیت خلافت۔"

محمد علی جمعیۃ خلافت کے صدر اب کی سال کے لیے بھی تھے لیکن خود جمعیۃ خلافت ہی میں جان اب کہاں باقی رہ گئی تھی؟ وہ کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے بھی ملک بھر میں عزت واحترام کے مستحق تھے لیکن کانگرسی حلقے، نہرو رپورٹ کے شائع ہو چکنے کے بعد سے ۱۹۲۸ء سے، ان کے نام سے بیزار ہو چلے تھے۔ اور اب متعدد اکابر کانگرس خصوصاً موتی لال نہرو، بلکہ خود گاندھی جی تک سے ان کی مخالفت کوئی ڈھکا چھپا ہوا راز نہ تھی!

یہ سب کچھ تھا، لیکن محمد علی خاموش اور معطل بیٹھنے والے کب تھے۔ فضا کتنی ہی مخالف، حالات کیسے ہی ناساز گار ہوں، تھکنا اور ہارنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی سنہ ۱۹۲۹ء میں ایک ہندو ممبر ہربلاس شاردا کی تحریک پر اسمبلی کے سامنے قانون یہ آیا کہ لڑکیوں کی شادی کمسنی میں قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ ابتداءً مسودہ قانون کا تعلق صرف ہندو قوم سے تھا، اور ان کے ہاں واقعۃً ایک حد تک اس کی ضرورت تھی بھی لیکن بعض نافہم و کج اندیش مسلمان ممبروں اور بعض "علما" نے اس کا دائرہ خواہ مخواہ وسیع کرا کے مسلمانوں کو بھی اس کی زد میں لے لیا۔ محمد علی کو خبر ہوئی، تو آگ ہو گئے کہ عمر نکاح پر یہ غیر مسلم گورنمنٹ کی طرف سے قید و بند کیسی، مسلمان قطعاً آزاد ہیں کہ اپنی لڑکیوں کو جس سن میں بھی چاہیں بیاہ دیں۔ غیروں کی طرف سے ان کے اندرونی و خانگی معاملات میں مداخلت صریحاً ناقابل برداشت ہے، اٹھے، اور اپنے ساتھ جمعیۃ علما، دیوبند، فرنگی محل، بدایوں وغیرہ کے علما کی ایک معقول تعداد کو لے کر اس شاردا بل کی عملی مخالفت میں اپنے اسی جوش و انہماک کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا کہ ذیل کا گشتی مراسلہ ان کے دستخط سے، دوسروں کی طرح مجھے بھی موصول ہوا:

"دہلی۔ گلی قاسم جان۔ ۲۸ اکتوبر ۲۹ء

جناب مکرم۔ السلام علیکم

دہلی میں علماء و زعماء کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر، ۲۷ اکتوبر ۲۹ء کو ایک مجلس مشاورت منعقد کی گئی۔ اور یہ طے کیا گیا کہ وائسرائے ہند کی خدمت میں وفد لے جانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ جو وائسرائے اور ان کی حکومت کا طرز عمل مسلمانوں کے اس عام جوش و خروش کے متعلق معلوم کرے۔ جو مسلمانوں میں شاردا ایکٹ کے نفاذ سے اپنے تئیں مستثنیٰ کرانے اور شریعت اسلامیہ کو مداخلت سے محفوظ رکھنے کے باب میں پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ کمیٹی ان مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد کرے جو اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔ چنانچہ ابتدائی کام کرنے کیلیے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے، جناب والا بھی اس کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ جناب جائنٹ سکریٹری کے پتہ پر اپنی منظوری سے اطلاع بخشیں گے۔ جواب بذریعہ تار مرحمت فرمائیے،

(مولانا) محمد علی (صدر)

"قرول باغ۔ دہلی"

مولانا نے اس سلسلہ میں کیسی کیسی سرگرم کوششیں کیں، کس کس طرح اپنی جد و جہد کو جاری رکھا، وائسرائے کے پاس کس طرح وفد لے گئے، وہاں سے کیا جواب لائے۔ کہاں کہاں تقریریں کیں، جوش و خروش کے ساتھ رہنمائی کن طریقوں پر کی۔ یہ ساری مفصل داستان دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی لیکن اس کا تعلق سیرت محمد علی سے ہے، نہ کہ اس سرسری ڈائری سے جس کا دائرہ صرف ڈائری نویس کے ذاتی علم میں آئے ہوئے واقعات تک محدود ہے۔

باب (۸۰)

۱۹۳۰ء (۱)

(سب وشتم کی گرم بازاری - داماد کا انتخاب)

۱۹۳۰ء کی پہلی سہ ماہی تمامتر علالت اور مخالفتوں کی نذر ہوئی۔ خلافت کمیٹی اب علانیہ کانگرس سے برسرِ جنگ تھی۔ اور خلافت کی طرف سے کہنا چاہیے کہ سارا کام محمد علی ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ خلافت ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ایک بہت طویل اور اہم رزولیوشن انگریزی میں اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ وہ تمامتر محمد علی ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔ ادھر سے بولنے والوں، لکھنے والوں، کام کرنے والوں کی کیا کمی تھی، ادھر گویا تنہا محمد علی کی ذات تھی، بجز شوکت علی اور مولانا عرفان اور شفیع داؤدی وغیرہ چند گِنے گنے کارکنوں کے، باقی سب رفیقانِ قدیم ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر سید محمود اور مولانا ابوالکلام اور عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خاں شروانی وغیرہم کانگرس کیمپ میں تھے، اور جمعیۃ علماء کے لوگ بھی رفتہ رفتہ کٹ کٹ کر اسی طرف شریک ہوگئے۔ بقول داغؔ ؎

سار ی خدائی اس کی طرفدار ہوگئی
اتنا نہیں کوئی جو ہو ایمان کی طرف

عبرت کا عجب منظر سامنے تھا۔ کل تک جن کا شمار معمولی رضاکاروں میں ہوتا تھا جو دوڑ دوڑ کر

محمد علی کی خدمت کرنا باعثِ سعادت سمجھتے تھے، بلکہ محمد علی ان سے جوتی پر لوٹا رکھنے کو کہہ دیتے تو اس کو وہ فخر و مباہات سے بیان کرتے۔ وہ تک آج سب "فرنٹ" تھے ــــــــ

عوام المسلمین بیشک اس وقت پھر زیادہ خلافت کمیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اور مسلم آل پارٹیز کانفرنس بھی محمد علی کی قیادت تسلیم کر رہی تھی لیکن خواص کا طبقہ روز بروز الگ بلکہ بیزار سا ہوتا جاتا تھا۔ اور مخالفین کے اخبارات تو جیسے اس موقع کی تاک ہی میں لگے تھے۔ شیر کو جاں بلب اور حالتِ نزع میں پاکر گیدڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ــــــــــــ

انگریزی کا سارا ہندو پریس دشمن، اردو کے غیر مسلم اخبارات کی بھی بدزبانی کی حد نہیں۔ ان سب سے بھی بڑھ کر دلشکن، دل آزار اور تکلیف دہ دہلی اور لاہور کے متعدد مسلم اخبارات کی روش! کوئی سخت سے سخت طعن محمد علی کے لیے اٹھا نہ رہا۔ ہر چھوٹی سی چھوٹی افواہ بشرطیکہ اس سے محمد علی کی توہین و تفضیح کا کوئی پہلو نکلتا ہو، ان اخبارات کے لیے آیت و حدیث کا حکم رکھتی تھی۔ کبھی یہ خبر اڑتی کہ محمد علی نے گورنمنٹ میں عہدہ قبول کر لیا ہے، اور اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہونے والے ہیں۔ کبھی یہ دروغ بے فروغ شائع ہوتا کہ محمد علی کو فلاں مسلم والی ریاست نے گرانقدر ماہانہ وظیفہ سے نوازنا شروع کیا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس قبیل کی بھی مضحکہ خیز خبریں یار لوگ گڑھ لیتے کہ محمد علی علیگڈھ یونیورسٹی کی رجسٹراری قبول کرنے والے ہیں جس کی تنخواہ چار پانچ سو سے زائد نہ تھی! یہ "ایماندار" اور "دیانتدار" اخبار نویس ان سب خبروں کو بڑے شوق اور چاؤ کیساتھ نہ صرف نمایاں کرکے شائع کرتے، بلکہ ان پر پرزور نوٹ لکھتے۔ بڑے بڑے ایڈیٹوریل لکھ ڈالتے، اور ان میں زیادہ سے زیادہ زہر ملا دیتے۔ اور حد یہ ہے کہ غریب کی علالت تک ان بزرگوں کی نظر میں بجائے قابلِ ہمدردی ہونے کے قابلِ مضحکہ تھی! ــ

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو!

——— اس ڈائری کے ناظرین ممکن ہے کہ ان بیانات کو مبالغہ آمیز سمجھیں اور خیال کریں کہ سیاسی مخالفتوں میں بھلا کوئی اتنا تھوڑے ہی حد سے گزر سکتا ہے، اور پھر اس کے مقابلہ میں جو ابھی کل تک ملت کا قائدِ اعظم تھا، ایسے حضرات بہتر ہوگا کہ کہیں تلاش کرکے کم از کم زمیندار (لاہور)[1] الجمعیۃ (دہلی)[2] اور ریاست (دہلی) کی ۳۰ء کی فائلیں ضرور پڑھ لیں!

جوابات کی محمد علی کے ہاں کمی نہ تھی، اب وہ جب جواب دیتے، تو مخالفین ہی کے لب لہجہ میں نہایت سخت اور بہت تلخ جواب دیتے۔ لیکن اول تو بیچارہ کو جواب دینے کی مہلت ہی کہاں تھی۔ یک انار و صد بیمار کا معاملہ تھا۔ کتنے اہم کام تنہا ان ہی کو انجام دینے پڑ رہے تھے، اس میں سب و شتم کے اس پشتارہ کے پڑھنے کا وقت ہی انھیں کہاں مل سکتا تھا۔ اور پھر آنکھ کی شدید کمزوری کے باعث طبی ہدایات کے ماتحت ان کا لکھنا پڑھنا بھی بہت محدود رہ گیا تھا۔ ضروری سی ضروری ملی و ملکی مسائل کے ہوتے ہوئے ان شخصی تعریضات اور ذاتی حملوں کی انھیں خبر ہی کم ہوتی۔ اور سب سے بڑی بات ہے (اور یہی ان کے ظرف کا پیمانہ تھا) کہ جواب وہ سخت تلخ یقیناً دیتے، لیکن صداقت و دیانت کا دامن اس شدید اشتعال کی حالت میں بھی نہ چھوڑتے۔ یہ کبھی بھی نہ کرتے کہ افترا کے جواب میں افترا، بہتان کے توڑ کیلیے بہتان پر اتر آئیں ——— شدید جسمانی آزار، شدید ذاتی صدمات، شدید ہجوم اعدا، میں مبتلا ہو کر اگر زبان میں حدت اور مزاج میں غلظت آگئی ہو تو یہ عین فطرتِ بشری تھی۔

[1] و [2] ظاہر ہے کہ ان سے مراد نہ آج کا زمیندار اور نہ آج کا الجمعیۃ۔ ۳۰ء و ۳۱ء میں تو یوم محمد علی کے سلسلہ میں تو مقالے ایسے ادب و احترام کے ساتھ ان پرچوں میں نکلے کہ ان سے آگے بڑھ کر ممکن ہی نہ تھے۔

ایک امر طبعی تھا، اور اس کے لیے سند بعض مسلم اکابر سے مل جاتی ہے۔ جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا۔
مزاج میں چڑچڑاہٹ آگئی تھی، تاہم زندہ دلی، بذلہ سنجی، برجستہ گوئی کا سرچشمہ خشک نہیں ہوگیا تھا۔ پنجاب میں نیا نیا لفظ "ٹوڈی" اور اس سے بڑھ کر "ٹوڈی بچہ" چلا ہوا تھا۔ زمیندار اسے خوب اچھال رہا تھا، اور روز ان لوگوں کی شان میں جو "نیشنلسٹ" نہ تھے، "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کا نعرہ لگا رہا تھا۔ اور اس پارٹی سے بچوں اور نوجوانوں نے واقعی اس نعرے سے آسمان سر پر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اتفاق سے عین اسی زمانہ میں محمد علی کا گزر لاہور میں ہوا۔ یہ موٹر پر شہر کے اندر گزر رہے تھے کسی بدتمیز نے پکار کر کہا "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے"! یہ زبان کب رکنے والی اور طرح دینے والی تھی۔ معاً موٹر روک، اسی ردیف و قافیہ میں پکار کر مصرعہ لگایا "دھوتی بچہ ولے وائے"!
——— "دھوتی بچہ" میں ہندو پرستی پر جو چوٹ تھی، بالکل ظاہر ہے۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی (اور اب "سب سے چھوٹی" کہاں، چار میں سے کل دو تو رہ ہی گئی تھیں) گلنار بی کا بھی سن ماشاء اللہ اچھا خاصہ ہو چکا تھا۔ اور موزوں شوہر کی تلاش قدرۃً جاری تھی۔
——— دسمبر ۲۱ء میں مولانا کی نظر بندی کے زمانہ میں احمد آباد کانگرس کے موقع پر اسی چھوٹی اور ہونہار بچی کی طرف اشارہ کر کے گاندھی جی نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ اگر گرفتار ہوگئے تو اپنا جانشین کس کو بنا جایئے گا۔ ہنس کر کہا کہ "گلنار کو"! ———
خاندان اور برادری کا کوئی لڑکا خیال میں نہیں آرہا تھا۔
مولانا کے ایک بڑے مخلص اور پرجوش جوان عمر رفیق کار شعیب قریشی تھے۔ ان کا ذکر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، خلافت کمیٹی اور وفد حجاز کے سلسلہ میں بھی، اور بھی کئی بار اور عین ڈائری کی ان سطور کی نظر ثانی کے وقت، خبر آئی ہے کہ وہ حکومت پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں

سفیر مقرر ہو کر دہلی آرہے ہیں۔ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے، بیرسٹرایٹ لا، شریف خاندان صورت وسیرت دونوں میں ممتاز۔ نہرو رپورٹ کے تجربہ کے بعد کانگریس کی سیاست سے بیزار ہو کر پبلک قومی زندگی ہی کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اور بھوپال میں ایک بہت اونچے عہدے پر ہو گئے تھے۔ گلنار بی کے لیے نظر انتخاب ان پر پڑی، غالباً عبدالرحمٰن صدیقی سندھی کی تحریک پر۔ عبدالرحمٰن بھی مولانا کے بڑے قدیم رفیقوں میں تھے۔ علی گڑھ کے ایم، اے۔ کریزنٹ کے دور اول میں اس کے منیجر رہ چکے تھے۔ اب ایک عرصہ سے مولانا سے بے تعلق ہو کر انگلستان میں اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ شعیب کے خاص دوستوں میں تھے۔ بہرحال ان ہی کے حسن توسط سے معاملہ نکاح شعیب قریشی کے ساتھ طے پا گیا۔ شعیب اب سن سے ذرا اتر چکے تھے۔ لیکن مرد کے لیے اتنا سن کچھ زیادہ نامناسب بھی نہ تھا۔ تندرست و وجیہ، انتخاب مالی، اخلاقی، دینی ہر حیثیت سے اچھا رہا۔

مولانا تلاش سکون وعافیت میں کچھ روز حیدر آباد کے ایک دور افتادہ مقام پر بھی میں اپنے ایک بے تکلف دوست قاسم حسین بدایونی (علیگ) کے پاس رہنے کے بعد اب بمبئی میں تھے۔ شوکت صاحب نے بلا کر بہ اصرار وہیں رکھا تھا، زیادہ تر تو آنکھوں کے علاج کے لئے اور باقی قومی کام تو چھوٹ سکتا ہی نہ تھا۔ اب ہم نیاز مندوں کو فکر تھی تو یہ کہ کس طرح گلنار بی کے عقد سے فراغت حاصل کر لیجائے۔ اور مجھے سب سے بڑھ کر اندیشہ یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں شادی کے موقع پر مولانا دل کھول کر نہ خرچ کرنے لگیں جس طرح گفتگو میں ان کی زبان نہیں رک سکتی تھی، اسی طرح خرچ کے باب میں ان کا ہاتھ رکنا جانتا ہی نہ تھا۔ مالی حالت جتنی زبوں تھی، مجھ پر روشن تھی۔ جی یہ ڈر رہا تھا کہ کہیں قرض ورض لے کر رہی سہی ساکھ بھی نہ ڈبو بیٹھیں۔ ڈرتے ڈرتے بمبئی خط لکھا، تو کچھ اسراف کی وعیدیں سنا ڈالیں۔ دریافت خیریت و دریافت حال کے لیے

پہلے ہی دو ایک کارڈ اور لفافہ ڈال چکا تھا۔ جمیعۃ العلما کے بزرگوں نے مخالفت کی اب پوری طرح ٹھان لی تھی، مجبوراً مولانا کے ہمدردوں اور معتقدوں کو جن میں پیش پیش قطب میاں فرنگی محلی اور مولانا عبد الماجد بدایونی تھے، ایک دوسری جمیعۃ العلما بھی بنا لینی پڑی تھی۔ جس کا صدر مقام کانپور تھا، اس کے حالات خاص طور پر پوچھنے تھے۔ وسط اپریل میں سب کا اکٹھا جواب آیا، بڑے کاغذ کے ۴۹ صفحوں پر! ——— جواب ایسے قلم سے، جو رفیقوں کی مسلسل غداریوں اور دوستوں کی خالی خولی بے مغز نصیحتوں اور ملامتوں سے بھنایا ہوا، اور اپنے خلاف سازشوں کے زبردست جال سے جھلایا ہوا ہے۔ لب ولہجہ کی تلخی اس حال میں شاید بالکل قابل معافی ٹھیرے۔ بعض بعض لفظوں اور فقروں کو اس ڈایری میں مجبوراً قلم زد کرنا پڑ رہا ہے، اور یہ بعض جگہ اس سے قبل بھی ہو چکا ہے، لیکن اگر ایسے فقروں کو یکسر قلم زن کر دیا جائے تو اتنی کتر بیونت شاید حدود تحریف میں داخل ہو جائے، اور ڈائری ڈایری رہ ہی نہ جائے۔

باب (۸۱)

سنہ ۱۹۳۰ء (۲)

(شرح و ہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو)

۱۱ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

دارالخلافہ۔ لولیس۔ مجگاؤں
بمبئی

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کے تین کارڈ اور آج ہی جب کہ آپ کو عریضہ لکھنے والا تھا۔ ایک لفافہ بھی سب مجھے موصول ہوئے۔ چونکہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے ارادہ کیا تھا کہ جب گلنار کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو آپ کو بلا لوں گا۔ اور بلا لکھے پڑھے گفتگو میں سب کچھ کہہ دیا جائے گا۔ مگر گلنار کی شادی کی تاریخ شعیب کے اور ہم سب کے رفیق صدیق عبدالرحمٰن صدیقی کی ولایت سے آمد پر موقوف ہے۔ اور متعدد تاروں کے تبادلے کے بعد وہ یورپ سے ۷ اپریل کو تو چل پڑے۔ مگر زیارت روضۂ پاک اور حج بیت اللہ کے بعد ہندوستان پہنچیں گے۔ اور ہم سب اسی امید پر جی رہے ہیں کہ وہ ذی الحجہ ہی کی کسی تاریخ کو دہلی پہنچ جائیں گے کیونکہ محرم میں شادی نہ ہو سکے گی اور صفر میں حمیدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تھا، وہ زمانہ بھی ناموزوں ہوگا۔ یوں تو کون عبدالرحمٰن کے حج سے خوش نہ ہوگا۔ بالخصوص جبکہ ان کی صحت بالکل غارت ہو گئی ہے اور وہ متعدد امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور سخت تکالیف اور درد میں مبتلا ہیں

لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ گلنار کی شادی جلد سے جلد ہو جائے اور صرف عبد الرحمن ہی کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے، ورنہ مارچ ہی میں عقد کر دینے کا خیال تھا۔ خط نہ لکھنے کی وجہ میں نے بیان کر دی۔ مگر اب خط لکھ رہا ہوں تو باوجود آنکھوں کی بصارت اس درجہ کھو بیٹھنے کے جی نہیں مانتا کہ مفصل خط نہ لکھوں اور سب باتوں کا جواب نہ دوں اور کچھ شکایات بھی نہ کر دوں جو ایام سرما میں دل کو جلا رہی ہیں۔

پہلے اسراف کے متعلق سن لیجئے[1]۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا جو گلنار کی شادی میں اسراف کروں گا۔ برادرم...... میں نے پہلے بھی ان رسوم میں اسراف سے کام نہیں لیا تھا۔ زہرہ اور آمنہ مرحومہ کی۔ نہ ان دو بچیوں کی کبھی کوئی رسم ادا کی جو اس اسراف کا الزام مجھ پر لگ سکتا ہے۔ چونکہ نہ عقیقہ میں، نہ بسم اللہ میں، نہ فقرہ میں، نہ منگنی میں کوئی رسم ادا کی تھی اور درحقیقت اس زمانے کا اکثر حصہ قید و بند میں گزرا تھا۔ رسم ادا بھی کس طرح کرتا۔ صرف نکاحوں کے موقعوں پر میری اہلیہ نے کچھ خوشی منا لی۔ وہ بھی نہ اس طرح کہ ناچ و رنگ ہوا ہو یا شب گشت ہوئی ہو یا کسی اور طریقہ پر برات نکلی ہو۔ جب سے پہلے دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی ماں عورتوں کے طریقہ پر ان کے لیے کچھ نہ کچھ میری نہایت محدود تنخواہ میں سے بناتی یا خریدتی ہی رہتی تھی۔ اور وہ بھی زیور نہ تھا، بلکہ معمولی روزمرہ کے استعمال کے کپڑے اور برتن بھانڈے۔ جب میں اکتوبر ۲۰ء میں یورپ سے واپس آیا تو ایک لڑکی ۱۸ کی تھی اور دوسری ۱۷ سے کچھ ہی کم ہو گی۔ میں تو ایک ہی کا نکاح کرنا چاہتا تھا اور اسکا بھی اسوقت نہیں۔ لیکن میری بیوی نے سب انتظام میرے ولایت سے آنے سے قبل ہی کر لیا تھا اور انھوں نے کہا کہ تمھارے قید و بند کا زمانہ اب پھر آگیا۔ میں تنہا دو جوان لڑکیوں کی ذمہ داری اپنے سر

[1] میں نے بربنائے اخلاص و نیاز مندی عرض کیا تھا کہ ہر طرح کے اسراف سے احتیاط رہے۔

لینا نہیں چاہتی۔ دو مسلمان نوجوانوں کو اس ذمہ داری میں شریک کرتی ہوں۔ آمنہ کی عمر بھی ۲۰ برس کی نہیں ہے جس سے قبل تمہارا ارادہ کسی لڑکی کے نکاح کا نہ تھا لیکن اس کو ہسٹیریا کا مرض ہوگیا ہے۔ اور حکیم اجمل خاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی رائے ہے کہ نکاح بہترین علاج ہے۔ دوسرے آمنہ دو برس کے پاس ہے کہ ہر سال ایک نکاح کیا جائے۔ میں ان دلائل سے قائل ہوگیا اور نکاحوں کی اجازت دی۔ مگر مجھ کو جامعہ ملیہ کے آغاز کے باعث ایک منٹ فرصت نہ تھی۔ اس لیے نکاح سے دو تین روز پیشتر مہمان داخل آکر مرادآباد میں معظم صاحب اور عبدالسلام اور مسعود کے مکانوں میں بیٹھ رہا۔ سوائے مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی کو بھی مدعو نہ کیا۔ انصاری وغیرہ دہلی سے بلا دعوت کے آگئے اور کچھ دے ہی گئے۔ مہمانوں کو معمولی کھانا کھلایا گیا۔ صرف رامپور سے برات آنے پر انھیں رسم کا پلاؤ، زردہ، قلیہ، قورمہ کھلا دیا گیا۔ گویا ہر نکاح کے کھانے کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح عیدالفطر کے لیے سویاں اور شب برات کے لیے حلوا۔ میں نے اس شادی میں بجز شرکت کے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے مجھے حق بھی نہ تھا کہ بیگم صاحبہ سے جن کے حسن انتظام کے سب قائل ہیں، کچھ کہتا۔ یہ تھی میرے گھر کی پہلی رسم۔ آمنہ مرحومہ اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی موتیں دوسری اور تیسری رسم تھیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسراف سے کام لیا۔ درحقیقت کوئی رسم ادا نہیں کی گئی اور جو کچھ کی بچ گئی تو خیرات نقد کی گئی اور جمعیۃ خلافت وغیرہ کی نذر کردی گئی، یا محلہ کی مسجد میں برقی روشنی کا انتظام کر دیا گیا جو الحمدللہ اس وقت تک جاری ہے۔ آمنہ کا سارا زیور خلافت کو دے دیا گیا۔ یہی بڑی خیرات تھی۔ چوتھی رسم حمیدہ مرحومہ کی شادی تھی۔ جو بڑی دو بہنوں کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ اس کے لیے بھی باوجود ہماری قید و بند کے میری بیوی مرحومہ نے کچھ نہ کچھ کر لیا تھا۔ مگر وہ انھیں کافی نہ معلوم ہوا۔ اور نہ معلوم

کو اپنی آنے والی موت کا پہلے ہی سے کچھ اندیشہ تھا یا لیا) اور مرحومہ تو کیا عجب ہے کہ تین سال سے
حرارت اور درد گردہ میں مبتلا تھی اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور انصاری دونوں کا اصرار
تھا کہ شادی کے بعد ہی نسوانی علاج ہو سکے گا۔ کیونکہ اس نے گھر میں آئی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کو
فیس دے کر امتحان و معائنہ کے بغیر رخصت کر دیا تھا) خود مرحومہ نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنی ماں پر
ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دھوم دھام چاہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک صاحب نے دسمبر میں تین سو
روپے دیے تھے۔ مدراس کانگریس میں اسی کی عمدہ کھدر خرید لی تھی اور ایک دوست کی دکان
سے چینی کے برتن اور گلاس وغیرہ قرض لے لیے تھے۔ اور بس۔ مگر اس کی ماں نے اپنے بھائی
منظم کو لکھا کر اپنے باپ کے ترکہ میں سے ۲۲ برس میں انھوں نے ایک بار کوئی دو ہزار روپیہ
آمنہ مرحومہ کے مکان کے لیے زمین خریدنے کو لیے تھے جو اب تک یوں ہی پڑی ہے۔ اور ایک
سنہ ۲۶ء میں اپنے اور میرے حج کے لیے دو ہزار لیے تھے۔ اب انھوں نے تین ہزار منظم کو لکھ کر
منگوائے اور ساری خرید و فروخت خود کی۔ اس بار چونکہ ما بدولت مالی مشکلات میں گھرے ہوئے
تھے، اس لیے رامپور سے بھی سب عزیزوں کو نہ بلایا گیا۔ منظم کی بیٹیاں اور میری بہن اور
شوکت صاحب کی بچیاں ہی شریک ہوئیں۔ باہر سے بھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ البتہ ایک
شب کو دہلی سے کوئی سو پچاس احباب کو کھانے پر مدعو کر لیا گیا۔ یہی اسراف ہوا تھا۔ یا
مرحومہ کے لیے کپڑا لیا گیا تھا۔ پہلے اسراف کا کفارہ یہ کیا گیا کہ جامعہ ملیہ کو پانچسو، جمعیۃ خلافت اور
جمعیۃ العلماء وغیرہ کو چند سو نقد دیے گئے۔ دوسرے اسراف کا کفارہ یہ کیا جا رہا ہے کہ مرحومہ
کے کپڑے اور برتن بجائے غریب لڑکیوں کو ان کے عقد نکاح کے موقعوں پر دیے جاتے
ہیں۔ الحمد للہ خیر صلاً۔ گلنار کی شادی کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے کہ شعیب جیسے صالح
مسلمان کے ساتھ خاندان کی رسم کو توڑ کر جوڑا جا رہا ہے۔ اور خدا اس کی عمر دراز کرے۔

توکل تو خدا ہی پر ہے لیکن اب اپنی صحت کا خیال کر کے کسی قدر مطمئن ہوں کہ اس رزاقِ حقیقی نے جو مسبب الاسباب ہے۔ میری بیوی اور بچوں کے لیے ایک بار و مددگار بھی پیدا کر دیا مگر اب خوشیاں منانے کی ہمت ہی نہیں۔ دو جوان لڑکیوں کے نکاحوں کے اتنے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا کہ شادی و خانہ آبادی کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے جو کچھ اسراف کیا تو وہ والدہ مرحومہ اور آمنہ مرحومہ کی قبروں کے بنوانے میں کیا ہے۔ کوئی قبر نہیں بنوایا۔ سینے پر سوائے خاک و گھاس کے کچھ نہیں۔ ایک جگہ سنگ سبز کا فریم سا بنوا دیا ہے۔ ایک جگہ سپید سنگ مرمر کا۔ اور لوحِ مزار کو خود Design کیا ہے۔ آمنہ کی قبر پر پیام مجبس اور دعائے اسیرؔ کا ایک شعر کندہ کرا دیا ہے۔

تیری صحت ہمیں مطلوب تھی لیکن اسکو	نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

حمیدہ کی قبر بھی سپید سنگ مرمر کی اسی طرح تیار کرائی جا رہی ہے۔ اور اس پر اس زمانے کے کہے ہوئے یہ دو شعر انشاء اللہ کندہ ہوں گے ؎

ہوا محسوس جب ہے خوشی تیری خوشی اپنی	نہ اپنی موت، موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے	اسے بیچارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

صبر کے سوا اب بھی چارہ نہیں۔ مگر اب یارائے ضبط کم ہے کیا کروں

تو نا گفتہ دانی بگفتن چہ سود

نکاح پڑھانے کا مسئلہ میرے اختیار کا نہیں ہے۔ شعیب کی جو مرضی ہوگی کیا جائے گا۔ گو میرا تو جی یہی چاہتا ہے کہ میرے صاحب السجن اور آپکے پیر و مرشد ہی نکاح پڑھائیں۔[1] بہرحال انشاء اللہ مولانا کفایت اللہ صاحب، صدر جمعیۃ العلما ہند نکاح نہ پڑھائیں گے۔[2]

---

[1] میں نے مشورہ دیا تھا کہ نکاح مولانا حسین احمد صاحب پڑھائیں۔ کراچی کے مشہور مقدمہ میں دونوں ایک ساتھ اسیر ہوئے تھے اور ایک ساتھ ہی سزایاب۔ اس وقت تک بھی باہمی تعلقات تھے۔ بتحریکِ مولانا محمد علی اسوقت تک مفتی صاحب سے سخت بے لطفی ہو چکی تھی۔

بھائی اگر تم نہ بھی لکھتے[1] تب بھی میں شریعت حقہ کے احترام کو قائم رکھنے کی خاطر ان مفسدوں کا مقابلہ ضرور کرتا، جو اسمبلی میں جا کر اپنے تئیں مصلحین کہتے ہیں۔ ان ہی پر سورہ بقرہ کی وہ آیات صادق ہیں کہ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ...... فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُھُمْ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ۔ میں نے پربھنی[2] میں ایک لمبا چوڑا برقی پیغام تیار کرنا شروع کر دیا، مگر ٹائپسٹ نہ ملنے اور خود علیل ہونے کے باعث اسے ٹائپ کر کے بھجوا لے نہ پایا تھا کہ اندور میں معلوم ہوا کہ کونسل آف اسٹیٹ نے بھی شاردا ایکٹ کو پاس کر دیا۔ تب تو خود ہی بیٹھ کر ٹائپ رائٹر پر وائسرائے کو ایک طول طویل اور سخت خط لکھا۔ مگر وہ بدبخت منظوری دے چکا تھا۔ اور عازم یورپ ہو گیا۔ میں بھوپال میں تھا کہ دہلی کے جلسہ کی اطلاع ملی اور میرے پاس جمیل میاں[3] کا تار آیا کہ داعیوں میں مفتی صاحب کا، ان کا اور میرا نام ہو گا۔ اجازت درکار ہے۔ ہفتہ کو تار ملا۔ ارجنٹ تار کے دام کہاں سے لاتا۔ ارادہ کیا کہ پیر کو معمولی تار دے دوں گا۔ مگر بھول گیا۔ حالانکہ اس دن کا خط بھی پیر تک پہنچ جاتا۔ بعد کو بمبئی سے گھومتا گھامتا احمد سعید کا خط آیا کہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا، اس لیے خلافت کی معرفت لکھا جا رہا ہے۔ بہرحال میں جواب دینا بھول گیا۔ مگر جلسے کی شرکت کے لیے پہلے ہی دلی پہنچا۔ احمد سعید تعین عمر کی کمیٹی کے سامنے تائید کر چکنے بعد خود ہی میری جگہ داعی بن بیٹھے تھے۔ میں آتے ہی دوبار ان کے اور مفتی صاحب کے گھر گیا، اور ایک بار دفتر جمعیت۔ مگر نہ ملے۔ دوسرے دن جمعیۃ کا جلسہ تھا جس میں سیاست (سطحی) بہت کچھ تھی۔ مگر مذہب کا قطعی

[1] شاردا ایکٹ (قانون امتناع ازدواج کمسنی) بنا تھا ہندوؤں کے لیے مگر چپک دیا گیا مسلمانوں کے سر۔ میں نے لکھا تھا کہ اس عظیم الشان فتنہ کے مقابلہ کیلیے آپ ہی جیسے قائد کی ضرورت ہے [2] پربھنی علاقہ نظام دکن۔ مولانا وہاں اپنے ایک دوست کے ہاں سکون صحت اور تبدیل آب و ہوا کے سلسلہ میں مقیم تھے [3] یعنی حکیم محمد جمیل خاں دہلوی فرزند حکیم اجمل خاں مرحوم

[4] خوب یاد کر لیجیے کہ یہ وقت کونسا تھا۔ جمعیۃ العلماء اور مولانا کے اختلافات اس وقت تک نہایت درجہ تلخ ہو چکے تھے

(باقی ص ۱۱۹)

فقدان تھا۔ شام کو دوسرے جلسہ کے متعلق جمیل صاحب کے ہاں مشورہ تھا۔ مگر مفتی صاحب اور احمد سعید دیر میں آئے۔ اور لوگ مشورہ کرتے رہے اور سب کی رائے یہی تھی کہ میں جلسہ کا صدر ہوں۔ وائسرائے کو ایک وفد کے ذریعہ الٹی میٹم دیدیا جائے۔ مسلمان اس ایکٹ سے مستثنیٰ نہ کیے جائیں تو کانپور کانفرنس منعقد کیجائے اور تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم پر عمل کرکے ہر کلمہ گو کو جو اس مداخلت فی الدین سے بیزار ہو دعوت دیجائے اور اس مصیبت پر خدا کا شکر کرکے ہمارے افتراق کو دور کیا جائے۔ اس لیے باوجود میرے صدر خلافت ہونے کے میں نے صرف خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب نہ کیا، کیونکہ "معتدلین" نہ آتے، نہ شیعہ اور قادیانی شریک ہوتے۔ اتنے میں مفتی صاحب اور احمد سعید آگئے۔ پہلے صدارت کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کس کا صدر ہونا مناسب ہوگا۔ مفتی صاحب کا جواب بے حد (Significant) ہے۔ خود ہی داعیوں میں شامل ہیں اور خود ہی فرماتے ہیں کہ میں اس وقت تک اس کے متعلق بالکل خالی الذہن ہوں۔ مگر احمد سعید نے اس خلائے محض کے پُر ہونے کا ثبوت بھی دیدیا اور کہا کہ "اگر جلسہ جمعیۃ العلماء کا بلایا ہوا ہے، اسی کا مستقل اور دوامی صدر اس کا بھی صدر ہوگا۔" تب جاکر چند دہلی والوں نے جو اس وقت موجود تھے، کہا کہ جلسہ تو اہل دہلی کا طلب کردہ ہے۔ جمیل میاں بھی داعی ہیں۔ اہل دہلی نے مہمانوں کے لیے خود ہی چندہ کیا ہے۔ آپ کو اس لیے دیدیا ہے کہ جمعیۃ العلماء کی کمیٹی منتظرکا بھی جلسہ ہونے والا تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمارے مہمانوں کا بھی انتظام کر دیجئے گا۔ بالآخر دعوت نامے منگا کر دیکھے گئے تو صاف درج تھا کہ یہ جلسہ جمعیۃ کے جلسے سے بالکل الگ تھا۔ مگر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۸) مولانا کا دل اپنے سابق رفیقوں کی طرف سے بہت ہی جلا ہوا ہے۔ اور وہ سچ کے خط میں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ پھر خود بھی ہر طرح کے جسمانی آرام اور قومی و ذاتی صدمات سے چور چور رہے۔ لہجہ کی کرختگی اور خشونت ایسی حالت میں بالکل درگذر کے قابل ہے۔

احمد سعید صاحب کا تحریر کردہ دعوت نامہ جو جمعیت والوں کو بھیجا گیا تھا۔ اس میں جمعیۃ ہی کا جلسہ بتایا گیا تھا۔ اس تضاد و تباین کا اقبال انھوں نے بھی کیا۔ بہرحال میرا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا اور بلا عذر تسلیم کیا گیا۔ گو چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ توں علمائے کرام اسے کڑوا قبول کر رہے ہیں۔ آپ کو نہ معلوم وہ گندہ قصہ یاد ہے یا نہیں کہ ایک ہیجڑا بنیے کی دکان پر سے اس کی غیر حاضری میں چنے ٹونگ رہا تھا۔ وہ پیشاب کر رہا تھا۔ پیٹھ پھیر کر دیکھا تو یہ نظارہ نظر آیا۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مرد ہے یا عورت۔ گھبرا کر چیخ اٹھا کر سارے چنے ٹونگ گیا۔ سالے چنے ٹونگ گئی......

مفتی صاحب نہ پورے دیندار نکلے نہ پورے دنیادار۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ محمد علی کا نام صدارت کے لیے بحیثیت داعی جلسہ پیش فرمائیں اور جمیل میاں بحیثیت داعی دوم اس کی تائید کر دیں گے تو فرمایا جمیل میاں پیش فرمائیں، میں تائید کر دوں گا۔ باوجود سب کے اصرار کے انھوں نے تحریک کرنے سے انکار کیا۔ مگر تائید کرنے کا اقرار کیا۔ نواب اسمٰعیل خاں[1] نے اس حیرت انگیز انکار و اقرار پر ایک سیدھا سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو کچھ نہ فرما سکے۔ جواب دیا تو یہ کہ تحریک پر اصرار کیوں ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جو سلوک مولانا محمد علی کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے جلسہ میں حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کیا اور باوجود ان کے رکن جمعیت اور اس کی انتظامیہ اور عاملہ دونوں مجالس کے رکن ہونے کے اپنی تقریر میں کہا کہ میں محمد علی کو تو جمعیت کا رکن ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اور جس طرح مسلم لیگ جلسہ میں جو گذشتہ اواخر مارچ میں ہوا انھوں نے لیمیز اللہ الخبیث من الطیب کی آیۂ کریمہ پڑھ کر نہرو رپورٹ کے مخالفین کو "خبیث" کا لقب عطا فرمایا تھا اور نہرو وانیوں کو "طیب" کا۔ اور جس طرح مقدم الذکر جماعت کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر محمد عالم کو صدر تجویز کر کے بلا رائے لیے ہوئے کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا۔ اور اسی طرح ایک

[1] میرٹھ والے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ اس وقت بھی قومی کاموں میں پیش پیش تھے۔ بعد کو مسلم لیگ کے رکن عظم ہوئے (م ۱۹۵۸ء)

تجویز نہرو رپورٹ کے متعلق پاس کرلی تھی۔ اس سے خطرہ ہے کہ جلسے کے لیے لوگوں کے آتے ہی
حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے بھائی نعیم خود آپ کا نام صدارت کے لیے پیش کر دیںگے۔
اس لیے ضرورت ہے کہ آپ خود ہی بہ حیثیت داعی جلسہ محمد علی کا نام پیش فرمائیں، تاکہ وہی بےلطفی
پیدا نہ ہو جو مرادآباد میں جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لیے ان کا نام پیش کیے جانے کے باعث کانپور
کے سالانہ اجلاس جمعیۃ العلماء کی مجلس استقبالیہ کو آج تک نصیب ہو رہی ہے ....
اس کے بعد ان ہی کی طرف سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ صدر کا انتخاب تو حاضرین جلسہ کے ہاتھ میں
ہے۔ تو ان سے عرض کیا گیا کہ یہ کلیہ نہیں ہے۔ خود جمعیۃ کے سالانہ جلسے کے لیے خلافت کانفرنس،
کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ کے لیے پہلے ہی انتخاب کر لیا جاتا ہے، تاکہ اس قسم کی ناگوار حالت پیدا
نہ ہو۔ جو کانگریس کو سورت میں ۱۹۰۷ء میں پیش آئی تھی۔ دہلی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس آپ نے
منعقد کرائی تھی اس کے لیے آغا خاں کا انتخاب ان کے ولایت جانے سے بھی پیشتر کر کے ان کو مدعو
کیا گیا تھا۔ آپ لوگ بحیثیت داعیان کے انتخاب کر لیجیے اور اسی حیثیت سے جلسہ کا آغاز کل
صبح فرما کر محمد علی سے صدارت کرائیے۔ یہ معاملہ صرف فتویٰ دینے کا نہیں ہے۔ فتویٰ تو جمعیۃ العلماء
دے ہی چکی ہے۔ اب مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کرانے کی تدبیر پر غور کرنے
اور ہر عقیدے اور ہر سیاسی روش کے مسلمان کو متحد کر کے شریعت کے احترام کرانے کا ہے۔ مفتی صاحب
نے اس پر کہا کہ اچھا ہم تینوں داعی اس کا فیصلہ کر لیں گے کہ محمد علی کا نام میں پیش کروں یا جمیل میاں
پیش کریں میں تائید کروں۔ چونکہ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اسی شب کو مسجد جامع میں فلسطین،
افغانستان، شام، وابل وغیرہ کے متعلق بالتفصیل تقریر کرنا شروع کروں گا۔ اور دو تین روز تک
اس سلسلہ کو جاری رکھوں گا، تاکہ ایک عرصہ سے میری دہلی کی غیر حاضری کے باعث اظہار
خیالات کا جو موقع نہیں مل سکا ہے، وہ مل جائے۔ اور یہاں خلافت توقع صرف صدارت ہی

کے مسئلہ پر دیر تک بحث چھڑ جانے کے باعث ہمیں مولانا نثار احمد[1] وغیرہ کو مسجد جامع کا جلسہ شروع کر دینے کے لیے بھیجنا پڑا۔ اس لیے اب ہم لوگ اٹھ کر مسجد جامع کو چلے گئے۔ جہاں دہلی کے مسلم رضاکاروں کی ایک جمعیت نے تین راتوں کے لیے جلسوں کا پوسٹر وغیرہ کے ذریعہ اعلان اور روشنی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا، اور مفتی صاحب وغیرہ کو جمیل میاں کے پاس چھوڑ گئے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا مولانا عبدالحلیم صدیقی[2] ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے بیچ میں کود پڑے تھے، اور جمعیۃ العلماء اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی فضیلت میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے وعظ دے رہے تھے، اور مولانا نثار احمد صاحب کو لب کشائی کا بھی موقع نہ دیا تھا، دوسرے دن بجائے مفتی صاحب کے جلسے کا بحیثیت داعی کے آغاز کرنے کے احمد سعید نے آغاز کر دیا اور یعقوب[3] کی اور مولانا عبدالحلیم کی تقریریں ہونے لگیں جس کے باعث یوں ہی فضا مکدر ہو گئی۔ اب حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ نعیم نے بھی اسی طرح کی تقریر کی (میں اب نہیں کہہ سکتا کہ کس کس نے تقریر کی۔ مگر جہاں تک ایک مریض کا حافظہ کام دے رہا ہے لکھ رہا ہوں) بالآخر خواجہ غلام السیدین نے جو انتظامات جلسہ اور دعوت ناموں کے اجرا میں احمد سعید کے ساتھ شریک مقرر کیے گئے تھے، رات کا فیصلہ مفتی صاحب کو یاد دلایا۔ اور مفتی صاحب نے مبہم طریقہ پر اس کی ایک حد تک تصدیق کی۔ مگر یہ نہ کہا کہ ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ بحیثیت داعی ہم خود ہی صدر کو منتخب کر لیں گے۔ کہا تو یہ کہ مجھے اس وقت تک فرصت نہیں ملی کہ جمیل میاں سے طے کرتا کہ وہ محمد علی کا نام پیش کریں اور میں تائید کروں یا میں خود تحریک کروں اور وہ تائید کریں۔ اب بحث اور چھڑ گئی اور

[1] کانپور اور آگرہ والے۔ کراچی میں ۱۹۲۱ء میں مولانا کے ساتھ ہی سزایاب ہوئے تھے اور اس وقت بھی مولانا کے مخلصوں میں تھے، چند سال ہوئے وفات پائی۔ [2] جمعیۃ العلماء کے ایک سرگرم رکن، ایک وقت کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں استاذ ہیں۔ [3] محمد یعقوب (مسلم لیگی) مرادآبادی ڈپٹی پریسیڈنٹ انڈین اسمبلی۔ بعد کو حیدرآباد میں رفارم افسر ہو گئے اور وہیں دفعتہً انتقال کیا۔

گلابی وہابیوں کی تائید ایک پکے وہابی مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح فرمائی کہ خود مجھ سے اپیل کیا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں، میں نے مجبور ہو کر ایک تقریر کی اور اس کے آخر میں یہ کہہ کر اپنا نام واپس لے لیا کہ مجھ پر اس اپیل کے خلوص کا تو مطلق اثر نہیں ہوا۔ مگر جو حالات پیش آئے ہیں ان کے بعد اس مجلس کی صدارت کرنا میں اپنی توہین سمجھوں گا۔

برادرم! جو ذہنیت ان دینداروں کی اور جو مکاری ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی اسے اس طرح ایک ایسے معاملہ میں بھی دیکھ کر جس میں ہمیں اپنی شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے غیروں کو بھی حاملین شریعت کے افکار اور ان کے اعمال سے متاثر کرنا تھا اور ہر عقیدے اور طبقے کے مسلمانوں کے اس امر میں اتحاد و اتفاق کو عالم آشکارا کرنا تھا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے جمعیۃ العلماء کی صدارت کا کبھی بھی خیال نہ کیا تھا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ایک خاص جماعت کو اس کا اصرار ہے اور بلا مجھ سے استمزاج کیے ہوئے انھوں نے چند ماہ پیشتر ہی میرا نام مجلس استقبالیہ کی طرف سے بھجوا دیا تھا۔ اور اس کے بعد علمائے کرام میں عجیب عجیب ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔ تو میں نے کانپور سے خط آنے پر اور مجلس استقبالیہ کے اصرار پر صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ خود انکار نہ کروں گا اور نہ خود کوئی کوشش کروں گا۔ اگر منتخب ہو گیا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور جمعیۃ کی از سر نو ترتیب کے متعلق جو عرصۂ دراز سے میرے خیالات ہیں، انھیں بصد عجز و ادب جمعیۃ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ مگر جو کارروائی کہ مراد آباد میں ہوئی اور اس سے پیشتر جو مضامین اور خطوط الجمعیۃ میں شفیع داؤدی اور شوکت صاحب کے خلاف صوبہ بمبئی کی جمعیۃ العلماء کے جلسہ کی صدارت کے بارہ میں بطور پیش بندی کے شائع کیے گئے۔ اور جس طرح کانپور والوں کے ساتھ صریح اور مسلسل بے ایمانی کی گئی ہے۔ اور اب جس طرح بلا حصول رائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب خود لکھ کر مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اس کے بعد میرے لیے

ناممکن ہوگیا کہ ان حضرات سے کوئی توقع اصلاح کی رکھوں۔ جب جلسہ شروع ہوگیا تو میرے پاس متعدد درخواستیں آئیں کہ جلسہ سے ہم سب اٹھ کر چلے آویں۔ مگر میں نے انکار کیا اور سب کو روکا تاکہ حکومت کو اور ہنود کو اس نفاق و شقاق کا نظارہ نہ دکھایا جائے۔ سب بیٹھے رہے۔ البتہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ شام کے جلسے میں نہ آئیں گے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا اور جو بیان ان تمام واقعات کے متعلق تیار کیا گیا، اس کے حرف حرف کو صحیح اور درست کرنے کے بعد خود میں نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ العلما سے استعفے دیے ان کے استعفوں کو بھی اس وقت نہ بھجوایا۔ ہماری جماعت نے وائسرائے کے پاس جو وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا، اسمیں بھی علاوہ مولانا حسین احمد صاحب کے اور دیوبند کے اکابر کے خود مفتی صاحب کو بھی شامل کیا۔ میں شام کے جلسہ میں یوں بھی نہ آسکتا تھا کیونکہ علیل ہوگیا تھا۔ مفتی صاحب ان تمام بیہودگیوں کے بعد اشک شوئی کے لیے میری عیادت کے نام سے تشریف لائے۔ اور میں نے انھیں ناشتہ کرایا۔ اور وفد میں جانے کے لیے نواب اسماعیل خاں نے ان سے کہا اور انھوں نے اقرار کیا۔ مگر دوسرے دن یہ کہہ کر علٰحدہ ہوگئے کہ شام کو میری "جماعت" (جمعیت نہیں۔ اس لیے کہ اس نے اس کے خلاف کوئی قرارداد نہیں کی) نے کہا کہ تم نہ جانا۔ تاہم میں نے ان سے احکام شریعت دربارۂ نکاح حاصل کیے اور گو مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے بیانات جو بجد مفصل اور مرتب تھے، مجھے اس سے مستغنی کر دیا تھا۔ تاہم میں نے بار بار مفتی صاحب سے ان کے بیان کا تقاضا کیا۔ اور باوجود اپنی علالت کے ان سے ملنے گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب شاہجہانپور جارہے تھے اور وہاں کئی روز وعظوں میں تھے۔ تاہم میرے اصرار پر تشریف لائے۔ اور اسٹیشن سے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم[1] نے آنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

[1] مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی، ناظم دارالعلوم دیوبند۔

مگر مرض الموت نے آ لیا۔ اور طیبؒ[1] کو اپنی جگہ بھجوایا۔ لیکن مفتی صاحب اور ان کے حواریوں کا رویّہ دیکھیے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے ایک تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا کہ خدا را ہمیں گورنمنٹ کے آستانہ پر سر جھکانے کے لیے نہ لے جایئے۔ ہم پر رحم کیجئے (حالانکہ احمد سعید Age of[2] Consent Committe) کے سامنے غلط سلط شہادت دینے کے لیے بلا تامل چلے گئے تھے۔ بہار کے سجاد نے ہم پر وائسرائے کی دست بوسی کی تہمت لگائی اور احمد سعید نے بھی الجمعیۃ میں دروغ بافیوں کا عرصہ تک سلسلہ جاری رکھا۔ (جو حقیقۃً آج تک جاری ہے) آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہم دونوں کو بیگانہ سمجھ کر سارا کام ہمیں پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ سنکر آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کو اسی جاہل مطلق نے جاکر سوتے سے جگایا تھا۔ اور ہمدرد میں میرا ہی مضمون اواخر مارچ ۲۸ء میں اس بل کے خلاف شائع ہوا تھا اور اسکو لے کر میں صدر جمعیۃ العلماء کی خدمت میں خود حاضر ہوا تھا۔ اور اس پر بھی ان کی غفلت کا یہ عالم رہا کہ نہرو رپورٹ کے معاملے میں تو یہ اس کی تائید میں درپردہ کوشش کر رہے ہیں۔ مگر شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے شاردا بل کے منظور ہوجانے تک اسقدر کم کام کیا کہ نہیں کرنے کے برابر ہے۔ بہرحال اب باوجود بصارت اور اعصاب کی اس حالت کے اور بخار جاڑے کے دو تین دن میں نے Age of Consent کمیٹی کی رپورٹ پڑھی اور ۲۵ ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان تیار کیا۔ اور ساری رات اور سارے دن خود ہی جاگ کر اور آرام لیے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کرکے ایک دن پہلے وائسرائے کے سکریٹری کو دے آیا۔ مسلمانوں کی قوم میں ایک بھی ٹائپسٹ نہ ملا جو اس کام کو کرتا۔

تین بجے شام کو یہ بیان وائسرائے کو ملا۔ بیچارہ کو گھنٹہ بھر بھی اس کے دیکھنے کو نہ ملا ہوگا۔

[1] مولانا محمد طیب دیوبندی موجودہ ناظم دارالعلوم دیوبند [2] کمیٹی برائے عمر رضامندی

دوسرے دن گیارہ بجے وفد پہنچا۔ جو جواب دیا اس کا جواب ہمارے تحریری بیان میں پہلے سے
موجود تھا۔ جب اس نے کہا کہ آپ کے بیان پر میں اس وقت تک صرف ایک سرسری نظر ڈال سکا
ہوں تو میں نے اس اقبال سے فائدہ اٹھایا۔ اور کہا کہ آج ہم آپ سے جواب لینا نہیں چاہتے
جب آپ اسے دوبارہ اچھی طرح سے پڑھ لیں گے۔ تو آخری جواب اس وقت لیں گے۔ چنانچہ
۱۵ر نومبر کو باوجودیکہ وہ اسی دن دکن کے دورہ پر جا رہا تھا، ڈیڑھ گھنٹہ اس سے مفصل اور
صاف صاف گفتگو رہی۔ اور وہ قائل ہوگیا کہ ہم اپنے عقائد اسلامی پر قائم رہتے ہوئے اس
قانون کو قبول نہیں کر سکتے۔ گو ہنود کے باعث اپنی مجبوری کا بھی اظہار کیا۔ (اس کو راز ہی میں
رکھیے) دوسرے ہی دن وہ نواب صاحب سے ملا اور کہا کہ اگر محمد علی نے Test Case اس
بنا پر جیت لیا کہ میں نے جس بل کے پیش ہونے سے پیشتر اس کے پیش ہونے کی اجازت دی تھی (جس
کے بغیر کسی کے مذہب یا مذہبی رسم وزواج کے متعلق کوئی مسودہ ہی نہیں پیش ہو سکتا) وہ صرف
ہنود کے لیے تھی تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اس کا نفاذ کسی دوسرے بل
کے ذریعہ سے نہیں ہونے دوں گا۔ میں وائسرائے سے ملنے سے پیشتر مفتی صاحب اور احمد سعید
کے سامنے جامع مسجد میں مسلمانوں کو جتا کر گیا تھا کہ کیا کہنے جاتا ہوں اور واپس آکر مسجد جامع میں
نماز مغرب سے قبل جو گفتگو ہوئی تھی، سب دہرا دی اور دونوں کو گھر سے بلوا کر ان ہی کے سامنے
سب کچھ کہا۔ تاہم ان کی حرکات ملاحظہ ہوں کہ ایک مجلس ناموس تحفظ شریعت بناتے ہیں۔
جس میں نہرودانی جماعت[1] حبیب الرحمٰن لدھیانوی، نعیم اور ظفر علی خاں تک ہیں لیکن میرا
نام تک نہیں۔ ان کی بے سود ہڑتال کی میں نے مخالفت نہیں کی، گو اسے بے سود اور غیر مؤثر
سمجھا، تاہم مجھے بدنام کیا گیا۔ پھر جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو جلوس نکالا، مجھ سے آکر ملے اور

[1] نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں صدر کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کے ہم خیال لوگ۔

امداد چاہی تو میں نے اس جلسہ میں بھی ان کی صدارت میں تحریک پیش کی۔ گو انھوں نے میری رائے پر عمل نہ کیا، اور جلوس کو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری تک نہ لے گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے پاس کچھ نہ تھا، میرے گھر آئے، میں نہ تھا۔ دوسرے دن میں اسمٰعیل خاں اور شفیع کو لے کر ان کے گھر گیا تو انھوں نے کہا کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ تب میں نے وہی تدبیر بتائی جو میں اندور ہی کے قیام میں طے کر چکا تھا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ مگر اس طریقہ پر نہیں جس سے شریعت بدنام ہو یعنی محض خلاف ورزی کی خاطر بلا ضرورت گڈے گڑیا کا بیاہ کرنا بلکہ جس لڑکے کو جس کی عمر ۱۵ یا ۱۸ سال کی ہو "قانون" کے باعث نکاح کی ضرورت ہو اور وہ اس حالت میں فرض یا کم سے کم واجب ہی ہوتا ہو، ایک ۱۵ یا ۱۷ برس کی تندرست اور بالغ لڑکی سے اس کا نکاح کرا دینا یا نابالغہ کا نکاح اس کے ولی کے حکم سے کرانا جبکہ اسے عمر یا سفر کے باعث اندیشہ ہو کہ اگر وہ مر گیا تو لڑکی یا اس کا مال و متاع خراب لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جائے گا اور اس لیے وہ اس کے سسر وغیرہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ یا ایسی حالت میں جب کہ لڑکی کی ماں زندہ نہیں ہے یا بڑی بہن کی شادی ہونے کے بعد وہ رخصت کر دی جائے گی۔ اور اس کی تربیت کے لیے ساس کے سوا کوئی عورت میسر نہیں ہے یا ولی اس قدر غریب ہے کہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتا اور سسر کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف انہی حالتوں میں نکاح پڑھوا کر اور رخصت کرا کے شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے گی۔[1]

یہاں تک ۱۱ اپریل کو لکھا جا چکا تھا مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لیے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن آنکھوں کے Specialist کے پاس گیا۔ اور اس نے بہت محنت کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ! میں آنکھ

[1] اس کے آگے مکتوب مولانا کا لکھا ہوا نہیں، کسی اور کے قلم کا ہے۔

تو بالکل جا ہی چکی ہے۔ اس سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے لیکن سیدھی آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا ہوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں۔ اس لیے کہ خون کی ایک دو پھٹکیں تازہ نظر آرہی ہیں۔ غالباً یہ اسی عریضے کے متعلق ڈاکٹر کا خیال تھا۔ یا ایک اور خط کے متعلق جس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں، جو میں نے سپرو[1] کو خود ہی بیٹھ کر مسلسل چھ گھنٹے میں ٹائپ کیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر کا بیان ہے کہ آنکھ کی Blood Vessel[2] تک دیواریں پھٹنے کے بعد اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب ہر وقت دوبارہ پھٹنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت خدا کا بڑا فضل ہے کہ گو ہر طرف خون کی چند پھٹکیں موجود ہیں جو بصارت کو دھندلا کر رہی ہیں۔ مگر بیچ کے دائرے میں جسے MACULA کہتے ہیں ایک پھٹک بھی موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اسی آنکھ کی بصارت ہے۔ اگر آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا یا تقریر کی تو نہیں کہہ سکتا کہ چند سکنڈ یا چند منٹوں یا چند گھنٹوں میں آپ بالکل اندھے نہ ہو جائیں۔ آپ کی آنکھ کے لیے کوئی دوا نہیں جو مفید ثابت ہو، سوائے اصل مرض کے علاج کے جو ذیابیطس ہے۔ اور سال دو سال کے مسلسل آرام کے۔ میں تو کہوں گا کہ آپ نوکر کو بھی کمرے میں نہ پکار کر بلائیں بلکہ اسے کمرے ہی میں بیٹھے رہنے دیں۔ تاکہ اشارے سے بلا سکیں۔ اس لیے اس کو پکار کر بلانے سے بھی آنکھ کے کسی نہ کسی Blood Vessel کے پھٹنے کا اندیشہ ہے اور اگر (Hemorrage)[3] ہو گیا اور خون کی پھٹک آنکھ کے سامنے آگئی تو آپ بالکل اندھے ہو جائیں گے کامل ایک گھنٹے کے امتحان کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے Eye Specialist[4] کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھو، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانہ

[1] سر تیج بہادر سپرو۔ ہندستان کی لبرل پارٹی کے مشہور لیڈر۔ [2] شریان خون۔ [3] سیلان خون۔ [4] ماہر امراض چشم

ہیں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت وسماجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کرکے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض باوجود ہماری آجکل کی منت وسماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان ستیہ گرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جو ان کا جواب نہیں دے سکتا، متواتر حملے کر رہے ہیں۔ اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ حاملین شریعت حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور الجمعیۃ[1] کے کالم اس کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ اب ان جملہ ہائے معترضہ کو میں نہیں ختم کرتا ہوں اور اپنے عریضہ کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتا ہوں۔ میری بتائی ہوئی تدبیر پر خوب جرح و قدح کی گئی اور جو تدبیریں بتائی جا رہی تھیں یعنی شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ وغیرہ۔ اس پر بھی غور کیا گیا اور آخر کو یہی طے پایا کر دہلی میں ہم سب مل کر متفقہ طور پر متذکرۂ بالا قسم کا نکاح پڑھوا کر شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں اور جب ہم پر مقدمہ چلایا جائے تو عذر پیش کریں کہ اس قانون کا نفاذ مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ہماری شریعت کے خلاف ہے، اور ایسے قانون کو مجلس مقننہ میں پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے

(مکتوب اس مقام پر اچانک ختم ہو گیا ہے۔ اس کے آگے کے فقرے پھر مولانا کے قلم کے ہیں)

---

[1] جمعیۃ العلماء کا اخبار جو اس وقت سہ روزہ یا سہ روزہ تھا۔

برادرم ایک اپاہج بھائی سے جس قدر لکھایا لکھوایا جا سکا۔ کیا گیا۔ مگر اتنے دن کے انتظار کے بعد مجبور ہو کر اس عریضے کو اسی طرح ناتمام بھیج رہا ہوں۔ میری آخری تحریر ہے۔ آخری تقریر بی اماں کے مولد امروہہ میں ۳؍ مارچ کو کروں گا[1]۔ براہ کرم وہاں تشریف لے آیئے۔ کانپور کا وعدہ فرمانے کے باوجود انتظار ہی دکھایا[2]۔ اگر میں واقعی اب بھی اس قابل ہوں کہ آپ جیسا مسلمان مجھ سے مل سکے تو ضرور آیئے۔

آپ کا اپاہج بھائی

محمد علی

---

[1] امروہہ میں جمعیۃ العلماء جدید کا جلسہ تھا۔ یہ انتہائی حسرت و یاس کے لفظ مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے لیڈر کے قلم سے کل ۵۲ سال کی عمر میں نکل رہے ہیں۔

[2] کانپور میں مجبوراً مولانا کو اپنے جدید رفیقوں کے ساتھ مل کر ایک جدید جمعیۃ العلماء بنانا پڑی تھی۔

باب (۸۲)

سنہ ۱۹۳۰ء (۳)

("یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہی")

صحابیوں کے سرتاج عمر فاروقؓ سے متعلق جب حدیث نبوی میں یہ مضمون نظر سے گذرا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے ان کا کوئی دوست باقی نہ رکھا۔ تو دل پر بڑا اثر پڑا تھا، اور حیرت بھی ہوئی تھی۔ قدرت حق نے اس کا ایک ہلکا نمونہ آنکھوں کو دکھا دیا۔ محمد علی اس آفتاب کے سامنے ایک ذرہ سہی، لیکن بہر حال اس ذرہ پر بھی اسی آفتاب کا پرتو پڑ رہا تھا۔ یہ مخالف، وہ مخالف، عمر بھر کے دوست رفیق، عزیز مخالف۔ جو اپنے خاص دست و بازو تھے وہ مخالف۔ اب کارٹون ان کے نکل رہے ہیں، ہجویں ان کی چھپ رہی ہیں۔ اور مخالفانہ مضمونوں اور تقریروں کی تو حد ہی نہیں۔ اور یہ ساری یورش اس محمد علی پر جس کی بائیں آنکھ تو بالکل ہی جا چکی، اور داہنی آنکھ کے بھی چلے جانے کا ہر وقت خطرہ۔ زور سے بات کرنا تک منع تھا! ——— عجب تماشہ تھا۔ کل تک عین مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں یہ الزام بعض مقدسین کی زبان سے لگایا جا رہا تھا کہ محمد علی تو بالکل ہندوؤں کے ہاتھ بک چکے ہیں، برابر مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں بولتے۔ اور آج جب محمد علی کانگرس میں اندھا دھند شرکت سے روکنے لگے، تو خود ہی لوگ پلٹ پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ تو عین انگریز پرستی ہے، یہ ہیں آزادی

کی راہ سے روک رہے ہیں!

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا!

لمبا چوڑا خط جس کے بعض حصے خون جگر سے لکھے ہوئے ہیں۔ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، لیکن جی نہیں مانتا کہ بعض فقروں پر دوبارہ آپ کو توجہ نہ دلائی جائے۔ سنیئے:۔

"........ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر امراض چشم کی رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو دور رکھو، اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ بہ ظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت وسماجت پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے، اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض باوجود ہماری آجکل کی منت وسماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جا رہے ہیں، اور صرف اس لیے کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان ستیہ گرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوا اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ کریں۔ ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر جو ان کا جواب بھی نہیں دے سکتا، متواتر حملہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے خلاف گندے سے گندے اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے حاملین شریعت حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد و رہنما ہیں اور الجمعیتہ[1] کے کالم اس کیلیے وقف ہوگئے ہیں۔"

[1] ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۱۹۱۳ء کی الجمعیتہ کا ذکر ہے، ذکر اس ڈائری کے مسودہ کے وقت کا۔ سنہ ۲۹ء کے الجمعیتہ کا، ورنہ اور نہ اس کی نظر ثانی کے وقت سنہ ۱۹۵۲ء کے الجمعیتہ کا۔

اجلاس جمعیۃ العلما، کی صدارت کے لیے مولانا کا نام بعض علما رہی کی طرف سے پیش ہوا۔
لیکن بعض بڑے ذمہ دار اور او نچے قسم کے علما نے یہ کہہ کر اس کی شدید مخالفت کی کہ محمد علی
"عالم" نہیں ہیں۔ اعتراض ضابطہ سے صحیح تھا لیکن اول تو بعض غیر علما اس کے قبل بھی جمعیۃ
کی صدارت کر چکے تھے، اس کی نظیر موجود تھی۔ دوسرے محمد علی کا اصل استدلال یہ تھا کہ
مذہبی مباحث میں تو علما کی قیادت بیشک مسلم لیکن جمعیۃ جب مذہبی مسائل پر نہیں بلکہ
سیاسی امور پر بحث کر رہی ہے تو اب عالم اور غیر عالم کے کوئی معنی نہیں۔ علما کا احترام
اپنی جگہ پر قطعاً مسلم، لیکن صرف مذہبیات کے حدود کے اندر۔ یہ نہیں کہ عالم کو ہر حال میں
اور ہر موقع پر غیر عالم سے بلند تر رکھا جائے۔ محض دنیوی مسائل پر جہاں بحث ہوگی، وہاں عالم وغیر عالم
ہر مسلمان کا درجہ یکساں ہے۔ محمد علی باوجود اپنی علیگڈھی اور ولایتی تعلیم و تربیت کے علما
کے احترام کے ہرگز منکر نہ تھے۔ وہ ان کے پورے مرتبہ شناس و قدر شناس تھے۔ لیکن اس میں
غلو کے بھی قائل نہ تھے۔ درجۂ اعتدال و توازن قائم رکھے ہوئے تھے۔ احترام واجب کے
ڈانڈے پرستش سے الگ کیے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح ڈاکٹر صرف مسائل
طب میں مستند و معتمد ہے، اور وکیل صرف مسائل قانون میں، اسی طرح فقیہ صرف مسائل
فقہ میں معتمد و محترم تسلیم کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ چونکہ وہ فقیہ ہے، اس لیے محفل مشاعرہ کا بھی
صدر وہی ہو، مسائل طب میں بھی اسی کا حکم چلے، سیاسیات میں بھی وہی امام تسلیم کر لیا جائے
—— یہ نکتہ آج ایک موٹی اور معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت خدا
معلوم کیوں بہتوں کی سمجھ میں یہ آیا نہیں، یا بعض کو اس کے نہ سمجھنے ہی میں مصلحت نظر آئی۔
بہرحال محمد علی کو بہت کچھ اس جرم میں سننا پڑا۔ اور یقیناً اس طوفان سب وشتم سے ان
کے بہت سے گناہ دُھل گئے۔ ذیل میں اقتباسات اس قسم کی "شریفانہ" تحریروں کے

کے دیے جاتے ہیں کہ ڈائری خواں کچھ تو اُس وقت کی فضا کی تیرگی کا اندازہ کرسکیں ـــــ لیکن نہیں، اس سے سوا اس کے کہ آج اتنے دنوں کے بعد پھر کچھ تلخیاں عود کرآئیں، اور ناظرین کو بھی مزید غصہ اُس وقت کے مخالفین و معاندین پر آجائے، اور کچھ حاصل نہیں اس لیے ان اقتباسات کی یہاں "تلاش" نہ فرمایئے۔

یہ سب کچھ تھا ہی، اُدھر لڑکی کی شادی کی تاریخ سر پر چڑھی چلی آرہی تھی۔ اور پرگذر چکا ہے کہ گھر بھر میں سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ منگیتر شعیب قریشی مولانا کے خاص رفیقوں میں رہ چکے تھے۔ سِن سے ذرا اتر چلے تھے، مگر ماشاء اللہ ہر طرح کس بل سے درست، خوب ٹانٹھے، جیسا کہ ہر جوان صالح و پاکباز جوانی کے بعد تک رہتا ہے۔ تاریخ بالآخر طے پاگئی۔ اور دعوت نامہ اس نیازمند کے نام موصول ہوا۔ دعوت نامے بہت ہی محدود تعداد میں جاری ہوئے تھے۔ مخصوصین کے نام نہیں، بلکہ مخصوصین میں جو اخص تھے، صرف ان ہی کے نام۔ اور اسی فہرست میں یہ ڈائری نویس بھی داخل تھا۔ مولانا اب بمبئی سے دہلی واپس آچکے تھے، اور قرول باغ میں جو نیا مکان اقبال منزل کے نام سے لیا تھا، وہیں مقیم تھے۔ اس مکان کو کوچہ چیلان والے وسیع مکان سے کوئی مناسبت نہ تھی، تاہم یہ بھی غنیمت تھا۔ کمرے اور برآمدے چھوٹے تھے۔ اور سب ملا کر فی الجملہ گزر کے قابل تھا۔ شادی اسی مکان سے ہونے والی تھی، اور خط یہیں سے موصول ہوا۔

سہ شنبہ۔ اقبال منزل، قرول باغ، دہلی۔

برادرم ماجد میاں صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ایک نہایت ہی طویل مگر اپنی نابینائی کے باعث ناتمام عریضہ مدت ہوئی ارسال کرچکا ہوں

مگر اب تک رسید نہ ملی[۱]، کانپور آنے کا وعدہ کر کے نہ آئے[۲]۔ حالانکہ اس وعدہ میں بھی مجھ سے علیحدگی کا اعلان تھا[۳]۔ اب امروہہ بلایا تب بھی نہ آئے[۴]۔ سنا ہے بہن کی طبیعت نادرست ہے[۵]

اگر یہ ہے تو دست بدعا ہوں، گو

کیا کہوں میری دعا بھی تو نہیں ہے مقبول

ورنہ خود حالت اس قدر خراب کیوں ہوتی۔

گلنار کا نکاح چھ بجے شام کو بتاریخ ۲۹ ذی الحجہ ۲۹ مئی قرار پایا ہے۔ مع بہن اور بچوں کے تشریف لائیے۔ آپ کا سخت انتظار ہے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کا انتقال ہوگیا[۶]۔ عالی حضرت نواب صاحب رامپور سخت علیل ہیں[۷]۔ مگر اپنی مجبوریوں کے باعث معذور ہوں[۸]۔ یہ سنت مارچ سے ملتے ملتے آخر مئی تک آپہنچی۔ تشریف آوری کے وقت مطلع فرمائیے۔

ہمدرد کے نام پیچ آتا تھا جو بند ہوگیا۔ تعجب ہے کہ پیچ میرے نام جاری نہ ہوا[۱۰]۔

آپ کا بھائی، محمد علی"

مکتوب میں کئی باتیں تشریح طلب ہیں۔ اس لیے کتابت میں اس پر ہندسہ ڈال کر تشریحات نمبروار ذیل میں عرض کیجاتی ہیں:۔

[۱] وہی طویل مکتوب بمبئی سے ۱۸ اپریل کا لکھا ہوا ہے، جو اوپر درج ہو چکا۔

[۲] یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا کا مکتوب آئے، اور جواب نہ عرض کیا جائے۔ خدا معلوم اس وقت کیا صورت پیش آگئی تھی، جو مولانا تک جواب نہ پہنچ سکا۔

[۳] کانپور میں جدید جمعیۃ العلماء کا افتتاحی جلسہ ہوا تھا۔ اور کانپور ہی اس جدید جمعیۃ کا مستقر قرار پایا تھا۔ صدر غالباً مولانا ہی مقرر ہوئے تھے۔ اصلی کارکن اور بہت پیش پیش مولانا

عبدالماجد بدایونی تھے۔

۳؎ میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ آپ جہاں کہیں بھی موجود ہوں اور جس غرض سے بھی بلائیں، مجھے حاضری میں کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن یہ حاضری محض شخصی تعلق اخلاص و نیازمندی کی بنا پر ہوگی، نہ کہ اس مجلس کے ساتھ ہم آہنگی کی بنا پر۔ مولانا نے اس کو اپنے سے علیحدگی کے معنی میں لیا۔

۴؎ امروہہ میں دوسرا جلسہ اسی جدید جمعیۃ کا بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ اور اس میں مولانا نے گویا اپنا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ بڑا چرچا ان کی اس تقریر کا رہا تھا۔

۵؎ یعنی اُس وقت تو نہیں لیکن اس سے کچھ قبل گھر میں طبیعت زیادہ علیل تھی۔

۶؎ نواب سلطان جہاں بیگم نوراللہ مرقدہا مراد ہیں۔ بڑی مسلم صفت و درویش دل فرمانروا گزری ہیں۔

۷؎ ہز ہائینس نواب حامد علی خاں مراد ہیں۔ اسی کے چند روز بعد انتقال کر گئے۔ یہ وہی ذات شریف ہیں، جنھوں نے اپنی آخر عمر تک محمد علی کو رام پور میں قدم نہ رکھنے دیا۔ حالانکہ محمد علی اپنی طرف سے ان کی ذات خاص کے ساتھ برابر تعلق وفاداری و نیازمندی قائم رکھے رہے۔

۸؎ مطلب یہ کہ ان حالات کا اقتضا یہ تھا کہ عقد کی تاریخ کچھ بڑھا دی جائے۔ لیکن دوسری معذوریاں اس راہ میں بھی حائل تھیں۔

۹؎ حضرت مولانا تھانویؒ اور خود محمد علیؒ، یہ دونوں بزرگ ایسے گزرے ہیں کہ ان سے جہاں مجھے انتہائی عقیدت اور محبت تھی، وہیں میں ان سے ڈرتا بھی بہت رہتا تھا۔ دونوں کے احساس نہایت نازک و لطیف تھے۔ ادنیٰ سی ادنیٰ چیز پر بھی نظر رکھتے تھے۔ میں نے کبھی ان دونوں بزرگوں کے نام سچ یا صدق جاری نہیں کیا، اس ڈر سے کہ خدا معلوم کون سی تحریر ان کے مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ اور فوراً مجھ سے مواخذہ ہونے لگے

——— مولانا محمد علیؒ نے بعد کو ایک بار زبانی بھی تقاضا کیا کہ "سچ" میرے نام کیوں نہیں آتا۔ میں نے جواب عرض کیا کہ "مجھے اپنا تعلق نیازمندی آپ کے ساتھ بہت ہی عزیز ہے، اور اس کے تحفظ کے خیال سے میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا اخبار پڑھتے رہیں"۔

باب (۸۳)

سنہ ۱۹۳۰ء (۴)

(چھوٹی لڑکی کا عقد۔ عالمِ ناسوت میں آخری ملاقات)

دعوت نامہ ایسے وقت پہنچا، جب میں تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی کی خدمت میں طویل عرصہ کے لیے مقیم تھا۔ حضرت تھانویؒ کے ساتھ گہری عقیدت دو ڈھائی سال سے پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو ان کے مواعظ و تصانیف متعلقِ فنِ سلوک کو پڑھکر، اور پھر جب جولائی ۲۸ء میں پہلی بار ان کی زیارت ہوئی، اس وقت سے عقیدت کے درجات میں بھی ترقی ہو گئی تھی، اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا۔ چنانچہ اب جبکہ آخری مئی ۳۰ء تھا، یہاں ۵، ۶ ہفتوں کے قیام کے ارادہ سے آیا ہوا تھا، اور ابھی یہ مدت آدھی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ خط پاکر ایک عجب پس و پیش میں مبتلا ہو گیا۔ نہ جاؤں تو دل اسے کیسے گوارا کرے، جاؤں تو اس سفر کے لیے حضرت تھانویؒ سے اجازت حاصل کرنے کی ہمت کہاں سے لاؤں ——— مولانا سے اور حضرت سے بے لطفی ایک مدت سے چلی آ رہی تھی، اور بے لطفی کا سبب نجاص یعنی شدید سیاسی اختلافات، اب نسبتہً بہت ضعیف ہو چکا تھا، پھر بھی غلط فہمیوں کا پہاڑ درمیان میں حائل تھا ——— غلط فہمیوں اور باہمی رنجشوں سے جب رسول پاکؐ کے صحابیوں تک کا دامن نہ پاک رہ سکا، تو چودہویں صدی ہجری کے بزرگان امت کے لیے اس سے تبری اور

تنزیہ کا دعویٰ کس منہ سے کیا جا سکتا ہے؟ یہ شان تو اس دنیا والوں کی نہیں ہے، جنت میں اہلِ جنت کی ہوگی کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي قُلُوبِهِم مِّنْ غِلٍّ۔

ڈرتے ڈرتے حضرت کی خدمت میں ذکر کیا، اجازت صرف ملی ہی نہیں، بڑی خندہ جبینی اور انبساط قلب کے ساتھ ملی۔ یہی نہیں، اصرار و تاکید کے ساتھ ارشاد ہوا کہ "ضرور جایئے۔ اتنے قدیم تعلقات کے حقوق کی ادائی یہی ہے"۔ ——— کیا کہا جائے ان بد اندیشوں کو جنھوں نے حضرت تھانوی کو "خشک" مشہور کر رکھا ہے! ——— بیوی اور بچیاں اس وقت سہارنپور میں تھیں۔ بھائی صاحب وہیں ڈپٹی کلکٹر تھے، اور اس سلسلہ میں میرے بھی اہل و عیال وہاں اکثر عرصہ تک رہ جاتے تھے، تھانہ بھون سے وہاں کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ سہارنپور آ کر سب کو لے لوا، ۵، ۶ آدمیوں کا قافلہ دہلی کو روانہ ہوگیا۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کا اپنا عام معمول اس وقت بھی نہ تھا۔ عزیزوں کے ہاں شرکت کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ محمد علی کے ہاں کی کشش عزیزوں کے ہاں سے بڑھ کر تھی۔ شدید گرمی میں سفر اختیار کر کے شریک ہوا، اور وہ بھی تنہا اپنی ذات سے نہیں، بیوی اور بچوں کو لے کر شریک ہوا۔ ایک طرف یہ احساس بھی پورے طور پر تھا کہ مہمان جتنے بھی بڑھیں گے، خواہ مخواہ محمد علی پر بار ہی ہوں گے، اور اس لیے عقل کا مشورہ یہی تھا کہ شریک نہ ہوا جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ ڈر بھی تھا کہ اگر دلی بھی بلائے پر نہ گیا، محمد علی کو بڑی سخت ناخوشی ہوگی۔ اور یہی خیال آخر میں سب پر غالب آیا۔

محمد علی کے ساتھ اب سیاسی کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے، جو ابھی چند سال قبل تک ان کے مشن کے مخالف رہ چکے تھے۔ سرکار برطانیہ سے اپنے ہوا خواہانہ تعلقات کے لیے

بدنام تھے، اور "نیشنلسٹ" تحریک کے بالکل مخالف تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے ذاتی تعلقات محمد علی سے پہلے سے بھی بہت اچھے تھے لیکن اب وہ ان کی سیاسیات میں بھی بہت پیش پیش ہوتے جا رہے تھے۔ سچ برابر اپنے اسی مسلک قدیم کے ساتھ، گولب لہجہ کو ہلکا کر کے نکل رہا تھا۔ سچ کو ان بزرگوار کی اتنی مداخلت خلافت کمیٹی میں کھٹکی، ناگواری کے ساتھ حیرت ہوئی اور ایک بار ڈرتے ڈرتے یہ عرض کرنا پڑا کہ اور کسی سے تو کچھ کہنے سننے کی ہمت نہیں، البتہ ملت کے سب سے زیادہ محبوب اور مخلص ترین لیڈر محمد علی سے یہ ضرور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

صبح کوئی ۸، ۹ کا وقت ہوگا جب ہم لوگ اسٹیشن سے ایک شکرم[1] پر لدے پھندے قرولباغ میں اقبال منزل کے دروازہ پر آ کر رکے، سامنے ہی نظر اپنے ہمنام مولانا بدایونی اور نواب محمد اسمٰعیل خاں (میرٹھ والے) پر پڑی۔ یہ لوگ اس وقت مولانا کے مخلص ترین رفیق تھے، اور مولانا بدایونی تو دور تحریک خلافت میں بھی بہت کچھ ساتھ دے چکے تھے۔ باہر کے مہمانوں میں یاد پڑتا ہے کہ بس ہم ہی تین تھے۔ اور باقی مہمانوں میں مولانا کے اعزہ و اہل خاندان تھے۔ چند ہی منٹ میں محمد علی خود دکھائی دیے۔ پرجوش معانقہ کے بعد فوراً بولے "آپ کے مصرعہ کے جواب میں جی میں تو آیا کہ سچ کو ایک پوسٹ کارڈ پر ایک شعر ہی لکھ کر بھیجوں ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!"

---

[1] کرایہ کی گھوڑے گاڑی کو (جس میں دو گھوڑے جتے ہوتے تھے) شکرم کہتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء تک دہلی میں اس کا رواج تھا۔ اور یہ اسٹیشن پر مل جایا کرتی تھی۔

شعر سنتا تھا کہ جیسے میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا، ندامت کا احساس آج تک زندہ ہے۔
کیا گزر گئی ہوگی محمد علی کے قلب پر، جب مجھ جیسے ہمہ اخلاص و نیاز کے قلم سے وہ مصرعہ اپنی شان میں پڑھا ہوگا! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس وقت تک وہ گالیاں کھاتے کھاتے اور سب و شتم سنتے سنتے ہر طنز و ہر تعریض کے بالکل عادی ہو چکے تھے، لیکن میرے قلم سے اس مصرعہ کے ادا ہونے کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ حسین بن منصور حلاج کی حکایت سنی ہے کہ اوروں کے پھینکے ہوئے پتھر بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیے تھے لیکن ابو بکر شبلی کے ہاتھ کا پھول بھی نہ سہ سکے!

دہلی جمعیۃ العلماء کا مرکز و مستقر تھا، اور یہاں اس وقت محمد علی کی مخالفت شباب پر تھی۔ جامع مسجد کی جمعہ والی تقریروں میں کسی مقرر کا محمد علی کا مقابلہ میں ٹھہرنا مشکل تھا۔ حالانکہ جمعیۃ کے پاس خود بھی بڑے بڑے خوش بیان مقرر موجود تھے۔ آخر مولوی شاہ عطاء اللہ صاحب بخاری امرتسر سے دہلی لائے گئے۔ شاہ صاحب خطیبوں اور مقرروں کے سردار تھے خصوصاً عوام کے مجمعوں کے لیے تو خطیب اعظم۔ میرے دہلی پہنچتے ہی خبر یہ سننے میں آئی کہ مولانا کو پوری طرح زیر کرنے کے لیے یہ سب سے زیادہ زبردست توپ لے آئی گئی ہے۔ اور ان کے چیلنج کے الفاظ بھی سننے میں آئے، جنکا دہرانا بھی اب تکلیف دہ ہے۔ خود مولانا سے ذکر آیا تو غصہ کے لہجہ میں نہیں بلکہ نیم مزاحیہ انداز میں بولے کہ "جی ہاں میں نے بھی سنا ہے، مسلم کے مقابلہ میں بخاری کو لایا گیا ہے۔" "بخاری" اور "مسلم" کا تقابل ظاہر ہے۔ مولانا ان صنعتوں کے بادشاہ تھے۔ بہرحال اس لطیفہ گوئی سے اپنا دل مطمئن نہ ہو سکا، اور فکر یہ پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس فتنہ کو روکا جائے، ورنہ معاملہ بہت آگے بڑھ جائے گا، اور نتائج بڑے افسوسناک اور بہت دور رس نکلیں گے۔ معلوم ہوا بخاری شاہ صاحب قرولباغ ہی میں جامعہ ملیہ کے

ایک پنجابی استاد کے ہاں فروکش ہیں، ہمت کرکے وہاں پہنچا، مولانا سے اجازت لیے بغیر، اجازت لینے کی ہمت ہی کس میں تھی۔ شاہ صاحب اس ڈائری نویس پر شروع سے کرم فرمایا کرتے تھے آج بھی اسی گرمجوشی سے ملے۔ میں نے کھل کر عرض کیا کہ "آپ کی دہلی تشریف آوری کی غرض یہ سننے میں آئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ملت کی تو بڑی بدقسمتی ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ آپ مولانا کے رفیق کی حیثیت سے کام کرتے، جیسا کہ دو چار سال ادھر تحریک خلافت کے دور میں کر بھی چکے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ اگر اب نہیں ممکن، تو یہ تو کسی حال میں بھی نہ ہو کہ آپ اور وہ ایک میدان میں باہم حریف اور مناظر کی حیثیت سے قدم رکھیں، اور خلقت کچھ آپکے ساتھ ہو کچھ ان کے ساتھ ہو۔ اس میں تو سارے مسلمانوں کی رسوائی ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری خاطر ہی سے اس تکلیف وہ امکان کو ختم کیجیے۔" شاہ صاحب نے جواب میں بڑی تشفی کی باتیں کیں، اور مجھے اطمینان دلایا کہ وہ خبر ہی مجھے بہت مبالغہ آمیز ملی تھی

بہرحال اس کامیاب ملاقات کے بعد میں شاہ صاحب کا شکر گزار لوٹا، اور ان کا یہ احسان آج تک یاد ہے۔

قیام دو ڈھائی دن رہا۔ ہمیشہ شگفتہ اور باغ و بہار رہنے والے محمد علی کو پہلی بار میں نے متفکر اور اداس پایا۔ عمر بھر کی زندہ دلی اب رخصت ہو رہی تھی۔ ۵۲ سال کی عمر میں ۶۴۔۶۵ سال کے معلوم ہونے لگے تھے۔ ذاتی صدموں، جسمانی بیماریوں، مالی پریشانیوں، قومی اور ملی فکرمندیوں کے ہجوم نے وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا۔ نوشہ ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھہرے تھے۔ باراتیوں میں سب سے پیش پیش عبد الرحمٰن صدیقی سندھی ایم اے تھے۔ جو ایک طرف نوشہ کے حبیب لبیب تھے، اور دوسری طرف محمد علی کے مخلص قدیم

اُئے وہی عبد الرحمٰن جن کی قسمت میں چند ہی مہینہ بعد لندن میں محمد علیؒ کو غسل میت دینا اور کفن پہنانا لکھا تھا! ——— دلہن والوں میں سب سے پیش پیش مولانا عبد الماجد بدایونی تھے۔ بارات سہ پہر کو موٹروں پر آئی۔ جامعہ ملیہ کی متعدد عمارتیں اس وقت قرولباغ ہی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی عمارت مع وسیع لالہ زار صحن کے، اقبال منزل کے قریب ہی تھی، بارات وہیں اتری وہیں نکاح ہوا۔ خطبہ نکاح مولانا بدایونی نے پڑھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب، مولوی احمد سعید صاحب وغیرہم کی شرکت کا تو اب امکان ہی نہ تھا۔ رہے سہے تعلقات جو مولانا حسین احمد صاحب سے تھے، وہ بھی اس وقت تک ٹوٹ چکے تھے، سیاسی و ملی اختلافات سے قطع نظر، محمد علی نے جیب سے ان کا ایک کارڈ بھی نکال کر دکھایا، جس میں دعوت نامہ کے جواب میں تقریب کے "اسرافی" پہلو پر کچھ گرفتیں تھیں۔ محمد علی کا دل ہر طرف سے ٹوٹا ہوا تھا، اس وقت ان نقروں کی برداشت کی قوت کہاں سے لاتا! بعد مغرب اسی لان پر چائے اور ناشتہ رہا۔

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی زوروں پر چل رہی تھی۔ اور محمد علی مسلمانوں کو لیے ہوئے اس سے علیحدہ تھے۔ اسی ہی قیام میں اپنے دو تین شعر اس تحریک کی رفتار سے متعلق سنائے، جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ ذرا تلخی بھی تھی۔ افسوس ہے کہ اب حافظہ میں صرف ایک ہی مصرع ہے

یہ نمک سازی کرے اور وہ نمک پاشی کرے

باقی قافیے "خدمت کاشی کرے" "شب باشی کرے" تھے۔ اب یہ شعر بھلا کہاں مل سکتے ہیں؛

محمد علی کے بعض بے تکلف دوست اور مخلص اپنی بیویوں کو انکے سامنے لے آئے تھے میری دقیانوسیت مجھے اس کی اجازت نہ دے سکی۔ اسی قیام میں ایک روز رات کے وقت جب محمد علی زنانہ میں آئے تو بعض بعض بیویوں کو پردہ میں دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون کون ہیں، میرا

سلام کہدو۔ ان کی بیگم صاحبہ نے میری بیوی کو بتایا، بولے "بہن، مجھ اندھے سے کیا پردہ۔ اب میرے سامنے آنے میں کیا مضائقہ"۔ ــــــــــــ مسئلے کے شرعی وفقہی پہلو سے یہاں غرض نہیں، غور صرف اس پر کیجئے کہ حسرت کی کن گہرائیوں کے ساتھ یہ فقرہ دل سے نکلا ہوگا! بصارت ایک آنکھ کی تو، قتی جا چکی تھی، اور دوسری کی بھی اچھی خاصی دھندلی ہو چکی تھی! یہ بے نور ۸۰-۸۵ سال کے سن میں نہیں، کل ۵۰ سال کی عمر میں وہ آنکھیں ہو رہی تھیں جنکی ذہانت کی چمک دمک ابھی کل تک دوسروں کو حیران کیے ہوئے تھی!

تیسری شام تھی کہ مولانا سے بعد مغرب رخصت ہوا ــــــــــ عالم ناسوت میں آخری رخصتی، آخری مصافحہ، آخری معانقہ! کون جان سکتا تھا کہ اب یہ پیارا پیارا چہرہ حشر تک دیکھنا نصیب نہ ہوگا! یہ محبت و اخلاص سے منور، اور اسلامیت کے نور سے دمکتا ہوا مکھڑا اب کبھی زندگی بھر دیکھنے میں نہ آئے گا! ؎

اب ہم ہیں اور یہاں تماشہ ہے حشر تک
آنکھیں ہوئی ہیں بند رخِ یار دیکھ کر!

ہائے، اس چہرہ کی محبوبیت اور نورانیت کا ایک ہلکا سا عکس بھی کس طرح کاغذ کے صفحہ پر منتقل کیا جا سکے!

ہرگز نیامد در نظر نقشے ز رویت خوب تر
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری!

——— . ———

باب (۸۴)

۱۹۳۰ء (۵)

(ایک مرگ ناگہانی اور "ہمدرد" بیمار مظلوم)

امیر المومنین سیدنا حضرت علیؑ کی خلافت کے حالات جب تاریخ و سیر کی کتابوں میں نظر سے گذرتے ہیں، تو حیرت اور عبرت دونوں شدت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ کے قریب ترین عزیز، اسلام لانے میں شرف اولیت سے ممتاز، شجاعت میں بے مثال، علم و عمل، تفقہ و ورع میں اپنی نظیر آپ۔ تمام صحابی آپ کے فضل و کمال کے قائل۔ اس پر یہ حال کہ آپ خلیفہ ہوئے نہیں کہ بغاوتیں ہر طرف پھوٹ پڑیں۔ ادھر شورش، اُدھر ہنگامہ۔ آج اس مخلص نے بغاوت کر دی، کل وہ وفادار، غدار بن گیا۔ بڑے بڑے قدیم مخلص عذر و فساد پر آمادہ، سرکشی و گستاخی پر ہر ہر فرد معترض و نکتہ چین، جیسے کسی کی زبان میں لگام ہی نہیں ——— آنکھوں نے اس منظر کو ایک ہلکے پیمانہ پر محمد علی کی زندگی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ علیؓ صحابی ہی نہیں، خلیفہ راشد بھی تھے، محمد علی بیچارہ عام امتی۔ اس کھلے ہوئے فرق مراتب سے قطع نظر کر لیجئے، تو تاریخ اپنے کو دہراتی ہوئی موجود۔ محمد علی ابھی چند سال قبل ملت کے عملاً "امیر المومنین" ہی تھے۔ مسلمانان ہند کے محبوب ترین لیڈر۔ یا اب یہ حال ہو گیا کہ بچہ بچہ دشمن و نکتہ چین۔ خال خال اخبارات، مثلاً انقلاب (لاہور) والامان (دہلی) ساتھ رہ گئے؛ اور سچ تو یہی محدود بساط کے مطابق مخلص تھا ہی

باقی سارے کے سارے اخبارات، اور اخبار نویس بس آستین چڑھائے ہوئے رہ گئے ہیں بے اختیار آیا کہ ایک مستقل مقالہ "علیؓ اور محمد علیؒ" کے عنوان سے لکھئیے، اور دنیا کو دکھائیے کہ خادم کے حصہ میں بھی قسمت کچھ منہ دم ہی کی سی آ رہی ہے۔ اور اپنا یہ منصوبہ مولانا کو لکھ بھی بھیجا۔ یہ بھی عرض کر دیا کہ اپنا پریس اب مجھی کو کر دیجئے۔ سب سے لڑ لوں گا، بھگت لونگا۔ نت نئے جھوٹے سے جھوٹے اور گندے سے گندے الزامات اب ہم نیازمندوں کے لئے برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔ لکھنؤ کے حاجی ظفر الملک علوی (سچ کے منیجر اور بانی) کہاں ابھی کل ڈیڑھ برس ہوئے ہمدرد کی منیجری بلا معاوضہ کرنا اپنے لئے باعث فخر و سعادت سمجھ رہے تھے، اور کہاں اب مقابلہ و مخالفت میں قلم در کف!

مولانا اب شملہ میں تھے، زار و نزار، ضعیف و ناتوان، بستر مرض پر دراز۔ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے، دماغی کام کرنے کی قطعی ممانعت کر رکھی تھی۔ اتنی سکت ہی کہاں تھی، کہ مخالفین و معاندین کی طرف توجہ کر سکیں۔ دہلی سے، لڑکی کے عقد کے معاً بعد روانہ ہو جانے کو تھے، اور یہی مجھ سے فرمایا بھی تھا جب۔ کئی دن ہوئے، تو میں نے دریافت خیریت کو عریضہ لکھا۔ جواب شملہ سے آیا:-

"۱۰ر جون سنہ ۳۰ئہ، ڈونارڈ لاج۔ کارٹ روڈ شملہ

برادر محترم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہٗ۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میرے امراض کی فہرست یوں بھی طویل ہو چکی تھی، صرف مرگ ناگہانی کا انتظار اور تھا۔ اب قلب بھی ریاح کا بار بار حملہ ہو رہا ہے۔ اس نے مرگ ناگہانی کا بھی انتظام کر دیا۔ ارادہ کر چکا تھا کہ گلنار بیگم کے نکاح کے بعد ہی یہاں آ جاؤنگا۔ مگر ایک وہابی کی نالش نے ۵ر دن روکے رکھا[1]۔ ۵ر کو چل کر ۷ر

[1] یہ دلی دیوانی کی نالش تو چاند بیبیاں کے مکان اور روپیہ کے سلسلہ میں تھی۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، جولائی سنہ ۳۰ئہ کے واقعات کے ذیل میں۔

جون کو یہان پہونچا۔ راستہ مین درد اُٹھا۔ دوسرے دن یہان بھی شب کو وہی حالت رہی۔ تیسرے دن صبح کو بھی وہی حالت تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ اب طبیعت قدرے سدھری ہے۔

مین اب ظفر الملک صاحب کے مضامین اور عطاء اللہ شاہ کی تقاریر اور کفایت اللہ صاحب و احمد سعید صاحب کی سازشون کے جواب دینے کے قابل کہان ہون جو جلسون مین شریک ہون۔ ڈیڑھ ماہ آرام اور کچھ کام کی غرض سے یہان آیا ہون۔ آپ آئیے تو یہان آئیے، تاکہ دل کھول کر باتین ہون۔

آپ کا عقیدتمند بھائی محمد علی"۔

آہ کہ یہ آخری خط تھا جو مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موصول ہوا ——— کون اُسوقت جان سکتا تھا کہ اس کے بعد ایک خط بھی انکے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھنا نصیب نہ ہوگا![1]

شملہ مشہور و معروف دار الصحت تھا۔ بڑے بڑے پرانے مریضون کو ڈاکٹری مشورے وہین کی آب و ہوا مین کچھ دن بسر کرنے کے دیئے جاتے تھے۔ پھر دہلی وغیرہ کے شور و شغب سے دور وہان کا سکون خود ایک بہت بڑی نعمت تھا، علاج کے لئے سہولتین ایک سے بڑھکر ایک اور ڈاکٹر بڑے سے بڑا موجود، شملہ اُسوقت ہندوستان کا گرمائی دار السلطنت ہی تھا، جس طرح دہلی سرمائی دار السلطنت تھا۔ وائسرائے بہادر سال کا بیشتر حصہ وہین بسر فرماتے تھے۔ صرف جاڑون کے چار مہینون کے لئے دہلی مین نزول اجلال ہوتا تھا۔ محمد علی کے امراض کی شدتون پر آخر وائسرائے کو بھی رحم آگیا۔ اتفاق سے اُسوقت وائسرائے تھا بھی ایک بڑا شریف دل انگریز، لارڈ ارون نامے (جو بعد کو لارڈ ہیلیفکس کے

[1] شروع جولائی میں میں نے حضرت تھانوی کی خدمت میں جو خط لکھا تھا، اسکا اقتباس ذیل مسودہ حکیم الامت (باب ۱۲) سے نقل کرتا ہوں۔

"مولانا محمد علی صاحب اسوقت بہت زیادہ علیل ہیں۔ قدیم امراض ذیابیطس وغیرہ پر جدید امراض ریاحی، درد قلب وغیرہ کا اضافہ ہوگیا ہے، تنفس سا ہر وقت رہنے لگا ہے، شملہ میں ایک ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ خواب آور دوا کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ سونا ممکن ہے نہ لیٹنا۔ دعائے صحت کے لیے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے"۔

اتفاق سے مشہور ہوا) اُس نے خود اپنا ڈاکٹر ان کے علاج کے لئے بھیج دیا۔ غرض جو بھی ممکن انسانی تدبیریں وہ علاج کے سلسلہ میں تھیں برتی رہیں۔ افاقہ خاطر خواہ گو نہ ہوا، اور نہ کسی کو اب اس کی امید باقی رہ گئی تھی۔ البتہ کئی ہفتوں کی دوا و درمن اور ہم نیازمندوں کی مسلسل مخلصانہ دعاؤں کے بعد اتنا ہوا کہ مولانا شملہ سے سفر کرنے کے قابل ہو گئے۔

اُن کی یہ جبری فرصت کا زمانہ مجھے بہت غنیمت نظر آیا۔ جھٹ حضرت تھانویؒ کی بعض مختصر تحریریں پاس بنا روانہ خدمت کر دیں کہ لیٹے لیٹے انھیں حسب فرصت ملاحظہ فرما لیجیئے گا، عجب کیا ہو الٰہی میں اب وقت آگیا ہو کہ اسلام کے دو بہترین خادموں کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو جائیں، اور ایک نئی مصالحت، مفاہمت کی بنیاد پڑ جائے! شوق وطن اور قصد السبیل یہ دو نام تو اچھی طرح یاد ہیں، شاید ایک آدھ اور کتاب مثلاً تربیت السالک بھی ان کے علاوہ تھی۔ مدت دراز سے بڑی تمنا تھا کہ محمد علی کا دل حضرت تھانویؒ کی طرف سے صاف ہو جاتا، اور اتفاق سے اس وقت تک بہت فرصت بھی نہیں تھی۔ یہ عاجز تو دونوں کی نیازمندی اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھ رہا تھا، دل نے کہا کہ اس خداداد موقع سے پورا فائدہ اٹھائیے، اور اپنی والی جہاں تک بھی بن پڑے، دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لائیے۔

کتابیں پہونچیں، لیکن تقدیر نے ایک بار پھر تدبیر کو باطل کر دیا۔ مولانا ابھی انھیں پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ سفر کی ٹھن گئی۔ والی بھوپال ہز ہائنس نواب سر حمید اللہ خان، مولانا کے پرانے عقیدتمندوں میں تھے، اور اب رامپور کے نئے نواب کو (جو اسی جون میں اپنے والد مشفق کی جگہ مسند نشین ہوئے تھے) بھی مولانا سے عناد باقی نہ تھا۔ یہ دونوں مولانا کو بلا رہے تھے۔ اس زمانہ میں برطانیہ کی لیبر وزارت نے ہندوستان سے صلح کرنے اور مطالبات ہند پر غور کرنے کے لئے

دسمبر میں ایک گول میز کانفرنس کے لندن میں منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس میں ہندوستان کی ساری ہی پارٹیوں کے نمایندے بلائے جاتے۔ مسلمانوں کے نمایندوں میں سب سے پہلا نام مولانا ہی کا وائسرائے (لارڈ ارون) کے ذہن میں آنا چاہئے تھا اور شاید آیا بھی۔ لیکن مخالفین اور حاسدین یہاں بھی نہ چوکے۔ اور نج کی سرگوشیوں سے لیکر اخبارات کے صفحات تک مولانا کی ذات پر خوب خوب حملے کر ڈالے۔ ایک مشہور دہلوی معاند نے تو کمال ہی کیا۔ کسی سے انگریزی میں لکھوا کر، اور اپنے صرف سے کئی سو کی تعداد میں چھپوا کر، ایک پورا پمفلٹ مولانا کی مخالفت میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں اور وزیروں کے پاس ڈاک سے روانہ کرکے، خود اپنی رسوائی کا مستقل سامان کر لیا! ——— چلا ہو! (مصرعہ)

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

شاید ایسے ہی موقع کے لئے ہے ——— یہ سب کوششیں بحمد اللہ ناکام رہیں۔ اور مولانا کا انتخاب بالآخر گول میز کانفرنس کی ممبری کے لئے ہوکر رہا۔ مولانا اب بھوپال میں نواب صاحب کے مہمان تھے، اور اپنی ہر ضعف و خستگی، ناتوانی و شدت مرض کے باوجود ولایت جانے کی تیاری کر رہے تھے، جانتے تھے کہ مسلمانان ہند کی وکالت ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا، اور نہ اس امت کا نقطۂ نظر اتنی خوبی سے کوئی اور سمجھا سکتا ہے۔ اخباری اطلاع اس درمیان میں یہ چھپی کہ اب مولانا کو ناقہ ہو رہا ہے، اور مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس دسمبر کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں ۱۸ اگست کو قرار پایا۔ کچھ امید پڑی کہ شاید مولانا اس جلسہ میں آجائیں۔ بڑی امیدوں کے ساتھ شروع اگست میں عریضہ بھوپال کے پتہ پر لکھا۔ پائنیر ۲۸ جولائی میں کسی کا مضمون بھی مولانا کی شخصیت پر مع انکی تصویر کے نکلا تھا۔ عنوان تھا " قابل مگر ناکام لیڈر Brilliant Man without an Achievement تامزفانٹ

فضا مین یہ مقالہ غنیمت معلوم ہوا ، کہ اس مین فی الجملہ تو مولانا کے کمالات کی داد تھی ۔ مخالفت کی شدت دیکھ کر دبی زبان کچھ یہ عرض معروض بھی تھی ، کہ ذرا اپنے رویہ مین بھی نرمی و مصالحت آمیزی پیدا کرنا چاہئے ۔ اور ابھی کچھ معروضات تھے ۔ جواب مفصل ، اور خوب مفصل ، اگست کے چوتھے ہفتہ مین موصول ہوا ، اور آہ کہ یہ انکا آخری خط تھا ، جو سرزمین ہند سے مجھے موصول ہوا ، اور یہ خط بھی لکھا ہوا نہین ، انکا صرف لکھوایا ہوا تھا ، محض دستخط آخر مین ، اپنے قلم سے کئے تھے ______ کون جانتا تھا کہ تازہ دستخط کے لئے بھی اب آنکھین عمر بھر ترستی ہی رہینگی !

خط کا لب و لہجہ یقیناً بہت تلخ ہے ، خصوصاً بعض دوسرے مخدومان ملت سے متعلق لیکن خستا کا پورا پس منظر اگر سامنے ہو ، تو خط نویس اپنی ان تلخ نوائیون کے لئے شاید بالکل ہی معذور قرار پا جائے ، خصوصاً جبکہ وہ غریب ایک طرف ذیابیطس ، ضعف اعصاب ، شدید ضعف بصارت ضعفِ قلب ، ضغطہ دم (خون کا دباؤ) اکٹھے اتنے امراض کا شکار ہو ، اور دوسری طرف طنز و تعریض ، طعن و تشنیع کے تیرون کی مسلسل بارش سے اس کا دل چھلنی ہو چکا ہو ۔ بہرحال اب وہ والا نامہ ملاحظہ ہو ۔

باب (۸۵)

۱۹۳۰ء (۲)

(مظلوم کی آہ۔ بیمار کی کراہ)

۲۰ر ستمبر ۱۹۳۰ء۔ گسٹ ہاؤس۔ بھوپال۔

برادرم محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

آپ کا محبت نامہ مورخہ ۲۰ر اگست مجھے کوئی ۷-۸ اگست تک غالباً مل گیا تھا۔ لیکن چونکہ محض عیادت نامہ نہ تھا بلکہ سیاست نامہ[1] بھی تھا۔ اس لئے جواب کی ہمت اس وقت نہ کر سکا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن[2] کے حکم سے اس وقت تک انتظار کیا جبکہ خود گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھکر خط لکھنے کے قابل ہو جانے کی امید تھی۔ جوں ہی حالت اس قابل ہوئی رسید ہی لکھ نے تقریباً جواب دیدیا اور جس بیمار کو نئے نواب صاحب رامپور اور شوکت صاحب کی طلبی پر رامپور جانے سے ڈاکٹر صاحب نے روک دیا تھا اور نواب صاحب بھوپال نے معذرت کا تار بھیج کر اس کی وجہ بیان کردی تھی، اس کو دوسرے ہی دن بمبئی بھاگنا پڑا کہ ڈاکٹر چشم کو پھر آنکھ دکھائے اور بالکل اندھا بننے سے بچ سکے۔ اس دن سے آج تک آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ کچھ بھی لکھ پڑھ سکوں، دوسروں کا محتاج

---

[1] ایک بار پھر یاد کر لیجئے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا شدت سے علیل ہیں اور ساتھ ہی خود اسلامی پریس میں ہر طرح کے طنز و تعریض اور گندے اتہامات کے ہدف بنے ہوئے۔ مزاج میں جھنجھلاہٹ ایسے موقع پر بالکل طبعی ہے

[2] ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں صاحب بھوپال کے خاص ڈاکٹر اور معالج۔ مولانا کے بھی بے تکلف دوستوں میں تھے۔

آپنے میری صحت کے متعلق ۱۹ اگست کو لکھا تھا کہ "میری دعاؤں سے خدا خدا کرکے آپ کے فاقہ کی خبر سنائی دی"۔ یقیناً میری بیماری میں فاقہ ہو تھا، مگر نہ اس قدر کہ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا۔ حقیقۃً فاقہ کا زائد حصہ خود شملہ کی بلندی سے نزول تھا۔ سولن پہونچتے ہی جب کہ ہوا اتنی تیز نہ ہی اس سے زائد فاقہ ہو گیا۔ اور پہلی بار اتنی بھوک لگی کہ میں نے دوسروں کو چائے پیتے دیکھ کر خود بھی ایک پیالی چائے مانگی۔ باقی فاقہ پلنگ پر پڑے رہنے سے ہوا۔ شاید کسی قدر دواؤں سے بھی ہوا ہوگا۔ رہا دعاؤں کا معاملہ، میں کب آپکی دعا کی تاثیر کا قائل نہ تھا۔ البتہ اگر اب بھی صاحبِ فراش ہوں تو ممکن ہے کہ تھانہ بھون[1] تو نہیں مگر شاید دیوبند[2] کی مقدس ہستیوں کی آپکی دعاؤں میں شرکت کا اثر ہو۔

اگر آپ کو فاقہ کے متعلق غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی تو آپ ہرگز مجھ سے نہ پوچھتے کہ میں ۱۵ اگست کو لکھنؤ آ رہا ہوں یا نہیں[3]۔ "شد رحال"[4] اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کیلئے جائز رہ گیا ہے جس کے متعلق ابھی عرض کروں گا۔ میں آج ہی مع اپنی اہلیہ کے دہلی جانا چاہتا تھا تاکہ رخت سفر باندھ سکوں۔ لیکن گذشتہ ہفتوں میں خون کا دباؤ کسی قدر بڑھا رہا اور ضیق نفس بھی کسی قدر رہا۔ اس کے باعث ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب نے پھر امتناعی حکم جاری کر دیا اور اب صرف میری اہلیہ دو ایک دن میں چلی جائینگی۔ اور ارادہ تھا کہ اگر جاتے وقت آپکو تار دے کر کم از کم وہیں بلا لوں اور نہ معلوم واپسی ہو یا نہ ہو[5] جاتے وقت آپ سے مل لوں۔ لیکن اب آپ سے اتنا قرب بھی اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ بھوپال

[1] اشارہ ہے حضرت تھانوی کی جانب، جن سے مولانا کے تعلقات میں اب پہلے کی سی کشیدگی نہیں باقی رہی تھی۔ [2] اشارہ ہے مولانا حسین احمد صاحب کی طرف جن سے مولانا کے تعلقات اب بہت ہی کشیدہ ہو چکے تھے۔ [3] یہ جلسہ مرکزی خلافت کمیٹی کا تھا، اور اس میں مولانا کی شرکت کے لیے ہر شخص چشم براہ بنا ہوا تھا۔ [4] تلمیح ہے ایک حدیث کی جانب جس کا یہ مضمون ہے کہ شد رحال (کجاوہ کا کسنا یعنی سواری پر سفر اختیار کرنا) تین ہی مسجدوں کے لیے ہونا چاہیے۔

[5] اپنی موت کے قرب کا احساس اب مولانا کو برابر رہنے لگا تھا۔

تشریف لائین اور خلافت کمیٹی کے جلسہ مین جو ۹ اور ۱۰ اکتوبر کو ہونے والا ہے بمبئی جاکر شریک ہون - مین انشاءاللہ ۱۰۰۰ تک بمبئی چلا جاؤن گا بشرطیکہ گول میز کانفرنس کے التوا کا حکم نہ آیا - براہ کرم ضرور آکر مل لیجیئے ۔ گو اب مین بزدل اور غدار ہون اور آپکے ۰۰۰ [1] کی طرح ایسا ہندو پرست نہین رہا جیسا کہ وہ دو تین سال پیشتر مجھکو کہتے تھے - تاہم چونکہ آپ کو نہ صرف دیوبند بلکہ تھانہ بھون سے بھی عقیدت ہے اس لئے بزدلون اور غدارون سے ملنا بھی آپ کے مذہب مین ناجائز نہ ہوگا ۔

پانیر مین[2] جو مضمون نکلا تھا وہ خود لغو تھا اور اسکا لکھنے والا بھی لغو - یہ ایک متعصب ہندو کا لکھا ہوا ہے - جو ان بزرگون کی طرح خوب جانتا ہے کہ جناح اور سر محمد شفیع بھی خریدے جاسکتے ہین مگر محمد علی انمول ہے۔ آپ جس طرح مذہب کے بارے مین ابتک صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے اور آپکی زندگی مین اس کے پہلے حصہ کی فلسفیت کے خلاف ابھی تک رد عمل جاری ہے اور آپ سائنس کو حرام سمجھتے ہین[3] اسی طرح آپ ابتک سیاست مین بھی صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے - تہذیب مغرب کی بیہودگیون اور مغربی استعمار کے خلاف ابھی رد عمل جاری ہے اور وہ ہنود کی تنگدلی اور تعصب کو ایک بڑی حد تک آپکی آنکھون سے چھپائے ہوئے ہے - یہی وجہ ہے کہ آپ نہ پانیر کے مضمون نگار کی شیطنت[4] کو پہچان سکے اور نہ ستیہ گرہیون کی روزانہ دروغ بافی کو۔

میرے اسمبلی کے انتخاب کے متعلق آپنے جو کچھ تحریر فرمایا ہے[5]، اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ نہ

---

[1] ایک مشہور عالم کا نام ہے [2] ۱۲ جولائی کے پانیر میں مولانا پر ایک مفصل مضمون کسی کا نکلا تھا جس میں مولانا کو بہترین مگر ناکام ترین لیڈر دکھایا گیا تھا - ملاحظہ ہو باب ہاتھل - مکتوب الیہ نے اپنے خط میں اس مضمون کی فی الجملہ داد دی تھی [3] یہ صرف مولانا کا خیال ہی خیال تھا جو یقیناً میری ہی گفتگو یا تحریر کی بے احتیاطیوں سے پیدا ہوگیا ہوگا - مگر بہرحال یہ تمامتر واقعہ نہیں۔ [4] یہ لفظ مکتوب الیہ نے بدلکر دکھدیا ہے مولانا کا اصل لفظ اس سے زائد کریہہ تھا [5] لیڈر ، ٹریبیون وغیرہ ہندو دن کے انگریزی اور اردو کے روزناموں کے حوالہ سے بعض اسلامی روزناموں نے بھی یہ خبر خوب پھیلا نا شروع کردی تھی کہ مولانا اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں اور انکے بعد اسکی صدارت (اسمبلی کی) کے بھی۔

نہ صرف زمیندار وغیرہ پر اعتراض کر رہے ہیں بلکہ مجھ سے بھی استفسار کر رہے ہیں کہ کیا واقعی تم اسمبلی میں شریک ہو گئے۔ حقیقۃً میرے قلب کی حالت نہ اس وقت ایسی تھی کہ میں سکون کے ساتھ ان چیزوں کے متعلق لکھ سکتا نہ اب پوری طرح اس قابل ہوا ہوں کہ سکون کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھ سکوں۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت و افسوس دونوں ہوں کہ میں نے اپنے دو دوستوں کو اس کی اجازت رپن اسپتال میں دے دی تھی جہاں کہ بستر مرض نہ اسی دیر میں بستر مرگ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو مجھے اسمبلی کا ممبر منتخب کرا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں اب اس رائے پر پہونچا تھا کہ اگر نیا دستور اساسی ایسا بن گیا کہ اس میں اسمبلی کو حقیقی آزادی مل گئی تو میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں گا گو اس وقت تک میں مولانا حسین احمد صاحب کی طرح اس میں شرکت کو جائز نہیں سمجھتا۔ ایک زمانہ میں مولانا حسین احمد صاحب میرے ہمخیال تھے اور جمعیۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے ہی کہنے سے جیل سے چھوٹتے ہی انھوں نے ایک تحریک سوراجیوں کے نقطۂ نظر کے خلاف پیش کرنا چاہی تھی جس کو . . . کفایت اللہ صاحب نے[1] (آپ نیز اور . . . . . کی دروغ بافیوں پر تو معترض ہیں . . . . . کفایت اللہ صاحب اور الجمعیۃ کی افترا پردازیوں کے متعلق نہ آپ نے کبھی کچھ لکھا نہ مولانا حسین احمد نے) ٹال دینا چاہا تھا۔ دو سال بعد . . . . . صاحب[2] اُ ہنگے . . . . . احمد سعید[3] نے مولانا حسین احمد ہی سے ایک ریزولیوشن تیار کرا کے جمعیۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں پاس کرا ہی کے چھوڑا۔ جس میں سر کے گرد ہاتھ گھما کر ناک پکڑی گئی تھی اور اسمبلی اور کونسلوں میں شرکت کے جواز کا فتویٰ دارالافتا سے شائع کیا گیا تھا۔ خیر یہ پرانی بحث ہے۔ میں مسلمان ممبران اسمبلی کی بے اصولیوں اور نفس پروریوں سے اتنا تنگ آگیا تھا کہ نواب اسمٰعیل خان اور شفیع داؤدی صاحب کے اصرار سے اور چند اور خلافت والوں کے کہنے سے میں نے اسے قبول کر لیا تھا کہ اگر دستور اساسی

---

[1] مفتی صاحب کا ذکر ہے۔ [2] موصوف کو مولانا نے تنبیہ جاہلیت کے ایک شخص سے دی تھی۔ جو اپنی پرخوری و تن و توش کے لیے مشہور تھا۔

کی بنیاد حقیقی آزادی قرار پائی تو مین شریک ہو جاؤن گا اور ان کے دوش بدوش تحفظ اسلامی اور استقلال ملی کے لئے جد و جہد کرون گا۔ مین خود والیسرائے کو رائے دے چکا تھا کہ انتخاب گول میز کانفرنس کے بعد کیا جائے لیکن شملہ مین جبکہ میری حالت بہت خراب تھی مجھے اطلاع ملی کہ انتخاب ابھی ہوگا اس پر مین نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے دوست ضرورت سمجھین تو میرا انتخاب کرا دین۔ لیکن چونکہ پہلا اجلاس گول میز کانفرنس کے بعد ہوگا میری شرکت اس پر منحصر ہوگی کہ دستور اساسی آزادی پر مبنی ہو۔ یہ تھی کل حقیقت لیکن آپ کے ستیہ گرہیون نے اس پر اسپیکری وغیرہ کا قصر تیار کر دیا۔

چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مفتری افترا پردازی سے باز نہین آتے اور افسانہ گوئی کے بغیر رہ نہین سکتے۔

انقلاب[1] مین جو مکتوب شایع ہوا تھا وہ میری درخواست کے ایک ماہ سے زائد کے بعد شایع ہوا۔ مین تو چند روز بند کر کے مہر سکوت اپنے ہونٹون پر لگا چکا تھا۔ لیکن اس امت مرحومہ کی مردم شناسی کو کیا کہا جائے۔ الجمعیۃ اور ریاست وغیرہ کی افترا پردازیون کے بعد مجبور ہو کر یہ خط سالک صاحب کو لکھنا پڑا اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اس مین فراہم کردہ مواد کو اپنے دو ایک مضمون مین شایع کر دین جو انھون نے نہین کیا۔

اب شرکت [گول میز] کانفرنس کے متعلق کچھ مواد آپ کو بھیج رہا ہون کہ آپ اسے اپنے کسی مضمون مین شایع کر دین۔ مین نہین چاہتا کہ میرا اصلی خط راقم کے نام کا شایع کیا جائے تاکہ

[1] شریک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب (لاہور) سالک نے لکھا تھا کہ لوگ طرح طرح کے اتہامات لگا رہے ہیں آپ خود ان معاندین کے منہ نہیں لگتے نہ سہی، لیکن اپنے متعلق صحیح معلومات تو اس نیازمند کے پاس کبھی کبھی بھیج دیا کیجئے۔ اشاعت ان شاء اللہ معقول طریق پر ہوجایا کرے گی

اشد ضرورت نہ ہو مگر اس کا سارا مواد آپ حرف بحرف شایع کر سکتے ہین اور یہ بھی لکھ سکتے ہین کہ
ان خیالات کا اظہار مین نے ان علقون مین کر دیا ہے جہان سے دعوت آئی تھی ۔ پاؤن مین پہلے ہی
حس نہ تھا اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردی مین ہر وقت گنگرین اور پاؤن کی قطع برید اور اسی طرح
کی موت کا اندیشہ رہیگا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور منجھلے بھائی صاحب گذر چکے ہین[۱]

اب تک صاحب فراش ہوں ۔ کانفرنس کے روز انہ اجلاس مین نہ صرف ہندوؤن اور
انگریزون بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیون سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنا پڑیگی ۔ ان تین
محاذون پر جنگ کرنے مین ہر وقت دل کی حرکت یکا یک بند ہو جانے اور موت کا اندیشہ ہے ۔[۲]
سب سے زیادہ کہ اب لکھ پڑھ نہین سکتا ۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دلا دیا ہے کہ اگر
مین سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤن جہان دنیا کی کوئی خبر نہ ملے ۔ لیکن اس پر بھی
مین سمجھتا ہون کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس مین شریک ہون اور وہان سلطان جابر اور
رعایائے جائر دونون کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کر دون[۳] ۔ تا آنکہ اس کام مین مر جاؤن
اس لئے قرض و دام لے کر ، بھیک مانگ کر ، اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے
اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلون گا ، اس لئے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل مین میری رفیق سفر رہی
جب منزل مقصود کے لیے احرام باندھون تو چاہتا ہون کہ وہ موجود ہو ورنہ لندن کا بدترین موسم
ہے ۔ اور ہر متمول انگریز اور میم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکون کو بھاگے جاتے ہین ۔
بہر حال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف ہے ۔ میرے خط بنام وائسرائے کو

[۱] یہ بہادر مجاہد جنگے خلاف ہر قسم کے انتہا پسند کے نعرے خود اسی کے قوم کے اکابر لگا رہے تھے ۔ [۲] اشارہ ہے اس حدیث
نبوی کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے
[۳] سچے بندہ کی یہ دردناک پیشین گوئی کیسی سچی اتری ۔

بطور خط کے نہ چھاپیئے ۔ اپنے مضمون مین آپ اس کے خیالات کو میرے ہی الفاظ مین شایع کر سکتے
ہین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخبار ہی اس کے لئے بہتر ہوگا ۔

جب آپ یہان آئین گے تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤن گا جو مسلمانون کی نمایندگی کے متعلق
مین نے بستر مرض پر سے بھی وائسرائے کو لکھے تھے ۔ اب رخصت ہوتا ہون ۔ میری گستاخیون
کو معاف کیجئے اور میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے اور جلد آکر مجھ سے مل جایئے ۔ میری اہلیہ کا بھی
سلام قبول کیجئے اور اپنے گھر مین ہمارا سلام شوق کہئے اور بچیون کو خوب سا پیار کیجئے ۔

آپ کا گستاخ بھائی محمد علی"

اس کے بعد ان ہی کاتب صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ مورخہ ۵ اکتوبر بھوپال سے حسب ذیل ملا ۔

"یہ عریضہ حسب ارشاد مولانا محمد علی صاحب قبلہ لکھ رہا ہون ۔ صاحب موصوف یکم اکتوبر
کا دن گزار کر شب کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوگئے ۔ یہ فرمایا کہ جناب کو اور جناب قطب الدین عبدالولی
صاحب کو اس امر کی اطلاع کر دون کہ ہر دو حضرات موصوف کے لئے دعا فرمائین اس لئے کہ مولانا
ممدوح کی علالت کا سلسلہ روانگی کے وقت تک تھا گو کسی قدر سابقہ حالت سے مرض مین کمی
تھی لیکن جدید شکایت ملیریا کی ہوگئی تھی جس سے ایک روز متلی کے باعث تکلیف رہی مگر
روانگی کے دن اس مین افاقہ ہوگیا تھا ۔"

باب (۸۶)

۱۹۳۰ء (۷)

(مرنے کے لیے۔ اللہ کے شیر کی آخری گرج)

شروع اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا جہاز پر بیٹھ برطانیہ روانہ ہوگئے۔ اپنی پہونچ نہ ہو سکی نہ بمبئی۔ قسمت میں یہی تھا کہ رخصتی ملاقات نہ ہونے پائے، حالانکہ مولانا نے بھوپال بار بار بلایا، اور بمبئی میں بھی کئی دن انکا قیام رہا تھا ———— آہ، یہ گمان بھی کسے تھا کہ یہ ولایت کا سافر حقیقۃً ٹکٹ جنت کا لے رہا ہے! ———— علالت روز بروز بڑھتی اور حالت ہر روز گرتی جارہی تھی۔ بیدرد معاندین، شاید اپنے ظرف پر قیاس کرکے، سمجھ یہ رہے تھے کہ مولانا یہ سفر کسی لطف و تفریح کی خاطر کر رہے ہیں۔ وہاں اس کا امکان ہی اب کیا باقی رہ گیا تھا۔ اُدھر دھن تھی، تو بس یہ کہ گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا، جس طرح بھی بن پڑے، اس نادر موقع پر پہونچوں اور دین اور وطن کی طرف سے آخری فریضۂ تبلیغ ادا کر جاؤں۔ میرے نام کا خط بھوپال سے لکھا ہوا ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، ایک بار پھر انکے ان فقروں سے اپنی یادداشت تازہ کر لیجئے:۔

"شدہ حال اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز ہو گیا ہے . . . پاؤں میں حس پہلے ہی نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے۔ اور سردیوں میں گنگرین یا ان کی قطع و برید اور اسی طرح کی موت کا اندیشہ رہیگا، جبسے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم

دمغفور منجھلے بھائی کو دو چار ہونا پڑا تھا . . . . . . ہتک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے یک لخت نقطہ پر جنگ کرنی پڑیگی۔ ان تین محاذوں پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے سب سے زیادہ یہ کہ اب گھر پڑھ نہیں سکتا . . . . . . میں سمجھتا ہوں کہ میرا فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جائر اور رعایائے جائر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں "

اللہ اللہ! کیا ہمت تھی! اور کتنا مضبوط ایمان تھا! موت کو اپنی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے ہیں، پھر بھی بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں! شملہ میں جب سرکاری اسپتال میں اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ کو لائے جا رہے تھے، تو کسی زنگریز، وہیں خاتون نے ترس کھا کر انگریز ڈاکٹر سے پوچھا کہ "ان بڑے میاں کو کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے جواب دیا" یہ نہ پوچھو۔ یہ پوچھو کہ کون سی تکلیف انھیں نہیں ہے"! ———— سفر شروع کرتے کرتے تو حالت اور بھی زار ہو چکی تھی۔ بیوی کو بھی، باوجود مصارف سفر مہیا نہ ہونے کے جو ساتھ لئے جا رہے تھے، تو وہ بھی اسی خیال سے کہ جو زندگی کی ہر منزل میں رفیق رہی، وہ سفر آخرت شروع کرتے وقت بھی پاس ہی رہے۔ خط میں یہ الفاظ بھی تو تھے،

"قرض دام لیکر، بھیک مانگ کر، جس طرح بھی ہو سکے گا۔ تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلونگا، اس لئے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی، جب منزل مقصود کے لیے احرام سفر باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو"

میں روانگی کے وقت ایک بڑے مخلص رفیق، میرے ہمنام مولانا عبدالماجد بدایونی نے جب پوچھا کہ آخر علالتوں کی پوٹ اور ایک زندہ لاش بنے ہوئے آپ ولایت جا ہی کیوں رہے ہیں

ترجواب مین صرف یہ الفاظ کہے ، " مرنے کے لئے "

جہاز پر جب سوار ہوئے ہیں ، تو خود سے سوار ہونے کے قابل کہاں تھے ۔ اسٹریچر (بہار ڈولی) پر لاکر سوار کرائے گئے ۔ فرانس پہونچتے پہونچتے حالت اور ردی ہوگئی ، لندن ابھی دور تھا ۔ اور علالت اتنی گرگئی تھی کہ اتنے سفر کا تحمل بھی ممکن نہ تھا ، راستہ ہی سے پیرس مین اُتار لئے گئے ۔ اور علاج مین بڑے بڑے ماہرین فن کا شروع کرا دیا گیا ۔ عین جس وقت ہندوستان مین یہ سخت تشویش انگیز اطلاعین آرہی تھین ، یعنی یکم نومبر ، یا اس کے لگ بھگ ، اسلامی ہند کا ایک خاصہ بڑا طبقہ ، اسلامی ہند کی کشتی کے اس سب سے بڑے ناخدا پر قہقہہ لگا رہا تھا ! آپ کہتے اور سمجھتے ہونگے کہ یہ وقت تو وہ تھا کہ دشمن بھی ویسے موقع پر قابل رحم وہمدردی ہو جاتا ہے ، لیکن محمد علی غریب کی قسمت مین یہ بھی نہ تھا ۔ ملاحظہ ہوں ، ستفاوت کے پورے کمالات کے ساتھ عین اسوقت یہ ایڈیٹوریل لاہور کے مشہور اسلامی روزنامہ زمیندار مین " مولانا محمد علی کی علالت " کے زیر عنوان نکلا تھا ۔

" اسوقت جبکہ گول میز کانفرنس کے دوسرے مندوبین ہائیڈ پارک کی سیر سے دل بہلا رہے ہین ، اور ہوائی جہازون کی نمایشین دیکھ رہے ہین ، مولانا محمد علی پیرس مین صاحب فراش ہین ۔ اگر یہ علالت مولانا کی ثمہ کی علالت سے مماثل ہے ، جس کے بعد آپ فوراً بھوپال پہونچ کر دائی بھوپال کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہوگئے تھے تو چندان تشویش کی بات نہین " ۔

گویا محمد علی کا جرم یہ تھا کہ وہ شملہ کی شدید علالتوں کے بعد زندہ کیون باقی رہ گئے ! ______

آپ کہینگے کہ شرافت تحریر کی حد کردی ، لیکن ذرا ٹھیرئیے ، ابھی کچھ درجے اور باقی ہین : ۔

" اگر اس علالت کی واقعی کوئی حقیقت ہے ، تو یہ امر سخت مصیبت ناک ہوگا "

آپ جلدی سے یہ نہ کہہ اٹھئیے کہ خیر ، بیچارہ نے کچھ تو تلافی کردی ، لیکن اس " مصیبت ناکی "

کی ذرا تشریح بھی سن لیجیے۔ ہمدردی اس لیے نہیں کہ محمد علی کی زندگی کی قیمت کسی ادنیٰ مسلمان کی زندگی کے برابر بھی ہے، یا یہ کہ لکھنے والے کو محمد علی کی جان کا درد و قلق کسی درجہ میں بھی ہے۔ بلکہ طنز و تعریض کے اس بھاری پتھر کے نیچے حقیقت یہ دبی ہوئی ہے کہ

"جس اعزاز کے حصول کے لیے مولانا ممدوح نے اپنے اصول کو چھوڑا، اس سے کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع آپ کو نہ مل سکے گا...... دعا ہے کہ خدا مولانا کو صحت عطا فرمائے، تاکہ

آقایانِ فرنگ کے آستانہ پر ناصیہ فرسائی کرنے کی جو آرزو انھیں اس پیرانہ سالی میں کشاں کشاں یورپ لے گئی ہے، پوری ہو جائے۔"[1]

اور یہ تحریر جو محض نمونہ کے طور پر درج ہوئی، نہ اس اخبار ہی کی آخری اور اکیلی تحریر تھی اور نہ خود یہ اخبار اپنے اس رنگِ تحریر میں منفرد تھا۔۔۔۔۔۔ محمد علی کا شمار یوں بھی صالحین امت میں تھا، پھر بھی خدا جانے زبان کے کتنے گناہ ان سے سرزد ہوتے رہے ہوں گے۔ حکمتِ خداوندی نے کیا اچھا سامان ان گناہوں کے دُھل جانے کا یوں بدزبانوں کے زبان و قلم سے ادا کر دیا!

[1] کس قدر مختلف تھا مرحوم کا نومبر ۱۹۳۳ء کا زمیندار جنوری ۱۹۵۲ء کے زمیندار سے جو اب لکھتا ہے: "وہ باتیں کرتا تو سننے والے ایسا محسوس کرتے جیسے شیرِ نر کچھار میں گونج رہا ہے، تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو سامعین یہ سمجھتے کہ آسمان کی آغوش میں بادل گرج رہا ہو، منبر پر ہو تو امام غزالی کی زندہ تصویر، میدان میں ہو تو محمد بن قاسم کا قابلِ فخر نمونہ..... اسلامیانِ ہند کا قائد اولوالعزم اور مجاہد سپہ سالار چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اسکے مضبوط قدموں سے کرۂ ارض کا سینہ بیٹھا جاتا، دورانِ تقریر میں ایسا معلوم ہوتا کہ جوش کیساتھ لرزتا ہوا محسوس ہوتا کہ اپنے آہنی پنجہ سے گردشِ افلاک کو مروڑ ڈالنے کو آگے بڑھ رہا ہے...... مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں بلند پایہ شاعر، بے مثال ادیب، متبحر عالم، حقیقت بیان خطیب، عدیم النظیر مقرر، اعلیٰ ترین مدبر، کوہ وقار مجاہد، اولوالعزم سپہ سالار، لاثانی اخبار نویس، جلیل القدر رہنما، اور بہترین سیاست داں تھے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کو اس مجسمۂ علم و عمل، اور تصویرِ عزم و ہمت جرنیل کی قیادت نصیب نہ ہو سکی۔

دنوں سے گزر کر نوبت ہفتوں کی آچکی، اور علالت کی تشویش انگیز خبریں برابر پہنچ آتی رہیں، خدا خدا کرکے وسط نومبر میں افاقہ ہوا اور محمد علی اس قابل ہوئے کہ کسی طرح لندن پہنچ سکے، معاندین کے طبقہ کے سوا اور جتنے مسلمان تھے، سب کے دل سے یہی دعائیں نکل رہی تھیں کہ مولانا کسی طرح لندن پہنچیں تو کہ ان کی شرکت کے بغیر مسلمانوں کی نمائندگی کانفرنس میں ادھوری کیا بمنزلۂ صفر کے رہ جائے گی، اللہ نے غریب مسلمانوں کی سن لی، اور مولانا کانفرنس میں پہنچ گئے۔ پہلے ہی اجلاسِ عام میں انکی جو تقریر ہوئی، اس نے دوست تو دوست دشمنوں تک سے داد لے لی۔ دسمبر کے شروع کی کوئی تاریخ تھی، جب مولانا کی تقریر کا جو خلاصہ تار پر اخبارات میں آیا، اس میں بھی یہ الفاظ موجود تھے:۔

"ہم دونوں بھائی وہ پہلے دو شخص ہیں جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال دیا تھا، لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں۔ لیکن، اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہونگا جب مجھے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ میں جب چاہوں، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوا دوں .....

میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں تو آزادیٔ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں .... برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے، لیکن ۳۰ کرور کی جس آبادی نے خود اپنے میں مرجانے کی ہمت پیدا کر لی ہے، اسے مارڈالنا کچھ آسان نہیں...... اصلی مسئلہ اس وقت ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے، دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرانے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے..... میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں، اب میں اس وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں، اگر آپنے یہ خود یا تو

تو میرے لیے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجئے۔"

اللہ اللہ! یہ اللہ کے شیر کی آخری گرج تھی، جو کہنا چاہیے کہ عین سلطان جائر کے دربار میں بلند ہوئی، اور حدیث نبوی کی وہ بات پوری ہوئی کہ سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے! ——— خوب لحاظ رکھ لیجیے کہ یہ دسمبر ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء نہ تھا۔ ۱۹۳۰ء کے معیار تقریر و تحریر پیش رکھ لیجئے، اور جب ایک نظر اس تقریر کے تیوروں پر کیجئے۔ یہ لارڈ ریڈنگ وہی "صاحب جبروت" بزرگ ہیں، جو ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے وائسرائے تھے، اور جن کی قہرمانی سے ایک عالم لرز رہا تھا۔ اور یہ حضرت بنفس نفیس گول میز کانفرنس میں جلوس افروز بھی تھے۔ ——— "موت یا آزادی"! یہ قلندرانہ نعرہ اس بیباکی سے کون لگا سکتا تھا، بجز اُس مردِ مومن کے جس کا ایمان غیب پر اس کے شہود و مشاہدہ سے شاید کچھ کم نہ تھا۔ مالک الملک کو اپنے بندۂ غیور کی بات کی لاج رکھنی تھی۔ کیسی بات اُس کی زبان سے نکلوا دی۔

اُدھر دنیا ہمت مردانہ کی ان رجز خوانیوں سے گونج رہی تھی، ادھر ہندوستان (خصوصاً لاہور، دلی اور بمبئی) کے بعض معلوم و معروف، اردو، و انگریزی اخبارات مسلسل بدزبانیوں اور سب و شتم کے تیر برسانے میں مشغول تھے، بیماریوں کی خبریں اور کارگزاریوں کی روداد اس زمانہ میں دوسرے ذریعوں سے آتی رہیں۔ خود مولانا کے خطوط اس درمیان میں جو آئے، وہ اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے نام آئے۔ لیکن اکثر ان میں یہ تصریح بھی ہوتی تھی کہ وہ خط اس نامہ سیاہ کے پاس بھیج دیے جائیں۔ مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بی اپنے شوہر شعیب قریشی (وزیر ریاست بھوپال) کے ساتھ خود بھی اس وقت انگلستان ہی میں تھیں

اور بیگم محمد علی تو (جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے) آخر وقت میں اپنے شوہر نامدار کا ساتھ دینے کیلیے ہمراہ ہی تھیں، اور ان کی عمر کی آخری منزل میں بھی زندگی بھر کی رفاقت کا حق ادا کر رہی تھیں ——— بیگم محمد علی محض بیوی نہ تھیں، محبوب اور بڑی چہیتی بیوی تھیں ——— مولانا شوکت علی بھی لندن ہی میں تھے۔ غرض محمد علی کے قریبی عزیزوں میں اس وقت صرف زہرہ بی ہی ہندوستان میں تھیں، اور قدرۃً ان کے ہر خط کی مخاطب بھی یہی تھیں۔ ذیل میں اس دور کے صرف دو خط درج کیے جاتے ہیں۔ نمونہ کے لیے بالکل کافی ہونگے۔ پہلا خط ۲ر نومبر کو پیرس سے لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا اس سے سات ہفتے بعد، ۲۶ر دسمبر کا لندن سے لکھا ہوا۔

باب (۸۶)

۱۹۳۰ء (۸)

(سفر کی کہانی مسافر کی زبانی)

(۱)

"پیرس (اسپلنڈڈ ہوٹل)
۴ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ۔
خداوند کریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آج ہندوستان سے چلنے کے ایک ماہ اور دو دن بعد میں پہلی بار تجھے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج رہا ہوں تاکہ تو اور سب عزیز و اقارب اور دوست احباب مطمئن ہو جائیں کہ خداوند کریم کے فضل سے میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ حقیقتاً جو دھچکا مجھے اس بار لگا وہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ باوجودیکہ یہ جگہ شملہ کی طرح سطح سمندر سے اونچی نہ تھی۔ تاہم خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح ۹۰ سے اوپر ہو گیا تھا اور لیٹنا سانس کے باعث ناممکن ہو گیا تھا۔ بھوپال میں بھی ابتدائے ستمبر میں بمبئی سے واپسی پر خون کا دباؤ یکایک اسی طرح بڑھ گیا تھا۔ مگر سانس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس بار سب سے زیادہ تکلیف دہ بخار، جگر کا بڑھ جانا اور اس میں درد پیدا ہو جانا، بھوک کا بالکل غائب ہو جانا،

متلی کا بار بار ہونا اور صفرے کی عجیب غریب زیادتی جس کے باعث پانچ دن تک غذا بالکل ہضم نہ ہو سکی اور اس طرح ایک طرف ضعف اور دوسری طرف صفرے سے کشتی لڑنا یہ سب کچھ ہوا۔ شملہ میں مرض کا پہلا سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلہ کی قوت تھی۔ بھوپال میں بمبئی کو واپسی پر حملہ اسقدر سخت نہ تھا، مگر بدن میں اب جان نہ تھی۔ یہاں تو کچھ نہ پوچھو کیا گزری۔ خدا ثریا بی کا بھلا کرے، رات دن میری رفیق سفر تھی اور مجھے اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ خدا بھلا کرے میرے مصری اور ترک دوست ڈاکٹر بھجت وہبی کا جنھوں نے بہتر سے بہتر ماہرین علاج قلب معدہ سے میرا علاج کرایا۔ اور صبح و شام خود بھی اس میں مصروف رہے۔ جو امداد ان سے مجھ کو ملی ساری عمر میں کسی سے نہیں ملی۔ ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ ان سے زیادہ اچھا اور سچا مسلمان میں نے آج تک نہیں دیکھا اور ان کا عشق میرے دل میں پہلی بار اُس وقت جاگزیں ہوا تھا جسے اب کوئی پچیس برس ہوئے ہوں گے۔ جب میں نے مدراس کے اسلامی اخبار میں اس مضمون کی نقل پڑھی جو انھوں نے انگلستان کے مشہور رسالہ "انیسویں صدی اور مابعد" Nineteenth Century and After میں پین اسلامزم یعنی اخوت اسلامی پر لکھا تھا۔ اقبال کو بھی پہلے میں نے اپنے اسلامی خیالات کا نقشہ انکے اس مضمون میں دیکھا تھا۔ اس سچے مسلمان پر جو ڈاکٹر آف لاء کی طرح ایم ڈی کی ڈگری انگلستان سے لیے ہوئے ہیں اور جو مصری حکومت میں جنگ سے پہلے اناٹومی یعنی علم تشریح کا پروفیسر تھا، عشق اسلام اور اسکی علمی اور عملی قابلیت کے باعث جو کچھ گزرا ہے وہ ایک لمبی داستان ہے اور جس طرح وہ آج پیرس میں ایک جلا وطن کی زندگی گزار رہا ہے اور دال روٹی کھا رہا ہے وہ بھی ایک داستان سے کم نہیں ہے۔ انشاء اللہ کبھی یہ سب داستان دہرائی جائے گی۔ آج وقت نہیں۔ جب میں سن ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کو لے کر آیا تھا تو میرے ترک دوست اسعد فواد بے اور میری مصری دوست ثریا خانم اسعد کی بیگم صاحبہ کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں رہتے تھے۔ پہلی بار ان تینوں

دوستوں سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ جب ۱۹۲۳ء میں مہاراجہ صاحب الور کی فیاضی اور
قدر افزائی کے باعث میں یورپ کو پھر علاج کے لیے آیا تو ڈاکٹر وہبی نے مجھے یہاں کے ایک
ماہر علاج ذیابیطس کو بھی دکھایا تھا۔ جب جرمنی جاتے وقت پیرس ہی میں بیمار ہو گیا تھا تو ان ہی
نے دیکھا بھالا تھا اور فرینکفرٹ روانہ کرایا تھا۔ واپسی میں مظفر دو میں اسی ہوٹل میں جہاں یہ لوگ
کرتے ہیں ٹھہرا تھا۔ جہاں اب بیماری کے باعث ہی اور میں رہتے ہیں۔
جہاز پر تو میں آنکھوں سے اندھا تھا۔ اور قلب کی حالت خراب تھی۔ البتہ عدن پہنچتے
ایک طبیعت درست ہو گئی تھی۔ وہاں جہاز سے اترنا چڑھنا اور اپنی مریدنی خیر النساء اور
حسین بھائی کے لائے ہوئے کھانے میں ذرا سا چکھ لینا بھی مضر ثابت ہوا اور دو دن بعد اس کا
اثر محسوس ہوا اگر دو چار روز بعد طبیعت پھر سدھر گئی۔ میں شوکت صاحب، زاہد اور بی
کے ساتھ قاہرہ تو اس بار نہ جا سکا۔ مگر پورٹ سعید میں بیت المقدس سے آکر حضرت مفتی اعظم
امین الحسینی صاحب جہاز پر مجھ سے مل گئے۔ اور ان کے سکریٹری اور ہمارے موتمر عالم اسلامی
منعقدہ مکہ معظمہ کے ترجمان عجاج صاحب قاہرہ جاکر شوکت صاحب سے مل آئے اور ان ہی کے
ساتھ واپس آکر مجھ سے مل بھی گئے۔ قاہرہ جانے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔ البتہ تین دن بعد مالٹا
اتر کر میں نے اس جگہ کو دیکھا۔ جہاں ہمارے سردار حضرت محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ہمارے رفیق مولانا حسین احمد صاحب اور عزیز گل صاحب وغیرہ مریدوں اور شاگردوں
کے ساتھ قید کر دیے گئے تھے۔ اس میں ہم چھ ان عزیز محمد حسن ہوئی گو میں موٹر سے بالکل نہ اترا
تھا اور صرف ایک گھنٹہ اس میں گھوما تھا۔ ادھر سمیرنا میں اکرم روحی بے اور ان کے ساتھ
ہی حضرت محمد رشاد خلیفۃ المسلمین مرحوم کے صاحبزادہ جو اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ یہیں
رہتے ہیں ملے۔ یہ شعیب صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ہم اسی دن پیرس چلے گئے اور گو راستہ لمبا

اور راستہ بھر اپنی ٹوٹی پھوٹی کہا۔ دس بارہ لفظ فرانیسی زبان میں اپنے کمرہ کے مسافر کو سمجھانا پڑا کہ پہلے ہم گاندھی جی کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے تھے اور اب کیوں مسلمانوں کی حق تلفی سے پریشان ہو کر ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس تحریک سے علٰحدہ ہیں۔ مگر ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز بلند کرنے لندن جا رہے ہیں، جس کے باعث مجھے کم آرام ملا، تاہم شام کو پونے گیارہ بجے ہم بخیریت پیرس پہنچ گئے اور ڈاکٹر وہبی اور شوکت اللہ شاہ کو اسٹیشن پر پایا۔ رات کو آرام سے سویا۔ صبح کو غسل کیا، ناشتہ کیا اور بی کے لیے چند ضروری چیزیں خریدنے بازار گیا۔ یہاں White Away سے بیسیوں بڑی دوکانیں تین چار بے حد مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک میں سب چیزیں مل گئیں، مگر مجھ پر یہ محنت سخت گزری اور بھوک سے بیتاب ہو گیا۔

ایشیائی کھانے کی تلاش میں ایک ارمنی کی دوکان میں گیا جہاں گوشت حلال ملتا ہے، خدا نے تمھاری بی کو بے حلال کیے ہوئے گوشت سے ابتک بچایا ہے اور ان شاء اللہ ہم لندن میں بھی اس سے محترز رہیں گے۔ اس دوکان میں پہلی جو چیز ملی وہ طولمہ (دولمہ) تھے مگر مجھے پسند نہ آئے تاہم بھوک سے مجبور ہو کر کھائے پھر گوشت اور چاول ملے جو خوب لذیذ اور پیٹ بھر کر کھائے گئے۔ غلطی یہ ہوئی کہ اس پر اکتفا نہ کیا گیا دہی میں ملے ہوئے سیخ پر لگے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی کھائے جو سب سے زیادہ مزیدار تھے اور ذرا سی کھیر بھی۔ اسقدر شکم سیر ہو کر کھانا ہزاروں مرتبہ کھایا تھا۔ مگر اب بیماری نے قوت ہضم نہیں چھوڑی تھی ذرا ہوا کھا کر جو ہوٹل آیا تو سوء ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ پلنگ پر آتے ہی لیٹ گیا رات کو کچھ نہ کھایا اور صبح بھی احتراز کیا البتہ غسل کر کے دوپہر کو ہوا خوری کے لیے بی کے ساتھ موٹر میں گیا اور الموڑہ کے دوست بدری ناتھ پانڈے اور گوبند ولبھ پنت جی سوراجی لیڈر نینی تال کے داماد چندردت پانڈے صاحب جو یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ساتھ تھے۔ واپسی میں

قے ہوئی اور پت نکلے۔ شب کو بخار بھی ہوگیا۔ یہ ۱۸ اور ۱۹ اکتوبر کی سرگزشت ہے۔ اس کے بعد چار پانچ دن سخت حالت خراب رہی۔ بالآخر (ڈاکٹر بوری) ماہر علاج قلب نے جلد سے جلد جو دن علاج کے لیے نکال سکتے تھے ڈاکٹر وہبی کی دوستی کی وجہ سے دیا۔ اس سے پہلے ایک دن ایک اور ماہر علاج قلب کے گھر جاکر قلب کی حرکت کا بجلی سے نقشہ کھچوایا اور قارورہ کا امتحان کروایا لیکن جگر کی خرابی بیتاب کر دیا تھا۔ پت برابر بن رہے تھے اور چونکہ غذا ہو نہیں رہی تھی اس سے خلو معدہ کے باعث اور بھی زیادتی تھی اور ان کے نکلنے میں آسانی نہ تھی۔ مجبور ہوکر معدہ کے علاج کے ماہر کو بلایا۔ اس نے کہا چونکہ تم کل ڈاکٹر بوری کا علاج شروع کرا رہے ہو اس لیے میری مداخلت بیکار ہوگی۔ تاہم شب کو سکون معدہ اور جگر کے لیے ڈاکٹر کو بہر لے۔ افیون کا انجکشن دو چار دن دلوایا جس سے اب نیند آنے لگی۔ دوسرے ہی دن سے ڈاکٹر بوری کا علاج شروع ہوا اور تین دن میں انہوں نے جگر کو درست کیا۔ قلب کی حالت کسی قدر بہتر کی اور اب ان کا علاج باقاعدہ ہونے والا تھا کہ آغا خاں صاحب نے اصرار کیا کہ میرے دوست پروفیسر واکیز کو بھی دکھاؤ۔

یہ ڈاکٹر بوری سے زیادہ مشہور ماہر علاج قلب ہیں مگر اب بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایک شفا خانہ ان کے سپرد ہے، وہیں روزانہ جاتے ہیں۔ مگر گھر پر کسی کا علاج نہیں کیا کرتے۔ یہاں تک کہ ٹیلیفون کی کتاب میں سے اپنا نام نکلوا دیا ہے۔ اسی باعث ان سے رجوع نہیں کیا گیا تھا۔ مگر آغا خاں نے اصرار کیا اور ان کو راضی کیا۔ مگر ان کے آنے کا چار پانچ دن انتظار دیکھنا پڑا اس لیے کہ وہ پیرس سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مگر ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونیز ولیوجو غالباً سمرنا کے رہنے والے ہیں آئے اور آکر دل، جگر، معدہ وغیرہ کی حالت دیکھ کر گئے۔ پیر دل پہ ورم پڑ گیا تھا۔ پیشاب آور دوا لکھ کر دے گئے اور اب چند دن صرف یہی علاج رہا۔ بالآخر

گزشتہ جمعہ کو بتاریخ ۱۲؍اکتوبر پروفیسر واکیر نے خود یہاں آکر مجھے خوب غور سے دیکھا اور تجویز کیا کہ چونکہ انھیں جلد کانفرنس میں شریک ہونا ہے اس لیے دل کی اصلاح بجائے منہ سے لینے کے پچکاری سے رگوں میں لینا چاہیے تاکہ جلد از جلد اثر ہو۔ چنانچہ ۱؍نومبر کو اللہ کا نام لیکر پچکاریاں کی گئیں اور کل ۵؍کو دے کر بند کر دی گئیں۔ اس عرصہ میں سب دوائیں بند کر دی گئیں۔ البتہ شب کو سوتے وقت ایک یا ڈیڑھ بڑا چمچہ ایک خوش ذائقہ شربت دیا جانے لگا تاکہ علی الصباح بلا تکلف ایک یا دو اجابتیں ہو جایا کریں اور روز صبح کو نمک کا بدمزہ اور تکلیف دہ جلاب جو شملہ سے اس وقت تک روزانہ بلاناغہ دیا جاتا رہا نہ دیا جایا کرے۔ واقعی یہ شربت بہت اچھا ثابت ہوا، اور تمھاری بی اور میں دونوں اسی کا استعمال کرتے ہیں (بی کا قارورہ بھی امتحان کے لیے پرسوں بھیجا گیا ہے، تاکہ نقرس کا علاج تجویز کیا جاسکے) چونکہ پیشاب آور دوا بھی بند کر دی گئی تھی اس لیے پیروں کا ورم اور بھی زیادہ ہو گیا۔ مگر آج پچکاریاں بند کر دی گئیں اور وہ پھر جاری ہو گئی ہے۔ روز بروز حالت بہتر ہوتی گئی مگر تین دن ہوئے، سورج خلاف معمول دو دن سے نکل رہا تھا میں بھی بی کے ساتھ موٹر میں جنگل کی ہوا کھانے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ کس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ ۱۰؍اکتوبر سے کمرہ میں بند تھا۔ اس سے پہلے پہلی بار ۳؍نومبر کو نکلا تو لفٹ (Lift) تک جانا دوبھر تھا۔ اور پھر دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ٹیکسی تک جانا مشکل تھا۔ خیر گھنٹہ بھر جنگل میں موٹر دھوپ میں گھمائی۔ پھر ایک جگہ آکر بی کو دودھ کی برف کھلوائی اور دو ڈھائی گھنٹہ بعد پھر ہوٹل آئے۔ ڈاکٹر وہبی صاحب اتفاق سے دیکھنے آئے اور نہ پایا تو سخت ناراض ہوئے اور اسی وقت معلوم ہوا کہ پچکاریوں کے زمانہ میں بھی اس کا سخت پرہیز تھا۔ کھانے کا تو پرہیز تھا ہی، سوائے دودھ ڈبل روٹی اور ترکاری کے سوپ (Soup) سب کچھ بند تھا۔ البتہ

تین چار دن تمھاری ساتھ کی ہوئی مونگ کی دال خوب کام آئی۔ کھچڑی پکوائی جاتی تھی مگر آج تک کسی نے ایسی کھچڑی نہیں کھائی، کبھی دال نہیں گلی تو کبھی چاول نہیں گلے اور گلوائے گئے تو اسقدر پانی ڈالا گیا کہ کھچڑی کا کسی کو گمان نہ ہو سکتا تھا۔ دلیا معلوم ہوتی تھی، اس میں نمک کم کہ ورم نہ بڑھے اور چکنائی نہ دار و کہ جگر نہ بڑھے، تاہم یہ سب کھانوں سے لذیذ تر معلوم ہوتی تھی، اس لیے کہ سوائے لانبے کدو کے سوپ کے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی، البتہ آلو ابلے ہوئے میں کر دیے جاتے تھے جس میں لیموں اور زیتون کا تیل ڈال کر سلاد بنا دیا جاتا تھا۔ خیر یہ بھی زمانہ جوں توں گزر گیا۔

آج صبح ۹ بجے آکر پروفیسر واکیز اور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونیز ولیو نے پھر دیکھا اور کہا کہ الحمدللہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں۔ اور حسب قرارداد سابق اب تم کل دس بجے لندن جا سکتے ہو۔ سوائے پیشاب اور دوا کے اور اجابت کے لیے شربت کے باره دن تک کوئی دوا استعمال نہ کرنا۔ اس کے بعد دل کی دوا جو منہ سے دیجاتی تھی وہ کھایا کرنا، اگر خدا نخواستہ پھر کوئی سخت خرابی محسوس ہو تو پچکاریاں پھر شروع کر دینا کانفرنس میں روزانہ شرکت کی غالباً ضرورت نہ پڑے، نہ ہر وقت حاضری کی، جتنا زیادہ آرام کر سکو کرنا۔ ہمیں امید ہے کہ کانفرنس میں وقتاً فوقتاً رائے بھی دے سکو گے جب ضرورت تقریر بھی کر سکو گے۔ جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو پھر پیرس آکر ہمارا علاج کرنا انشاءاللہ ایک یا ڈیڑھ مہینہ کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائے گا کہ کبھی گویا یہ مرض ہوا ہی نہ تھا۔ دوا اور غذا کے متعلق مفصل ہدایات وہ اس وقت ارسال کر رہے ہیں تاکہ لندن جا کر ڈاکٹر عبدالرحمٰن ان پر خود بھی عمل کر سکیں اور مجھ سے بھی عمل کراتے رہیں۔ ان کا انگریزی میں ڈاکٹر دسبی ترجمہ کر لیں گے۔ بیگم صاحبہ بھوپال کو راستہ میں انفلوئنزا ہو گیا، اسی لیے عبدالرحمٰن

پیرس نہ رک سکے۔ اگر ان کی طبیعت درست ہو گئی ہو گی تو وہ شاید آج لندن سے یہاں آ جائیں
تاکہ میرے ہمراہ سفر کریں۔ ورنہ فرانس کی حد پر یعنی کیلے کے بندرگاہ میں زاہد آ جائیں گے اور
اپنے ہمراہ ہم دونوں کو لندن لے جائیں گے۔ آجکل کیلے سے ڈوور تک سمندر کا سفر تکلیف
ہوتا ہے۔ جس دن شوکت صاحب لندن گئے اس دن سخت طوفان تھا۔ زاہد صاحب تو
یہاں سے ۲۶ر اکتوبر ہی کو لندن روانہ ہو گئے تھے۔ شوکت صاحب ایک ہفتہ بعد یعنی ۲ر
نومبر کو گئے۔ یہاں ایرانی، افغانی اور ترکی سفراء سے ملاقات کی۔ رؤف بے حسب معمول
خود یہاں تشریف لائے اور گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ عدنان بے اور ان کی بیگم صاحبہ
خالدہ ادیب خانم یہیں تھے۔ مگر اب لندن تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہاں ان سے ملاقات
ہو گی۔ فتحی بے صاحب یہاں ترکی کے سفیر تھے۔ مگر وہ ایک نئی سیاسی پارٹی کی صدارت
کے لیے انگورہ جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ میرے پرانے رفیق اور سچے مسلمان منیر بے صاحب
ترکی سفیر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے یہ سوئٹزرلینڈ میں تھے۔ ان سے میری دوستی ۱۹۲۰ء میں ہوئی
تھی، جبکہ توفیق پاشا کی سرکردگی میں پہلا ترکی وفد صلح کے لیے آیا تھا اور شرائط صلح کو سخت
تباہ کن پاکر واپس چلا گیا تھا۔ جب مجھے ...... جا کر اس وفد سے ملنا ہوتا تھا تو نماز کے
لیے مصلّٰی ان ہی کے ہاں ملتا تھا۔ ان ہی کے ذریعہ سے ہم نے خفیہ طریقہ پر سلطان وحید الدین
کے پاس توفیق پاشا کی بہو اور سلطان کی لڑکی کی معرفت اپنے وفد کا خط بھجوایا تھا۔

افغانی سفیر یہاں اب تک وہی ہیں جو شاہ ولی خاں کے ہمراہ یورپ آئے تھے اور جنھیں
متھرا سے اپنے ساتھ بٹھا کر موٹر میں دہلی لایا تھا، تاکہ وہ اسی شام کو اپنے سسر کے ساتھ اپنی ماں
سے ملنے مینی تال جا سکیں۔ گول میز کانفرنس کا کام الحمد للہ جا بجا اچھی طرح ہوتا رہا، اور
مہاراجہ صاحب الور نے اس میں بڑی مدد کی۔ شوکت صاحب اسی لیے یہاں سے ۲ تاریخ

کو چلے گئے۔ آغا خاں صاحب دو دن پہلے جا چکے تھے۔ مجھ سے ان سے ٹیلیفون پر خوب باتیں ہوئیں اور ان کو متفق پایا۔ جو خبریں بعض امریکن اخبارات کے ذریعہ سے ملیں ان سے امید ہوتی ہے کہ ہندوستان کا مطالبہ غالباً متفق ہو" خدا ہم چنیں کند"۔ کامیابی ہر حالت میں سخت مشکل ہے۔ مگر اس کے بغیر ناممکن ہے۔ خدا کرے مہاسبھائی ذہنیت سمندر پار جا کر بدل جائے اور ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا صحیح احساس ہو جائے اور ایک دوسرے کو غلام بنانے کے خیال کو چھوڑ کر سب کو دوسروں کی غلامی سے نکالنے کی کوشش کریں۔ خدا ہندو مسلمان دونوں کی توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کریں اور نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کریں۔ آمین ثم آمین۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس خط کو سب عزیز و اقارب کو رام پور میں سنا کر فوراً عرفان صاحب کے پاس بھجوا دینا کہ اسی ہفتہ خلافت میں شائع ہو جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کی نقل دفتر خلافت کو بھجوا دی جائے۔ اصل تم اپنے پاس رکھو۔

یہی خط نواب اسماعیل خاں اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے لیے ہے۔ سب کو سلام دعا پیار۔ طارق کو بالخصوص۔

تیرا دعا گو اور دعا کا طالب

"محمد علی"

---

(۲)

سات ہفتہ بعد کا خط

"ہائڈ پارک ہوٹل
۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ۔

خداوند کریم ہم سب کو جلد اور بامراد ملائے۔ خدا کو یونہی منظور تھا کہ میں آج تجھے اپنے ہاتھوں سے خط لکھوں۔ ورنہ گزشتہ جمعہ کو جو بڑا خط اپنے سکریٹری سے میں "ٹائپ" کرا رہا ہوں، اس کے شب کو ختم کراتے ہی میری طبیعت اتنی گبڑی کہ میں نے خود ہی بڑے ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر امیر ڈنگر کے دوست ڈاکٹر رائل اور تلمنہ بی کے شوہر ڈاکٹر انکلینوٹیا کو بلایا اور دونوں نے حالت اس قدر ابتر پائی کہ فوراً دو نرسوں کو طلوا بھیجا اور اگر اتنی جان بھی نہ ہوتی کہ پاس کے ہسپتال (St. Georages Hospital) تک جو سڑک کے کونے پر ہے بھیجا جا سکے ہے تو ضرور بھیج دیا جاتا۔ ۹ر کی شب کو حرارت تو ضرور ۹۹ تھی مگر نبض ۱۳۵۔ ۱۰ر کو بالکل بے ہوش رہا۔ حرارت ۹۷ رہی مگر نبض ۱۰۰ تک گری پھر ۱۳۵ تک بڑھ گئی۔ ۱۲ر کو حرارت ۹۵ گر گئی، مگر جلاب کے باعث جس کا ہوش مجھے صرف اجابت آنے سے ہوتا تھا، نبض ۔۔ تک گر گئی۔ آنکھ کھلی تو ذرا بھی ہوش نہ تھا کہ میں دو دن سے موت کے منہ میں تھا، نہ اس کا ہوش تھا کہ دن ہے یا رات۔ رات کو دن سمجھ کر لارڈ سینکی لارڈ چانسلر کو جو وزراء میں سب سے معقول آدمی ہے، اس شب کے وقت حاضری کھانے پر بڑی منت سماجت نرس کی کر کے بلایا۔ کیونکہ ریمزے میکڈانلڈ ہند و مسلم معاملات کو سلجھانے سے قاصر تھا اور مجھے دھن اسی کی تھی۔ نہ معلوم کس طرح نرس راضی ہو گئی۔ غالباً اتنا بڑا نام سنا تو ہیبت زدہ اور مرعوب ہو گئی

لارڈ ریڈنگ بڑا شریف انگریز ہے، سمجھ گیا اور سن چکا تھا کہ موت اور زیست کے بیچ میں ہوں
اس لیے دوسرے ہی دن صبح گیارہ بجے آنے کا وعدہ لکھا کر دیا۔ وہ آئے اور گو شوکت صاحب
نے بھی اسی وقت آنا چاہا اور میں گھبرایا کہ بات نہیں کرنے دینگے جس سے کسی قدر ناچاقی ہوتی۔
تاہم دس منٹ ہی میں میں نے اپنا مطلب ادا کر دیا اور کہہ دیا کہ سارے ہندوستان
کا ہندو مسلم (مسئلہ) ایک ہے۔ قومی ہے اور تاریخی ہے، صوبہ وار نہیں ہے۔ صرف اصول
پر ہر جگہ طے ہوگا اور وہ اصول یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو پوری قوت مسلمانوں
کو دو اور قسمہ ہنود کے لیے اس طرح لگا رہنے دو یعنی Power of Mojority
خواہ ۵۵ یا ۵۴ کی ہو یا ۵۴-۵۶ کی اور Protection of Minority خواہ ۵۵ کی ہو
یا ۵۰ کی۔ غضب یہ ہو رہا ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کے بہانے سے پنجاب اور بنگال
میں مسلمانوں کی مجارٹی کو مینارٹی کیا جا رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کل آنکھ کھولتے ہی
بیگم شاہنواز کی تحریر اس مضمون کی پڑھی کہ پنجاب میں ایک دو مسلمان کم کر دیے جائیں
تو کیا ہرج ہے۔ یہ رحمدلی اور ملک پروری نہیں ہے، پاگل پن ہے۔ یہاں آئے ہی کیوں
تھے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ ۵ دن سے برابر ترقی ہے۔ کل ۱۴ تک ہسپتال
جا کر آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک رات کی ساری نیند اس مصیبت میں گئی کہ ۱۹ دسمبر
تک "خلافت" میں میری پوری تقریر کا ترجمہ نہیں شائع ہوا تھا۔ حالانکہ ۱۲ کی شب کو
دی تھی اور اسی شب کو اصلاح کر کے "مسلم آؤٹ لک" لاہور کو ارسال کی تھی۔ تین
گھنٹے جس مصیبت میں کاٹے تھے وہ خدا ہی جانتا ہے (اب یہ) "خلافت" والے تو دو ہفتے
میں لندن کے اخباروں سے بھی لے سکتے تھے۔ مگر فکر کسے اور عقل کس کو۔ دفتر میں عجیب
بونڈھا چھوڑ کر آیا تھا۔ خدا رحم کرے۔ اچھا اب رخصت۔ اس کی بہت صاف نقل کسی

سمجھدار شخص سے کرا کے عرفان صاحب بلکہ کسی اور کو بھی بھیج دو کہ بغیر سنسر کے دیر لگائے ہوئے فوراً طبع ہو جائے۔ اصل ماجد، ذوالفقار بھائی اور معظم کو دکھاتے ہی اسمٰعیل خاں صاحب کو بھیجدو۔ اور اُن سے کہدو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو اسی ڈاک سے بھیج دیں۔ کا کسی ترکیب سے حیات کو بھی فوراً ہی پہنچ سکتا۔ مگر اب سکریٹری کی جگہ ایک چھوڑ دو دو ہیں۔ ہیں خدا معلوم مصارف کیسے ادا کروں گا۔ بی کے لیے مجبور ہو کر ایک علحدہ کمرہ لیا ہے جس میں شوکت صاحب بھی آکر سو جاتے ہیں۔ مظفر زاہد کے ساتھ ہے۔

طارق کو اور تجھے پیار۔ تمہارا

محمد علی"

باب (۴۴)

۱۹۳۱ء

ملت یتیم ہوگئی

دسمبر کے آخری ہفتہ کی ابتدا تھی کہ اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد ڈیڑھ دو ہفتہ کے ارادہ سے جانا ہوا۔ محمد علی کے پرستاروں کی کہاں کمی تھی۔ یہاں بھی شیدائیوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ موجود تھا۔ کانفرنس کی تقریروں پہ ہر کان لگا ہوا۔ ہر زبان پر داد وتحسین، علالت سے تشویش واضطراب ہر دل میں پیدا۔ خیریت وصحت کی دعائیں ہر لب پر۔ انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا ایک خط، اور ساتھ ہی وزیر اعظم برطانیہ کے نام ٹائپ شدہ محضر بیاں ملے۔ خط میرے نام تھا، اور سیاست وعلالت دونوں کی دلآویز وموثر تفصیلات سے لبریز۔ دست بہ دست گشت ہونے لگا۔ اور پھر الٹ کر مجھے اس کا دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ ورنہ یہ ڈائری ہرگز اس سے محروم نہ رہتی۔ اپنی شدید خطرناک (اور جیسا کہ چند ہی روز میں ثابت ہوگیا) مہلک بیماری، اور اس کے آلام وشدائد کو اپنے شگفتہ پیرایہ میں لکھنا یہ محمد علی ہی کا حصہ تھا ——— کون جانتا تھا کہ شمع اب بالکل بجھنے ہی کو ہے، اور یہ بہار اس کی آخری بھڑک اور آخری جھلملاہٹ کی ہے! بیماری کے دورے اب جلد جلد پڑنے لگے تھے۔ اور عقلاً وقتِ آخر اب بالکل سامنے تھا۔ لیکن طبیعت کمبخت

غفلتوں میں مدہوش و سرشار۔ یہ باور کرنا ہی کب چاہتی تھی اپنے اور دوسروں کے بہلانے کو دل ہمیشہ یہ تاویل کر لیتا تھا کہ "نہیں، جس طرح پچھلے دورے جھیل لے گئے، اب کی بھی اللہ انھیں اچھا ہی کر دے گا۔" محمد علی کے بغیر دنیا کیسی سونی ہو جائے گی، امتِ اسلامیہ کا کیا حشر ہوگا، مسلمانانِ ہند کیسے یتیم اور بے سر دھرے کے ہو جائیں گے، نفس ان امکانات ہی کو تصور کے سامنے لاتا جھجکتا۔ اور ہر دفعہ ان کو اپنے سامنے لانے سے ٹال لے جاتا تھا!

بات کہتے سنہ ۱۹۳۱ء شروع ہو گیا۔ جنوری کی غالباً ۸ تھی۔ جب حیدر آباد سے براہ دہلی واپسی کی ٹھیری۔ شب میں خواب دیکھا کہ کوئی جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ دن میں اداسی افسردگی اور خوف کا اثر قائم رہا۔ سہ پہر کو ٹرین روانہ ہوئی۔ راستہ میں ۸ کو تازہ اخبار مل سکے۔ بڑے بڑے جنکشن جہاں تازے اخبارات مل سکتے تھے، اتفاق سے رات گئے پڑے ۹ کو صبح سویرے گاڑی دہلی پہنچی۔ اسٹیشن پر میرا بھتیجا ملا۔ جو طبیہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایک ہی آدھ بات کے بعد اس نے کسی سلسلہ میں کہا "کل تو کالج بند تھا اور شہر میں ہڑتال تھی"۔ "کیوں؟" کا سوال قدرتی تھا۔ "مولانا کے انتقال کی خبر پر"۔ جواب بھی اسی دم مل گیا۔ "کون مولانا؟" سوال کرنے کو تو بے دھڑک کر دیا۔ لیکن نہ پوچھیے کہ اس ایک آدھ سکنڈ کے قدرتی وقفہ میں دل پر کیا گزر گئی! بات بالکل موٹی اور صاف تھی۔ سوا ان مولانا کے اور ہو کون سکتا تھا؟ کون دوسرے مولانا بیمار تھے، جنکے انتقال پر شہر میں ہڑتال ہو جاتی؟ ابھی ریل سے مع پورے سامان کے اتر بھی نہیں پایا تھا کہ یہ سوال و جواب شروع ہو گئے تھے۔ اتر رہا تھا کہ یہ بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ جواب ملنے میں دیر ہی کیا لگتی۔ "مولانا محمد علی"! ـــــــــ اُف! کیسی منحوس گھڑی تھی، جو یہ الفاظ کان کے پردوں سے ٹکرائے!

ہائے! کاش کبھی یہ خبر سننے کو نہ ملتی! جی تلملایا۔ جیسے کوئی نوگرفتار پرندہ قفس کے اندر تڑپ رہا ہو۔ رو۔ روتے بنتا تھا نہ کچھ کہتے سنتے۔ زبان پر ایک چیخ کے ساتھ "انا للہ" کے الفاظ آئے، اور پلیٹ فارم پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا! آنکھوں کے نیچے اندھیرا آرہا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا الٹ پلٹ ہوئی جارہی ہے! دو چار منٹ بعد جب حواس ذرا قابو میں آئے، تو جھٹ جا نماز بچھا پلیٹ فارم پر نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اور چار رکعتیں پڑھ کر اس پاک و پاکیزہ روح کو ایصالِ ثواب کیا۔ اور دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھائے تو اب رونا بھی دل کھول کر آیا۔ طبیعت بھری ہوئی تھی ہی۔ آنسو اُمنڈ اُمنڈ کر اب نکلنے شروع ہوئے۔ دعا و مناجات کے الفاظ اب کہاں یاد، لیکن عجب نہیں جو کچھ اس قسم کے ہوں:

"اے اللہ۔ تیری ذات ہر طرح بے نیاز ہے۔ لیکن ہم بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں۔ اتنا بڑا سرو اد اٹھ گیا۔ قوم کی قوم بے سری ہوگئی۔ ساری امت یتیم ہوگئی۔ اب کون ہماری صحیح رہنمائی کرے گا؟ انگریزوں کے، ہندوؤں کے، سارے غیرمسلموں کے مقابلہ میں کون ہم سب کی طرف سے سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے گا؟ یہ اخلاص، یہ فراست اب کہاں دیکھنے میں آئے گی؟ اے اللہ! محمد علی کو اٹھا کر آخر ہم لوگوں کو اب کس پر چھوڑا؟ کس کے دل میں یہ درد، کس کی عقل میں یہ رسائی ہے؟

اے اللہ! تو اپنے اس بندے کی خطاؤں سے، لغزشوں سے درگذر کر! وہ تیرے دین کا دیوانہ تھا۔ تیرے نام کا عاشق تھا، تیرے رسول کا پروانہ تھا۔ اپنی عزت، اپنی وجاہت، اپنی قابلیت، اپنی صحت وہ سب تیرے دین ہی کے لیے وقف کیے ہوئے تھا۔ انسان تھا بشر تھا بشری کمزوریاں بھی یقیناً رکھتا تھا۔ غصہ ور تھا۔ مزاج اور زبان پر قابو نہ تھا۔ ان سب خطاؤں کو تو اپنی مغفرت بے حساب کے پانی سے دھو دے۔ اس نے تیری راہ میں کتنے

دکھ درد سہے، کتنے ظلم اٹھائے، اپنوں اور بیگانوں سب کے تیروں کا کیسا ہدف بنا رہا تجھ پر یہ سب خوب روشن ہے۔ اس کی مظلومیت ہی کو اس کا شفیع بنا۔ اس کو جنت اور اپنے غفران و رضوان کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجوں میں جگہ دے! اس کا حشر اپنے اولیا و مقبولین اور اپنے بندگانِ متقین و صالحین کے ساتھ کر۔ اس کی تربت پر اپنی رحمت کے بیشمار پھول برسا۔ اور ہم سب کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو صبر عطا فرما۔ تیرے ہی کسی عارف نے تیری زبان سے ادا کیا ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضاے ما

سو اس کا ظہور آج سے بڑھ کر اور کب ہوا ہوگا۔ تیرے بڑے سے بڑے دشمن اور نافرمان باغی بندے کیسے ہٹے کٹے گھوم رہے ہیں اور وہ جو تیرے پیچھے اپنے کو فنا کیے ہوئے، مٹائے ہوئے تھا۔ اسی کو تو نے اٹھا لیا!

رو دھو کر طبیعت جب ذرا ہلکی ہوئی، تو تانگہ کر کے سیدھا اڈیٹر روزنامۂ ملت، جعفری صاحب کے ہاں گیا۔ محمد جعفری (سہدرہ) کے خوب جانے پہچانے ہوئے سب اڈیٹر اور پھر اڈیٹر) گو اب مولانا کی سیاست سے علٰحدہ ہو چکے تھے، پھر بھی برسوں ان کی صحبت میں رہ چکے تھے، ان کے مرتبہ شناس تھے، اور اب بھی رشتۂ اخلاص ان سے جوڑے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر دل کی بھڑاس اور نکلی۔ رونا از سرِ نو آیا۔ اور اب تعزیت میں وہ بھی شریک تھے۔ عزا و ماتم کے موقع پر کسی مخلص و غمگسار کا مل جانا خود ایک بڑی نعمت ہے ——— جعفری ہی بیچارہ نے جلے ہوئے دل کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ فلاں ادارہ کو

بھی با دلِ ناخواستہ اور شرما شرمی، رائے عامہ سے ڈر کر، مولاناؔ کے ماتم میں حصہ لینا پڑا۔ یہ بھی وہیں سننے میں آیا کہ کل شام کو تعزیت کا جو عظیم الشان جلسہ شہر میں ہوا تھا، اس کی صدارت فلاں عالم کو دی گئی تھی لیکن ان کی پھسپھسی اور بے دلی سے کی ہوئی تقریر سے کہیں زیادہ گرمجوشی، اخلاص اور اثر ویش بند ہو گپتا (ایڈیٹر "تیج") کی تقریر میں تھا ——

آج دہلی کا شہر ہی میری نظر میں کچھ سے کچھ تھا۔ جعفری کے ہاں آنے جانے میں آخر دو مرتبہ ان ہی سڑکوں سے گزرنا پڑا۔ بظاہر سب چہل پہل اسی طرح کی تھی۔ اسٹیشن پر مسافروں کا وہی ہجوم، وہی ریل پیل، ٹراموے، بسوں، تانگوں کا وہی شور و غل، بازاروں کا وہی ہنگامہ لیکن اپنی نظر میں آج دلّی بالکل سونی ہی تھی، اس کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ کہاں سہاگن کا چہرہ اور کہاں بیوہ کا بشرہ! ایک محمد علی کی ذات سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر پُر رونق ہے۔ آج جب وہ نہیں تو رونق کی جگہ ہر چہار طرف اداسی ہی اداسی ؎

ہے تمہارے ہی دم سے یہ بزمِ طرب ابھی جاؤ نہ تم، نہ کرو یہ غضب

کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ ہے

محمد علی کی کتابِ زندگی ختم ہو گئی۔ ڈائری کے نام سے جو یہ کتاب ڈائری نویس نے اپنے ذاتی تاثرات کی ان سے متعلق گھسیٹ ڈالی، وہ بھی اب خاتمہ کے قریب آ گئی صرف ایک باب آگے اور آتا ہے۔ جس میں ہم ایک عام اجمالی تبصرہ ان کی زندگی پر ہوگا۔ اور اس کے بعد چند ضمیمے ملیں گے۔ سچ میں ان کا ماتم ہفتوں نہیں، مہینوں بلکہ شاید برسوں ہوتا رہا۔ ان تعزیتی تحریروں، اور منثور و منظوم ماتموں میں اقبالؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سید سلیمان ندوی و حفیظ جالندھری کے افاداتِ قلم خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور مولانا

شوکت علی و حافظ ہدایت حسین بیرسٹر مرحوم کی تحریریں جو ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، وہ سب بہ طور ضمیمہ محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح اس نامہ سیاہ کی دوسری تحریریں بھی، جو کسی موقع پر حضرت مرحوم کے سلسلہ میں نکل چکی ہیں۔

لیکن سب سے بڑھ کر موثر اور بابرکت حضرت مولانا تھانویؒ کا میرے نام کا مختصر سہ سطری تعزیت نامہ ہے۔ دونوں بزرگوں کے درمیان ایک عرصۂ دراز تک تو خاصی ناگواری رہ چکی تھی۔ اور پوری صفائی تو آخر تک بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس پر بھی جو خط حضرتؒ نے میرے خط کے جواب میں مجھے تحریر فرمایا، وہ ظاہر کر رہا ہے کہ ادیبا، اللہ کا ظرف بھی کتنا بلند ہوتا ہے! ضمیمہ کا انتظار کیوں کیجئے۔ وہ خط یہیں اور ابھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

"محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں، اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اسی اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں[1]۔ اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے، اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔"

---

[1] دونوں نے ایک دوسرے کو غالباً ایک بار دور سے دیکھا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد میں۔ قریبی تعارف اس وقت بھی نہ ہوا تھا۔ اور اسکو بھی ایک لمبی مدت ہو چکی تھی۔ غالباً ۱۹۱۲ء میں جب محمد علی بجائے مولانا کے مسٹر تھے۔

اس نامہ سیاہ نے دونوں بزرگوں کو ملانے اور یکجا کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا ذکر حضرت تھانویؒ کے حالات کے سلسلہ میں کتاب "حکیم الامت: نقوش تاثرات" میں ملے گا۔

باب (۴۸)

اے ہلالِ ماخمِ ابروئے تو

شیخ احمد سنوسی کو چھوڑ کر، جن کی عظمت و جلالت کا اثر مجھ پر گو بہت گہرا اثر رہا، لیکن ان سے کل صحبت ہی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی نصیب رہی، اور اس لیے اس نقش کو بھی زیادہ پائداری نصیب نہ ہوئی، مستقل، گہرا اور پائدار اثر میری زندگی پر سب سے زیادہ دو ہی شخصیتوں کا پڑا اور میری زندگی کے بہ قدر ظرف سنوارنے، اور سدھارنے میں سب سے زیادہ معین ہوا ——— اگرچہ ناکارہ زندگی اپنی نااہلی کے باعث کچھ بھی سنور اور سدھر سکی ہو! ——— اور ان دونوں میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے حق تقدم مولانا محمد علی کو حاصل ہے۔

ان کا نام اُس وقت سے سننے میں آنے لگا، جب اپنا بالکل بچپن تھا۔ اسکول کے کسی بالکل ابتدائی درجہ کا طالبعلم تھا، اور وہ کالج کے منتہی ہو چکے تھے۔ ماہنامہ علیگڈھ میگزین کے حصہ انگریزی میں ان کا نام اور ان کے کارنامے بار بار آتے تھے، اور اپنے پڑھے لکھے عزیزوں سے یہ چیزیں سن سنا کر ان کی عظمت اسی وقت سے دل پر بیٹھ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ خود ان کی اردو اور انگریزی تحریریں مزے لے لے کر پڑھنے لگا، اور نقش عظمت روز بروز اور گہرا ہوتا گیا۔ کالج سے نکلا ہی تھا کہ پہلی بار ان کی زیارت ہوئی اب وہ کامریڈ کے مشہور ایڈیٹر تھے اور تحریک علی گڈھ کے ایک نامور علمبردار، عظمت تو

پہلے سے قائم تھی ہی، محبت بھی پہلی نظر پڑتے ہی پیدا ہوگئی۔ "چون تو اندم نظرؓ کا معاملہ۔ باقاعدہ ملاقات اور تعارف کوئی دو سال بعد ہوا۔ محبت اس ساری مدت میں برابر بڑھتی ہی رہی، اور یہ اپنی مذہبی بدعقیدگی کے باوجود۔ پھر ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں جب وہ جیل میں تھے، اور میں از سر نو مسلمان ہوچکا تھا۔ اُن کا عشقِ رسول دیکھ کر اور نعتیہ کلام پڑھ کر خود ان کی ذات کے ساتھ ایک عاشقانہ اور والہانہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ اور محبت اور علمی عظمت میں نئی آمیزش گہری مذہبی عقیدت کی بھی ہوگئی۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ جیل سے باہر آئے تو انھیں مرشد سمجھ کر پابوسی کے لیے لپکا، انھوں نے جھکنے سے روک کر دوستانہ مصافحہ اور معانقہ پر سنبھال لیا۔ اور مدۃ العمر اپنی طرف سے بہ طور دوست، رفیق اور عزیز کے رکھا ——— میری ان کی عمر میں ۱۴ سال کا فرق تھا۔ سن کی بڑائی چھوٹائی کا یہ فرق مرتبہ کے لحاظ سے بھی آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہزار بے تکلف کرنا اور بالکل مساوات کی سطح پر لے آنا چاہا لیکن مجھے "ایاز قدر خود بشناس" کی پند سودمند یاد تھی۔ میں کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھا۔

ستمبر ۱۹۲۳ء سے وسط ۱۹۳۰ء تک بہ کثرت یکجائی رہی۔ سال میں کئی کئی بار میں دہلی جاتا (شروع میں جانا علی گڑھ ہوتا) اور اس سے زیادہ وہ لکھنؤ آتے رہتے۔ متعدد سفر ان کے ساتھ کیے، دہلی سے لکھنؤ تک، دہلی سے پانی پت تک، کانپور سے لکھنؤ تک وغیرہ۔ ایک ایک بار بھوپال اور کانپور اور بمبئی میں یکجائی رہی۔ ان کی پبلک زندگی کے علاوہ ان کی خانگی زندگی کا بھی کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہ رہا۔ ان کی رنجشیں بھی ان کے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ دیکھیں۔ غرض یہ کہ انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا، اور ہر طرح سے جانچا، پرکھا، تولا۔ یہ کہنا کہ ان کی شخصیت ہر بشری کمزوری سے پاک تھی، حدِ مدح میں شاعرانہ

مبالغہ کرنا ہوگا۔ وہ نہ فرشتہ تھے اور نہ کوئی نبی مرسل۔ ہر معمولی انسان کی طرح گوشت و پوست سے بنے ہوئے اور جذبات و احساسات رکھنے والے ایک امتی تھے۔ مزاج کے تیز تھے اور گو پٹھان نہیں، لیکن بہرحال "رامپوری" تھے۔ اشتعال بہت جلد قبول کر لیتے۔ خصوصاً آخر کے چند سالوں میں کثرتِ آلام و امراض اور ہجوم افکار کے باعث۔ اور بات بات میں غصہ میں آ جاتے۔ زبان پر قابو باقی نہ رہتا تھا۔ جوش میں خدا معلوم کیا کیا زبان پر آ جاتا۔ اور خرچ بھی زبان ہی طرح قابو سے باہر تھا ——— لیجئے، بس بشری کمزوریوں کی فہرست ختم ہوگئی، مجھ جیسے گھرے اور قریبی تعلق رکھنے والے کے علم میں بھی ختم ہوگئی۔ رواج عام اس وقت اپنے اپنے اخبار متعلقہ میں طرح طرح کے القاب و خطابات کا چلا ہوا تھا۔ زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں "ظفر الملت والدین" تھے۔ تنظیم میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو "سیف الملت والدین" تھے۔ وغیرہ محمد علی نے کبھی اپنے کو "محمد الملت والدین" لکھوانے نہ دیا۔ اور تو اور "رئیس الاحرار" انھیں ایک دنیا لکھ رہی تھی۔ لیکن اپنے اخبار ہمدرد میں اس لفظ تک کے روادار نہ ہوئے۔ خرچ جیسا اپنی ذات پر کرتے، ویسا ہی پیسہ دوسروں کو کھلانے پلانے، تحفہ تحائف پیش کرنے، اور دکھیاروں کو دینے لینے میں اٹھاتے۔ اور دو چیزوں کے تو کہنا چاہیے کہ بادشاہ تھے۔ ان دو صفات میں ان سے بڑھ کر کیا، ان کے ہم پلہ بھی اپنے علم و تجربہ میں کوئی دوسرا نہ ملا:-

(۱) ایک، اسلام اور امت اسلامی سے بے انتہا محبت۔ دنیا میں کہیں کسی مسلمان کو تکلیف پہنچے، اور ممکن نہ تھا کہ محمد علی کا قلب اس سے نہ دکھے ——— کا نما اُفریقہ کے کسی مسلمان کے چبھا، اور اس کی چبھن محمد علی یہاں بیٹھے محسوس کر رہے ہیں۔

(۲) دوسرے، سچائی اور حق گوئی۔ پارٹی کی مصلحتوں سے متاثر ہوتے میں نے ہندوستان کے چیدہ سے چیدہ مسلم اور ہندو لیڈروں کو دیکھا، اور تحزب (جماعت بندی)

میں مبتلا بڑے بڑے علما ر و مشائخ کو پایا ہے۔ بے لاگ اور بے دھڑک۔ دوست، عزیز، بزرگ کسی کی بھی پروا کیے بغیر دل کی بات زبان پر لے آنے والا، محمد علی کا سا کوئی دوسرا دیکھنے میں نہ آیا ——— سادگی، اخلاص، بے تکلفی، بے تصنعی یہ سب صفات اس ایک صفت کے لازمی برگ و بار تھے،

اتنی خوبیوں اور ظرافت و کردار کی ان ملکوتی بلندیوں کے بعد، عجب کیا جو حق تعالے حشر میں ان کے پیر و مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی قدس اللہ سرہٗ (متوفی ۱۹۲۶ء) کے اس وجدانی حسن ظن کو صحیح ثابت کر دکھائے کہ اگر علی برادران عہد نبوی میں ہوتے تو ان کے جذبات ایمانی سے کیا بعید ہے کہ خود حضورؐ ان ہی نام کے ساتھ جنت کی بشارت دے دیتے کہ محمد علی فی الجنۃ و شوکت علی فی الجنۃ ——— رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اور محمد علی کی محبت اور انتہاء محبوبیت کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ آج جب اُن کا مسکراتا ہوا شگفتہ اور شاداب چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے، تو ۲۰ سال گزر چکنے پر بھی، خدا جانتا ہے کہ ان کی وہ محبوبیت تازہ ہو جاتی ہے، اور دل بھر آتا ہے۔ ——— خسرو دہلوی نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو مخاطب کر کے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کے مصرعہ کے مصرعہ اپنے لیے قال نہیں حال ؛

ترک من ایں مہ غلام روئے تو !

اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ع جملہ ترکان جہاں ہندوئے تو !

اور اس سے بھی بڑھکر ع انبساط عید دیدن روئے تو !

اور اے ہلالِ ما خم ابروئے تو !

خدا معلوم آپنے کسی خوش گلو مطرب کی زبان سے یہ غزل کبھی سنی ہے یا نہیں، اگر سنی ہے تو بس تصور اسی پُرسوز محفل کا جما لیجئے۔ اپنی تو سب سے بڑی مسرت ایک دو دن نہیں برسوں یہی رہی کہ

اس روئے انور کی زیارت ہو جائے۔ اور اپنے کسی عمل کا سب سے بڑا صلہ یہی کہ اس کی داد محمد علی کی زبان سے مل جائے!

ہائے، کتنا محبوب و شاداب چہرہ اور کتنا دلکش و پُربہار بشرہ تھا، جو صبح محشر کے طلوع تک کے لیے نظر سے مخفی ہو گیا! ———— جی چاہتا تھا کہ بس دیکھے ہی چلے جایئے، اور باتوں میں وہ دلآویزی کہ بس سنتے ہی رہیے!

ضمیمہ (۱)

محمد علیؒ

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے، مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا، جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی، اور جس کی موت، اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ اس پچھلے زمانہ میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سروار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لیے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اس خیال سے کہ کچھ بھی چلا جائے محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لیے یہ منادی

---

[۱] سچ (مرحوم) ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء

کردی تھی کہ ماحمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم۔ اس کے فرشتوں نے بندوں تک محمدؐ کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی؛

اے پاک پروردگار، اے سب کے جلانے اور سب کے اٹھانے والے مولا تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب تیری مشیت بلا شبہہ، آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر قادر لیکن کیا ہم جیسے ناتوان و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمایش، اتنے بڑے ابتلاء، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمایشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لایق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لیے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں عین اسی وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت ہماری سب سے قیمتی کمائی، ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا جس کی موت کی خبر بھی سننی پڑے، اسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جا سکتا لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر تیرے حبیب و محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لا سکا تو تیرے اس حبیب پاکؐ کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمایش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمایش کے لیے دل، و جگر کس سے مانگ کر لائیں۔

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں کہ ایک بڑا قومی لیڈر اٹھ گیا۔ نیشنل کانگرس کا سابق صدر چل بسا۔ ہند و مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہو گیا، یہ سب کچھ صحیح ہو گا۔ لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا، پیغمبر رب کا پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا! آج ماتم اس کا نہیں، کہ ایک جادو بیان مقرر اور بہترین انشا پرداز گم ہو گیا، ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی، جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ اور ہر آن اگر تڑپ تھی تو رسولؐ کی نصرت و خدمت کی! اس کی سچی آپ بیتی تو خود اسی کے ایک شعر میں سنیے ؎

سب کھو کے تری راہ میں میں دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

بیشک اس نے دنیا اور دولتِ دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھ دی اور کھوئی بھی کسی کی راہ میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا "پاتے" ہوئے اور "لیتے" ہونے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی اور "کل" انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڑھ میں نام پیدا کیا، آکسفرڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی "سول سروس" کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کیے گئے، بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ پکڑ کر رب کعبہ سے مانگی گئی تھی کہ میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم

بنا دے ساتھ نہ چھوڑا، جو نہ صرف "مسٹر" بلکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا! چہرہ پر داڑھی، سر پہ ٹوپی، جسم پہ کھدر، حافظ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، دین کی تڑپ ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، گریڈ و بہدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی آویزش، جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، "بنگالی ٹولہ" سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلحدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شروانی، مجید خواجہ، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ جہاں تک پہنچ چکی تھی کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اُسے کوئی کیا سمجھاتا، اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر اللہ کے لیے سب سے لڑا، اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی، ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دل شکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے، کوئی کہتا کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں، ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟ کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور و غل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت اور وقت کو ضائع کیا، ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کرنی تھی۔ اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی دیوانہ ہو چکا تھا، اسے جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد

مرعس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، محمد علی کو نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے، وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی کے اس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے، نہ "کمیونلزم" وہاں مدنظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا، اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اس کے لیے باعث فخر یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا، اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اس کی ہندوستانیت ماتحت تھی اس کی اسلامیت کے! وہ خدا، اور "وطن" دو کا قائل نہ تھا۔ قائل صرف "خدا" کا تھا اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض کر رکھی ہے اس لیے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے وابستہ کی گئی ہیں اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں، تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آرہی ہے۔ قالوا یا صالح قد کنت فینا مرجوّاً قبل هٰذا اتنهانا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا وانّنا لفی شكٍّ مما تدعونا الیه مریب۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کا کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا، کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی تھی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا، کسی کو جلا وطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔

محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبوبوں اور عاشقوں سوختہ جانوں اور دل فگاروں کے لیے یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکستِ نفس!

عشقِ معشوقاں نہان ست و ستیز — عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشقِ معشوقاں دو رخ افروختہ — عشقِ عاشق جانِ او را سوختہ

محمد علی تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجہ شہادت رکھتی ہے۔ پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام

شاہد ہے وَالَّذِینَ آمَنُوا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہِ اُولٰئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَاءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لیے ہوئے عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے اور تیرے نیازمندوں کو اپنی جگہ یہ یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا۔ اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا۔ جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا۔ اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی ان شاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص، غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کامریڈ و ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج تجھے خود سنانے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین ۔۔۔ کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے ۔۔۔ ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے

تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا ۔۔۔ چند نعم البدل دیے ہوتے

تھی شہادت کی کس قدر جلدی ۔۔۔ کام کچھ اور بھی کیے ہوتے

خوب کھُلتا بہشت کا رستہ ۔۔۔ ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

بدنصیب قوم تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! اے خفتہ بخت ملت تو آج یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی، صبر کر، جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست، ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے، لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہہ اپنے دل کو سمجھائیں

اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟ ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل ۵۲ سال کی ہوئی۔ حضور انور نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی کی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا۔ قبل اس کے کہ مخدوم کی زندگی میں مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کس کس طرح نکل کر رہیں گی۔

ضمیمہ (۲)

محمد علیؓ کا مقام[1]

محمد علی کی موت، آپ نے دیکھا، کہاں ہوئی؟ وطن سے ہزارہا میل دور، ہندوستان کے کسی گوشہ میں نہیں، حجاز میں نہیں، عراق میں نہیں، مشرق کے کسی حصہ میں نہیں، خاص زمین انگلستان پر، فرنگیوں کے دیس میں، اہل کفر کے درمیان، وطن سے دوری، اکثر عزیزوں سے مہجوری، غریب الوطنی محمد علی کو تو اپنا وطن نہایت عزیز تھا! اور اپنے وطن سے بھی بڑھ کر اپنے آقاؐ کا وطن عزیز و محبوب تھا یہ کیا ہوا کہ موت ایسے دار الکفر میں واقع ہوئی؟ ——— لیکن یہ بھی آپنے دیکھا کہ مرنے کے بعد جگہ کہاں ملی؟ وہ جگہ، جو ہمارے آپکے تصور سے بھی بالاتر تھی، بیت المقدس! سلیمانؑ و داودؑ کا قبلہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ اور خود نبی القبلتینؐ کا پہلا قبلہ! صدہا انبیاء کا مقام بیشمار پیمبروں کی سجدہ گاہ!

موت ہوتی کہاں ہے اور جگہ ملتی کہاں! حدیث کو چھوڑیے جس میں یہ ذکر ہے کہ بیت قدس کی مسجد میں ایک نماز کا ثواب ہزاروں نمازوں کے برابر ہے، خود قرآن مجید کو دیکھیے وہ کیا کہتا ہے مسجد کا نام مسجد الاقصیٰ، دور والی مسجد، کہاں سے دور؟ کس سے دور؟ برائیوں سے دور، گندگیوں سے دور، پلیدیوں سے دور! اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ تنہا وہ مسجد ہی نہیں، اس کا آس پاس، اسکا پڑوس اس کا گرد و نواح برکتوں والا، برکتوں اور رحمتوں کا گنجینہ، بھلائیوں اور پاکیزگیوں کا خزینہ! ہاں وہ مقام جہاں اس کو لایا گیا تھا، اور انتہائی عروج کے وقت لایا گیا تھا، جو سب سرداروں کا

---

[1] سچ (مرحوم) ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء

سردار، اور سارے پاکوں سے بڑھ کر پاک ہوا ہے، سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی، سبحان اللہ! کتنی زندگیاں اس موت پر نثار، جس کے بعد یہ درجہ نصیب ہوا! "جسم" جہاں سے جہاں پہنچایا گیا، سب نے دیکھا "روح" کہاں پہنچائی گئی ہوگی، اس کا اندازہ کون کرے! جسے آدمی کاندھوں پر لاد کر لے گئے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے ہوں گے، اس کا درجہ و مرتبہ کون پہچانے؟

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت

مرگے، کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند!

لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کا ایک بڑا سیاسی لیڈر اٹھ گیا، اور یہ کہہ کر گویا ماتم کا آخری لفظ ختم کر دیتے ہیں! اللہ کے بندو، یہ مرتبے کہیں محض قومی لیڈروں کو حاصل ہوا کرتے ہیں، کہیں محض ایڈیٹروں، انشا پردازوں خطیبوں کے نصیب میں آیا کرتے ہیں؟ یہی بات کسی کے منہ سے نہیں نکلی کہ محمدؐ کا دیوانہ اٹھ گیا! ہاں وہ محمد علی اٹھ گیا، جو محمدؐ کے دین کا شیدائی، محمدؐ کے رب کا پرستار، محمدؐ کی امت کا عاشق، محمدؐ کے نام کا دیوانہ تھا، وہ محمد علی جس نے اپنے کو محمدؐ میں فنا کر دیا تھا، محمدؐ کے غلام کے مرتبے بھی اونچے نہ کیے جائیں گے تو اور کس کے کیے جائیں گے؟

ضمیمہ (۳)

"اسلام کا دیوانہ"

[فاضل اجل، شیخ وقت، علامہ مناظر احسن گیلانی بہاری شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ کی تقریر، جو مولانا کے جلسۂ تعزیت منعقدہ ۵ جنوری ۱۹۳۱ء میں شہر حیدرآباد دکن میں کی گئی]

مولانا محمد علی مرحوم جن کو اب میں حضرت مولانا شاہ حاجی حافظ محمد علی شہید نور اللہ ضریحہ واشرق بنور وجہہ روحہ کہتا ہوں۔ کے متعلق لوگوں کا کچھ ہی خیال ہو لیکن ان کے ایک نادیدہ مخلص کے سامنے ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچے کے ایک مجذوب فقیر تھے۔ کل ساڑھے بجے حیدرآباد کے مسلمانوں کا ایک عظیم جلسہ رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے جمع ہوا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا، جلسہ سے کچھ دیر پیشتر دماغ میں چند مصرعے موجزن ہوگئے۔ قلمبند کر لیا چونکہ تعزیتی تجویز کے پیش کرنے کی سعادت میرے سپرد ہوئی تھی، اس لیے کھڑا ہوا اور بول نہیں سکتا تھا لیکن بولنے پر مجبور ہوا۔ حمد و نعت کے بعد وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا وسیجزی الله الشاکرین وماکان لنفس ان تموت الا باذن الله کتابا مؤجلا، ومن یرد ثواب الدنیا نؤته منها ومن یرد ثواب الآخرة نؤته منها وسنجزی الشاکرین۔ پھر حدیث الاعمال بالنیات ولکل امرء ما نوی الحدیث۔ پڑھی اور کہنے لگا کہ اپنی بے زوری میں زور پہنچانے

کیلیے میں نے پناہ اسی تاریخی آیت کی لی ہو جس کے نیچے دنیا کے سب سے بڑے انسان سے جدا ہو جانے کے بعد دنیا کی سب سے بہترین جماعت کو تسلی ملی تھی۔ دیکھو رامپور کی ایک بیوہ جو ایمان و اسلام کے گھرانے کا روشن چراغ تھی۔ اور عزم و یقین کا پہاڑ۔ اس سے کہا گیا کہ اپنے بچوں کو اس اسلامی مدرسہ میں بھیجدے جس کا نام مدرسۃ العلوم مسلمانان تھا۔ نیک بخت ضعیفہ نے اسلام ہی کیلیے غالباً اس نیت سے اس نے اپنے بچوں کو وہاں داخل کیا لیکن معاملہ دوسرا ہوا۔ اس نے اسلام کے آغوش میں پرورش پانے کیلیے لڑکوں کو اس مدرسہ میں بھیجا تھا لیکن انکو ایسی گود میں ڈالدیا جس کی ہر شکن اسلامی تحریک کے لیے خطرناک ضرب تھی۔ لڑکے بوڑھے کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس نے انکو دین سے نزدیک ہونے کیلیے بھیجا تھا لیکن وہ دور ہوتے گئے اور اتنے دور کہ بالآخر ان میں جو تھا جو تھا اس کیلیے یہ بعد بھی کافی نہ ہوا اور وہ آکسفورڈ کے بلند میناروں پر چڑھ گیا۔ جہاں سے اسکی ماں کا وطن ایمان نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بڑی کامیابیاں، بڑی اولوالعزمیاں تھیں، جو اس غیر اسلامی فضا میں اسکے اردگرد جمع ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد کا وہ تیسرا ہونہار طالب العلم شمار کیا گیا۔ کرزن رانلمہ کے بعد اسکی تصویر سے آکسفورڈ کے حلقوں نے اپنی نمائشی کمرہ کو سجایا۔ وہ ہندوستان واپس ہوا یہ جذبہ لیکر کہ روپیہ کے سنہرے کے کسی ڈھیر میں اپنا حصہ مقرر کرلے۔ اور عمدہ موٹریں، دلکش بنگلے، قسم قسم کے کھانے، طرح طرح کے لباس سے اندرونی لذت ہوتے ہوئے ہمچشموں میں اپنے کو نمایاں کرلے۔ چند دنوں کیلیے وہ اس وادی میں چلا گیا لیکن بڈھی ماں کی پاک سرشت غیب میں جاکر جاذبۂ الٰہیہ کی صورت میں مبدل ہوئی۔ مسٹر محمد علی (آکسن) پر پالٹیکس کا جنون سوار ہوا۔ بڑودہ سے روانہ ہو دیکھا گیا کہ چڑھی ہوئی مونچھوں، زرق برق سوٹوں کے درمیان ایک عالیشان کوٹھی کے اندر ٹائپ رائٹر لیے ہوئے اس مسلمان بڈھی بوڑھی کا لڑکا ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اپنا ادبی زور، انسانی قوت، سیاسی مہارت کا غلغلہ بلند کر رہا ہے۔ نہ صرف ہندی انگریزی داں بلکہ خالص اینگلو سیکسن نسل کے افراد جنہیں اس عہد کا وہ شخص بھی شریک تھا جو براعظم ہند کا گورنر جنرل اور برٹش ایمپائر کے تاجدار کا نائب السلطنت سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی بیوی ہفتہ میں دن تک نہایت اضطراب میں گزارتی تھی جس دن ان کا مرشد پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔ یہ پہلی کمند تھی جو پھینکی گئی تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک باغی کے ہو

غلام کو اسکے آستانے تک پہنچا دیا جائے۔ دوسری جنبش دنیا کے اس "حادثۂ عظمیٰ" سے شروع ہوئی جس نے مختلف دوروں سے گذرتے ہوئے بالآخر مسئلۂ خلافت کے مستقل عنوان سے شہرت حاصل کی۔ "خلافت" کا دامن اگر ایک طرف عالمگیر سیاست عالم سے بندھا ہوا تھا، لیکن بہرحال اس کا دوسرا کنارہ اس سراپردۂ نبوت سے وابستہ تھا جس کے گوشے قبۂ خضرا کے کنارے لٹک رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ محمد علی نے خلافت کو سیاست سمجھ کر پکڑا لیکن خلافت نے مسٹر محمد علی (آکسن) کو اس نیت کے ساتھ پکڑا جو اس کی ضعیفہ ماں کی آخری آرزو تھی۔ کچھ دن گذرے کہ آکسفورڈ کا مشہور و معروف علی گڈھ کالج کا فخر و ناز گھسیٹا جا رہا تھا کھینچا جا رہا تھا، اور ان جھٹکوں کے ساتھ گھسیٹا جا رہا تھا کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا، وہ کھینچا کھینچا، اتنا کھینچا کہ بالآخر اس کی نگاہوں سے وہ سارا تماشا نابود ہو گیا جو ایک اس کے سامنے تھا۔ اب اس کے آگے کچھ نہ تھا اور اگر کچھ تھا تو وہ صرف جمال جہاں آرا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہ اس میں غرق ہوا، ڈوبا اور ایسا ڈوبا کہ پھر کبھی نہ ابھرا عشق کی وادی میں سیاست کے میدان سے آیا تھا، نادانوں نے آخر وقت تک اس کو لیڈر، قائد، انگریزی زبان کا منشی، اردو کا خطیب و شاعر سمجھا، حالانکہ محمد علی تو جانباز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور یوں "انما الاعمال بالنیات" کی تفسیر پھر ایک بار ایسی ہستی کے ذریعہ سے کرائی گئی جس کی عظمت و جلال کا سکہ ایشیا پر بھی جما ہوا تھا اور جس کے رعب قابلیت کی دھاک یورپ کے قلوب پر بیٹھی ہوئی تھی، جس کا ذکر افریقہ کے صحرا میں بھی عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اور جسے وہ بھی جانتے تھے جو نئی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ حدیث بخاری کے پہلے صفحہ میں پڑھو اور اس کی شرح ایشیا کی وسعتوں، یورپ کی کشادگیوں، امریکہ کی پہنائیوں، افریقہ کے طول و عرض پر مطالعہ کرو۔

محمد علی کیسی غلطی تھی ان لوگوں کی جو تجھے آخر میں بھی وہی سمجھتے تھے جو تو اول میں تھا،

اور اس سے صبر و قرار کی توقع کرتے تھے، حالانکہ وہ حرفِ تھا، اور اس سے حزم و احتیاط کی امیدیں باندھتے تھے، حالانکہ اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ اس سے مصلحت دوزی و عاقبت اندیشی کا انتظار کرتے تھے، حالانکہ وہ مصلحت سوز تھا۔ ہاں کبھی وہ مسٹر محمد علی آکسن تھے لیکن کیا اب وہ علوی شجاعت کے اندر غرق ہو کر صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فانی ہونے والا انسان نہ تھا۔ یقیناً اس نے کبھی شیکسپیر اور ملٹن کے اشعار یاد کیے تھے لیکن اب اس کی زبان پر قرآن مجید کی ربانی آیتوں کے سوا اور بھی کچھ تھا، کیا عجیب انجام ہوا اس شخص کا جو شیطانی راہوں پر سلوک کرنے کے لیے نیت کی نہیں بلکہ تجویز کی غلطی سے پڑ گیا لیکن جذب کی قوت نے راہ کفر کے اس سالک کو اسلام کے میدان کا مجذوب بنا دیا، وہ آکسن اور مسٹر بن کر جوان ہوا تھا لیکن حاجی، حافظ، مولانا بن کر شہید ہو گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔

مولانا عبدالماجد صاحب! میں نے کن مشکلوں سے ان فقروں کو ادا کیا اور کس طرح اس وقت لکھ رہا ہوں بس کیا عرض کروں۔ میں نے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں دیکھا تھا لیکن میری روح ان کو دیکھ رہی ہے، خدا جانے کیا مناسبت تھی۔ آپ کا بار بار یہ جملہ یاد آتا ہے "کہ تجھ سے اور ان سے بڑی مناسبت ہے"۔ بہرحال میں نے اور خدا جانے کیا کہا۔ کیا بکا۔ اس کے بعد وہی چند مصرعے جو موزوں ہوئے تھے شکستہ حال میں چیخ چیخ کر سنانے لگا۔ اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، جو کچھ میں ان کو پا رہا ہوں، ان مصرعوں میں شاید اُن کی تصویر کسی نہ کسی طرح اتر گئی ہے۔

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی — فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ ما ئیس عشقبازاں — بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی

به دل بودی فقیرے بینوائے — به قالب پیکر شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — دگرنہ عاشق مستانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نسوزم — تو شمع دین را پروانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت — ز آئین خرد بیگانہ بودی
بیابانہا ز تو زورے و شورے — بجانہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی از رہ اخیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

چہ آمد بر سر زندان کہ آن را
خم و خمخانہ و پیمانہ بودی

ضمیمہ (۴)

"دیباچہ سیرت محمد علیؒ"

[سیرت محمد علی، مصنفہ مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی، شائع شدہ ۱۹۳۲ء پر دیباچہ

مولانا دریابادی کے قلم سے]

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے۔ اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سرفہرست کس کو بنایا جائے، اور کون ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے، اور وہ نام امت کے محبوب ترین ناموں "محمد" اور "علی" کا مجموعہ ہوگا۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علمائے دین پیدا کیے، لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی وگرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور ریفارمر پیدا کیے، لیکن ان کی اور ان کے "ریفارم" دونوں کی شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب زبان آور پیدا کیے۔ لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگرسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہی حال دوسرے مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور ان سے بھی تنگ تر دائروں میں

---

[1] نوشتہ ۱۹۳۳ء

گونج گونج کر رہیں۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی، اُجالوں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائےگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی، اور جیلخانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں نے بھی، راجوں اور مہاراجوں کے قصر و ایوانوں نے بھی۔ اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام سن سن کر ڈراینگ روم کے کوچ اور سوفے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسے۔ اس کا پیام سن سن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا بلبلا کر روئے۔ خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے کھنڈر، ویرانے، "قوم پروروں" کی کانگریس، اور "ملت پروروں" کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ، سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقشِ قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، یہ قبول خداداد اور مرجعیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت زور بازو کا نتیجہ نہیں۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں کا ہو گیا تھا، اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے۔ محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا، وعدۂ ربانی کر

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال

سیجعل لھم الرحمٰن ودّا ‏ کرتے رہے ہیں، خدائے رحمٰن ان کے لیے (خلق کے
(مریم - ع ۹) ‏ دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔

کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت و پوست میں مجسم محمد علی کی زندگی میں نظر آئی!

اس دل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کی خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے۔ جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی ———— وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ ———— دولت کیا ٹھیرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی! ایک آئی دولت اور فانی نعمت تھی، آئی اور گئی۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح ‏ باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر مسلمان! انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضیٰؓ کی؟ خلیفۂ رسول عثمان غنیؓ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسینؓ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کر ان کے غلاموں کے غلام محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجیے! صانع کامل کی مصلحتیں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا؟ کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے۔

ادب، سیاست، خطابت و صحافت، قیادت اور انشا پردازی طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہو گیا تھا، مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں پہچان لیا، اور

جیتے جی نہیں، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا۔[1]

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی — فدائے ملّتِ جانانہ بودی

ببزمِ اہلِ عشق بازاں — ببزمِ دشمناں فرزانہ بودی

بدل بودی فقیرے بے نوائے — بقالب پیکرِ شاہانہ بودی

سیاست را نقابِ چہرہ کردی — وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

سیاست تہمتے بر حسنِ پاکت — ز آئینِ خرد بیگانہ بودی

چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم — تو شمعِ دین را پروانہ بودی

بیانہا ز تو زورے و شورے — بجانہا ہمت مردانہ بودی

رسیدی اندرہ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے محمد علی جو کچھ بھی رہے ہوں۔ علی گڈھ کے ایک مشہور کھلنڈرے، آکسفرڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشاپرداز، ایک بہترین ایڈیٹر، شیکسپیر کے ایک ماہر نقاد، اتھیلو وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہو گئی تھیں، اور کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے ضبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا لیکن دل سے صدا اٹھی تو بس یہی کہ آج "محمد" کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں وہ محمد کا شیدائی، دینِ مصطفےٰ کا دیوانہ، اسوۂ محمدی کا بن داموں کا غلام تھا،

[1] آگے فارسی کا کلام مولانا مناظر احسن گیلانی کا ہے۔

ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور اس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی۔ مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی۔ اسلام پر، قانونِ اسلام پر، شعائر اسلام پر کہیں کوئی حملہ ہوا اور تڑپ محمد علی کے دل وجگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آ پڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، خود مسلمانوں سے ہو محمد علی کا سینہ ہروار کے لیے سپر بنا ہوا! ۱۹۲۶ء میں حج اور شرکت موتمر اسلامیہ کے لیے حجاز جاتے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم سے خود لکھا "اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی"۔ دن رات، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ۔ آخری سفر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، تو اس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی موت جب آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے لے کر غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے، اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم برپا ہو جائے، اور یہی ہوا! پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، جو بعض انبیاء کرام تک نے کی! سلیمانؑ اور داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی آخر المرسلینؐ کا پہلا قبلہ!

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت (اقبال)

جسم کو جو عروج نصیب ہوا وہ سب نے دیکھا "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے، اسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجہ و مرتبہ کو کون پہچانے!

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کرسکتا ہو، جو عین ہیجانِ مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل شستہ و برجستہ اظہارِ خیال کرسکتا ہو، جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے سارو اایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کرکر کے انھیں قائل و معقول کرسکتا ہو، گرد میں سیاستِ حاضرہ اور مذہب پر دس دس، بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشا کے ساتھ سپردِ قلم کرسکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ ان ہی میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگولے، اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ جائیں۔ محفلِ سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آجائے۔ مسئلہ قتلِ مرتد پر جب فقہی استدلال و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے اہلِ علم عش عش کر اٹھیں۔ آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے۔ نماز کا پابند اتنا کہ برطانوی ایوانِ پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے۔ اور اس خالص فرنگستانی عمارت میں بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے۔ دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے۔ سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے۔ ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہلِ سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرفراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی جامع الورود ہستی کی سوانح مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے، اس پچیس تیس سال

کے اندر اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند، اور عالم اسلامی میں، جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی، محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کار فرما، اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ سہی، اس میں موجود، ایسے شخص کی سیرۃ نگاری ایک شخص کی سیرت لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کیے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے، اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیں، اور وہ بھی فی الفور نہیں، ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی، لیکن حالات مساعد نہ ہوئے تھے نہ ہوئے۔ تفصیلات کو چھوڑیے، ان اسباب کی شرح اگر کیجائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے۔ جمود و افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر، جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و نوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لیے کئی کئی قوی الجثہ اور تنومند پہلوان کشتیاں نکالے ہوئے اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار رہتے۔ آفرین و رحمت اس کی ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی و کارگذاری پر جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ——— وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا۔

منازل سفر کی دوریوں، اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سروسامانیوں اور

یارانِ طریقت کی کج ادائیوں کی حکایت کیا، اور کس سے کیجے؛ اور کیجے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے، خود جوہر ہی کے الفاظ ہیں

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہرکیف و بہرحال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضرِ خدمت ہیں، یہ "تحفۂ دل" ہیں۔ ان پر "مالِ تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحبِ سیرۃ کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گذری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے۔ اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے، "فالدِّقّا بنا" کے وقائع اور کارنامے کوئی "حافظ شیراز" کی زبان میں آخر کیوں کر بیان کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جابجا صدمہ یقیناً پہنچے گا، اس کے لیے شروع سے تیار رہنا چاہیے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰؓ کے سیرۃ نگار کے لیے جنگ صفین اور حسین ابنؓ علی کے سوانح نویس کیلیے میدانِ کربلا کا ذکر زبانِ قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہے؟

ضمیمہ (۵)

جوہر اور ان کی شاعری

[کلام جوہر (مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۳۵ء) پر مقدمہ، مؤلف ڈائری کے قلم سے]

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں، بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا، جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں میرے ایک حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کا رہے کا زاں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا اس لیے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہو کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مشکی خر — آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

---

[۱] نوشتہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۵ء

داغ کی غزل یاد کیجیے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کچھ کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے، سن کر پھڑک گئے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیے میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کے زانو پر کودا ہوں، اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۹۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو اور فضول شعر مگر بامعنی اور موزون کہے تھے اور اچھا ہوا اب کسی کو یاد نہیں، ورنہ جب میری Offical Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھے، کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے یا سیرت پیشوا ئے قوم ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے دجن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ "بھائی یہ تو چڑیا چڑونٹے کی کہانی اور مطلب بھی صاف

معلوم ہوتا ہے، مگر مدرسہ والوں سے ڈربی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے۔ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو اور جواب دہی ہمارے سر پڑے۔" آپ نفسیات کے ماہر ہیں کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیے کہ گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا، اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے، اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔" مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعِ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم تین شعرا کا کمال

حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب (تربیل دآزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر"۔ خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعد حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا جو چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا، ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمرد میں نہیں وہ چاندنی نہیں لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارہ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے۔ گر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالات گرد و پیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کیڑے بھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر ہمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آئی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی

بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ "تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ کر بھیجیے۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں۔ (Touch stone کی معشوق سے زیادہ قابل قدر نہیں۔ A poor thing but mine own

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ ....

(غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے بقول آپکے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی کے لیے ہیں۔"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپنے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں کسی اخباری مضمون کا نہیں ایک خانگی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر ۲۶ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۱۶ء کے شروع میں، اسی نظربندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں۔ کسی والانامہ میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیے تھے۔ اس پر اس نیازمند کا اشتیاق بڑھا، عرض کیا کہ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپکے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے۔ ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا آپ اوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ! اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کرکے، ٹھہر ٹھہر کر اور غور کرکے لکھے جاتے ہیں؟ —— بیچارہ کو خیال تک نہ ہوگا کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپکر

اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، قوم کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے (یا کانگریس اردو میں "چنے گئے")۔ لوٹ کر آئے۔ بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکلا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی اور کلب میں بھی! شیکسپیر کے فلاں ڈرامہ پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر صحیح معنی میں لیڈر تھے۔ اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی بے خود اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علیؒ کے قالب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور بن نہ پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ترکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لیے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونیں پیش آگیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ——— اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے ساتھ مست تھے! ہاں مست الست! ———

ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ

شروع ہوگئی، ــــــــــ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ : آہ کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا ــــــــــ محمد علیؒ اب اپنے عالم میں کہاں تھے، قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منھ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظربندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں، اکھٹے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بنکر نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی ترچھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

بول لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے   اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں ٹھہری مہر، لیکن حقیقت مہر کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ سب نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشقِ معشوقاں نہان ست و ستیز   عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر

محمد علیؒ اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہوچکے تھے، سوچ سمجھ کر بولے ؎

یہ نظربندی تو نکلی رد سحر   دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لیے نقد جان کا مطالبہ ہوتا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظربندی ملا   کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسرے کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں ہم کو سرِ دار دیکھکر　　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے۔ یہ خاکسار عرض کرے گا کیا خوب اظہارِ حقیقت کر دیا ہے! اسی نظربندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا "ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی گھر گھر تبلیغِ اسلام کروں"!

نظربندی اور اس کے بعد جیل پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا تھا، توپ پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پیترے! ادھر ہندوستان کے اندر حکومتِ پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا کہ محمد علیؒ دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں۔ وقت کی ضرورت ناگزیر کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی!

اذاں حرم میں کلیسا میں دیر میں ناقوس　　　کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدمِ تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہرحال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال چکے تھے اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء میں پکڑے گئے اور اگست سنہ ۲۳ء تک کچھ کم دو برس پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار دولتمدار کے مہمان ——— اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت　　　اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن، مذہب سے عزیز تر، دنیا دین پر مقدم، کانگریس کے صدر منتخب ہوئے، ملک نعروں سے گونج اٹھا! محمد علیؒ کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر!______ وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل وجان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لیے یہ خبر سنکر کیسا کچھ بے چین نہ ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں، پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو۔ وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے، قرآن میں کیا "تخرج الحی من المیت" مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب، اس کے بعد جو شعر ہے اسے کے پڑھنے سے پہلے اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اتارا!

۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا ــــــــ

نہ پوچھیے کہ محمد علیؒ پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی خبر محمد علیؒ کے حق میں خود قیامت بن کر رہی، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر سب جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۲۴ء سے آغاز ۳۱ء تک زندہ ضرور رہے اور بہتیرے زندوں سے بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے، سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد ۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی دیا دیتوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا! اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا! لیکن دل کی کلی جو الغائے خلافت سے مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علیؒ اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے ڈھو رہے کر رہے تھے! ــــــــ

اب وہ انسان نہ تھے۔ صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر دیکھنے میں لندن کا سفر تھا گول میز کانفرنس کے لیے، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! خوش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"۔ مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان ۱۳۴۹ھ کی بند رہویں شب

میں عین اُس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، منفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے مشیت الہٰی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ــــــ شاید اس لیے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے! "آزادی" محمد علیؒ کے ملک کو کیا ملتی، محمد علیؒ کی روح کو البتہ مل گئی، بند ء اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں، قبلہ اول ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل، اقبال نے کہا ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ کا غلام اور رشید الی محمد علیؒ جا کس راستہ سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پہ رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا دلی یا کلکتہ یا بمبئی میں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں تو آسانی سے نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر | یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے، اس کے لیے ضرورت کسی تمہید کی ۔ نہ دیباچہ کی نہ پیش نامہ کی۔ ورق الیٹے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی

طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہیے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو شاید راہ اور زیادہ سہولت اور خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علیؔ ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو — مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا — تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں — پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش — تھی رات یاس اور دلِ ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا — دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں۔ انگریزی سنہ ۱۹۰۷ء ہے۔ علی گڈھ، محمد علی کے محبوب علی گڈھ میں لڑکوں نے انگریز استادوں کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے۔ کالج بند، خدایانِ کالج حیران و پریشان۔ بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں۔ مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے۔ اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر کے دم بھرنے پر نہیں ناز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں اپنے جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو	ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو
یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شک ہے ہم کو	وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغولِ دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڑھ میں	اور اس پہ یہ تماشا کہ ہر طرف اور جا بجا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا	جو اسکی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو
تم ہی ہو زندۂ جاوید باقی جانے والے ہیں	نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیلِ بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں، یک بیک خبر پہنچی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین ؟ کامریڈ کی اڈیٹری میں محمد علیؒ کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشاپرداز۔ کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے اڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سرشام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسہ سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی اور یہ رونقِ صحافت و سیاست رخصت۔ محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؂

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین	کوئی دن اور بھی جیے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے	ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رندِ بادۂ حق کے	ابھی دو چار خُم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی	کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کھلتا بہشت کا رستہ	ساتھ ہم کو بھی گر لیے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا، وہی رنگ یہاں بھی ہے، شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی

اہتمام کسی نظرثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح و ترمیم بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے، یہی حال نثر کا ہے یہی حال نظم کا ہے۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظربندی" کا تھا لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت "نظرکشائی" کا قرار پایا۔ خوب خوب پتہ کی کہنے لگے ؎

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو ۔۔۔ ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے تھک گئے اُسے ۔۔۔ اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیئے گا ؎

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے ۔۔۔ یہ کیا کہ ہے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا ۔۔۔ جو ہو وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

وہ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ۔۔۔ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو ۔۔۔ باقی ہے موت ہی کا دل بے مدعا کے بعد

حنا کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھئے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ۔۔۔ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ۔۔۔ ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

قعرِ جہنم عشق ہے بے صرفہ محتسب ۔۔۔ بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہرحال ایک مسلّم استاد تھے۔ جوہر ان کے مقابلے میں مبتدی اور نوآموز محض

پھر بھی شعر کچھ ایسا بیٹا نہیں۔ یا ؎

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں — آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر ہندوستان بھر کی سڑکوں پہ، گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پہ چرچا تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی بی اماں کا تھا۔ اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؑ کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے یا اپنی آٹو بیاگرافی (خود نوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلم بند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا — سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت — پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے

کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے — اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لیے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے	ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعہ کو رکھا ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لیے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو۔ عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔

جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا۔ جوش سے بے خود یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی	سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلیے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا	تفسیر آج ہو گئی کید متین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا	ایک عرض اور بھی ہے الٰہی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اسکے باب میں	کب ہوگی لامکاں سے مشیت مکین کی
تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہ	ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑا دیا اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رام پور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، پڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ کسی کو مستقل جلا وطنی بھگتنا پڑے جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی

سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے　　ہم نہ تھے ان کے آستانے کے

ایک ایک کر کے سب گئے تنکے　　ہوئے برباد آشیانے کے

دیکھیے اب یہ گردش تقدیر　　کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھیے کیا ہو بود و باش کا حال　　ہم ہیں باشندے جیلخانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں، سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا! راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں　　اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے　　ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے　　ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت　　اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں　　بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس قید پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانہ پر ہزاروں آبادیاں! مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوہا جب تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جوہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے۔ ان کی شاعری الفاظ و حرف کی اب رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا دیوانہ جیسے ایک دوسرے دیوانے بلا کسی ظاہری تعارف و ملاقات کے خوب پہچانا اور خوب ہی کہہ الا

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی — فدائے ملتِ جانانہ بودی

سیاست را نقابِ چہرہ کردی — دگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت — ز آئینِ خرد بیگانہ بودی

رسیدی از رہِ اغیار تا یار — عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن)

زبان پر آئی ہوئی 'واہ' کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل سے نکلی ہوئی 'آہ' کی رسائی مالک کے عرش تک! رومی اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لیے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لیے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہوگئے، محاورات تبدیل ہوگئے۔ ترکیبیں نئی ہوگئیں، لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جوہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا۔ فنا کر دیا تھا۔ عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے!

ضمیمہ (نمبر ۲)

محمد علیؒ

مُبلّغ، مُفسّر، مناظرؒ

(۱)

"انگریزی ترجمۃ القرآن کے نسخوں کا پہنچنا میرے حق میں سر دہ بہ مستاں یاد دہانیدن کا مضمون ہوگیا۔ جن کرم فرمانے یہ تحفہ عنایت کیا تھا، انھیں میں نے خط میں لکھا کہ اس سے بڑھ کر مسرت کا دن اور کون میرے لیے ہوگا کہ اس قید و بند سے رہائی پاتے ہی یورپ پہنچوں اور وہاں کے ہر شراب خانے سے نہ سہی تو کم از کم ہر ہر پارک، ہر ہر چوراہہ سے ان جنگ کے دیوانوں کو اُس دین کی تبلیغ کروں جو اسلام کی آشتی اور امن کے اندر قومی جنگ و جدل کے نعروں کو یکسر خاموش کر دیتا ہے۔ اسلام کی حکومت اس عصبیت و تنگ نظری کی دشمن ہے، جو قوم کو خلق کرتی رہتی ہے، اور انسان کا کام تمام کرتی رہتی ہے۔ ہمارا اللہ رب العٰلمین ہے۔ اس کے ہاں تفریق نہ عرب و عجم کی، نہ آریائی اور سیما طیقی نسلوں کی اور نہ اینگلو سیکسن اور ٹیوٹن قوموں کی" (ص ۱۲۱)

یہ الفاظ کس کے قلم سے نکل رہے ہیں؟ تبلیغ اسلام کی یہ تڑپ کس کے دل میں اٹھ

لہ یہ مضمون خلافت (بمبئی) کے محمد علی نمبر کیلئے لکھا گیا تھا، پھر صدق جلد اول نمبر ۳ (یکم جون ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا۔

رہی ہے ؟ دعوتِ دین کے اس جوش و ولولہ سے کس کا سینہ شق ہوا جا رہا ہے ؟ ——
کہیں مولوی محمد علی لاہوری نہ سمجھیے گا۔ یہ درد دل اس محمد علی کا ہے جو "کامریڈ" کا اڈیٹر تھا اور ملک و ملت کا مشہور لیڈر، چھنڈواڑہ کا نظربند، اور کراچی کا باغی، کانگریس کا صدر اور احرار کا سردار، تحریکِ خلافت کی جان، اور تحریکِ ترکِ موالات کا روح رواں، جسم اسیرِ فرنگ اور روح طوافِ کعبہ میں مشغول! ہاں وہی محمد علی جو کبھی علیگ اور آکسن تھا

یہ نظربندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

"حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے" اور "معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے"
ان مصرعوں کو جی چاہے چھوڑتے جائیے۔ مگر کیا اس شعر پر بھی نہ رکیے گا؟

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے!

شعر و قافیہ کی داد کا خیال بھی دل میں نہ لائیے۔ یہ اگر شاعری ہے تو آخر آپ بیتی کسے کہا جائے گا؟

محمد علیؒ کو بے شمار انسانوں نے جانا۔ گنتی کے چند تھے جنھوں نے پہچانا۔ "تقریر" کی گرج دلوں کو دہلا کر، ملک کے در و دیوار کو ہلا کر رہی۔ "تکبیر" کی بھنک بس خال ہی خال کسی کے کان میں پڑی۔ بجلی کے لپ کو جلتا اور چمکتا سب ہی دیکھتے ہیں۔ بجلی کا "کرنٹ" کس خزانہ سے آتا ہے، اس کی خبر کسے ہوتی ہے؟ قوم کی لیڈری، سیاسیات کی رہبری، سب نے دیکھی ان ساری سرفروشیوں اور جانبازیوں کی تہ میں جو دین کی تڑپ تھی اس پر نظر بہت کم لوگوں

کی ٹیڑی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں نظر بند ہوئے۔ مہرولی لینسڈاؤن ہوتے ہواتے، نومبر ۱۹۱۵ء میں چھنڈواڑہ پہنچے، اور نظر بندی کے کوئی چار برس یک لخت یہیں گزارے۔ قرآن مجید کی تلاوت، برکت اور ثواب کے خیال سے شروع سے کرتے چلے آئے تھے، معانی و مطالب کی سمجھ کے ساتھ اس کا مطالعہ زندگی میں پہلی بار اب شروع کیا، اسلام کی دردمندی پہلے سے موجود تھی۔ اب قرآن پاک نے اپنا اعجاز دکھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا والہ و شیدا مست و دیوانہ بنا لیا! ——— بارود اگر پہلے ہوئی ہو تو دیا سلائی دکھاتے ہی آگ پکڑ لینے میں دیر کیا لگے گی؟ ——— مسلمان محمد علی نے اب از سر نو اسلام قبول کیا۔ اب وہ مسلمان اس لیے نہیں تھا کہ مسلمان گھرانے میں پیدائش ہوئی تھی، اور باپ دادا کا مذہب اسلام چلا آتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی عقل نے اور تحقیق نے اس مذہب کو اختیار اور اسکے دل نے اور دماغ نے اس دین کو سب سے اچھا اور سب سے پکا اور سب سے ستھرا پایا۔

"نومسلم" کے جوش کا پوچھنا کیا۔ نومسلم محمد علی کی ذہنیت عام بشری ذہنیت سے انوکھی نہ تھی۔ بلا کا جوش تبلیغ پیدا ہوا۔ دل بے تاب کہ جو دولت اپنے کو نصیب ہوئی ہر کھینچ کھینچ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر ایک عالم کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ جلد سے جلد بھی اور زائد سے زائد بھی۔ اور طبیعت بے کل کہ دنیا جہان میں اللہ کا کوئی بندہ اس نعمت سے محروم نہ ہونے پائے،

لیکن سب سے بڑی دھن اس کی کہ کوئی اور آئے یا نہ آئے کم سے کم یورپ اور امریکہ تو ضرور ہی اسلام کی حلقہ بگوشی میں آجائیں۔ پانچ برس بعد سنہ ۱۹۲۳ء کے مئی جون میں جب بیجاپور جیل میں قید سخت کاٹ رہے تھے، اس وقت اسلام پر انگریزی زبان میں تصنیف کی سوجھی۔ دکتابوں کا کوئی بڑا ذخیرہ پاس، نہ بیٹھنے کے لیے کرسی اور میز، اور پھر ادھر دل کی

اور ہند کے قومی و ملّی معاملات میں الجھا ہوا۔ ادھر ہوش، جوان چہیتی لڑکی کے مرض الموت کی خبریں پاکر اڑے ہوئے۔ اس پر بھی ذوق و شوق نے اچھی خاصی ضخامت کا مسودہ تیار کر دیا۔ ختم ہوجانے اور نظر ثانی کے بعد تو خدا جانے کیا کچھ، اور کتنا کچھ ہو جاتا۔ موجودہ ناقص، ناتمام اور بالکل قلم برداشتہ ابتدائی مسودہ کی صورت میں وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں طومار کاغذات کے اندر جو کچھ ملا وہ جامعہ ملیہ والوں کی ہمت سے ٹائپ ہوگیا ہو فلسکیپ کے ۳۰۴ صفحوں میں آیا ہے۔ اور اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خاکہ ذہن میں تھا، مشکل سے اسکا نصف دائرہ تحریر میں آسکا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کتاب ایک طرح کی آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری (آٹو بیاگرافی) ہے۔ مضمون یہ ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا، آنکھ کھول کر اسلامی تعلیمات کے یہ یہ نشانات دیکھے۔ گھر میں یوں رسماً مذہبی تعلیم پائی۔ مکتب، اسکول، کالج میں مذہبی و روحانی حیثیت سے ماحول کی صورت یہ رہی۔ گرد و پیش بے دینی کے چلن یہ یہ دیکھے۔ جنگ بلقان، یورپ کی سیاسی بد دیانتی کے ہولناک مظاہرے فلاں فلاں دیکھنے میں آئے۔ اور پھر جنگ عمومی نے یورپ کے روحانی واخلاقی افلاس کا پردہ بالکل ہی فاش کر دیا۔ حق گوئی نے نظر بند کر دیا ——————

نظر بندی ۱۹۱۴-۱۹ء کے زمانہ میں پہلی بار قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کا موقع ملا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسلام کی حقیقت اب سمجھ میں آئی۔ عبدیت الٰہی اور خلافت فی الارض کے معنی اب روشن ہوئے۔ یورپ کے سارے درد کا درمانِ وحید اسلام ہی نظر آیا۔ اپنی ترقیوں پر مطمئن، نت نئے آلات کی ایجاد میں منہمک، سارا فرنگستان مہذب درندہ بنا ہوا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا، اپنی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ ان غریبوں کو کیا خبر کہ دنیا کو

تسکین کی راہ دکھانے والا مذہب، اسلام کے نام سے موجود ہے۔ یہ بدنصیب تو اپنے مذہب کو مذہب سمجھے ہوئے ہیں۔ ان مروجہ مذاہب کی جو حقیقت ہے اس سے تو لامذہبی بھی کوئی ایسی بری چیز نہیں۔ گڑھی ہوئی انجیلیں، پولوس کی مشرکانہ تعلیمات، بھلا ایسے خرافات کے مجموعہ کو آسمانی مذہب حقانیت و روحانیت سے واسطہ کیا؟ ——— آگے خدا جانے کیا کیا ہوتا۔ ناتمام کتاب بس یہیں پہنچ کر تمام ہو جاتی ہے۔ کتاب کا نام "Islam The Kingdom of God"

یعنی اسلام یا حکومت الٰہی ہے۔ اسم با مسمّیٰ۔ اس لیے کہ تشریح کتاب بھر میں زمین پر نیابت الٰہی قائم کرنے اور دنیا کو عدل سے بھر دینے کی اور مرکزی نقطہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کی تفسیر ہے۔ اسی کتاب کا جسے ابتک نہ کسی کمپوزیٹر نے کمپوز کیا، نہ کسی پریس نے چھاپا، نہ کسی دارالاشاعت نے شائع کیا، اقتباس شروع مضمون میں درج کیا گیا۔ محمد علی وہاں ذکر پانچ سال قبل ۱۹۱۸ء کی کیفیت کا کر رہے ہیں، لیکن کیفیت پانچ سال بعد ۱۹۲۳ء میں بھی جوں کی توں موجود ہے۔ (اور موجود تو ۱۹۳۱ء میں مرتب دم تک ہی) ایک اقتباس آپ دیکھ چکے۔ اب دوسرا ملاحظہ ہو:-

"آسٹریلیا یا افریقہ کے کسی وحشی کو جس نے اپنے وحشت زادے زاید کچھ کبھی نہ دیکھا ہو ذرا ایک بیک پکڑ کر کسی جہاز پر تو سوار کرا دیجئے اور وہ جہاز دس کے اگر ساحل امریکہ پر جو آج دنیائے قدیم کے ہر متمدن سے متمدن خطہ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس وحشی کے لیے اس براعظم کا انکشاف کیا آج بھی ویسا ہی حیرت انگیز ہوگا، جیسا کولمبس نے چار سو برس قبل کیا تھا؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ ... بات کہ کولمبس کو تو خالی خولی ایک براعظم ہی ملا تھا اور اس وحشی سیاح کو اس کے ساتھ ساتھ ایک پورا تمدن بھی ملے گا۔ اسکی مسرت اور اسکی حیرت کا کیا کہنا؟ یہی بس

حال میرا بھی (قرآن پڑھ کر ہوا) مجھے بھی بیک وقت دوہری دوہری دولتیں نصیب ہوئیں۔ اللہ کو اور اللہ کے کلام کو تو سمجھا ہی، ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی۔" (ص ۹۵)

لوگ کہتے ہیں کہ خود شناسی سے خدا شناسی تک پہنچو، یہاں الٹی خدا شناسی ہی خود شناسی کا بھی ذریعہ بن گئی۔ "من عرف نفسہ عرف ربہٗ" (جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو بھی پہچان لیا) مدت سے سنتے چلے آئے تھے، آج محمد علی کی زبان سے "من عرف ربہٗ عرف نفسہ" (جس نے اپنے رب کو پہچانا، اپنے آپ کو بھی پہچان لیا) بھی سن لیا!

نومسلم کے جوش تبلیغ کا اندازہ اسی نومسلم کی زبان سے کیجئے:۔

"میں اپنی اس نئی دنیا کی دریافت کو کیا اپنے ہی تک سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا؟ نہیں، کہاں ممکن تھا؟ دوسرے معاملات میں میں کیسا ہی خود غرض سہی، اس حقیقت کبریٰ کا، اس حقیقت الحقائق کا انکشاف جس گھڑی میرے روبرو ہوا۔ میرا سارا وجود اس سے پر ہوگیا۔ میں اسے چھپانا چاہتا بھی، تو میرے سینے کے اندر اس کا چھپا رہنا کیونکر ممکن تھا؟ میری روح کا تو ریشہ ریشہ اس انکشاف سے پھٹنے لگا اور جی بے اختیار بیقرار ہو ہو کر یہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر سب کو اس کی دعوت دینی شروع کر دوں ——— گھر کے بڈھوں بچوں کو، نوکروں، چاکروں، کتے، بلی جانوروں کو، درختوں اور جھاڑیوں کو، سب کو یہی پیغام یہی بشارت، (دیوانہ وار) پہنچانا شروع کر دوں۔" (ص ۱۰۹)

کیا خبر تھی کہ حزن کے اندر یہ بے پناہ قوت رکھ دی گئی۔ یہ مشہور فرنگی فاضل میکس مولر کا قول ہے کہ:

"حق کا نشہ ایمان والوں پر ایسا سوار رہتا ہے کہ جب تک وہ اپنے خیال میں قول اور عمل سے اس کا اظہار نہ کر ڈالیں۔ جب تک وہ اپنے پیام کی منادی روئے زمین کے چپہ چپہ پر نہ کر چکیں، ان کے دل کو چین اور قرار آ ہی نہیں سکتا۔"

محمد علیؒ اس مقولہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

"مدتیں گزریں جب میں نے اول اول اس عبارت کو پڑھا تھا، تو اس کے خطیبانہ انداز بیان کی خوب داد دی تھی۔ اب جب اپنے اوپر آ کر پڑی تو معلوم ہوا کہ حق وایمان اندر ہی اندر جو عظیم الشان غیبی قوت پیدا کر دیتا ہے اس کے سامنے یہ عبارت خطیبانہ اور زور دار ہونا کیا معنی بالکل کمزور اور پھسپھسی سی ہے۔ مومن کا قلب تو ایک بم کا گولہ ہوتا ہے کہ اب پھٹا اور جب پھٹا۔" (ص ۹۹)

امتی کا ذہن یہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد معاً اپنے رسولؐ اور رسولوں کے سردار کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے آقائے نامدار کا بے پناہ جوش تبلیغ یاد پڑ جاتا ہے۔ وہ کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو دعوت دینا، وہ ضیافت کے بعد اپنی برادری والوں کے سامنے اسلام کی روحانی ضیافت پیش کرنا۔ وہ سالہا سال مکہ میں اسی کے پیچھے ہر طرح کی سختی برداشت کرنا، وہ اپنے شہر والوں سے مایوس ہو کر طائف کا رخ کرنا اور وہاں کی آبادی کا انتہائی بیہودگی سے پیش آنا، لہو لہان مکہ واپس تشریف لانا، پھر حج کے موقع پر مدینہ والوں سے آس لگانا، ناکام ادھر سے اُدھر پھرنا، حاجیوں کے اس گروہ سے اٹھ کر ابھی اُس گروہ کے پاس جانا، ایک ایک کا دل ہاتھ میں لینا اور زبان کی موہنی، بہلانا، سمجھانا، پرچانا۔ غرض ایک اللہ کی منادی کے پیچھے خلق اللہ کی خفگی مول لینا، دنیا جہان کے جتن کر ڈالنا، یہ سارا سماں اس اُمتی کی نظر میں پھر جاتا ہے۔ اللہ اکبر اس رسولؐ کی ہمت،

استقلال کی، پامردی کی، ایثار کی، تحمل کی تھاہ کوئی بھی پاسکا ہے! اور پھر

"وہ حق ہی کیا جو اپنا مبلغ آپ ہی نہ ہو۔ "مشتری" اور "تنخواہ دار" کیا خوب! سچا "مشنری" (مبلغ) تو وہ ہے جو تبلیغ کی خاطر اپنی نقد جان تک حاضر کردے، چہ جائیکہ خدمات تبلیغ کا معاوضہ بصورت نقد وصول کرے۔" (ص ۹۰)

دل میں جذبۂ صادق موجود ہو تو میدان عمل کی تلاش کے لیے کیا کہیں باہر جانا ہے۔ موقع تو ہر جگہ موجود ہے۔ محمد علی نے تبلیغ بیتول جیل کی چار دیواری کے اندر، یاران مجلس کے درمیان ہی شروع کردی۔ ذرا یہ چھوٹی سی کہانی ان ہی کی زبانی سنتے چلیے :-

"توریت میں تو نہیں، البتہ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یوسفؑ نے توحید کا وعظ اور بہترین وعظ اپنے ساتھ کے دو قیدیوں کو سنانا شروع کردیا تھا، ان قیدیوں کو جو اب تک فرعون مصر کو اپنا خدا جانتے اور مانتے ہوئے تھے اور یوسفؑ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بھی یہی وعظ جیل میں شروع کر کے اس سنت پیغمبری پر عمل کیا۔ اور میرا تجربہ تو ہندوستان کے اندر ایک سے زائد جیل سے متعلق بالفاظ شکسپیر یہ ہے کہ ہر شہر کے اندر خیر کا جلوہ ضرور رہتا ہے۔" (ص ۱۴۱)

لیکن اصلی لگن یورپ جاکر اپنا پیام حق سنانے کی لگی ہوئی تھی، کچھ اس کا ذکر مضمون کے شروع ہی میں آپ سن چکے، کچھ اب سنیے :-

"ویلز (مشہور انگریز مصنف) کی یہ دونوں کتابیں پڑھ کر میں بے تاب ہوگیا کہ یورپ پہنچوں اور اسلام کا پیغام ان کا فروں تک پہنچاؤں۔ جنھوں نے قوموں اور نسلوں اور حکومتوں کی پوجا کر، اپنا شعار بنالیا ہے۔ حالانکہ پرستش حق ہے صرف خدائے واحد کا۔

کٹی ہوئی اور سکڑیوں میں بٹی ہوئی نہیں، بلکہ سارے عالم و مسلم کائنات انسانی کے پروردگار عالم کا۔ بس ہماری طرف سے اس کی اطاعت ہو۔ اور اس کی طرف سے فضل و کرم"۔

"اس کے یہ معنی نہیں کہ تبلیغ کی ضرورت ہندوستان میں، اور خود مسلمانوں کے اندر نہیں۔ یقیناً یہاں بھی بہت ضرورت ہے، اور خیرات کی طرح تبلیغ کو بھی اپنوں ہی سے شروع کرنا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کر لی جائے کہ بڑوں کا بگڑنا بہت ہی بڑی برائی ہے اور ایشیا و افریقہ کے مقابلہ میں اس وقت یورپ و امریکہ کی بڑائی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اپنی ساری ترقیوں کے ساتھ کاش یورپ و امریکہ اگر اپنے اندر وہ شے پیدا کر لیں جس کے بغیر کوئی ترقی حقیقی ترقی کہی ہی نہیں جا سکتی۔ یعنی مذ دینداری تو یہ تو وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ایشیا و افریقہ ابھی مدتوں کر سکنے کا دم نہیں رکھتے۔" (ص ۱۲۶)

۱۹۲۳ء میں پھر ۱۹۱۴ء کا ذکر:-

"اگر مغرب کسی طرح ہمارے مذہب کا مطالعہ کرنے اور اس کے سمجھ لینے پر آمادہ ہو جاتا تو میں نے اس وقت خیال کیا کہ رنگ اور نسل کے پیدا کیے ہوئے سارے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور مغرب و مشرق دونوں بڑے نفع میں رہیں" (ص ۱۳۴)

بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شفیق طبیب کو کہیں سے تریاق ہاتھ آگیا ہے اور وہ بیتاب ہے کہ کس طرح مار گزیدہ تک اڑ کر پہنچے اور اسے موت کے منہ سے جا کر نکال لائے۔

(۳)

قسمت میں نہ تھا۔ یورپ گئے، لندن اور پیرس دونوں جگہ خوب ہی تقریریں کیں لیکن حیثیت مبلغ اسلام کی نہ تھی۔ رئیس وفد خلافت کی تھی۔ ان تفصیلات کی تلاش یہاں نہ کیجئے کہ کن مجبوریوں سے اور کیسے نازک حالات کے ماتحت قید سے چھوٹتے ہی کس طرح

یورپ روانہ ہو جانا پڑا۔ بہرحال ہوا یہی۔ ترکوں سے شرائط صلح درپیش، معاہدہ بالکل دستخط ہونے کو۔ ایسی حالت میں محمد علی اپنے دو تین رفیقوں کے ساتھ ہندوستان کی خلافت کمیٹی کی طرف سے یورپ پہنچتے ہیں، اور معاً ترکوں کی وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ وفد سیاسی اور گفتگو کے مخاطبین آبادیاں اور قومیں نہیں بلکہ حکومتیں اور وزارتیں تبلیغ اسلام اور مذاکرۂ دینی کا موقعہ تو ظاہر ہے کہاں نکل سکتا تھا۔ حسرت برسوں بعد تک رہی۔

"ہمارے وفد کی نوعیت بہت مقید ہو کر رہی۔ خطاب یہ تو نہیں کہ بجز حکومتوں کے...... اور کسی سے جائز نہ تھا لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مخاطبت اصلی حکومتوں ہی سے تھی، تبلیغی آزادیاں اب کہاں باقی رہ سکتی تھیں" (ص ۱۴۷) —— اس پر بھی کیا محمد علی . چوکنے والے تھے؟

"میری مذہبی دیوانگی دیکھ کر انگلستان میں متعدد دوستوں نے مشورہ دیا کہ مذہب کا نام بھی تقریروں میں زبان پر نہ لانا لیکن اس مشورہ پر عمل بھلا کب ہو سکتا تھا؟ ہم بھی کیا کوئی ترکی قوم پرور تھے، جو اپنی قوم کی سرزمین کے لیے لڑ رہے تھے؟ ہم تو ترکی نہیں ہند کے رہنے والے تھے اور رعایا اس شاہ انگلستان کی جس سے ترکی برسر جنگ —— لیکن تھا کیا؟ تھا یہ کہ ہم مسلمان رعایا تھے جنگی اطاعت مسیحی فرمانروا کے ساتھ مشروط۔ اس واضح اور صریح شرط کے ساتھ تھی کہ ہمارے جذبات دینی کا احترام کیا جائے گا۔ اور جذبۂ دینی ہی کا تو تقاضا تھا کہ ہم اس حکومت کی نصرت و تائید میں وفد لے کر آئے تھے جس کی بقا کا دامن خلافت عالم اسلامی سے وابستہ تھا۔ دول متحدہ نے جو ہماری سند نمایندگی تسلیم کی اور ہمیں کہنے سننے کا حقدار قرار دیا تو اسی بنیاد پر تو" (ص ۱۴۹) پھر آخر کوں

کے خلاف جو احساس قدر تعصب پھیلا ہوا تھا اس کی آخری بنیاد کیا تھی؟ وہی مذہب یعنی ترک چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے انھیں حاکم بنے رہنے کا کوئی حق ہی حاصل نہیں، کیونکہ خود اسلام کا تصور ان بدنصیبوں کے دلوں میں کیا تھا؟ (نعوذ باللہ) مشرقی ظلم و استبداد تعشف و تنگ نظری اور نفس پرستی کا مجموعہ، اور عقائد میں جابجا یہود اور مسیحیوں کی تعلیمات سے سرقہ! معاذ اللہ جن لوگوں کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی، ان کے سامنے ترکوں کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے، جب تک یہ سارے پردے ایک ایک کرکے ہٹا نہ لیے جائیں ——— محمد علی سے بڑھ کر ان نزاکتوں کو کون پہچان سکتا؟ اور پہچاننے کے بعد کون ان سے بڑھ کر ان کی رعایت کرتا؟ موقع بے موقع جب جب بس چل سکا، تقریریں، تحریریں، جہاں دیکھیے سیاسیات میں دینیات کا پیوند! ——— صورت پڑ جائیے تو ایک پُرشوکت تقریر، سنی کی جانب آئیے تو محض ایک نعرۂ تکبیر!

یورپ کی مشہور عالمگیر جنگ ابھی تازہ ہی تازہ ختم ہوئی تھی، محمد علی کی ہر تان اسی پر آکر ٹوٹتی تھی کہ یورپ ذرا اپنے کو دیکھے تو، زخموں سے کیسا چور چور جسم ہے، گویا ایک مستقل گھرا ناسور! ان سارے امراض کا مداوا اگر کہیں ہے تو صرف شفاخانۂ اسلام میں!

یورپ کی جان کا اصلی روگ اور تہذیب نو کا سب سے زبردست دیوتا "وطن" اور "قوم" ہے ع

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جس کو دیکھیے قوم اور وطن کے نشہ میں سرشار، نسل و رنگ کے مرض میں گرفتار، تجارتی رقابت، معاشی کشمکش، قومی منافرت، بلوے، بغاوتیں، اور کشت و خون، قتل و غارت، بم اور مشین گن،

ڈریڈناٹ اور تارپیڈو تڑپتی ہوئی لاشیں اور خاک وخون میں لوٹتے ہوئے سر، لازمی نتائج!
ہولناک جنگ یورپ کے زمانہ اور قرب صلح کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"اب مجھے یہ آس بندھی کر ادھر صلح ہوئی اور ادھر ٹھیک اسی گھڑی میں یورپ پہنچوں اور خوشامدیں کر کر کے ان کے دلوں میں اتاروں کہ اس دین پر ذرا تو غور کریں جو نسل و رنگ کی پیدا کی ہوئی دشمنی کے مٹانے میں ہر معیار سے اب تک کامیاب ہی ثابت ہوا ہے۔" (ص ۱۳۶)

"موجودہ مسیحیت نے خدا کے باپ ہونے پر اتنا زور دیا، لیکن انسان کے بھائی ہونے کا اسے خیال ہی نہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اتنی پیش گوئی تو کی ہی جا سکتی ہے کہ یورپ بعد جنگ بہر حال وہ نہ ہوگا جو یورپ قبل جنگ تھا۔ اور اس ہولناک جنگ کا بھوت اتر جانے بعد اُسے اس دین کی طرف بآسانی متوجہ کیا جا سکے گا۔ جس کی دعوت حکومتِ الٰہی نے دی ہے اور جس کی پکار یہ ہے کہ حکم و حکومت صرف خدائے واحد کی ہے۔ سب انسان یکساں اسی ایک بادشاہ کی رعایا ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ سوچ کے میں نے دل میں عہد کیا کہ جوں ہی جنگ ختم ہوئی اور ہم رہا ہوئے، میں یورپ اس جدید ترین شریعت کو لے کر پہنچوں گا جو ساتھ ہی قدیم ترین بھی ہے کہ خدا نے اسی کا مکلف انسانوں کو بنایا تھا۔" (ص ۱۳۷)

انسان خدا کا خلیفہ ہے۔ زمین پر اپنے خالق کی طرف سے حکومت کرنے کو بھیجا گیا ہے۔ جس قانون کے مطابق اسے حکومت کرنا ہے، اُسی کا نام شریعت اسلامی ہے۔ روئے ارض پر عدل وامن کا اگر قیام منظور رہے تو بجز اسلام قبول کیے اور اسلام کے قانون پر عمل کیے چارۂ کار نہیں۔ یہی سبق ہے جو محمد علی دیتے ہیں۔ یہی سبق ہے جو اپنی اس کتاب میں جا بجا دیتے گئے ہیں۔ یہی سبق ہے جو رئیس وفد خلافت کی حیثیت سے جتنا بھی بن پڑا

محمد علی دے گئے۔

"لا اکراہ فی الدین" کی متعدد تفسیریں نظر سے گزری ہونگی۔ معروف و متداول تفسیر تو یہ ہے کہ قبولِ اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے۔ مقصود اعلیٰ غلبۂ اسلام ہے، جو جزیہ کی صورت میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جب دین حق کا وضوح ہو چکا، اس کے قبول کرانے کے لیے جو بھی طریقے استعمال کیے جائیں، ان پر جبر و اکراہ کا اطلاق نہ ہو گا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ خلاصہ یہ کہ دین کے باب میں جبر نہیں۔ آج اس آیت کی تعبیر ایک اور سن لیجئے۔ "فی" کے معنی "اندر" کے بھی تو ہیں۔ اس لیے آیت سے یہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ "دین کے اندر کوئی جبر و اکراہ باقی نہیں رہ جاتا۔ جب حق کا کامل وضوح ایک بار ہو گیا، جب عقیدہ ایسے مالک پر جم گیا جو اپنے پرستاروں کی خبر گیری وولدہی سے کسی آن غافل نہیں ہوتا تو اب دین کا مطالبہ جو کچھ بھی ہو، فرمائش جس قسم کی بھی اطاعت و عبادت کی ہو، مومن کی طرف سے غفلت و تساہل ممکن کیونکر ہے۔ جبر و اکراہ کی گنجائش ہی اب کہاں باقی رہی! بندۂ مومن تو ایسے محبوب آقا و پروردگار کی رضا جوئی کے لیے ہنسی خوشی، دوڑ دوڑ کر اپنا سب کچھ پیش کر دیگا، اپنے کو لٹا دیگا، اپنی جان تک نذر کر دیگا۔ جان ہے آخر کیا چیز؟ اسی کا عطیہ اور اسی کی ملک، اس کی حکمت و مصلحت ہم سے جس وقت بھی اس کی واپسی کا تقاضا کرے تو ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔ اس دین کے اندر داخل ہو جانے کے بعد سارا کاروبار تو رضا کارانہ رغبت و شوق اور والہانہ محبت و ذوق کا چلنے لگتا ہے۔ جبر و زبردستی کا نشان ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے؟"

آیت کی یہ تفسیر ہو یا نہ ہو (اور زیر نظر کتاب کچھ تفسیر ہے بھی نہیں) لیکن کیا بطور ایک

لطیف صوفیانہ نکتہ کے بھی آپ اس کی داد نہ دیں گے؛ اور یہ تو محض ایک آیت نمونہ کے طور پر ہے جو نقل کر دی گئی، ورنہ اس طرح بیسیوں مضامین متعدد آیاتِ قرآنی سے استنباط و استخراج کیے ہوئے محمد علی کی کتاب اسلام میں درج ہیں۔

یورپ کے مبلغ اسلام کے لیے ایک ہی وقت میں جنگ کے تین تین محاذوں پر نظر رکھنی لازمی ہے۔ ایک طرف تو دہریت، مادیت اور الحاد کا زور ہے۔ قرآن مجید کو اس رنگ میں پیش کرنا ہے کہ ملحدوں اور لامذہبوں کے اعتراضات از خود ساقط ہوتے جائیں۔ دوسری طرف مسیحیت کے پھندے بھی میدان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اور مسیحیت کو چونکہ عموماً حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل ہے، اس لیے قدرۃً یہ فتنہ شدید تر ہے۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ ساری حکومتیں خواہ برائے نام سہی لیکن ہیں بہرحال ضابطہ نے اب تک مسیحی ہی۔ مبلغ اسلام جب یورپ کے علاقہ میں پیش قدمی کرے گا تو اس کو مذہب مسیحیت سے عظیم الشان مقابلہ کے لیے پوری طرح مسلح ہو جانا چاہیے۔ پھر مسیحیت بجائے خود کوئی مستقل مذہب نہیں۔ یہودیت ہی کی ایک شاخ ہے جس میں یونانی بت پرستوں کے شرک کی قلم لگی ہوئی ہے پس مسیحیت کے مقابلہ میں قدم اٹھانے والے کی نظر مسیحیت کے ان اخذوں، یعنی مذہب یہود اور عقائد مشرکانہ یونان پر بھی خوب عمیق و وسیع رہنی چاہیے۔ ڈھائی پونے تین سو صفحہ کی کتاب میں (چھپنے پر ممکن ہے کہ ضخامت کچھ بڑھ جائے) بحمد اللہ ان مباحث کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ خصوصاً مسیحیت پر تو ایسی زبردست تنقید کی ہے کہ جن لوگوں کی عمریں عیسائیوں سے مناظرہ اور گفتگو میں گزری ہیں وہ بھی اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں یک اصطلاح "Higher Criticism"

کی ہے۔ اردو میں اس کے مقابل کسی اصطلاح کا علم نہیں۔ لفظی معنی "تنقید اعلیٰ" کے ہیں۔ مراد اس سے یہود و نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ کی تنقید ہے۔ یورپ میں یہ ایک باضابطہ اور مستقل فن بن چکا ہے (جیسے ہمارے ہاں فن اسماء الرجال) اور ستر اسّی سال کے اندر اس پر صدہا تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بائبل کی ایک ایک کتاب لے کر اس پر مفصل بحث ہوتی ہے کہ وہ کتاب کس زمانہ کی، یا کن کن زمانوں کی تصنیف ہے؟ کس مصنف نے تنہا یا کن کن مصنفوں نے مل کر اسے تصنیف کیا ہے؟ جس شخص کی جانب منسوب ہے اس کی جانب انتساب کہاں تک صحیح ہے؟ جعلی و الحاقی عبارتیں کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں؟ وقس علیٰ ہٰذا۔ محمد علی کی سطر سطر سے ٹپکتا ہے کہ جیل کی فرصت کے زمانہ میں انھوں نے بائبل اور اس کی تنقیداتِ عالیہ کا خوب ہی مطالعہ کیا ہے اور اس سمندر میں گہرے غوطے لگا، خوب خوب موتی نکالے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ اور حواریانِ مسیحؑ کا تقابل، واقعۂ اُحد سے صحابۂ کرامؓ کی جاں نثاری پر استدلال، حواریوں کے "اعمال نامے"، ان کے مقابلہ میں حضرات صحابۂ کرامؓ کے جیتے جاگتے معتبر و مستند واقعات، مسیحیت کی حقیقت، حضرت مسیحؑ کا اصلی مشن، مذہب یہود میں مشرکانہ خیالات کی آمیزش، فیلو (Philo) فلسفی کے اثر سے مسیحیت کا مسخ ہو کر پولوسیت بن جانا، پال (پولوس) کی سعی، مسیحؑ کی مفصل پردہ دری، موجودہ مسیحیت میں شرک جلی کا امتزاج، اناجیل اربعہ خصوصاً انجیل یوحنا کی جعلی حیثیت، علوم نظری میں توغل کی ہجو، امام احمد بن حنبلؒ کی مدح و توصیف، امام پر سید امیر علی کی تعریض اور اس کا جواب، یہود کی مغضوبیت دورِ حاضر میں، سائنس اور مذہب کے حدود، ابتدائً ممانعتِ کتابتِ حدیث کے مصالح، تدریجی نزولِ قرآن کے مصالح (رحمت کے لیے، کفار کے لیے اور پیغمبر کے لیے)

علم کلام کا بنیادی مسئلہ، مسیحیت پر یونانی فلسفہ کا اثر، مسیحیت پر ایران کے مذہب ثنویہ کا اثر، مسیحیت کی تاریخ، تحریف کتب سماوی سابقہ کا ثبوت، امیر علی اور سر سید نے اسلام پر دفاعی حیثیت سے جو کتابیں لکھی ہیں، ان پر محاکمہ۔ وغیرہ ان تمام عنوانات پر فاضلانہ تبصرہ دیکھنے کا اگر اشتیاق ہو تو اپنے اشتیاق کا کافی ثبوت بہم پہنچا کر جامعہ ملیہ سے کتاب شائع کرائیے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک ایک مقام کی سیر اور کرتے چلیے:۔

"لیکن تفسیر و تعبیر کی اس ذاتی آزادی کے بعد جس کا میں پوری طرح قائل ہوں اور کسی آزادی کا قائل نہیں اور یہ معصیت تو میرے نزدیک اکبر الکبائر کا مرتبہ رکھتی ہے کہ کوئی بندہ اور بشر تفسیر و تعبیر کی آڑ پکڑ کر کلام الٰہی میں کچھ اپنی طرف سے بڑھا دے، یا گھٹا دے یا اس میں کچھ اور رد و بدل کر دے! تنقید اعلیٰ نے خوب روشن کر دیا ہے کہ بائبل یعنی عہد قدیم وجدید دونوں کی کتنی کتابیں دوسروں کے نام سے لکھ دی گئی تھیں اور رفتہ رفتہ جو الحاقات ہوتے رہے ان کے لحاظ سے تو وہ کتابیں کیا ہیں گویا طبقات الارض کے مطابق مختلف ادوار کے اور وہ بھی تہ بہ تہ طبقے ہیں! اور ستم یہ کہ ان تمام تحریفات کے تسلیم ہو جانے کے بعد ہی ماہرین فن اس تحریف پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں کرتے، بلکہ مجرموں کی طرف سے یہ صفائی پیش کرنے لگتے ہیں کہ اخلاص و صداقت کا معیار تو آخر ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف ہی رہا ہے بلکہ بعض نے تو کمال ہی کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ محرّف کی نیت تو نیک ہی ہوتی ہے! اور اس لیے وہ قابلِ الزام نہیں بلکہ قابلِ عزت ہے۔ چنانچہ مسٹر جیڈ وک اپنی وی بائبل آف ٹوڈے میں لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں نے خود لکھ کر ان تصانیف کو اکابر (یعنی انبیاءؑ و حواریین) کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ ان کے حق میں اتنا تو بہرحال کہا ہی جا سکتا ہے کہ انھیں

خود نمائی اور ذاتی شہرت مقصود نہیں تھی۔ اپنے کو انھوں نے مٹا دیا، اپنے کو گمنام و بے نشان کر دیا تاکہ کتب مقدسہ کی عظمت میں فرق نہ آنے پائے۔"

کیا خوب! اگر یہ استدلال صحیح ہے تو آخر اس میں کیا برائی ہے جو بت پرست قوموں میں بتوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہم پرست معتقدوں کے سوالات کے جوابات خود چھپے ہوئے بت کی زبان سے دیا کرتا ہے۔ گمنامی اور بے نشانی میں تو اس کی بھی مطلق شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر دنیا میں جتنے بڑے بڑے جعلساز ہوئے ہیں، جنھوں نے مصنوعی سکے بنائے ہیں، جعلی دستاویزیں تیار کی ہیں، جعلی نوٹ چلائے ہیں، یہ غریب کس خود نمائی اور ذاتی شہرت و نمود کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں؟ کیوں نہ اسی دلیل سے ان سب کو ہیرو قرار دے لیا جائے؟ افسوس ہے کہ خود بائبل کے اندر اس جعل و تلبیس کی سند جواز موجود ہے، ملاحظہ ہو پال کا مکتوب رومیوں کے نام باب ۳ آیت ۷۔

لیکن قرآن کریم کی تعلیم نے اس کے برعکس ایسے محرفین اور جعل سازوں کی شدید ملامت و مذمت کی ہے، فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (البقرۃ ۹)

اور حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا جعلساز اور کھوٹے سکے گھڑنے والا بھی اس مجرم کے جرم کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بندہ اور بشر ہو کر اپنے کلام کو معاذ اللہ کلام الٰہی بنا کر پیش کر دے۔" (ص ۱۶۱-۱۶۲ ملخصاً)

کتاب مسودہ کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ مولانا کے شیدائیوں کی تعداد خدا کے فضل سے ہر طبقہ میں اچھی خاصی موجود ہے اور پھر یہ کام تو خالص دینی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے نصیب میں کتاب کے مراتب طبع و اشاعت کی تکمیل آجائے۔[1]

[1] الحمد للہ کہ اس مقالہ کی تحریر کے چند سال بعد ۱۹۴۳ء میں کتاب بائبل کے نام Fragment سے ... کے ساتھ محمد بخش اقبال ایم اے لاہوری کی مستعدی کے طفیل شیخ محمد اشرف تاجر کتب انگریزی لاہور کے ہاں سے ۲۰۴ صفحوں کی ضخامت سے شائع ہو گئی۔ ہندوستان میں مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی سے مل سکے گی۔ ۱۹۵۲ء

جواہرلال کے نقطۂ نظر سے

یا

"جوہر" میزان جواہر میں!

محمد علیؒ کو صدارت کانگریس (کوکناڈا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء) کے بعد کانگریسی لیڈروں کے جو جو تلخ اور دردناک تجربات پیش آئے، خدا نہ کرے کسی اور کو پیش آئیں۔ لیکن اس کے باوجود گنتی کے جن دو چار لیڈروں سے وہ آخر تک خوش رہے یا یوں کہیے کہ زیادہ ناخوش نہیں ہوئے ان میں سے ایک جواہرلال نہرو بھی تھے۔ محمد علی جب صدر ہوئے تھے تو انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا تھا۔ آج یہ خود صدر کانگریس ہیں، اور محض کانگریس ہی کے صدر نہیں کہنا چاہیے کہ ایک گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے ملک کے سب سے بڑے لیڈر، بلکہ یہ ایک استثنا بھی کچھ واجبی سا ہے —— بہرحال آج ان کا نام بک رہا ہے، اور ان کے زبان اور قلم کا ایک ایک لفظ، یورپ میں بھی، اور ہند میں بھی جواہرات کا مول رکھتا ہے۔

ان کی تازہ آپ بیتی، یا خود نوشت سوانح عمری کو انگریزی میں نکلے ہوئے ابھی دن ہی

لہ صدق ۱۱ جولائی ۱۹۳۶ء

گئے ہوئے، برسوں نہیں، مہینوں نہیں، کہنا چاہیے کہ ہفتوں کی بات ہے۔ اسی اپریل ہی میں تو پہلا ایڈیشن لنڈن میں نکلا۔ بس چھپنے کی دیر تھی کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اسی مہینے کے اندر دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی، اور "آناً فاناً" وہ بھی ختم! ——— اردو کے مصنفین اس داستان "طلسم ہوش ربا" پر کیسے یقین کریں؟ ——— مئی کا مہینہ آنا تھا کہ نوبت تیسرے ایڈیشن کی آگئی! قیمت گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ اور بڑھی بھی تو کیسی، اضافہ پانچ فیصدی یا دس فیصدی کا نہیں، پچاس فیصدی سے زائد کا! (پہلے ہندوستان میں سات روپیہ کو آتی تھی، اب گیارہ روپیہ کو آنے لگی) انگریز پبلشر کیا کوئی ایسا نادان تھا کہ گھر میں سونا برسے اور وہ دوڑ دوڑ کر اسے سمیٹنے اور بٹورنے کی کوشش نہ کرے؟ ——— اور ستم دادِ فطرت کی اس ستم ظریفی کی دیکھیے کہ جواہر لال اٹھے تھے سوشلزم کی تبلیغ کو، سرمایہ داری کو مٹانے کو، اور بنے جا رہے ہیں دھڑا دھڑ رائلٹی سے خود بھی سرمایہ دار!

آپ بیتی کسی کی بھی ہو، بہرحال جی لگنے والی ہوتی ہے اور پھر یہ تو ایک مشاق حبیب قلم کے قلم سے ہے۔ دلکش کیوں نہ ہوتی؟ ضخامت چھ سو صفحہ سے اوپر۔ اور وہ بھی اچھی بڑی تقطیع پر اور خاصی گنجان طباعت کے ساتھ۔ اس پر بھی آخر میں جی اکتا نہیں جاتا کہ اتنی طوالت کیوں کرتے چلے گئے، بلکہ کچھ جھنجلا ہی کر رہتا ہے کہ ابھی کچھ اور لکھنا تھا، ختم کیوں کر دیا۔ مصنف کا نقطۂ نگاہ ظاہر ہے کہ کانگرسی اور "اشتراکی" ہے، اور اس نقطۂ نگاہ کو ظاہر ہے کہ آخر عمر کے محمد علیؒ سے ہمدردی ہو ہی کیا سکتی تھی۔ اور اس لیے محمد علی کے حالات و کمالات کی تلاش کے لیے کتاب کے اوراق کی الٹ پلٹ سودمند ہونے کی توقع ہی کب ہو سکتی تھی؟ پھر جواہر لال کی اس کتاب کے اقتباسات، دوسرے لیڈروں کے ساتھ محمد علی سے متعلق، ہندوستان کے انگریزی اخبارات، اور پھر ان سے نقل ہو کر مسلمانوں کے اخبارات میں شائع بھی ہو چکے تھے ———

تو تو قع اگر پہلے کچھ تھوڑی بہت تھی بھی، تو ان آفتاب ساتے نے اسے زندہ کب رہنے دیا تھا؟

لیکن جواہر لال بہر حال جواہر لال ہیں اور ان کی سرگذشت حیات، ان کی شخصیت کی آئینہ بردار، ہندو نامہ نگاروں کی پستیوں سے بالاتر۔ ممکن نہ تھا کہ محمد علی اپنی زندگی میں، جواہر لال کی نگاہ میں کچھ اور ہوتے، اور وفات کے بعد جواہر لال کی کتاب میں کچھ اور ہو جاتے۔ جواہر لال "دین" سے بے بہرہ سہی، "دیانت" سے تو ناآشنا نہیں کسی کے وہ دشمن سہی، لیکن شریف دشمن۔ محمد علی ان کی اس بزم کاغذی میں، ایک دو بار نہیں، بار بار آتے ہیں۔ اور ذرا دیر ہی نہیں دیر تک، جواہر لال سے سابقہ اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح واقعات کے عالم میں گوشت پوست کی دنیا میں رکھتے تھے۔ کبھی ہنستے ہیں، کبھی ڈانٹتے ہیں، کبھی محض مل ملا کر چلے جاتے ہیں۔ ہم آپ، اپنی اپنی محفلوں میں محمد علی کو بار بار دیکھ چکے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے جواہر لال کی عینک سے وہ کیسے نظر آتے ہیں۔

محمد علی مسلمانوں کے لیڈر تو بہت مدت ہوئی ہو ہی چکے تھے۔ "آل انڈیا" لیڈر یعنی سارے ہندوستانیوں کے لیڈر، کہنا چاہیے کہ تحریک خلافت کے وقت سے ہوئے۔ لیکن خود تحریک خلافت ہی کیا تھی؟ ایک دوسرا نام علی برادران کا، یا عام فہم و عام پسند لفظوں میں محمد علی شوکت علی کا! ۱۹ء ختم ہو رہا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں کہ علی برادران پہلی قید فرنگ سے چھوٹے، اور چھوٹتے ہی دھادا کر کے کانگریس کے اجلاس (امرتسر) میں پہنچے۔ آنا ان کا نہ تھا۔ ملک کی تاریخ میں انقلاب کا، سیاسیات کی سرزمین پر ایک بھونچال کا آنا تھا۔ سات کروڑ مسلمانوں کی قوم کا مسئلہ ملک کا اس وقت تک مسئلہ رہا۔ وقت "وفاداری" کا تھا۔ مشیت الٰہی میں وقت آیا کہ سیلاب کے بند اب ٹوٹے اور پانی کا ریلا پورے زوروں کے ساتھ

آئے۔ محمد علی کا پبلک تعارف جواہر لال سے اسی موقع پر ہوتا ہے:

"امرتسر کانگرس پہلی گاندھی کانگرس تھی........ علی برادران نظربندی سے ابھی ابھی رہا ہوئے تھے۔ معاً کانگرس میں آ شریک ہوئے۔ قومی تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، ایک نئی روح دوڑ گئی۔ محمد علی چند ہی روز بعد، یورپ وفد خلافت لے کر روانہ ہوگئے۔" (ص ۴۴ و ۴۵)

۱۹۲۰ء کے شروع میں، شاید مارچ کا مہینہ تھا، الٰہ آباد میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام سید رضا علی صاحب کی کوٹھی پر ہوا ——— یہ وہی سید رضا علی مراد آبادی ہیں، جو آج[1] آنریبل اور سی، آئی، ای اور "سر" اور خدا جانے اور کیا کیا ہونے کے بعد افریقہ میں گورنر جنرل بہادر کے ایجنٹ ہیں، اس وقت الٰہ آباد میں وکیل اور زبردست "مسلم لیگیے" تھے ——— اتنا معرکۃ الآرا جلسہ اور محمد علی ہندوستان میں نہ موجود ہوں! شوکت علی غریب سے جو کچھ بن پڑا کیا۔ لیکن محمد علی کی بات کوئی کہاں سے لاتا۔ جواہر لال اس 'خلا' کا صرف ذکر کرکے گزر جاتے ہیں۔ (ص ۴۶)

۱۹۲۱ء کا زمانہ بھی حکومت ہند کے لیے عجب پریشانی کا زمانہ تھا۔ اور پریشانی کیوں، سراسیمگی کہیے۔ وائسرائے بہادر سے لیکر ہر ہر ضلع کے بڑے صاحب و چھوٹے صاحب کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے۔ بچوں کی سیٹی پر دشمن کے بگل کا گمان، بوڑھوں کی کھنکار پر "کانگرس کی جے" کا اشتباہ! اتفاق کی بات کہ ۱۰ مئی کو موتی لال جی کی صاحبزادی کی شادی کی تاریخ قرار پائی۔ کسی نے اڑا دی کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور و معروف ہنگامہ (غدر) بھی اسی تاریخ کو تو میرٹھ سے شروع ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا، صاحب بہادروں کی جیبوں میں پستول، بڑے بڑے

---

[1] یعنی وسط ۱۹۳۶ء میں

پرانے خیر خواہ، اور بیرے، خانساماں، سب مشتبہ۔ قلعہ میں تیاریاں کہ شاید شہر کی گوری آبادی کو پناہ یہیں لینی پڑے۔ پولیس، فوج سب لیس۔

یہ طول طویل داستان تو چھوڑیے مضمون سے اس کا تعلق بس اس قدر ہے کہ جشن شادی کی اس "دحشت ناک" تاریخ میں مدعو، گاندھی جی کے ساتھ محمد علی شوکت علی بھی تھے، دہشت، صرف گورنمنٹ ہی پر طاری نہ تھی۔ اس میں مبتلا خود جواہر لال جی بھی تھے۔ اُدھر ڈر یہ سمایا ہوا کہ یہ قانونِ سرکار کی خلاف ورزی اور توہین کس بے جگری سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اودھر دھڑکا یہ لگا ہوا کہ یہ تحریک خلافت کی روز افزوں ترقی کے ساتھ جذبۂ مذہبیت کو بھی ترقی کیسی ہوتی جا رہی ہے! بیرسٹر تصدق شروانی کے چہرے پر واڑھی، بیرسٹر مجید خواجہ کے چہرے پر داڑھی! اور سب سے بڑھ کر خوفناک وجود علی برادران کا!

"علی برادران خود ہی مذہبی خیال کے تھے، وہ اور اس آگ کو ہوا دیتے رہے" (ص۷۲)

سال کی آخری سہ ماہی تھی کہ کراچی کا مشہور مقدمہ چلا، اور علی برادران کو دو دو سال کی سزائیں ملیں۔ ہند جدید کا یہ روزنامچہ اس اندراج سے خالی رہ نہیں سکتا تھا۔

"علی برادران کو طویل سزائیں اس جرم میں ملیں کہ انھوں نے فوج میں بغاوت پھیلانی چاہی۔ جن الفاظ کی بنا پر ان پر مقدمہ چلا، ہندوستان کے سیکڑوں جلسوں میں ہزارہا اشخاص نے ان ہی کو دوہرایا۔" (ص ۸۰)

آج کے ہز مجسٹی ایڈورڈ ہشتم[1] ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں شہزادۂ ویلز تھے، اور ہندوستان کے دورہ کو تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ کی بے بسی حد کمال کو پہنچ چکی تھی! فکر اس کی ہوئی کہ "باغیوں" سے کچھ تو صلح کی طرح ڈالی جائے۔ ایسا ہوا کہ

[1] جو معاً بعد تخت و تاج سے دست بردار ہو کر محض ڈیوک آف ونڈسر رہ گئے۔

شہزادہ کے ورود کلکتہ کے وقت ساری نیکنامی، بدنامی میں تبدیل ہو کر رہے۔ خیال آیا، اور سلسلۂ جنبانی شروع ہوئی۔ مشہور لیڈر، سی، آر، داس جیل میں تھے۔ نظر ان ہی پر پڑ گئی کہ گاندھی جی کو ہموار اگر کوئی کر سکتا ہے، تو وہی ہیں۔ رائے یہ قرار پائی کہ ایک مختصر سی کانفرنس، حکومت اور کانگریس کے درمیان ہو۔ اب سوال یہ پیش ہوا کہ اس میں شریک کون کون ہو؟ گاندھی جی نے کہا کہ اسیر کراچی، محمد علی کی شرکت تو بہرحال ضروری ہے۔ جواب ملا کہ یہ تو بہرحال ناممکن ہے، اور لیجیے۔ اسی پر معاملہ ختم!

"تجویز غالباً اس لیے گر گئی کہ گاندھی جی کا اصرار تھا کہ مولانا محمد علی، جو اس وقت کراچی جیل میں تھے، ضرور اس کانفرنس میں شریک ہوں، گورنمنٹ نے اسے نہ مانا۔" (ص ۹۳)

خود جوہر کا ایک شعر ہے ؎

ہیں یوں تو فدا ابر سیہ پر سبھی میکش
پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

گورنمنٹ کی اس ضد کے عالم آشکارا ہو جانے کے بعد کہ صلح کی گفتگو داس سے ہو سکتی ہے، گاندھی جی سے ہو سکتی ہے لیکن نہیں ہو سکتی تو ایک محمد علی سے، جوہر کی نظم اور جواہر کی نثر میں کس غضب کا توارد ہو کر رہتا ہے!

۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے جیل خانوں کی بارکیں جو سیاسی لیڈروں سے دھڑا دھڑ بھرنی شروع ہوئیں، تو اکثر لیڈروں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی لیکن محمد علی اس باب میں آزمودہ کار تھے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں، ۱۹۱۶ء میں، مولانا ابوالکلام کی طرح، طویل نظر بندی اور جیل سے مشرف ہو چکے تھے (ص ۹۰) یاد ان کی ہر موقع پر آتی ہے، خاص طور پر وہ اس یاد آئے، جب خود کانگریس والوں کے سامنے کونسل کے قطعی مقاطعہ کا فرمان نافذ ہوا،

تو ایک نہیں کئی آوازیں اس رائے کی مخالف تھیں۔ ان لوگوں کے سامنے آئرلینڈ کی "سن فین" تحریک کی مثال تھی یعنی کونسلوں پر قبضہ تو کر لیا جائے، لیکن ان میں جا کر کام نہ کیا جائے۔ جواہر لال کی بھی یہی رائے تھی :-

"محمد علی اس وقت بسلسلۂ وفد خلافت، یورپ میں تھے، جب واپس آئے تو کامل مقاطعہ کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا۔ وہ اسی "سن فین" طریقہ کو پسند کرنے والے تھے" (ص ۹۹)

تذکرۂ جوہر اس طرح ضمناً و تبعاً تو اس جواہر نامہ میں بہت جگہ آگیا ہے مفصل اور مستقل تذکرہ اس موقع پر ہے، جب محمد علی کانگرس کے صدر ہیں، اور جواہر لال کانگرس کے سکریٹری۔ اتفاق و اختلاف، قرب و بعد کے منظر تفصیل سے یہیں دیکھنے میں آتے ہیں :-

"۲۳ء کا دسمبر تھا کہ کانگرس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا (علاقۂ مدراس) میں منعقد ہوا۔ صدر مولانا محمد علی تھے اور اپنے حسب معمول خطبۂ صدارت بڑا ہی لمبا چوڑا پڑھا۔ لیکن اس طوالت کے باوجود تھا وہ دلچسپ ہی۔ مسلمانوں کا ایک اور فرقہ وارانہ نظارہ دکھا کر بتایا یہ تھا کہ وائسرائے کے پاس ۱۹۰۶ء میں جو مسلمانوں کا وفد سر آغا خاں کی قیادت میں گیا تھا، اور جس کے مطالبہ پر انتخاب جداگانہ کا سرکاری اعلان ہوا، وہ وفد خود سرکار ہی کی طلب پر مرتب ہوا تھا، اور سوال و جواب سرکاری ہی تھے۔

میں انکار کرتا رہا لیکن محمد علی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان کے زمانۂ صدارت بھر کے لیے، کانگرس کا جنرل سکریٹری ہو جاؤں۔ آیندہ کی روش جب تک صفائی سے پیش نظر نہ ہو، میں عہدہ قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا لیکن محمد علی کے اصرار پر

غالب نہیں آسکتا تھا۔ اور یہ اپنی جگہ پر ہم دونوں کو محسوس ہوگیا تھا کہ میرے سوا کوئی اور سکریٹری، صدر صاحب کے ساتھ پوری طرح نباہ کر بھی نہیں سکتا۔ محمد علی کی محبت بھی غضب کی تھی، اور غصہ بھی غضب کا۔ اور میری خوش قسمتی تھی کہ میرا شمار، محمد علی کے محبوبوں میں تھا۔ محبت باہمی اور ہم خیالی کا رشتہ ہم دونوں کو جوڑے ہوئے تھا۔ ان کی مذہبیت بے پناہ تھی، اور میرے خیال میں حدود عقل و علم سے متجاوز۔ اور میں مذہب سے کورا۔ لیکن میری کشش کی چیز تھی ان کی اخلاص مندی ان کی زبردست قوت عمل، اور ان کی طباعی و ذہانت۔ وہ بڑے ظریف تھے، لیکن ان کے چبھتے ہوئے فقرے دلآزاری کی حد تک پہنچ جاتے تھے، اور ان کے کتنے دوست ان سے اسی سے روٹھ روٹھ گئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فقرہ انھیں سوجھ جائے اور زبان تک آئے بغیر دل ہی میں رہ جائے، پھر نتیجے جو کچھ بھی ہوں ہوا کریں۔" (ص ۱۱۷)

محمد علی کی جو صورت ہماری آپ کی جانی پہچانی ہوئی تھی، اس سے یہ تصویر کچھ ایسی بہت مختلف تو نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مصور جہاں کیمرا لیے کھڑا ہے، اس کی دھوپ چھاؤں کا کچھ اثر تو تصویر کے رنگ پر بہر حال پڑے گا۔

"پورے سال بھر نباہ خوب ہوتا رہا، گو چھوٹے چھوٹے اختلافات بھی بہت پیش آتے رہے۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں آتے ہی یہ قاعدہ چلایا کہ سب ممبروں کو صرف سادہ نام ہی لکھا جائے۔ باقی تعظیمی القاب الفاظ سب حذف کر دیے جائیں۔ ہندوستان میں یہ القاب بھی کیسے بے گنتی۔ مہاتما اور مولانا، اور پنڈت اور شیخ اور سید اور منشی اور مولوی اور ان پر تازہ اضافہ شریمت اور شری کا! اور انگریزی کے مسٹر اور اسکوائر

تو موجود ہی تھے۔ اور پھر ان کا استعمال اس قدر اسراف کے ساتھ اور اس قدر کثرت کے ساتھ تھا کہ میں نے چاہا کہ ایک سنہ قائم کر دوں لیکن میری چلنے نہ پائی۔ محمد علی نے واسطے ولا دلا کر، تار پہ، بحیثیت صدر مجھے حکم دیا کہ ابھی پرانا دستور قائم رکھا جائے، اور خصوصاً گاندھی جی کو تو ضرور مہاتما رہنے دیا جائے۔" (ص ۱۱۱)

اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ محمد علی کو حفظ مراتب کس درجہ عزیز تھا۔ لیکن خیر یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اہمیت کی اصل شے اب ملاحظہ ہو:۔

"جس موضوع پر ہمارے آپس میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، وہ خدا تھا۔ محمد علی کو عجیب و غریب ملکہ حاصل تھا کہ خدا کا ذکر وہ کانگرس کے رزولیوشنوں تک میں لے آتے تھے! کہیں یہ کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، کہیں یہ کہ خدا سے دعا کی جائے! میں ہمیشہ مخالفت کرتا۔ اور اس وقت محمد علی میرے الحاد پر برس پڑتے! لیکن یہ بات بھی عجیب تھی کہ اس کے بعد وہ مجھ سے یہ کہا کرتے کہ زبان سے تم کچھ بھی کہو، یا ظاہری عمل سے جو کچھ بھی دکھاؤ، اپنے باطن میں تم مذہبی شخص ہو ضرور۔ میں نے خود بارہا غور کیا کہ ان کا یہ مقولہ کہاں تک صحیح تھا۔ لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں مذہب اور مذہبی کے معنی ہی بہت کچھ مختلف ہیں۔"

محمد علی کے جوش مذہبی کے نظارے ہم آپ تو بہت سے دیکھ چکے ہیں، لیکن جواہر لال کی یہ شہادت، خود منکر اور بیگانۂ دین ہو کر کسی دوسری شہادت سے کچھ کم وزن رکھتی ہے؟ ——— عجب نہیں کہ حشر میں بھی ایک دستاویز محمد علی کے حق میں، اور سیکڑوں ہزاروں تحریروں سے بڑھ کر قیمتی نکل آئے، اور عقل و فرزانگی کی اسی ایک شہادت کے گزر جانے کے بعد پھر محمد علی کی دیوانگی و شوریدگی کے لیے کسی اور بیان کی، کسی اور دلیل و برہان کی

ضرورت ہی نہ باقی رہ جائے!

"میں محمد علی سے مذہبی بحث و مباحثہ کرنے کو ٹال ہی جاتا تھا، اس لیے کہ میں خوب سمجھتا تھا کہ اس سے فریقین کو بس غصہ ہی آ کر رہے گا، اور ممکن ہے انھیں میری کسی بات سے دکھ پہنچ جائے۔ مذہب کوئی سا بھی ہو، اس کے پختہ پیرووں سے مذہب کے موضوع پر گفتگو کرنا ہے نازک۔ اور مسلمانوں سے مخاطبت میں تو یہ نزاکت اور بڑھ جاتی ہے، ایسے کہ انھیں تو دائرہ سے باہر ہونے کی اجازت ہوتی نہیں، عقائد کے لحاظ سے ان کا سیدھا راستہ تو ایک ہی ہے جو تنگ بھی ہے۔ اور مومن کو داہنے بائیں کسی طرف ذرا بھی ہٹنے کی اجازت نہیں۔ ہندوؤں کی حالت اس سے ذرا مختلف ہے گو ہمیشہ یہاں بھی نہیں"

جواہر لال جی نے ابھی ایک ہلکی سی چوٹ محمد علی کی طوالت پسندی پر کی تھی لیکن یہ مذہب اور لا مذہبی اور ہندو ذہنیت پر ایک بھلا چنگا تبصرہ خود ہی کر ڈالا جسے ہمارے موضوع سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اب اس کے بعد سنیے :۔

"تو اس لیے میرے اور محمد علی کے درمیان مذہبی گفتگو نہیں آنے پاتی تھی، لیکن بھلا وہ چپ رہنے والے کب تھے۔ کچھ ہی روز بعد (یہ شاید ۱۹۲۵ء ہو یا شروع ۱۹۲۶ء) ان کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا۔ ایک دن وہ اِبل ہی تو پڑے۔ دلی میں ان کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا، کہ انھوں نے گھیر گھار کر مذہب کے موضوع پر مجھے لانا چاہا۔ میں نے ٹالنا چاہا اور عرض کیا کہ ہمارے نقطۂ خیال اتنے مختلف ہیں، اور ایک دوسرے کو قائل کرنا مشکل ہی ہے، لیکن وہ بھلا کب ٹالے ٹلنے میں آنے والے تھے۔ بولے "صاف صاف کہہ ڈالو۔ تمھارے خیال میں میں مذہب کے معاملہ میں کچھ دیوانہ سا ہوں، تو آج اسی کو خوب اچھی طرح صاف کر لو۔" اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ "میں نے مذہب کا مطالعہ کیا ہے

اور مطالعہ بھی عمیق و وسیع۔ ادھر دیکھو۔ وہ سامنے الماریاں جو کتابوں سے بھری ہیں وہ مذہب ہی سے متعلق ہیں، خصوصاً اسلام اور مسیحیت سے متعلق اور ان میں جدید ترین کتابیں بھی ہیں، مثلاً ویلز کی God. The Invisible King۔ پھر دوران جنگ میں طویل نظر بندی کی جو مہلت ملی، یہ وقت میں نے قرآن مجید کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اور تفسیریں اور ترجمے دیکھے۔ اور اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں ۹۷ فیصدی تو ایسی ہیں جو بالکل عقل میں آجاتی ہیں۔ اب بس ۳ فیصدی عقل بشری کے ماوراء امور سے متعلق ہیں، سو ظاہر ہے کہ جس کی ۹۷ فیصدی باتیں بالکل دلنشین ہوگئیں، اس کی بقیہ ۳ فی صدی پر ایمان لانے سے کون سا امر مانع ہو سکتا ہے؟"

یہ استدلال تو کچھ ایسا قوی نہ تھا، لیکن بحث و مباحثہ سے بہر حال میں بچنا چاہتا تھا۔ میرے لیے حیرت کی چیز وہ نہیں، جو میں نے اب تک کہی، بلکہ وہ ہے جو اب کہنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس کے بعد محمد علی نے کہا کہ "قرآن جو کوئی بھی انصاف اور بے تعصبی سے پڑھے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ اور یہ میرے علم میں ہے کہ گاندھی جی اسے خوب پڑھ چکے ہیں، اس لیے دل ہی دل میں اسلام کی صداقت کے تو لامحالہ قائل ہوگئے ہوں گے۔ کبر نفس کی بنا پر اس کا اعلان نہ کریں تو اور بات ہے۔" (ص ۱۱۸ - ۱۱۹)

جواہر لال کا قلم جزئیات میں یقیناً کہیں کہیں بہک گیا ہے لیکن کلی اور اصولی حیثیت سے محمد علی کی ذہنیت کا جو نقشہ دکھا دیا ہے، وہ بالکل نقل مطابق اصل ہے۔

دنیا میں، کون بجز محمد علی کے ایسا سر پھرا تھا کہ دوسروں سے اس طرح لپٹ لپٹ کر تبلیغ کیے جاتا! مخاطب ہیں کہ سننے سے جی چرا رہے ہیں، پہلو بدل رہے ہیں، اور وہ ہیں کہ اپنی دھن

میں مست، سناتے چلے جاتے ہیں! ——— دنیا ایسوں کو خردباختہ و دیوانہ نہیں تو اور کیا کہیں عاقل و فرزانہ کہے گی؟

اس کے بعد تذکرہ کا رخ خالص سیاسی ہے۔

"سالِ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگرس سے ہٹتے گئے، یا ان ہی کی زبان کے تتبع میں، کانگرس ان سے ہٹتی گئی۔ رفتار اختلاف بہت ہی تدریجی رہی، یعنی اس مدت میں، یعنی کئی سال تک محمد علی کانگرس میں، اور آل انڈیا کانگرس کے جلسوں میں نہ صرف برابر شریک ہوتے رہے، بلکہ سرگرم حصہ بھی لیتے رہے۔ لیکن دوری اور بیگانگی بہرصورت بڑھتی ہی گئی۔ اس صورت حال کی ذمہ داری فلاں فرد یا فلاں فلاں افراد پہ ڈالنی تو شاید صحیح نہ ہو۔ اس لیے کہ واقعات ملک کی رفتار ہی لے اس نتیجہ کو ناگزیر بنا رکھا تھا۔ تاہم یہ نتیجہ افسوس ناک ضرور تھا جس نے ہم میں سے بہتوں کے دل کو دکھ پہنچایا۔ اس لیے کہ اختلافات، فرقہ دارانہ مسئلہ پر جو کچھ بھی ممکن ہوں، لیکن سیاسی مسئلہ میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ محمد علی آزادیٔ ہند کے دلدادہ تھے۔ اور جب یہ سیاسی سطح نظر مشترک تھا، تو پھر فرقہ دارانہ مسئلہ میں بھی ہمیشہ ان سے سمجھوتہ کی گنجائش تھی۔ محمد علی کو ان رجعت پسند دل سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ جو فرقہ وارانہ مسائل کے علم بردار بنے گھوم رہے ہیں۔" (ص، ۱۱۹-۱۲۰)

تقدیر نے ذرا یاوری کی ہوتی، تو حالات کیا سے کیا ہو گئے ہوتے! مشہور و معروف نہرو رپورٹ ستمبر ۲۸ء میں نکلی۔ محمد علی، بیمار و نزار، ذیابیطس کے شکار کئی مہینہ قبل یورپ علاج کے لیے جا چکے تھے۔

"ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ محمد علی ۲۸ء کے موسم گرما میں یورپ جا چکے

تھے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی اس وقت ایک زبردست کوشش ہوئی، اور کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کاش محمد علی اس وقت ہوتے۔ بہت ممکن تھا کہ نتائج دوسرے نکلتے۔ لیکن جب تک وہ واپس آئیں آئیں، معاملات بہت دور تک پہنچ چکے تھے۔ اور حالات ناگزیر نے انھیں دوسرے فریق میں لا کھڑا کیا۔" (ص ۱۷۰)

یہ ذکر آج ملک کی آزادی کامل کے سب سے بڑے علم بردار اسی محمد علی کا ہو رہا ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء میں خود اپنے بہت سے بھائی ہندوؤں کی زبان میں "ٹوڈی" تھا "غدار" تھا "قوم فروش" تھا، طلب جاہ کا پتلا اور نمائش کا متوالا تھا!

"دو سال بعد، سنہ ۱۹۳۰ء میں جب جیل بھرنے لگے، اور قانون شکنی کی زبردست تحریک پھر شروع ہوئی، محمد علی نے کانگرس کے فیصلہ کی خلاف ورزی کی، اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے۔ مجھے ان کی شرکت سے دکھ پہنچا۔ میرے خیال میں وہ خود اس سے خوش نہ تھے، چنانچہ لندن میں انھوں نے جو کچھ کیا، اس سے صاف یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے لیے اصل جگہ ہندوستان کا میدان جنگ ہے، نہ کہ لندن کانفرنس کا لیے ثمر کمرہ؛ اگر مقدر میں ان کا ہندوستان واپس آنا ہوتا تو مجھے اپنی جگہ پر یقین ہے کہ وہ دوبارہ شریک جنگ ہو کر رہتے۔ جسمانی حیثیت سے ان کی حالت یاس کو پہنچ چکی تھی، اور سالہا سال سے مرض کا تسلط ان پر جمتا چلا آ رہا تھا۔ لندن جب پہنچے، تو ضرورت انھیں آرام و سکون کی تھی، برعکس اس کے انھیں دھن اس کی سوار رہی کہ واقعی کوئی کارنامہ اپنے شایان شان انجام دے ڈالیں۔ بس، اسی نے انھیں اور جلد ختم کر ڈالا۔ فرنگی جیل میں، ان کی خیرہ فات پا کر ہیں دھک سے رہ گیا۔" (ص ۱۷۰)

آخری وقت کا منظر آپ دیکھ چکے، تو اب اس زندگی میں آخری ملاقات کا نظارہ بھی کرتے چلیے۔ وہ بھی کچھ کم اثر انگیز نہیں:

"میری آخری ملاقات محمد علی سے دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبۂ صدارت کے بعض حصے انھیں ناپسند ہوئے تھے، اور ان پر وہ شدت سے نکتہ چینی کرتے رہے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ کانگریس آگے بڑھی جا رہی ہے اور سیاسی اقدامات میں پیش پیش ہو رہی ہے حالانکہ وہ خود سب سے پیش پیش رہنے والے تھے۔ اس لیے قدرۃً یہ دیکھ دیکھ کر بےچین ہو رہے تھے کہ انھیں پیچھے رہ جانا پڑے اور دوسرے آگے نکلتے چلے جائیں۔ مجھے انھوں نے خاص طور پر نصیحت فرمائی کہ 'دیکھو جواہر لال! تمھیں متنبہ کیے دیتا ہوں کہ یہ جو آج تمھارے ساتھی بنے ہوئے ہیں، تمھارا ساتھ نہیں دینے کے۔ وقت پڑنے پر سب تم سے غداری کر جائیں گے۔ تمھیں پھانسی پر چڑھانے والے تمھارے یہی کانگریسی ہوں گے' ——— ایک ہولناک پیش گوئی!" (صفحہ ۱۲۰)[1]

تین چار صفحے کا مفصل تذکرہ یہی تھا ——— لفظی ترجمہ کی سعی کسی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی ہے کوشش صرف یہی رہی ہے کہ جواہر لال اگر اردو میں لکھتے تو اس مفہوم کو کیونکر ادا کرتے ——— اس مستقل تذکرہ اور ابتدا کے ضمنی تذکروں کے علاوہ دو جگہ ذکر اور ہے۔ ہندو مسلم نزاعات اور "فرقہ وارانہ" کشمکش کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں بار بار کوشش اس کی ہوئی کہ گفت و شنید، بحث و مباحثہ کے ذریعہ سے کوئی صورت مفاہمت کی پیدا ہو۔ ان جلسوں کا نام اتحاد کانفرنس ہوا کرتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا کانفرنس وہ تھی جو ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی صدر کانگرس

[1] یہ ہولناک پیش گوئی اس صورت میں تو نہیں لیکن ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کی صورت میں بہرحال پوری ہو کر رہی۔ (ماجد)

کی دعوت پر دہلی میں ہوئی تھی، اسوقت جبکہ گاندھی اپنا اکیس دن کا شہورت لیکے ہوئے تھو" (ص ۱۳۹)
مسلمانوں میں احساس قومی و تحریک وطنی کے ارتقاء کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، اور یہ بات ۱۹۱۴ء کا ہے کہ

"مسلمانوں کے طبقۂ اعلیٰ کا جو رجحان اب وطنیت کیجانب ناگزیر ہو چکا تھا، اسے نہ گورنمنٹ روک سکتی تھی، نہ آغا خاں، جنگ عظیم نے اس تحریک کی رفتار تیز کر دی، اور ادھر نئے لیڈر پیدا ہوتے گئے، ادھر آغا خاں ہٹتے گئے۔ علی گڑھ کالج تک کو اپنا رنگ بدلنا پڑا، اور نئے لیڈروں میں سب سے زیادہ زبردست طاقت والے علی برادران ہی تھے، جو دونوں کے دونوں علی گڑھی تھے۔" (ص ۴۶۶)

غرض اسی طرح محمد علیؒ کی قوت کا، شخصیت کا، جوش کا، اخلاص مندی کا، مذہب پرستی کا اعتراف جواہر لال کے حقیقت نگار قلم سے، موجود ہے، اتنی وضاحت وصراحت اور اتنی تکرار و تواتر کیساتھ کہ اس سے زیادہ کی توقع کسی طرح بھی نہیں قائم کی جا سکتی تھی۔ جواہر لال آخر اپنی ہی سرگزشت لکھ رہے تھے، کوئی "مناقب محمد علی" لکھنے تو بیٹھے نہ تھے ——— ہندو اخبارات نے کتاب کے جو اقتباسات شائع کیے تھے، ان میں اور اصل کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عوام کی زبان پر چڑھا ہوا ایک مصرع ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

دنیائے اسلام کے "گوہر" نہ سہی، "جوہر" کی قدر "جوہری" نہ سہی، (جواہر) کے ہاں تو بہی طرح موجود ہے!

ضمیمہ نمبر (۸)

محمد علیؒ اور تحریک ہجرت[1]

[جس زمانہ میں سچ کی اشاعت ملتوی تھی، اور صدق ابھی جاری ہوا نہ تھا[2]، سر تھیوڈر ماریسن کے ایک مضمون پر ذیل کا مراسلہ روزنامہ ملت (دہلی) میں شائع کرنا پڑا تھا۔ کوئی افسانہ کیسا ہی فرضی ہو، جب بار بار دہرایا جاتا ہے، تو خلقت کی نگاہ میں ایک مسلّم تاریخی حقیقت بنجاتا ہے۔ حال میں ایک اسلامی معاصر کے کالموں میں پھر اسی افسانہ کی بازگشت نظر پڑی، اس لیے مراسلۂ مذکور، خفیف لفظی تغیر کے بعد صدق میں شائع کیا جارہا ہے]

ایڈیٹر صاحب ملت۔ السلام علیکم

آپ کے روزنامہ میں سر تھیوڈر ماریسن کے ایک مبسوط مضمون کا ترجمہ مسلسل نکل رہا ہے، ماریسن صاحب مدتوں علی گڈھ میں مسلمانوں کے ملازم رہ چکے ہیں، اور مسلمانوں کے ہمدرد مشہور ہیں۔ لیکن اسلامی سیاسیات پر ان کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے، حسب توقع خالص برطانوی امپریلزم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہے۔

سارے مضمون کے مغالطوں اور غلط بیانیوں کی مفصل تردید کی نہ حاجت نہ مہلت اس وقت صرف ایک مسئلہ کو تمثیلاً پیش کرنا ہے، اور وہ بھی مختصر لفظوں میں۔ ۹؍مارچ کے

---

[1] صدق یکم ستمبر ۱۹۳۶ء [2] یعنی شروع جنوری ۱۹۳۳ء سے لیکر آخر اپریل ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ۔

کے پرچہ میں سرموف فرماتے ہیں :۔

"مولانا محمد علی مرحوم، انگلستان ایک وفد لے کر گئے، اور انھوں نے مسٹر ایچ اے، ایل، فشر کے سامنے، جو وزیر ہند کی نیابت کر رہے تھے، یہ تشریح کی ......

مگر مولانا محمد علی کو خالی ہاتھ ہندوستان واپس آنا پڑا، اور وہاں سے واپسی پر انھوں نے اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ تلقین شروع کر دی کہ حکومت نے اسلامی شریعت کو اپنے پانوں کے نیچے کچل ڈالا ہے، اور اس لیے ہندوستان اب دار الحرب ہے، اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر ایسے ممالک میں ہجرت کر جائیں، جہاں اسلام کی حرمت و عزت اب تک قائم ہے۔ اس آواز پر لبیک کہتے ہیں ہزاروں سیدھے سادے مسلمان تحریک ہجرت میں شریک ہو گئے۔"

اس کے آگے ان بدنصیب مہاجرین کے مصائب کی تفصیل ہے۔ اور پشاور اور کابل کے درمیان، بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کی قبریں بنجانے کا دردناک تذکرہ ہے گویا علی برادران کی سیاہ فردِ جرائم کا ایک اہم عنوان یہ بھی ہے کہ انھوں نے بے سمجھے بوجھے ہزارہا مسلمانوں کو بے خانماں اور طرح طرح کے ناقابل بیان شدائد میں مبتلا کرا دیا!

یہ الزام حکومت کے ایجنٹوں کی زبان پر پہلی بار نہیں آیا ہے۔ لندن یونیورسٹی کے ایک نامور "مستشرق" پروفیسر گب ہیں، آپ نے "ماہرین فن" کے قلم کا ایک مجموعۂ مضامین "وہ ذر اسلام" (Whither Islam) کے نام سے سال دو سال اُدھر شائع فرمایا ہے، اس کے صفحات میں بھی یہی مضمون شد و مد سے دہرایا گیا ہے، مگر علی برادران کے نام کی تصریح نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ۲۰ء کی تحریک ہجرت کے سلسلہ میں جو کچھ بھی بے عنوانیاں پیش آئیں ان کی ذمہ داری علی برادران، خصوصاً مولانا محمد علی پر ڈالدینا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے سر مائیکل اوڈوائر کے معروف و معلوم مظالم پنجاب کو سر تھیوڈر مارلین سے منسوب کر دیا جائے! مارلین صاحب تو تاریخ کے پروفیسر رہ چکے ہیں، اور ان کی تاریخ دانی مشہور ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں رہا کہ ہجرت کا زور تو ۲۰ء میں، جون، جولائی، اور اگست کے مہینوں میں رہا۔ جب محمد علی غریب، تحریک کی رہنمائی کرنا الگ رہا، ہندوستان سے اور اپنے وطن سے، ہزارہا میل دور، عین سر مارلین کے وطن میں موجود، اور اپنے نہیں ان کے ہم وطنوں کے سامنے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کر رہا تھا! ——— ہندوستان کی سرزمین کو تو وہ مہینوں قبل غالباً فروری میں چھوڑ چکا تھا!

محمد علی کی ذات الگ رہی، محمد علی جس کمیٹی کے روح رواں تھے، یعنی مرکزی خلافت کمیٹی، خود اس کا بھی کوئی تعلق، تحریک ہجرت سے، اگست ۲۰ء تک مطلق نہ تھا، اور تحریک تمامتر دوسرے ہاتھوں میں رہی! سرکاری سالنامہ انڈیا ۲۰ء میں "بہت کچھ جھوٹ کے باوجود، اتنا سچ بھی تحریر ہے کہ تحریک ہجرت کا آغاز صوبہ سندھ سے ہوا، اور تحریک، صوبۂ سرحدی میں، حیرت انگیز سرعت کے ساتھ "مقامی ملاؤں کے اثر سے" پھیلی۔ (ص ۷۵ کتاب مذکور)

بے خانماں مہاجرین کے جوش ہمدردی میں، کاش سر مارلین کو برطانوی شرافت کا وہ یادگار واقعہ یاد آجاتا، جو مہذب و شائستہ گورے سپاہیوں کے ہاتھوں، کچا گڑھی ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا تھا! ایک بدمست گورا، شراب کے نشہ میں (اور شاید حکومت کے نشہ میں بھی) جھومتا ہوا زنانہ درجہ میں گھسا، اسے دیکھ کر ایک غریب مہاجر حبیب اللہ، عورتوں کی عزت

آبرو بچانے کو آگے بڑھا۔ اور اسی جرم کی پاداش میں دہیں کھلے خزانے "دلیر و شجاع" فوجی گوروں کی ایک پوری جماعت کے ہاتھ سے شہید ہو کر رہا۔ ——— جن حضرات کے پاس ینگ انڈیا بابت ۱۹۲۰ء کی فائل موجود ہو۔ وہ جولائی اور اگست کے پرچوں میں خود گاندھی جی کی تحریریں اسی موضوع پر، نیز چشم دید گواہوں کی باضابطہ شہادتیں ملاحظہ فرمالیں۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے تحریک ہجرت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، ۱۰ اگست کے جلسہ میں منظور کیا۔ کارروائی پوری باقاعدگی اور نظم کے ساتھ کرنے کو مولانا شوکت علی نے سب سے پہلے سفیر افغانستان متعینہ دہلی سے معاملات طے کرنے ضروری خیال کیے۔ چنانچہ سفیر صاحب سے مراسلت ۱۱ اگست کو شروع کی۔ ۶، ۷ ہفتے گزر گئے اور محض ضابطہ کی مراسلت ہی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ تحریک ترک موالات، اپنی پوری تفصیل کے ساتھ بروئے کار آگئی، اور معاً خلافت کمیٹی، تحریک ہجرت نہیں بلکہ ترک موالات کی جانب انہماک، جوش و قوت کے ساتھ متوجہ ہو گئی ——— مولانا محمد علی اس وقت تک بھی ہندوستان نہیں آئے تھے۔ وہ تو کہیں شروع اکتوبر میں ہندوستان پہنچے ہیں۔ اگست اور جولائی اور جون کے واقعات کا ہفتوں اور مہینوں پیشتر کے گزرے ہوئے واقعات کا ذمہ دار اس مرحوم کو قرار دینا، یورپ ہی کے "مورخین محققین" کا کارنامہ ہو سکتا ہے!

ضمیمہ نمبر (۹)

محمد علیؒ

(ریڈیو اسٹیشن دہلی سے تقریر۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۰ء، وفات ۱۹۳۱ء)

[ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس کی تقریروں میں، خیال رکھ لینا چاہیے کہ نہ سیاسیات پر کچھ کہا جا سکتا ہے، اور نہ مذہب پر کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے۔ محمد علیؒ پر بھی تقریریں عام قواعد سے مستثنیٰ نہ تھی، احتیاط کے باوجود بعض الفاظ اور فقرے اصل تقریر کے وقت چھوڑ ہی دینے پڑے تھے]

نومبر کا مہینہ ہے اور شروع کی تاریخیں، سنہ انیس سو چھبیس، سہ پہر کے وقت، کانپور اسٹیشن سے لکھنؤ میل چھوٹنے کو ہے کہ دو شخص، ندوہ کے سالانہ اجلاس سے موٹر پر بھاگا بھاگ اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ پٹ ٹکٹ لے لوا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیروں کی مدد سے پھینک پھانک سکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز بمبئی سے بیٹھے چلے آرہے تھے۔ نو وارد دونوں کے دونوں ٹھیٹھ ہندوستانی۔ کھدر پوش، جبا پوش، داڑھی باز۔ ایک وجیہ و جامہ زیب، دوسرا کریہہ و بدقطع۔ صاحب بہادران نو واردوں کا کینڈا دیکھ کچھ ہنسے، کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں جو یہ سمجھے ہوں کہ یہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ یا دل کے "بادشاہی" روزمرہ میں "وو آؤٹ" (Rout) والے ہیں!

خوش قطع نووارد نے اسی برتھ پر قبضہ جمایا جس پر "صاحب" پہلے سے جمے ہوئے تھے۔ گاڑی چلی، اور گنگا کا پل بات کہتے آگیا۔ ادھر پہیوں سے گھڑگھڑ کی آواز آئی، اُدھر صاحب بہادر ان دونوں دیسی آدمیوں کی طرف دیکھ چھچھڑی ادا سے مسکرائے، اور منہ بنا کر بولے "So This is mother Ganges" یہ گنگا مائی ہے (طنز کا زور لفظ mother پر تھا۔ پاس کا کھدر پوش معاً چائے کی پیالی منہ سے ہٹا، انگریزی زبان میں ٹھیک انگریز کے لب و لہجہ میں بولا "اچھا! تو آپ کے دریا سے یہ رشتہ ہے؟ مرد آدمی یہ دریا کو مائی اور موسی، اماں اور خالہ کہنا کیا معنی؟" "صاحب" یہ تڑاق سا جواب پا، سناٹے میں آگئے —— یہ تڑپڑا جواب دینے والا محمد علی، اور اس کا ساتھی کہیے یا "تابع مہمل" آپ کا یہ خادم!

صاحب بیچارہ کو یہ گمان نہ تھا کہ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھائے ہوئے اور جسم پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا، چہ جائے کہ انگریزی میں جواب دے سکے۔ اور وہ بھی ایسی شستہ و برجستہ! کچھ دیر غوطا میں رہے، پھر ادھر سے منہ پھیر کر گفتگو اپنے پرانے اور ہم جنس رفیق سفر سے کرنے لگے۔ اتفاق سے موضوع گفتگو تھا کرکٹ۔ ولایت سے مشہور ٹیم ام، سی، سی، نئی نئی ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ دونوں صاحب بہادر لگے آپس میں یہ گفتگو کرنے کہ فلاں کھلاڑی ایسا ہے اور فلاں ویسا۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ محمد علی سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "دخل در معقولات معاف، آپ رائے زنی میں بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔" اور لگے تفصیل و تشریح کرنے کہ فلاں میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ ہوتے ہوتے تبصرہ نفس کرکٹ پر شروع ہو گیا اور بیان ہونے لگی گویا انگلستانی کرکٹ کی پوری تاریخ۔ بولنے والا اب گفتگو کیوں کر رہا تھا، یوں کہیے کہ کسی انسائیکلو پیڈیا کا آرٹیکل کرکٹ پر سنا رہا تھا۔ صاحب بہادر فرط حیرت سے دم بخود کہ الٰہی یہ کس قیامت کا

انسان ہے کہ شکل ملاؤں کی سی، اور ماہرانہ معلومات اور فنی تنقید میں کرکٹ بازوں کا استاد! آخر سنتے سنتے گھبرا کے ایک بار بولے "آپ کو بڑے ہی معلومات کرکٹ سے متعلق ہیں"! انھوں نے کہا "ایسے معلومات ایک مجھی کو کیا، ہر علی گڈھ والے کو ہوتے ہیں"۔ وہ بولا "اچھا تو آپ علی گڈھ کے پڑھے ہیں، کپتان رہے ہوں گے"۔ بولے "جی نہیں، کپتان تو بڑے بھائی تھے"۔ (Big Brother یہ شوکت صاحب کے لیے Big Brother کی اصطلاح خود محمد علی کی چلائی ہوئی تھی، اور سارا انگریزی پریس اس سے واقف ہو چکا تھا۔ صاحب بہادر نے اپنے نزدیک گویا بڑی پہیلی بوجھی، اور بول اٹھے "You Talk like Mohammad Ali یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں"! یہ بولے I am Mohammad Ali "زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں"!

صاحب کی حیرت اب دیکھنے والی تھی۔ آنکھیں پھاڑے، اور نظر اس کھدر پوش کے چہرہ پر گڑوئے ہوئے بولے Really! one of The Two Ali brothers "کیا واقعی؟ وہی محمد علی، جو علی برادران میں سے ایک ہیں"! انھوں نے جھک کر جواب دیا Yes, and The younger and more sharp Tongued of The Two "جی ہاں وہی بھائی، جو دونوں میں چھوٹا، اور زبان کا زیادہ تیز ہے"! صاحب کو ابھی اپنی حیرت کو دور کرنے میں دیر سکنڈوں کی نہیں، منٹوں کی لگی۔ بےچین اور بیقرار، پہلو پہ پہلو بدل رہے ہیں اور ٹکٹکی ہے کہ محمد علی کے چہرہ کی طرف لگی ہوئی۔ محمد علی نے جو یہ دیکھا تو صاحب بہادر کو اور گڑبڑانا شروع کر دیا۔ بولے "یہ میرا نام سن کر آخر اتنی گھبراہٹ کیوں؟ کیا یہ خیال تھا کہ علی برادران جہاں کہیں کسی انگریز کو دیکھ پاتے ہیں بس اس پر جھپٹ پڑتے ہیں؟ تو اطمینان رکھیے اطمینان دیکھ لیجئے: (ہاتھ پھیلا کر) یہ میرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملے دملے کا تو خیال بھی

دل میں نہ لائیے۔" صاحب کے ہاتھ میں وقت کا مشہور انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے پڑھاکر" اچھا۔ ان الزامات کا کیا جواب ہے، جو یہ روز آپ پر لگاتا رہتا ہے؟" محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں، بولے" اسے تو آپ ہی پڑھیے، میں پرچہ کو نہیں، پرچہ نویس کو خوب پڑھ چکا ہوں۔ آکسفورڈ میں میرے زمانہ میں تھا، مجھ سے پیچھے۔ آتا جاتا اس کو اس وقت بھی کچھ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ گلہ ہوا اور گلہ بان نہ ہو تو نہ سہی لیکن یہ عجب تماشہ ہے کہ اس کا کوئی گلہ نہیں، اور کہتا اپنے کو گلہ بان ہے!" یہ سارا لطیفہ تھا ایڈیٹر صاحب کے نام Mr. Sheppard پر! ——— داستان خاصی طویل ہوگئی۔ ایک ہی قصہ کو کہاں تک سنے جایئے گا۔ چھوڑیے یہیں اس قصہ ناتمام کو۔

سنہ ۱۹۲۰ء ہے۔ محمد علی۔ وفد خلافت لیکر یورپ گئے ہوئے ہیں، کوئی سنتا نہیں چاہتا اور یہ ہیں کہ اپنی سنائے چلے جاتے ہیں۔ لندن میں ایک جلسہ میں تقریر کا موقع ڈھونڈھ نکالا۔ کن مشکلوں سے اجازت پانچ منٹ کی ملی۔ کہنے کھڑے ہوئے کہ" حضرات! یہ تو سوچیے کہیں آرہا ہوں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے، اور ترجمانی مجھے کرنا ہے ۳۰ کروڑ انسانوں کے خیالات کی۔ اب آپ خود ہی حساب لگا لیجئے کہ فی منٹ نہیں، فی سکنڈ بھی نہیں، ہر سکنڈ کی کسر میں کتنوں کے خیالات و جذبات آپ تک پہنچاؤں گا۔" آوازیں آنے لگیں آپ کہے جایئے کہے جایئے، اور ہر پانچ منٹ کے بعد پانچ ہی پانچ منٹ اور بڑھتے رہے یہاں تک کہ پورے بیس منٹ ہو گئے!

اسی سفر میں لندن کا ایک اور منظر۔ مولانا مخالفین کے مجمع میں تقریر کر رہے ہیں کہ

"صلح کے وقت ہم استنبول کس طرح چھوڑ سکتے ہیں، تھریس اور سمرنا تو پھر غنیمت ہیں، لیکن استنبول سے ہماری تاریخ وابستہ ہے۔۔۔۔۔۔" یہیں تک پہنچے تھے کہ ایک گوشہ سے آواز آئی کہ "یعنی یعنی؟ استنبول آخر کب سے آپ کے قبضہ میں ہے؟" جواب میں دیر کیا تھی، کھٹ سے ارشاد ہوا کہ "کوئی فاضل تاریخ مجھ سے سنہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس وقت تو بس اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے پاس ہندوستان ہے، اس کے تگنے زمانہ سے ہمارے پاس استنبول ہے!" جلسہ لوٹ لوٹ گیا۔ اور فاضلِ تاریخ کی آنکھیں پھر نہ اونچی ہوئیں!

مہاراجہ الور، جو ابھی کل تک زندہ تھے، ابھی تو بہت سے لوگ ان سے واقف ہوں گے ۲۸ء میں ایک بار مہربان ہو، مولانا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ انگریزی کے تو ماہر تھے ہی فارسی کا بھی اچھا مذاق رکھتے تھے، شاعر تھے، وحشی تخلص تھا۔ پہلی ملاقات میں اپنا دیوان مولانا کو پیش کیا۔ تو اس پر یہ الفاظ لکھ دیئے "To my maulana from his Wahshi" "اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کی طرف سے!" یہاں کیا دیر تھی۔ جب جامعہ ملیہ کا نصاب اپنا تیار کیا ہوا [illegible]، جھٹ اس پر یہ سطر لکھ، سارا قرضہ دم نقد چکا دیا۔ "From a Bogus maulana To a real Maharaja" "ایک نام کے مولانا کی طرف سے ایک کام کے مہاراجہ کی خدمت میں!"

لطائف و ظرائف اس طرح کے کوئی دو چار، دس بیس ہوں تو کہے جائیں۔ یہاں تو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، معمول یہی تھا ——— کہاں تک سنیے گا؟ اور کوئی کہاں تک سنائے گا؟ سننا اور سنانا الگ رہا، کسی کو یاد ہی کب رہ سکتے ہیں؟ اور یاد کو بھی چھوڑیئے، یہی کیونکر ممکن تھا کہ کوئی سال کے ہر دن، اور ہر دن کے چوبیسوں گھنٹے، ہمزاد بنا، ساتھ ہی ساتھ

بسا اور چکا رہے؟ ! جس قبر میں قوم و ملت کی بے شمار آرزوئیں اور ولولے مدفون ہیں، وہیں آج ہزار ہا ہزار ادبی لطیفے اور چٹکلے بھی زیرِ خاک ہیں۔

مناسبتِ لفظی کے بادشاہ تھے۔ قوتِ حافظہ بلا کی تھی، برجستگی اور حاضر جوابی تو کہنا چاہیے کہ ان پر ختم تھی۔ چاہے کسی والیٔ ملک کے دربار میں ہوں، جامع مسجد کے منبر پر ہوں، عدالت کے کٹہرے میں مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوں کہیں اور کسی حال میں ہوں، اپنی آمدِ طبع سے نہ چوکتے۔ حد یہ ہے کہ شدید غصہ کی حالت میں بھی ذہانت کند نہ ہوتی اور اس پر جلا ہوتی۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں حکیم صاحب کے مکان پر ہو رہا ہے۔ محمد علی بیمار و معذور لیٹے ہوئے ہیں۔ مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر ہیں۔ یہ بھی ایک روزنامہ کے مالک ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کے نفس ناطقہ روزنامہ کے اڈیٹر صاحب بھی ہیں، اور صاحبزادہ بھی۔ بحث نے طول پکڑا، گرماگرمی نے زبانوں پر چھالے ڈال دیے۔ سوال و جواب کی تلخیوں نے منہ کے مزے خراب کر دیے۔ آخر وہ تینوں صاحب ناخوش ہو، جلسہ پلیٹ فارم سے بیچ اٹھ کر جاتے ہوتے ہیں۔ اُدھر وہ اٹھے، اور ادھر محمد علی نے پکار کر کہا "غضب ہو گیا۔ باپ بیٹے روح القدس تینوں کے تینوں خفا ہو گئے"!

ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔ محمد علی شاعر بھی تھے، اور شاعری کی دنیا میں نام تھا جوہر۔ بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص رہ جاتے ہیں، ان کے لیے تجویز کرتا ہوں اسی وزن و قافیہ میں شوہر ——— بیشک عروسِ سخن کو ایسا شوہر کبھی کیوں ملنے لگا تھا!

شیفتہ کی مشہور غزل ہے "پشیمانیوں میں ہم" "نادانیوں میں ہم" اس پر غزل کہنے بیٹھے

تو مطلع ارشاد ہوتا ہے:

کیوں شہر چھوڑ جا بسیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

علی گڈھ کے مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی بے تکلفی کے تھے۔ اس کے ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم!

خود بیجاپور جیل میں تھے۔ بڑے بھائی، بحیم و شحیم، راجکوٹ جیل میں پڑے پڑے دبلے ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی نوجوان ہی تھے کہ علی گڈھ کالج میں زبردست اسٹرائک ہوئی، اور کل کچھ ایسی بگڑی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کالج ہی کا دم واپسیں آپہنچا، سرسید کی برسی کا دن آیا، اور عین اسی دن اولڈ برائز نے اپنا سالانہ جلسہ شانہ طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں، اور ایک منظوم عرضداشت سرسید کی روح کی خدمت میں، اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا پیش کرتے ہیں۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد مذہبی ملحوظ خاطر ہیں ؎

یہاں دُعا کہ تاثیرِ دعا میں شک نہ ہو تم کو
وہاں عنائع نہ ہوگی پھر بھی مشغولِ دُعا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اسکی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو

ردیف دال میں یہ غزل کیسی چل گئی ہے، اور ہر شعر کیسا بولتا ہوا ہے ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ جیل کے باہر تھا، جیل کے اندر خود محمد علی کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ سہی آپ بیتی کا ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے محمد علی کو دور سے، سردارِ قوم کی حیثیت سے جانا، پیشوائے ملت کی حیثیت سے پہچانا، خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے قریب سے دیکھا، بہ حیثیت دوست کے

عزیز کے۔ انسان کے۔ ان دیکھنے والوں نے کیا کچھ دیکھ لیا، کیا کچھ پالیا۔ ایک صداقت مجسّم، پیکرِ اخلاص، جراُت، ہمت و بے خوفی کا مجسمہ! پاس والے جتنا قریب سے دیکھتے گئے، جوہر کے یہی جوہر اور زیادہ کھلتے گئے۔ ابھرتے گئے۔ نکھرتے گئے۔ کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں، جو کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو محمد علی قطعاً سیاسی نہ تھے، ایک بار نہیں، ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے، مہر و الفت کے بندے۔ بیوی بچوں، دوستوں رفیقوں کے عاشق زار، عزیزوں کے جان نثار، اجنبیوں تک کے مونس و غمگسار، کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے، میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ عالم اسلام کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم، افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے، اور اس کی چبھن محمد علی دہلی میں بیٹھے محسوس کریں۔ "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کسی کے حق میں شاعری ہوگی، ان کے حق میں واقعہ۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص۔ خود اپنے گھر میں مفلسی و ناداری، مہمان اور دوسروں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے ہیں، اور زبردستی کھانا کھلا رہے ہیں!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار۔ ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی۔ ۲۳ء میں ابھی جیل میں تھے، کہ منجھلی لڑکی، جوان، شادی شدہ، دق میں مبتلا ہوگئی، اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور اور محصور، صدہا میل دور، باپ پر کیا گزر رہی ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا ہے، وہ اپنی نازوں کی پالی نورِ نظر کے واسطے کیسا کچھ بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑپھڑایا ہوگا۔ کچھ اور زور نہ چلا تو عالمِ خیال میں بیٹی سے کہنے لگا ؎

میں ہوں مجبور، پر اللہ تو مجبور نہیں   تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے دل کو یوں سنبھالنے لگے ؎

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی ڈگیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ — اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر عرض کرتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا — تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تقدیر کا نوشتہ کسی علاج و تدبیر سے مٹ نہیں سکتا، شعر کہنے سے پہلے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

ایک نہیں، دو دو، جوان، پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا، قبر میں اتارا، سلایا۔ دل ذاتی صدموں کی تاب کہاں تک لاتا۔ قومی صدمے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر ۲۴ء میں ترکوں نے خلافت نہیں توڑی، محمد علی کا جگر پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ جئے اس کے بعد بھی برسوں اور بہتوں سے زندوں سے بڑھ کر اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنسے بھی، بولے بھی، گرجے بھی، لیکن اندر ہی اندر برابر گھلتے رہے، پگھلتے رہے، سلگتے رہے۔

پروردگار سے اتنا ربط و تعلق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھنے بیٹھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جہاں یہ مضمون آجاتا کہ ڈرنے کی چیز بندے نہیں، اللہ ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے، اور ان آیتوں کو بار بار پڑھتے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ تو گویا تکیۂ کلام تھا۔ سورۂ یوسف کی آیت ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ کو فرمائش کر کے سنتے اور

وجد کرتے۔ ایک مشہور مفکر نے شہادت دی ہے کہ کانگریس کا رزولیوشن ہو، تقریر ہو، کچھ ہو، کمال تھا محمد علی کو کہ پھیر پھیر کر خدا کا نام ضرور لے آتے تھے۔ آخر آخر دل سب کی طرف سے ٹوٹ گیا تھا، اور خود اپنے مصرع کی تفسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ ع

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

جنوری ۱۹۳۱ء کی ۴ اور ۵ کی درمیانی سب مسلمانوں کے ہاں پندرہویں شعبان کی مبارک شب، اور روے زمین کے مسلمان، ذوق وشوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا کی اور آخرت کی، دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اس برکت والی رات میں مشیتِ الٰہی نے اپنی یہ نعمت ان سے واپس طلب کر لی۔ شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہل وطن و اہل ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان، لندن میں جاں آفریں کے سپرد کی، اور آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں نصیب ہوئی؟ قبلہ اول میں ہیکل سلیمانی کے قریب، جامع عمرؓ سے متصل! اقبالؒ کو الہام ہوا ع

سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

ماتم وشیون کی صدائیں ملک کے ایک ایک گوشہ سے، ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، ایک ایک گانوں سے، اور ہندوستان ہی نہیں، سارے عالم اسلامی میں اس زور وشور سے اٹھیں، اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ "ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے" ان ہی کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرما گئے ہیں ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ضمیمہ نمبر ۱۰

محمد علیؒ کے خطوط

[شروع سال ۱۹۴۱ء سے دہلی ریڈیو اسٹیشن نے اپنے ہاں سے مشاہیر کے خطوط پر تقریروں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا۔ سلسلہ کا عنوان تھا "سمندر پار سے خطوط" اور اس میں وہی خطوط جگہ پا سکتے تھے، جو ہندوستان کے باہر سے لکھے گئے ہوں۔ اپریل میں باری محمد علیؒ کے خطوط کی بھی آئی۔ اور اس وقت مدیر صدق نے ذیل کی تقریر نشر کی۔ ایک سرکاری محکمہ ہے۔ اس کی پابندیوں کو ناظرین تقریر پڑھتے وقت ذہن میں رکھیں۔ تقریر کا وقت ۱۵ منٹ کا تھا]

نوجوانی سے لیکر اپنے قبل از وقت بڑھاپے تک محمد علی یورپ سمندر پار چھ بار گئے۔ اور خط ہر دفعہ وہاں سے بہت سے لکھے لیکن شروع میں ان خطوط کو کون محفوظ رکھتا؟ اس وقت کسے خبر تھی کہ گودوں کا کھلایا ہوا لڑکا، ساتھ کا کھیلا ہوا نوجوان ایک روز شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے گا؟ آخر کے خطوط بے شک بہت سے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس لیکن وہ زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز۔ انھیں کوئی ریڈیو پر کیسے لائے۔ خاص و عام کو کیسے سنائے؟ اس ذخیرہ کے علاوہ بھی جتنے ہیں

---

[1] صدق یکم دسمبر ۱۹۴۱ء

اتنے زائد ہیں کہ کوئی انھیں پھیلانے پر آئے تو آج کا سارا پروگرام اسی ایک عنوان کی نذر ہو جائے داستان گو تھک جائے، اور داستان ختم نہ ہو پائے۔

محمد علی، مولانا تو بہت بعد کو ہوئے۔ شروع میں تو مدتوں مسٹر رہے، مسٹر ہی کہلائے پہلا سفر ۱۸۹۸ء میں کیا۔ جب پرانی صدی کے ختم ہونے کے بعد دو سال رہ گئے تھے۔ سن اس وقت بیس سال کا تھا۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں کیا، جب نئی صدی کو شروع ہوئے بھی دو ہی سال ہوئے تھے۔ سن اس وقت ۲۴ سال کا۔ دونوں سفر طالب علمی ہی کے سلسلہ میں تھے۔ زیادہ تر آکسفورڈ اور لندن میں۔ مشغلے اسی سن و سال کے لائق اور مراسلے ان ہی مشغلوں کے مناسب حال۔ انگریزی میں لکھے ہوئے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڈھ منتھلی میں "Oxford Idling" کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکر ان میں زیادہ تر ہوتا کالج کے کھیل کود کا، ہمجولیوں کی رنگ رلیوں کا، اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا اس دور سے یقیناً آپ کو کچھ زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔

تیسری بار انگلستان جانا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ اب محمد علی ملک کے ممتاز جرنلسٹ اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز تھے۔ کامریڈ عرصہ سے نکل رہا تھا۔ اور اب ہمدرد بھی نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کانپور کی ایک نئی نکلنے والی سڑک کی زد میں ایک مسجد کا گوشہ آرہا تھا۔ اس پر قدرۃً ایک سخت ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اور معاملہ شہر بلکہ صوبہ کے حدود سے نکل کر "آل انڈیا" بن چکا تھا محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری کو ساتھ لے چپ چپاتے ولایت روانہ ہو گئے کہ وہاں جا کر اس معاملہ، اور ایک یہی کیا، ملک کے بہت سے معاملات پر لوگوں سے ملیں ملائیں، دلوں کو گرمائیں طبیعتوں کو نرمائیں، تقریر سے، تحریر سے، قلم سے زبان سے۔ غرض وہاں پہنچ کر ہنگامہ خطابت سے لکھے، عموماً انگریزی میں۔ اکثر کامریڈ میں چھپ بھی گئے۔ انھیں پڑھ کر نقشہ نظر کے

سامنے پھر جاتا ہے۔ اس وقت کے ہندوستان کا، اس وقت کے ہندی مسلمان کا، اس وقت کے انگلستان کی شان و شوکت کا۔ ناکامیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں۔ ہمت پست نہ ہوئی۔ دعوتیں اور ضیافتیں محمد علی کی کثرت ہوئیں لندن میں بھی اور اڈنبرا، نیوکاسل وغیرہ میں بھی۔ ان جلسوں اور صحبتوں میں شریک انگلستان کے مشاہیر بہت سے ہوئے۔ مثلاً اہل قلم و اہل صحافت میں ایچ۔ جی۔ ویلز، جی۔ کے چسٹرٹن۔ اے۔ جی۔ گارڈنر، سی۔ پی۔ اسکاٹ۔ جے۔ اے۔ اسپینڈر، ولفریڈ سن لیمس اور آئرلینڈ کے مشہور شاعر ڈبلو۔ بی۔ ایٹس۔ اہل سیاست میں ریمزے میکڈانلڈ، کیر ہارڈی، جان ڈلن۔ آبرے ہربرٹ، ڈاکٹر رودرفرڈ، مسٹر نیونسن وغیرہم۔ کچھ ایسے مشاہیر بھی تھے جو عین وقت پر خود آنے سے معذور ہو گئے اور اپنے بجائے اپنے معذرت نامے بھیج دیے۔ مثلاً برنارڈ شا، مسٹر بلنٹ وغیرہم۔ محمد علی ان جلسوں سے خوب کام نکالتے۔ جو کچھ کہنا ہوتا ان ہی موقعوں پر کہہ ڈالتے۔ طویل مراسلے، ان کے ٹائمز میں تو بار نہ پاتے، البتہ دوسرے مشہور اخبارات میں ان کے بیانات نکلتے رہتے۔ لارڈ ہیڈلے اس زمانہ میں نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور لیڈی ایولین کوبولڈ تو ان سے قبل ہی اسلام قبول کر چکی تھیں، ان راستوں سے بھی محمد علی نے انگلستان کی سوسائٹی کے اندر خوب گھس پیٹھ پیدا کی۔ اور اپنے مشن میں کچھ ایسے زیادہ ناکام نہ رہے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں جو مراسلہ نکلا ہے، اس میں اپنے اس سفر پر گویا تبصرہ کرتے ہیں۔ "۲۰ نومبر کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں۔ اس لنچ کی حیثیت سیاسی اور نزاعی نہ ہوگی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندوستان اور انگلستان، اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں۔ اور تا کہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزنوں دونوں کو بتا دیں کہ وہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب

ایسے بے تعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکے ہیں۔ بلکہ ہمارا عزم اور ہمارے مقصد اور گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں۔ مشہور افسانہ نگار ایچ، جی، ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے۔ بلکہ اب کی جمعہ کو تو ان میاں بیوی نے اپنے ہاں رات کو کھانے پر مدعو کر دیا ہے۔ اور وقت بھی سوا آٹھ کا رکھا ہے کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک سے فارغ ہو جاؤں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بےخبری اور جمود دور کرنے اور انھیں بار بار چونکاتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہم خیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں میں بحیثیت مجموعی مایوس نہیں ہوں

محمد علی اب ملک و ملت یعنی ہندوستان اور اسلام دونوں کے سفیر تھے، اور یہ دوہرا نقطۂ نظر قائم ہو چکا تھا۔ چوتھا سفر انگلستان اور فرانس کا ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ اب ان کا شمار ملک کے مسلّم لیڈروں میں تھا۔ اور مسلمانوں میں تو وہ مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل تھی کہ باید و شاید۔ اب ان کی حیثیت سفیر سے زیادہ مجاہد کی تھی۔ انگلستان خصوصاً شہر لندن میں بہت سی تقریریں کیں۔ ایسکس ہال کیکسٹن ہال وغیرہ میں، اور کچھ فرانس میں بھی۔ موضوع تقریر اسلام اور ہندوستان دونوں کی ترجمانی اور پرجوش ترجمانی ہی رہتا تھا۔ تقریروں اور سیلاب تحریروں کے انہماک میں ہندوستان خطوط لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے۔ اور جو کچھ لکھے ہیں ان کی اشاعت کی نوبت اور بھی کم آئی کوئی اخبار اس وقت اپنے ہاتھ میں تھا نہیں، نہ اردو کا نہ انگریزی کا۔

پانچویں بار۔ بیمار اور زار و نزار ایک قدر دان، جوہر شناس ہندو رئیس کے خرچ پر ۱۹۲۸ء میں اپنے علاج کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ ذیابطیس کا علاج فاقوں کے ذریعہ سے کرنا تھا، اور اس طرز علاج کے ماہرین فرانس میں تھے۔ اس لیے قدرۃً اب کی زیادہ تر

قیام فرانس ہی میں رہا۔ اور ڈاکٹروں کی شدید تاکید پر سیاسیات وغیرہ سے ایک بڑی حد تک الگ تھلگ رہنا پڑا۔ اس سفر میں راستہ سے جو مفصل خط لکھا ہے قابل ملاحظہ ہے۔ اقتباس ذرا طویل ضرور ہوگا۔ لیکن اس سے ایک طرف تو اس سفر اور چوتھے سفر دونوں کے مقاصد روشنی میں آجائیں گے۔ اور دوسری طرف مولانا کا مجلسی اور معاشی نقطۂ نظر بھی کسی قدر واضح ہو جائے گا۔ خط ولایتی جہاز میڈونیا سے لکھا گیا ہے۔ تاریخ ۸ جون ۲۸ء کی پڑی ہے۔ اور اب جامعہ والوں نے خطوط محمد علی کے مجموعہ میں چھاپ بھی دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :۔

"چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا۔ اور ایک آخری کوشش اس کی کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کیجائے ....
گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا۔ مگر

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بھی کیا حشر ہوا۔ اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستاں بوسی نہ کریں گے۔ اگر پھر جائیں گے تو اسی لیے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں گے۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دور نظر آتا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی ...... آج مسٹر ولسن پولیٹکل سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے جہاز پر ملاقات ہوئی تو ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ ٹیلر کمیٹی[1] کے سلسلہ میں انگلستان جا رہا ہوں۔ محض اپنی صحت کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اور اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے متمول ملک کی طرف، ایک فاقہ مست بصرف کثیر اس لیے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے۔

[1] ایک سرکاری کمیٹی۔ اس کے سامنے اظہار دینے بہت سے ہندوستانی ولایت گئے تھے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں لیکن سوائے مسز اینی بیسنٹ[1] کے اخبار نیو انڈیا کے ایڈوٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس میں ملبوس ہوں۔ . . . . . . آج صبح سے تموج میں بہت کمی ہو گئی ہے اور آج شب کو ۸ ½ سے جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے۔ جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے. . . . . . ڈیک پر میرے قریب ہی ایک خوش رو، وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر لیٹے رہا کرتے تھے، وہ کبھی کبھی ایک دو لفظ بول دیا کرتے تھے۔ آج ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو رہی جس میں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور ان کی عمر وغیرہ کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بظاہر اسے سنکر اور کچھ دلچسپ پاکر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی۔ اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے، مگر پر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی جس کے بعد انھوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد بھی دی، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیر جنرل ہیں۔"

دوسرا خط فرانس کے قیام کے بعد لندن سے ۱۹ اگست کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے طویل اقتباسات بھی نہ لطف سے خالی ہوں گے نہ فائدے سے۔ اس لیے اور بھی کہ اس میں ذکر ایک مشہور بزرگ قوم کی وفات کا ہے۔ جن سے محمد علی سے خاصی چشمک رہ چکی تھی۔ اپنی صحت اور بد پرہیزی کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں :-

"جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کیا۔ کیا معلوم تھا کہ ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا۔ اسی وقت سید امیر علی صاحب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے. . . . . . گو کچھ عرصہ سے وہ صاحب فراش تھے، تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ یہاں جس طرح جینا مشکل ہے اسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جسٹس امیر علی صاحب

لہ مدراس کا مشہور انگریزی روزنامہ کئی سال تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔

کا انتقال ہوا ہے لوگ چھٹیاں منانے جارہے تھے۔ تجہیز وتکفین کا سامان منگل تک نہ ہوسکا۔
یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا ہوگا، اس لیے کہ جب میں قبرستان پہنچا
تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی .... ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ
پڑھا چکے تھے۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں۔ اور اس شہر خموشاں کا نام بھی
Necropolis ہے۔ ریل کی پٹری اس کے اندر تک آئی ہے۔ نہایت وسیع
میدان میں باغ لگایا گیا ہے۔ جس کے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ
سڑکیں، روشیں چلنے پھرنے والوں کے لیے بنادی گئی ہیں۔ اس شہر خموشاں کے اندر اچھی خاصی
ریستوران بھی موجود تھی، جہاں لنچ کھایا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں
کے لیے بھی ہے۔ یوں تو تجہیز وتکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کرلیا تھا لیکن بعد
کو معلوم ہوا کہ قبر کا رخ کسی قدر غلط تھا لیکن الحمد للہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ اور امام صاحب نے
میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ
بیس ہی آدمی رہ گئے تھے جن میں لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے سابق لفٹنٹ گورنر سر لوئی ڈین
تھے، سر لوئی ڈین نے مجھے پہچان کر اردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت کیا اور فرمایا
کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمد للہ کہکر اور ان سے ہاتھ ملا کر
آگے بڑھا .... مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے، ان سب کو
میں نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا کہ سب سے پرانی قبر ایک خاتون صفیہ احمد فارسی کی ہے۔

یہ خط بھی جامعہ کی چھپی ہوئی تازہ کتاب خطوط محمد علی میں درج ہوچکا ہے۔ آگے چل کر
اسی خط میں بمبئی، حیدرآباد، جہلم، رانڈیر اور مصر کی متعدد میتوں کی قبروں کا ذکر ہے، اسکے بعد نوحیوں
کی قبروں کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے۔ اس سے کچھ تو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محمد علی

سیاسیات کے علاوہ بھی انگلستان میں کیا کیا دیکھتے تھے اور کس نظر سے۔

"اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی اور سے ہو سکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ بااثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں ٹیلیفون پر رات دن باتیں ہوا کرتی ہیں۔ خواہ ٹائمز کا فارن ایڈیٹر ہو خواہ برنرڈشا ...... وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی دوبارہ آنے پر یہاں اصرار کیا۔ اس طرح گھنٹہ بھر گفتگو کی۔ اور مجھ سے اعتراف کیا کہ تم نے جو باتیں بتائیں وہ نہ صرف عجیب و غریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے، آج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسپکٹیٹر کے ایڈیٹر سے دو گھنٹے باتیں ہوا کیں، اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن ایڈیٹر سے ۱۰½ سے ۱۲ تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی۔ خود ہی اس نے ملنے کی خواہش کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا۔"

یہ وقت تھا جب اسی محمد علی نے، جو اب نہ مسٹر تھا نہ مولانا بلکہ صرف دیوانہ، راؤنڈ ٹیبل (گول میز) کانفرنس کے بھرے مجمع میں اپنی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کا ساحل آخری بار چھوڑتے وقت بھی تو جب ایک مخلص نے بڑھ کر پوچھا تھا کہ "آخر آپ اس حالت میں جا کس لیے رہے ہیں؟" تو دیوانہ کی زبان سے بےساختہ یہی نکلا تھا کہ "مرنے کے لیے"

سچے کی بات اللہ نے سچ بھی کیسی کر دکھائی!

ضمیمہ نمبر (۱۱)

محمد علی: بانیٔ جامعہ

(جوہر کے جوبلی نمبر کے لیے لکھا گیا)

محمد علی اپنی زندگی بھر کچھ نہ کرتے صرف جامعہ ہی کی بنیاد ڈال جاتے تو بھی ایک کارنامہ سرمایۂ عمر ہونے کے لیے کافی تھا ـــــــ اللہ کا وہ شیر تو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر دھر کے دنیا سے اٹھا۔

ہائے کیا زمانہ وہ ۱۹۲۰ء کے آخر اور ۱۹۲۱ء کے نصف اول کا تھا! کتنا جوش و خروش! اخلاص تھا کہ سینوں سے ابلتا ہوا، امنڈتا ہوا۔ ایثار تھا کہ عہد صحابہ کا نمونہ دنیا کو ایک بار پھر دکھا رہا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورت سب اپنے اپنے رنگ میں مست! کل کی فکر میں آج کو تجے ہوئے "آجل" کے خیال میں "عاجل" کو بھولے ہوئے، چھوڑے ہوئے ـــــــ محمد علی ان دیوانوں، سرفروشوں کے لشکر کا سردار۔

"تلقین یہ شروع کی کہ ایسی خدا فراموش و مذہب دشمن حکومت جو خلافت اسلامیہ سے برسرپیکار ہو، اس کے اور اس کے ملحق اداروں اور محکموں سے کسی طرح کا تعلق جائز نہیں۔ اس کے عہدے، اس کے منصب، سب بحکم "عطائے تو بہ لقائے تو" اس کی طرف

ـــــــ

[1] صدق ج ۲، نمبر ۴۴ (۱۰ فروری ۱۹۳۷ء)

قابل واپسی۔ پھر سرکاری اور نیم سرکاری تعلیم جوان سارے تعلقات کے لیے سنگ بنیاد ہے وہ بدرجۂ اولیٰ قابلِ ترک ولائقِ احتراز۔ تو اب مسلمانوں کے بچے کیا کریں؟ کریں یہ کہ

"ایں سررشتۂ تعلیم اندوستِ ما باشد"

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں ـــــــ نصاب اپنا ہو، استاد اپنے ہوں تعلیمی ماحول اپنا ہو۔

پیام لے کر رخ پہلے علی گڈھ کا کیا کہ وہیں کے یہ ساختہ پرداختہ تھے اور وہیں ان کا سب سے بڑا امید گاہ تھا۔ پیام سہل اور معمولی نہ تھا۔ ایک مستقل انقلاب کی دعوت تھی۔ اور انقلاب کا رجز کن کانوں کو خوش گوار معلوم ہوا ہے؟ لڑکوں میں چند سعید روحوں نے بڑھکر لبیک کہا، باقی ہر طرف سے انکار و ملامت ہی کے آوازے بلند ہوئے ـــــــ اُس سے پولیس کے ڈنڈوں اور سنگینوں کے سائے میں نکالے گئے۔

داستان بڑی طویل اور دردناک ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے اس وقت کے اخبارات کے فائلوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ علی گڈھ متضاد تاروں سے روزناموں کے کالم لبریز ہوتے تھے۔ کمر کوئی مصیبت تھی جو محمد علی اور ان کے جواں ہمت رفیقوں کو جھیلنی نہ پڑی ہو۔ رسم افتتاح کے لیے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا وجودِ مقدس ہاتھ آگیا۔ اور بے سروسامانی کے اسی عالم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوگئی۔ وہی جامعہ جس نے ایک فرزند رشید ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صورت میں پیدا کردیا۔

کلاسیں درختوں کے چھاؤں میں ہونے لگیں۔ لڑکوں کے رہنے سہنے کے لیے خیمے نصب ہوگئے۔ محمد علی سب ہی کچھ تھے۔ چندہ بھی لائیں۔ پرنسپلی کے فرائض بھی ادا کریں۔ استادوں کا انتخاب بھی کریں۔ نصاب درس بھی ہر مضمون کا شروع سے لیکر بی اے تک

مرتب کریں! ـــــــ عین اس عالم میں جب ذرا سے بھی سکون سے سانس لینے کی نوبت آئی، اس نیاز کیش کو جس کی شہرت چند روز قبل تک پورے ملحد ہونے کی تھی، اور بجا تھی جنوری ۱۹۲۱ء میں خط لکھا کہ فلسفہ کی پروفیسری کی جگہ تمھارے لیے روکے ہوئے ہوں، لیکن مذہب علم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان دلا دو تو بے تکلف چلے آؤ۔ خط کی اصل عبارت مکتوبات محمد علی وغیرہ کے سلسلہ میں بار بار چھپ چکی ہے۔ یہ محض خلاصہ درج ہوا۔

اس غرض سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ محمد علی کو مذہب کس درجہ عزیز تھا۔ اور وہ ہر معاملہ کو مذہب ہی کی عینک سے دیکھنے کے کس قدر عادی تھے حقیقتاً وہ مذہبی دیوانے تھے۔ انھیں غلط سمجھا اس نے جس نے انھیں سیاسی فرزانہ خیال کیا۔ جامعہ قائم کرنے سے ان کی پہلی غرض یہ تھی کہ یہاں سے دین وملت کے سنجیدہ خدمت گزار پیدا ہوں اور ضمناً ملک و وطن کی خدمت بھی ہو جائے۔

پائنیر نے جو اس وقت تک تمامتر انگریزی ہاتھوں میں تھا مولانا کی زندگی ہی میں ایک مضمون ان پر لکھا تھا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ ہندوستان کا وہ ذہین اور طباع شخص ہے جو کوئی تعمیری کام اپنی یادگار نہیں چھوڑے جا رہا ہے ـــــــ اس خیال کی تردید کے لیے جامعہ ملیہ کا وجود کافی ہے۔ جو ایسی سعید اولاد چھوڑ جائے، اسے یہ کہنا کہ وہ لا ولد اٹھ گیا، کیسی صریح زیادتی اور ظلم ہے!

ضمیمہ (نمبر ۱۲)

محمد علی کی یاد[ا]

محمد علی کا انتقال شروع ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو اب تک خدا جانے ان کی کتنی سوانح عمریاں تیار ہو چکی ہوتیں اور ان کی تقریروں اور تحریروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان پر تبصروں اور تحشیوں کا کتنا بڑا انبار لگ چکا ہوتا! یہاں یہی غنیمت ہے کہ جس طرح بھی بن پڑا "سیرت محمد علی" جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام شائع ہو گئی۔ اس کے بعد سے سناٹا تھا۔ یہاں تک کہ اس خادم ملت کی تقریروں اور تحریروں کے بھی ضبط کا کوئی اہتمام نہیں! شکر، اور صد شکر کہ بعد مدت جامعہ والوں میں احساسِ فرض بیدار ہوا ——

وہی جامعہ، جو محمد علی کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے ع

بعد مدت کے ترے مستوں کو پھر آیا ہے ہوش!

مضامین محمد علی، درسی کتابوں کی چھوٹی تقطیع پر ۵۹۰ صفحوں کی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ مرتبہ، ایک جامعی فاضل، محمد سرور، صاحب بی۔ اے استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں کتاب مجلد، مع تصاویر محمد علی۔ قیمت عہ۔ دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ (امین الدولہ پارک

[ا] صدق یکم مئی ۱۹۳۶ء

ہر جگہ کتبۂ جامعہ سے مل جائے گی۔ شروع میں فہرست مضامین، اور مرتب کے قلم سے چند صفحوں کا مقدمہ۔ نام سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کل مضامین کا مجموعہ ہو۔ ایسا نہیں یہ مضامین صرف ہمدرد کے درج ہیں۔ اور ہمدرد کے بھی دور اول (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۱۴ء) کے نہیں، صرف دور ثانی (نومبر ۱۹۲۴ء تا مارچ ۱۹۲۹ء) کے۔ پھر اس دور کے بھی سارے مضامین نہیں، انتخاب سے کام لے کر ایک بڑا حصہ اس دور کے مقالات کا یکجا کر دیا گیا ہے۔ دیباچہ میں ان ضروری تصریحات میں سے ایک چیز بھی درج نہیں۔ اور یہ بڑی فروگزاشت ہے۔ کل مضامین ایک جلد میں سما بھی کہاں سکتے تھے، متعدد جلدیں ان کے سمیٹنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ یہ محض جلد اول ہے۔ اس لیے قیاس یہی ہوتا ہے کہ ناشرین نے اسی ایک مجموعہ پر اپنی ہمت کو ختم کر دیا۔ خدا کرے یہ قیاس غلط نکلے۔ اور اگر ناشرین یہ ارادہ بھی کر چکے ہوں، تو محمد علی کے قدر دان اپنی قدر دانی کا عملی ثبوت اس زور و شور سے بہم پہنچائیں اور ناشرین کی ایسی ہمت افزائی کریں کہ انھیں خواہ مخواہ اپنا ارادہ بدلنا اور اس مجموعہ کو محض جلد اول قرار دینا پڑے۔

محمد علی کو کوسنے والے، گالی دینے والے بے تعداد تھے۔ ماننے والے، داد دینے والے شاید ان سے بھی زاید۔ کم ایسے تھے جو محمد علی کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔ فاضل مرتب کا شمار ان ہی چند خوش نصیبوں میں ہے۔ انھیں بہت ممکن ہے کہ محمد علی کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع زیادہ نہ ملا ہو۔ لیکن بہرحال وہ اس شہید ملت کی شخصیت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"وہ مخالفتوں اور مصیبتوں میں ہمت ہارنے کو گناہ سمجھتا تھا۔ اپنوں سے لڑا، بیگانوں کو ان کی ناحق دوستی پر ڈانٹتا رہا۔ اپنے بگڑ گئے اور بیگانوں نے بدنام کرنا شروع

کر دیا۔ لیکن اس باہمت اور جوانمرد کے چہرے پر شکن تک نہ آئی، اور اپنوں اور بیگانوں کا آخر دم تک نہایت پامردی سے مقابلہ کرتا رہا۔ محمد علی اسوۂ حسینی کو اپنے لیے اِمام جانتا تھا، اور اسی پر وہ تمام عمر عامل رہا۔ وہ شہید ملت ہے، اور اس کی گفتار، کردار، اسکی جانکاہ بیتابیاں، دوستوں سے محبت، اور پھر ان سے عداوت، دشمنوں سے نفرت، اور پھر ان سے محبت، عزیزوں سے مخالفت، دل سوزوں سے بُعد، خون دل پلا پلا کر کسی نخل کو بر و مند کرنا اور اس کے پھل کو تلخ پاکر اس سے ہاتھ کھینچ لینا کسی بات کو اپنی طبیعت حق شناس کے خلاف پاکر اس کی مخالفت کے درپے ہونا، خواہ اس کی مخالفت میں اس کے عزیز سے عزیز جذبات کا خون ہی کیوں نہ ہو، بظاہر اس کا مجموعۂ اضداد ہونا اسی اسوۂ حسینی کی جلوہ فرمائیاں ہیں۔"

"کتاب کی غرض، اس "خانماں خراب" لیکن دراصل متاع عاجل کی حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ محمد علی کا دماغ بڑا تھا، اور دل اس سے بھی بڑا۔ اور گرد و کے نامساعد حالات، زمانہ کے تغیرات ملک و وطن کے متضاد مظاہر اور اسلام اور جہان اسلام کے انقلابات نے محمد علی کے دل و دماغ کو کچھ اس طرح متاثر رکھا کہ اس کی شعلہ نوائیاں ہر اس خرمن کو، جو اسے باطل نظر آتا، جلاکر بھسم کرنے پر تل جاتیں۔ اس قسم کی خاشاک سوز آگ کو پردوں میں سجاکر دوسروں کو دکھانے کی کوشش بہت مشکل ہے۔ مرتب نے اپنے بس بھر اس امر کی سعی کی ہے کہ قارئین ...... اس آگ کی حقیقت کو سمجھیں۔"

"اندیشہ تو یہ اسکا تھا کہ ملیت" (یا صحیح طور پر "وطنیت") کی موجودہ رَو جو نہ صرف بلکہ بہت سے دینی اداروں تک کی اسلامیت کو بہائے لیے جا رہی ہے کہیں اسی لپیٹ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یہ معلم بھی نہ آجائیں، اور محمد علی کی تصویر ان کے قلم سے ناقص، ادھوری، اور مسخ شدہ نکلے۔

لیکن یہ اندیشہ باطل ثابت ہوا۔ انھوں نے توازن قائم رکھا، اور تصویر بڑی حد تک صورت کے مطابق ہی کھنچی۔

نومبر ۲۴ء سے مارچ ۲۹ء تک کا زمانہ محمد علی کی زندگی کا ایک بہت مختصر اور محدود حصہ ہے۔ اور پھر جب اس دور کے بھی کل مضامین یکجا نہ ہوں، تو یہ دور اور بھی سکڑ جاتا ہے لیکن ایک اعتبار سے یہ دور ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ محمد علی جب اگست ۲۳ء میں قید سے رہا ہوئے، تو معاً ان کی خدمت میں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ دسمبر ۲۳ء سے دسمبر ۲۴ء تک وہ صدر کانگریس رہے۔ اور اسی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں دورہ کرتے رہے۔ ٹھیٹھ اسلامیت کے باوجود، اس وقت وہ انتہائی قومیت کے بھی علمبردار تھے۔ یہاں تک کہ بیگانوں نے تو خیر، اپنوں نے بھی انھیں ہندو پرست کہنا شروع کر دیا۔ اور ۲۴ء کے مرکزی خلافت کمیٹی کے ایک اجلاس میں، جو دہلی ہی میں، اور غالباً دفتر ہمدرد ہی میں منعقد ہوا تھا، ایک بہت مشہور عالم نے کھلے الفاظ میں محمد علی کو اسی کے طعنے دیے۔ ۳۰ء میں محمد علی کھلم کھلا کانگریس سے الگ ہو گئے۔ لیکن اس کی ابتدا، آخر ۲۸ء ہی سے ہو چکی تھی۔ مضامین کے پیش نظر جلد میں دونوں مسلکوں کی جھلک موجود ہے۔ کانگریسی رنگ کی گہری اور مسلم کانفرنسی رنگ کی ہلکی ——— حالانکہ جب محمد علی سرتاپا کانگریس میں غرق تھے جب بھی ان کی اسلامیت کب ہلکی پڑنے پائی تھی؟ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

مضامین کی ترتیب بلحاظ تاریخ نہیں، بلحاظ موضوع ہے۔ تاریخی الٹ پلٹ اس لیے ناگزیر ہے۔ بہت سے پچھلے مضامین شروع میں آگئے ہیں، اور بہت سے پہلے مضامین نے جگہ آخر میں پائی ہے۔ شروع میں دو دعائیہ مضامین کا مقدمہ ہے۔ پھر "آپ بیتی" جس کے اندر ۳۰ مضامین ہیں۔ پھر

"مسائل ملی" جو ۲ مضامین کا جامع ہے۔ پھر "مسلمان اور متحدہ قومیت ہند" جس کے تحت میں کل دو مضامین "شخصیات" پر۔ پھر "مسلمان اور آزادی" مع چھ مضامین کے۔ آخری عنوان "بادشاہت اور جمہوریت" کا جس میں پانچ مضامین ہیں۔ یہ ترتیب عنوانات، اگرچہ جامع ہے نہ مانع لیکن بہرحال جیسی کچھ بھی ہے غنیمت ہے، اور پڑھنے والے کی رہنمائی کے لیے کافی حد تک کافی۔ پڑھنے والے کو فرط اشتیاق میں دقایق تالیف و ترتیب پر غور کرنے کا ہوش ہی کب باقی رہے گا؟

گائے اور باجہ جس طرح آج اتحاد وطنی کی راہ میں حائل ہیں محمد علی کے وقت میں بھی تھے، محمد علی نے دہلی کی یونٹی کانفرنس کے موقع پر آخر ۲۴ء میں جواہر لال نہرو اور چند اور ہم خیال ہندوؤں مسلمانوں کی اتفاق رائے سے یہ چاہا تھا کہ

"گائے ذبح کرنے اور باجہ وغیرہ کے تمام مسائل اسی طرح طے کرنے جائیں کہ تمام ملتوں کو صاف اور صریح طور پر مذہبی آزادی دیدی جائے لیکن اسی کے ساتھ اس توقع کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ یہ کانفرنس امید کرتی ہے کہ اس آزادی کا استعمال اس طرح نہ کیا جائے گا کہ دوسروں کی دلآزاری ہو، مگر لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موہن مالوی نے اس کو گوارا نہ کیا، اور جو تجاویز منظور ہوئیں، ان میں اس مذہبی آزادی کو مقامی رواج کی شرائط و حدود کے ساتھ مشروط و محدود کر دیا گیا۔" (ص ۱۹۵)

سو اب، اس دل جلے کے الفاظ میں

"یہ مسئلہ اس وقت طے ہوگا جب یا تو سڑکوں کو آیند و روند کے واسطے چھوڑا جائے

اور اسے اور ہر کام کے لیے بند کر دیا جائے، یا پھر ان کو بالکل کھول دیا جائے۔ ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جہاں چاہیں، اور جب تک چاہیں، ڈھول اور تاشے پیٹا کریں اور سنکھ اور قرنا بھونکا کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمان آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جس طرح سجا کر جس سڑک سے جہاں چاہیں لے جائیں، اور ان کا گوشت چاہے ڈھکا لے جائیں چاہے کھلا لے جائیں، کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو۔ چند دن میں آپ ہی دونوں ملتیں، ایک دوسرے کی ضد پر اپنے فرائض ادا کرنا چھوڑ دیں گی، اور شرافت اور بھل منسی کی طرف عود کریں گی اور حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنائیں گی۔" (ص ۱۹۶)

پھر آگے چل کر مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ

"اسلام کسی مسلمان کو اس کا حکم نہیں دیتا کہ وہ مسجد کے سامنے مجرد باجہ کے ساتھ ایک جلوس کے نکلنے پر کسی کا مقابلہ کرے، اور اس سے جنگ و جدال کرے۔ باجہ کو زبردستی روکنا میرے نزدیک مناسب نہیں ہے لیکن اگر کوئی ملت مسلمانوں کی عبادت میں خلل انداز ہو اور اس پر اصرار کرے کہ نہیں ہم تو تمہاری عبادت کے وقت ضرور شور مچائیں گے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو حسب استطاعت اس خلل اندازی کو بند کرنا چاہیے، اس بارے میں پھر وہی احکام شریعت متعلق سمجھے جانے چاہئیں، جو فرائض مذہبی کی ادائگی کی بندش کے متعلق ہیں۔"

اور سب سے آخر میں:-

" ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو۔ اور حکومت اس تماشہ کو دیکھ رہی ہے، اور کسی سے آج مرعوب نہیں، اور دونوں کو مرعوب کیے ہوئے ہے، یہ ایک سیاسی جنگ ہے۔ اور میں نہ اسی کو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں اور نہ اسی کو چاہ سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم ہیں۔" (ص ۱۹۰)

تازگی اور زندگی کلام جوہر کا خاص جوہر ہیں۔ بارہ بارہ پندرہ پندرہ برس کے لکھے ہوئے مضامین معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کے لکھے ہوئے ہیں تشریح طلب اقامات وتلمیحات پر مرتب کو حواشی دینے ضرور تھے۔ اور یہ ایک بڑی کمی ہے، جو تہذیب کتاب کے سلسلہ میں رہ گئی لیکن اس پر بھی کوئی نمایاں بے لطفی کتاب پڑھنے میں معلوم نہیں ہوتی۔

جنوری سنہ ۲۷ء میں "نئی دہلی" میں مرکزی اسمبلی کے نئے اسمبلی ہال کا افتتاح وائسرائے بہادر کے ہاتھوں، بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ امیدوں کے سبز باغ نے کتنوں کے غنچۂ دل کھلا رکھے تھے۔ محمد علیؒ بہ قول خود "حکومت کی بے وفائی پر وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکے تھے" تاہم اردو کے قلیل الاشاعت لیکن سب سے زیادہ معزز و باا ثر روزنامہ کے اڈیٹر تو بہر حال تھے۔ تماشہ میں شریک ہوتے ہیں، اور دوسرے دن اپنے ناظرین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں:۔

"..... کتنے سادہ لوح ہوں گے، جو اپنے دلوں میں اس آرزو کو چھپائے ہوئے امید وبیم کی حالت میں ہوں گے۔ کتنے اور ہوں گے جن کا اصولِ زندگی عشاق کی طرح یہی ہے کہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔۔۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یہ نام کے عاشق اسی میں مگن ہیں کہ اصلاحات کی توسیع کے لیے شاہی کمیشن مقرر ہو یا نہ ہو نائب شہنشاہ کا درشن تو نصیب ہو گا۔ اسی سے بھاگ کھلیں گے۔ ملک کی وارث خالق کے حکم سے تو خلق ہی تھی، مگر اس نے بادشاہت اور شہنشاہیت کے فریب میں آکر اپنی آزادی کیا بلکہ ملکیت کو غلامی کے عوض کب کا بیچ دیا، اور وہ حقیقت شناس ہستیاں بھی جن سے توقع کی جا سکتی تھی کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے ترکہ کو کبھی کسی کے فریب میں

آکر نہ چھوڑیں گی، وہ بھی بظاہر دولت و ثروت سے محروم ہو کر اس فریب پر مجبور تھیں کہ بادشاہوں کو دیکھ کر قصیدے دل ہی دل میں لکھیں ۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے   اب فریب طغرل و سنجر کھلا

.... کاش طغرل و سنجر کے فریب کی طرح قیصر ہند اور نائب قیصر کا فریب کھل جاتا اور کوئی ان تماشائیوں سے کہتا کہ ؎

اے تماشاگاہ عالم روے تو   تو کجا بہر تماشا می روی

۳۰ کروڑ خدا کی مخلوق، یعنی نسل انسانی کا ایک خمس مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے، جو سات ہزار میل کے فاصلہ سے سات سمندر پار آکر ان پر حکومت کرتے ہیں، عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے۔ اور پانچ براعظموں کے تماشائی دور دراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ اور دلی کا لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس کا تماشا کریں تو تعجب کی بات نہیں، لیکن آج یہ مخلوق خود دوسروں کی تماشائی ہے! ....

ہر ملت اور ہر طبقہ کے لوگ تھے، اور سب سے زیادہ نمایاں وہ وارثان تاج و تخت تھے جو نائب السلطنت کے سید ھے ہاتھ پر جلوہ گن تھے جن میں سورج بنسی بھی تھے اور چندر بنسی بھی۔ مگر آج جن کا جگمگاتا لباس اور زنانہ زیورات کو اس چمکتے ہوئے ذرہ سے ہرگز زیادہ وقعت نہ دیتے تھے، جن پر حکومت کا مہر عالمتاب چمکتا ہو اور ان کو بھی چمکا رہا ہو

میں اگر فقط نامہ نگار ہوتا، تو مجلس کی ترتیب، شرکائے جلسہ کا لباس یا آج کل کے فیشن کے مطابق بعض کی بے لباسی نہیں تو کم لباسی، اور فوج کی صف آرائی اور جلوس کے طمطراق کا حال لکھتا، مگر کیا کروں۔ یہ میرا حقیقی شعار نہیں۔ ملک و ملت کے عشق میں قلم کو بھی ایک آلہ کی حیثیت سے اٹھا لیا گیا ہے ....

لاؤڈ اسپیکر نے ایک ایک حرف یعنی کھانسی، کھنکار، سنوا دی گر گوش مُردہ ہوش سا ای تقریر میں ایک حرف مطلب بھی نہ سن سکا۔ سارے ملک میں سرکار والا تبار کے قدوم میمنت لزوم نے تفریق و انتشار پھیلا رکھا ہے لیکن لاٹ صاحب بہادر نے فرمایا کہ یہ قانون سازی کا گول گھر اتحاد کی علامت ہے! .... اور کیوں نہ ہو، ہمارے تعلیم یافتہ ہمیشہ ہمیش اسی چکر میں رہیں گے اور یہ دائرۃ السوء اسی طرح تا قیامت باقی رہے گا .... خیال تھا کہ کم سے کم شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوگا، مگر تقریر کا خاتمہ صرف دعا پہ ہوا۔ دوا کا نام بھی نہ تھا۔ لاٹ صاحب نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل و عدل کی توفیق دے۔ ہم سوا آمین کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں کو عقل دے کہ اس فریب عدل سے نجات پائیں۔" (۲۰۲ تا ۲۰۳)

اب تو کسے یاد رہ گیا ہوگا لیکن بات کچھ ایسے بہت دنوں کی نہیں، وسط ۲۶ء کی ہے کہ وطنیت کے بعض علمبرداروں نے "فرقہ داریت" سے تنگ آکر ایک نئے نظام کی طرح "انڈین نیشنل یونین" کے نام سے، صدائے طبل و دہل کے ساتھ نہیں، صدائے نا قو کے ساتھ ڈالنی چاہی تھی، پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے دستخط سے جو دستور العمل اس نئی مجلس کا شائع ہوا، اس کی رو سے ہر ممبر کو سب سے پہلے یہ اقرار کرنا تھا کہ "ہندوستان کی ترقی اور آزادی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتیں ایک مشترکہ اور متحدہ ہندوستانی قومیت پیدا کریں۔" اور اقرار نامہ کی سب سے آخری دفعہ یہ تھی کہ "میں کسی ایسے فرقہ وارانہ نظام کا جسے یونین نے قومیت ہند کو نقصان پہنچانے والا قرار دیا، نہ ممبر ہوں اور نہ ممبر ہوں گا۔"

محمد علی کا قلم اس پر ایک طویل تبصرہ کے دوران میں رواں ہوتا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک مقصد اور حصول مقصد کے لیے وسائل کا تعلق ہے، اس نئی تحریک میں کوئی ندرت نہیں، اور جس خطرے کا ذکر خود ان حضرات نے اپنے بیان میں کیا کہ کہیں یہ مجلس بھی صرف یہی نہ کرے کہ موجودہ سیکڑوں مجالس میں ایک اور اضافہ کرے، اس سے بچنا اس مجلس کے لیے آسان نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں مذہب سازی اور مجلس سازی کا ایک مہلک مرض پیدا ہو گیا ہے، اور بجائے اس کے کہ ہم موجودہ مذاہب میں سے کسی کے احکام کی پابندی کریں، یا پرانی مجالس میں سے کسی کے مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں، ایک نئے مذہب اور نئی مجلس کے بانی ہونے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر مذہب اپنے معتقدین پر کچھ نہ کچھ ذمہ داری عائد کرتا ہے، اور ہر مجلس اپنے ارکین کو کسی نہ کسی قدر ضرور پابند کرتی ہے، اس ذمہ داری کا شعور و احساس کو ہم میں پیدا نہیں ہوتا، اور ان پابندیوں سے تو ہم اکتا جاتے ہیں، مگر نئے نئے مذاہب اور نئی نئی مجالس کی بنیاد ڈالنے کے لیے ہمارے ہاتھ کھجلاتے رہتے ہیں۔ ایک ندرت البتہ اس نئی مجلس کے بانیوں نے رکھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے ارکین تمام مجالس ملی سے علیحدہ ہو جائیں۔ مگر یہ ندرت ایسی زبردست تھی کہ اسی کے باعث یہ نئی مجلس عجوبۂ روزگار بنی جاتی تھی ...... اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازہ پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو امید کو باہر چھوڑ آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی جس کے دروازہ پر کندہ ہو کہ جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت و مذہب کو باہر چھوڑ آئے ...... یقیناً

ایک مختلف الاجزاء مگر متحدہ اور مشترک قومیت ...... کو ترتیب اور نشو و نما دینا ہر محب وطن اور ...... وطن پرور ہندوستانی کا فرض ہے لیکن بے سوچے سمجھے کلی تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کیونلزم یا ملیت، نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے۔ اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبہ اور خاندان کی پرورش اور ان کی تنظیم سے منع کرتا پھرے ......

قومیت کو منتہائے نظر بنانا یورپ کی تقلید جامد ہے، اور وطنیت خود وثنیت یا بت پرستی ہے۔ اسلام وطن پرور ہے مگر وطن پرست نہیں۔" (ص ۲۵۹ تا ۲۶۲)

"ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم"۔ سارے مجموعہ میں چھوڑنے کے قابل کون سا مضمون ہے؟ سب ہی مضامین اول سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہیں۔ لیکن بعض مضامین پھر بھی خصوصیت کے ساتھ، اور ایک سے زائد بار پڑھنے کے قابل ہیں، اگر کسی اور غرض سے نہیں، تو کم از کم مضمون نگار کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے، اور محمد علی کے دماغ اور دل دونوں کا عکس دیکھنے کے لیے۔ اور ان ہی میں ایک وہ مضمون ہے، جو وسط کتاب میں مسودۂ قانون توہین انبیاء و بزرگان دین پر ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آج سے چند سال قبل ادھر تعزیرات ہند میں کوئی دفعہ انبیاء و بادیانِ مذہب کی توہین کو جرم قرار دینے والی تھی ہی نہیں! اور اس سے بعض خبیث طبع لوگوں کو گندہ دہنی کے خوب موقع مل جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں اس قسم کا ایک سخت مسلم آزار واقعہ لاہور میں پیش آیا، ہائیکورٹ سے ملزم بری ہوگیا۔ سارے اسلامی ہند میں ایک تہلکہ مچ گیا سب نے ناانصاف جج پر دھاوا بول دیا۔ جو اس صرف محمد علی کے درست رہے، پرزور رائے عامہ کے خلاف ہمدرد میں لکھا کہ "قصور قاضی کا نہیں، قانون کا ہے"۔ (افسوس اور حیرت ہے کہ یہ مضمون لائق مرتب کی نگاہ انتخاب سے کیسے رہ گیا؟) اور پھر خود ہی ایک مسودۂ قانون

اس مضمون کا پیش کیا، جو بالآخر اسمبلی میں پاس ہو کر دفعہ ۲۹۵۔ الف کے نام سے تعزیراتِ ہند کا جزو بنا۔

اس مسودہ کو مسلمان ارکانِ اسمبلی کی خدمت میں پیش کر کے لکھتے ہیں کہ "مجھ جیسے عطائی نے ایک مسودۂ قانون تیار کیا ہے، جسے آج اطبائے حاذق کے سامنے نہایت ادب و عجز و انکسار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں"۔ باقی

"جہاں تک خود میرا تعلق ہے مجھے : قانون کی ضرورت ہے : عدالتوں کی حاجت اگر کوئی ہندوستانی بھائی اس قدر شقی القلب ہے کہ مجھ سے تو ایک معمولی جانور کا تقدس منوا کر اس سے متمتع ہونے کے حق سے میری دست برداری کا طالب ہے لیکن انسان جو اشرف المخلوقات ہیں، ان میں سب سے اشرف نبی سرورِ کونین اور باعث تکوینِ عالم کا جو تقدس میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، اس کا اتنا پاس بھی نہیں کرتا کہ اس برگزیدہ ہستی کی توہین کر کے میرے قلب کو چور چور کرنے سے احتراز کرے۔ تو ہندوستان کو اس غلامی سے نکالنے کے لیے جس میں آج وہ مبتلا ہے، اور جو کاؤ پرست ہندوؤں کے وجود سے کہیں زیادہ، ہمارے اور ہماری ملت کی بے حرمتی کا سبب ہے، مجھ سے جہاں تک صبر ہو سکے گا، صبر کروں گا اور جب صبر کا جام لبریز ہو جائے گا تو اٹھوں گا اور یا تو اس گندہ دل، گندہ دماغ، گندہ دہن کافر کی جان خود لے لوں گا، یا اپنی جان اسی کوشش میں کھو دوں گا۔" (ص ۳۴۵)

انگریزی حکومت کے طرز کار پر دوسروں نے کیا کچھ کہہ ڈالا، اور کتنا کچھ کہہ ڈالا ہے محمد علی کو دیکھیے، ان کی ساری ذہنیت کا عطر دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

"انگریز کسی کو ہرگز اس وقت تک کچھ نہیں دیتے جب تک انھیں اس کا یقین

نہ ہو جائے کہ اگر آج اتنا بھی نہ دیا گیا تو کل کو اس سے دوگنا اور تگنا دینا پڑیگا۔" (ص۳۵)

جامعہ ملیہ کے خصوصیات کی تفصیل میں رسالہ کے رسالے اور کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر دیکھیے خود بانی جامعہ کس حیرت انگیز اعجاز کے ساتھ اس کی خصوصیات، چشم زدن میں گن جاتا ہے:

"خدا پرستی۔ ملت پروری۔ وطن دوستی" (ص۴۱)

ایسی کتاب جو اسلامی جوش، سیاسی معلومات، تاریخ سیاسیات ہند، اور ایک نہیں بیسیوں مسائل حاضرہ کے اعتبار سے قابل قدر ہو، اور دلچسپ زبان اور دلکش حسن بیان کے ساتھ، باوجود تقریباً ۲۰۰ کی ضخامت اور خوشنما جلد وطباعت کے کل ۱۲ میں ہاتھ آجائے اس کے مطالعہ سے اپنے کو محروم رکھنا (اگر شدید تنگدستی ہی مانع ہو جب تو مجبوری ہے ورنہ اور کسی عذر کی بنا پر تو) خود اپنے ذوق سلیم پر ظلم کرنا ہے!

ضمیمہ نمبر (۱۳)

زندگی کی آخری شب

(مولانا شوکت علی صاحب کا مکتوب روزانہ خلافت میں)

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لندن ۳۱-۱-۹

عزیزم جعفر صاحب - السلام علیکم - میں نے دفتر کے تمام کارکنوں کے نام خطوط لکھے تھے، تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے، آپ کا نمبر آج آیا ہے، اور یہ خط میں خون جگر سے لکھ رہا ہوں۔ تم کو سلام کیا لکھتا۔ ہر ہفتہ تمھارا خط آتا تھا، اور حالات معلوم ہوتے تھے۔ اوروں کو سلام لکھتا یا اس کو جو دفتر میں بہت سے کاموں کا ذمہ دار تھا۔ آج کے خط سے تمھاری شکایت دور ہو جائے گی۔ مگر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں جب خلافت کے لیے خط لکھتا ہوں تو وہ خط سب خلافت کے حامیوں کے لیے ہوتا ہے۔ اب چند خطوط میرے اور آئیں گے، اس کے بعد میں خود بمبئی اور ہندوستان میں ہوں گا۔ اور کولھو کا بیل پھر کام میں لگ جائے گا۔ اور اب ان شاء اللہ پہلے سے زیادہ طاقت اور کامیابی کے ساتھ کیونکہ خدا بہت سے نئے کام کرنے والے پیدا کر رہا ہے۔ آج محمد علی کا جنازہ پانچ دن

کفن دوزوں کے مکان پر آرام کرکے ٹلبری بندرگاہ کو گیا اور ۳ بجے جہاز "نرکندہ" اس کو لے کر بیت المقدس کو روانہ ہو گیا۔ ۱۶ جنوری کو بیگم محمد علی، زاہد اور میں اسی جہاز پر مارسیلز سے روانہ ہوں گے اور ۱۲ کی صبح کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ جہاں مصر، شام، فلسطین اور عراق کے عرب بھائی اس کو مسجد اقصیٰ میں دفن کریں گے۔ میرا بھائی کہو، بیٹا کہو، سردار کہو، غلام کہو، عاشق کہو یا معشوق، مجھ سے رخصت ہو گیا اور اب میں اکیلا رہ گیا۔ بے دست و پا ہوں، مگر خدا پر بھروسہ ہے۔ اور وہ ایک محمد علی کی جگہ دین مقدس کی خدمت کے لیے ہزار محمد علی پیدا کر دے گا۔ میں تم سے دور ہوں پھر بھی خوب جانتا ہوں کہ اس موت سے مسلمان بجائے کمزور ہونے کے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ خیر جو کچھ ہو اسلام کا مخلص سپاہی میدان جنگ میں ایک زبردست ڈنکے کی چوٹ مار کر سپاہی کی موت مر گیا۔ اور اسلام کا نام کر گیا۔ ہنستا اور کھیلتا دنیا سے اٹھ گیا۔ آج دل ہی عدم ہے، ہاتھ حالات لکھتے ہوئے کانپتا ہے، پورا قصہ بمبئی میں آکر سناؤں گا۔ اس وقت تک دل پر قابو پا جاؤں گا۔ آج عبارت آرائی کو دل قبول نہیں کرتا۔ پھر بھی جبر کر کے ضروری حالات لکھتا ہوں۔

محمد علی کا علاج صرف احتیاط، سکون اور پرہیز تھا۔ سب سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں نصیب ہوتی مسلمانوں کی موت اور زیست کا سوال تھا کس طرح خاموش رہتا۔ عمر بھر کبھی احتیاط کام کے وقت کی نہ تھی۔ اب کیا کرتا۔ اور پرہیز کون عمر بھر کرتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوت ۱۰ برس معمولی احتیاط کی زندگی بسر کرنے میں کام کرتی اس کو دس مہینے میں خرچ کر دیا۔ اور بی اماں مرحومہ کی طرح یہ طاقت خرچ کر کے میٹھی نیند سو گیا۔ آخری دورہ تقریباً ۲۰ دسمبر کو پڑا تھا۔ میں ۲۳ دسمبر کو آئرلینڈ ۴ دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے

ملتوی کر دیا۔ نرسوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور ہم سب شب و روز ہائڈ پارک ہوٹل میں موجود رہتے تھے۔ اور میں تو وہیں سوتا تھا۔ ۴۸ گھنٹے کی کشاکش کے بعد خدا نے خطرہ سے باہر کر دیا اور اب امید پڑی تھی کہ وہ کام سے باز آئیں گے اور خدا ان کو صحت دے گا اور وہ ہندوستان مع الخیر واپس جائیں گے۔ طبیعت اس قدر درست ہوگئی تھی کہ ۳۱ دسمبر کو گلنار بانو کی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے بہت سے احباب کو ہندوستانی شفیع ہوٹل کے طیار کیے ہوئے کھانے کی دعوت دی۔ آج تک کبھی کسی اولاد کی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب میں نے منع کیا تو کہا کہ "مت روکو، میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ وہ بچی خوش ہو جائے گی۔" میں اسی دن آئرلینڈ چلا گیا کیونکہ محمد علی کی صحت اچھی تھی۔ اور وہاں جانا ضروری تھا تاکہ مقررہ ملاقاتیں ہو جائیں، اور آئرلینڈ کے حالات سے واقف ہو جاؤں۔ چار دن رہ کر واپس آیا۔ اور اتوار کی صبح کو ۸ بجے لندن واپس آگیا۔ مگر گاڑی ہی میں ۸ ½ بجے تک رہا۔ بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی، اور کیسے ملتی۔ ہفتہ کے دن صبح کو ایک گھنٹہ بھر نواب عبد القیوم سے سرحد کے معاملہ پر مفصل گفتگو کی۔ وہ خود سرحد کی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اور چاہتے تھے کہ سرحد کے معاملہ میں مسلمان نہایت سختی کے ساتھ کھڑے ہوں اور مطالبات میں کمی نہ کریں۔ اس کے بعد ۱ ½ گھنٹہ سندھ کے بارہ میں سر شاہ نواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبد العزیز صاحب لاہور سے ۲ گھنٹے مسلمان عورتوں اور اسلامی حقوق کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ دو دن قبل تین گھنٹے متواتر سر جوزف کاربٹ کے سامنے ٹائمز ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن ۲ ½ گھنٹے خود اس کے پروف صحیح کیے۔ ۵ بجے شام کو ہفتہ کے دن ڈاکٹر سے کہا کہ میں تھک گیا ہوں ذرا آرام کر لوں۔ دو گھنٹے آرام کیا۔ جب ۷ بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے تو دماغ درست تھا مگر زبان بند ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر راٹلز کو ڈاکٹر انگلشر نے بلایا اور انھوں نے کہا کہ

دماغ میں خون کی رگیں پھٹ گئی ہیں اور اب کوئی امید نہیں ہے۔ یہ واقعہ قریب ۱۱ بجے شب کا تھا۔ سب کو پہچانتے تھے۔ سیدھی ٹانگ، سیدھے ہاتھ اور سارے جسم پر سیدھی طرف اثر تھا فالج کا سا۔ ۲ بجے سے بالکل غافل تھے۔ اور ۹ ½ بجے دن کو نہایت سکون کے حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عبد الرحمٰن صدیقی صرف علاوہ نرس کے کمرہ میں تھے۔ انھوں نے سب کو پکارا اور اور لوگ بھی آگئے۔ میں انتقال کے ۵ منٹ بعد پہنچا، اور گلناز بانو تھوڑی دیر قبل جن لوگوں نے ہفتہ کے روز ملاقات کی تھی ان کو اس طرح گزر جانے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ساری قوت صرف کر دی تھی اور دماغ اس قدر اسراف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں جب اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو اسی وقت صاحب خانہ نے اطلاع دی اور میں سیدھا ہوٹل آیا۔ بیگم محمد علی کی خدمات اور ہمت کا تذکرہ کرنا بیکار ہے۔ شب و روز خدمت کی مظفر علی دیانا سے ملنے کو آگئے تھے۔ وہ اور زاہد بھی حاضر رہتے تھے۔ شعیب صاحب کو جب کام سے فرصت ملتی تھی تو وہ بھی دن میں تین چار پھیرے کرتے تھے۔ ہز ہائینس مہاراجہ الور تو اس رات بالکل نہیں سوئے۔ پانچ یا چھ مرتبہ کمرے میں دیکھنے آئے اور بعض اوقات سونے کے کپڑوں میں اور ننگے پاؤں۔ ان کو اس قدر صدمہ ہے کہ جب مجھ کو دیکھتے ہیں رنج کی وجہ سے سلام کر کے منہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔

عزیزی میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے محمد علی کا چہرہ اس قدر خوبصورت کبھی نہیں دیکھا میٹھی نیند، اطمینان سے جیسے کوئی سوتا ہوتا ہے۔ آخری وقت میں ذرا تکلیف نہ تھی، سکون تھا۔ مسلمان تھا، مسلمان کی موت اس کفرستان میں مرا، اور تمام ملک والوں سے خراج تحسین

وصول کیا۔ خبر ہوتے ہی ہر طرف سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہاں کے ہوٹلوں سے میت صرف رات کے ۱۲ بجے کے بعد باہر نکالی جاتی ہے۔ لندن کے تقریباً سب ہندو اور مسلمان آنے والے آتے تھے اور زیارت کر کر کے چلے جاتے تھے۔ گول میز کے سب ارکان باری باری آتے تھے۔ سفید چادر چہرہ پر پڑی تھی، جب ہٹا کر منہ کھول کر میں دیکھتا اور دکھاتا تھا تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آرام سے سو رہا ہے، آنکھ یا چہرہ پر تکلیف کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا۔ شام ہی کو ہوٹل کے منیجر نے مشہور کفن تیار کرنے والے کارخانہ ملس کو بلایا جس کی منتظمہ ایک معقول عورت تھی۔ زاہد جاکر سب جگہ دیکھ آئے۔ رات کے ۱۲ بجے موٹر کر کے اور اسٹریچر بھی اور بہت ہوشیار اٹھانے والے احتیاط سے میت کو اٹھا کر لفٹ سے نیچے لائے اور موٹر میں رکھا۔ میں اسی موٹر میں سوار ہوا۔ نئے مکان میں رکھا جہاں رات ہی کو دوا کا انجکشن دے کر نعش کو ایسا کر دیا گیا کہ دس برس تک بھی خراب نہ ہو۔ میں اور دو مسلمان عزیز طالب علم اس مکان میں زمین پر سوئے۔ صبح کو عبدالرحمٰن صدیقی، مظفر اور میں نے غسل میت دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، زبان پر کلمہ طیبہ اور قرآن مجید تھا اور محبت والے ہاتھ آخری خدمت کرتے تھے۔ زاہد ٹیلیفون پر بیٹھے سب کو اطلاع دیتے تھے۔ نماز جنازہ شام کو ۶ بجے پیڈنگٹن ٹون ہال میں ہوگی جہاں ۴۰۰ یا ۵۰۰ آدمیوں کی گنجائش تھی۔ عالیشان جگہ تھی۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ۵ بجے سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مہاراجہ کشمیر، نواب صاحب بھوپال، مہاراجہ بیکانیر اور تمام ارکان اور وزرا، معہ وزیر ہند موجود تھے، جب جنازہ کی موٹر آئی تو ہز ہائی نس شاہ ولی خان سفیر افغانستان، عفیفی پاشا سفیر مصر، نوری اسفندیاری صاحب سفیر ایران، شیخ حافظ وہبہ صاحب سفیر حجاز اور مسلمان ارکان گول میز کانفرنس اور دیگر حاضرین نے کندھا دیا۔ باہر انگریزوں کا ہجوم تھا۔ اور اندر بھی تمام جماعتوں کے انگریز نمائندے تھے۔ ہال میں نماز ہوئی۔ کفن کا بکس یہاں بہت خوبصورت بناتے ہیں اور قیمتی ہوتا ہے۔

ایک چھوٹی آئینہ کی کھڑکی تھی، جس میں سے چہرہ نظر آتا تھا۔ اخبار والے موجود تھے۔ سب نے فاتحہ کے بعد زیارت کی اور ایک گھنٹہ کے بعد میت پھر قیام گاہ پر گئی۔ خوبصورت پھولوں کے ہار مہاراجہ والد مہاراجہ دھولپور، مہارانی کوچ بہار، حیدرآباد دکن کے وزراء، اور لندن کے ہندوستانی طلبہ کی طرف سے رکھے تھے۔ وہ کمرہ اچھا تھا۔ قریب ہی میں سوتا تھا۔ دن اور رات تلاوت قرآن مجید ہوتی تھی۔

۵ جنوری کو نماز جنازہ ہوگئی۔ آج صبح میت جہاز پر گئی۔ ہندوستان لاتے تھے مگر فلسطین کا تذکرہ عبدالرحمن صاحب صدیقی نے کیا تھا۔ اور بعد کو مفتی اعظم کی دعوت اور تمام برادران وطن کی تجویز پر مسجد اقصیٰ میں دفن کا قصد کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات براہ راست عرب سے وابستہ ہو جائیں۔ ۲۱ کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ بیگم صاحبہ اور زاہد جہاز سے بعد تجہیز و تکفین بمبئی آئیں گے اور میں خشکی سے شام اور بغداد ہوتا ہوا کراچی جہاز سے پہنچوں گا۔ ہاں ہمارے عزیز دوست اور قابل فخر مجاہد رؤف بے بھی موجود تھے اور میت کو کندھا دے رہے تھے۔ اخبارات اور تاروں میں تمام جگہوں سے اظہار ہمدردی ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ اس مجاہد اسلام کی موت بھی کام زندگی سے اچھا کرے گی۔ دعا فرمایئے۔ بمبئی کے تاروں سے ہمدردی کی خبر ملی۔ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ بمبئی تو مسلمانوں کی خدمت کچھ کر گیا۔

ضمیمہ (نمبر۱۴)

آخری لمحے اور وصیتیں

از

(جناب حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر ایم۔ ایل سی کانپور)

مولانا محمد علی کے میرے تعلقات ۱۸۹۴ء سے تھے، جب کہ میں اور وہ دونوں علی گڈھ میں تعلیم پاتے تھے، یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ جو تعلقات برادرانہ اس وقت قائم ہوگئے تھے، ان میں باوجود اکثر اختلاف آراء کے کبھی کمی نہ ہوئی، بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوتے گئے،

خلافت کے زمانہ میں بھی میں نان کوآپریٹر نہیں تھا لیکن جب وہ آتے میرے یہاں ہی ٹھہرتے۔ اختلاف آراء سے ذاتی تعلقات میں فرق نہ آیا۔

جس جواں مردی سے انھوں نے ملک اور قوم کی خدمت کی وہ عدیم المثال ہے، آخر میں ان کو برادران ہنود سے بہت شکایت پیدا ہوگئی تھی، وہ علانیہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہرگز وہ اس حیثیت میں نہیں دیکھ سکتے جس میں کہ ہندو ان کو رکھنا چاہتے ہیں، ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء کو جناب نواب صاحب چھتاری نے ——— اپنے چند ہندوستوں کو ایٹ ہوم اپنے جائے قیام الگزنڈرا ہوٹل لندن میں دیا تھا۔ اس میں صاحب وزیر ہند مسٹر ویجوڈ بین بھی تشریف لائے تھے، میں اور مولانا ایک کوچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، مسٹر بین نے مجھ سے کہا کہ مولانا سے باتیں کرنا فخر ہے، تم اکیلے ہی یہ فخر کیوں کر حاصل کر سکتے ہو، مجھ کو بھی حصہ دو۔ میں ہٹ گیا اور مسٹر بین

مولانا کے پاس بیٹھ گئے، اور بہت دیر تک دونوں میں ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، مولانا نے وہاں بھی مسلم مطالبات کی تائید و ترجمانی کی تھی، ۱۵ر نومبر سے مولانا محمد علی کی حالت اچھی نہیں تھی، لیکن باوجود سخت بیماری کے مولانا راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جاتے اور حصہ لیتے تھے۔ پرائم منسٹر سے ان کو یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مسلم مطالبات کو سننے پر ہمدردانہ طریقہ سے طیار نہیں ہیں، وفات کے چند روز قبل وہ صاحب فراش ہو گئے تھے، میں ان کو دیکھنے جب مجھے فرصت مل جاتی تھی برابر جاتا تھا، بعض مرتبہ روز بعض مرتبہ دوسرے تیسرے روز۔ اپنی وفات سے کچھ ہی قبل ایک نہایت معرکۃ الآرا مضمون مسلم مطالبات پر انھوں نے لکھوا کر پرائم منسٹر کو بھیجا جو ممبران راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کو بھی بھیجا گیا۔ جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس دن بھی میں ان کو دیکھنے گیا تھا، مجھ کو انھوں نے یٰسین شریف تلاوت کرنے کو کہا، اور اسکے بعد آخری وصیت مسلم مطالبات کے متعلق انھوں نے یہ کی کہ ہندوستان میں پانچ صوبے مسلمانوں کی اکثریت والے قائم کرانے میں بجان و دل کوشش کرنا اور اگر یہ پانچ صوبے قائم ہو جائیں تو انتخاب جداگانہ کو اس طرح ترمیم کر دینا کہ مسلمانوں کے انتخاب میں چالیس فی صدی کم سے کم مسلمانوں کے ووٹ ہوں اور کم سے کم دس فیصدی دیگر اقوام کے ووٹ ہوں۔ آخر الذکر ترمیم میں چند دقتوں کا ہونا انھوں نے تسلیم کیا، لیکن یہ کہا کہ میں انتخاب جداگانہ کو ترک کرنے کی رائے نہیں دے رہا ہوں بلکہ اس میں ترمیم کی رائے دے رہا ہوں۔ گفتگو بہت صاف تھی اور آخر وقت تک ہوش و حواس بجا تھے۔ افسوس کہ مسلمانوں کا ایک ایسا چراغ کہ جس کی اس وقت سخت ضرورت تھی گل ہو گیا۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو بخش دیا اور اپنے الطاف سے اس کو مالا مال کر دیا، لیکن مسلمانوں کو اس کی رہبری سے محروم کر دیا۔

اشاریہ

محمد علی حصہ دوم

(اشخاص)

محمد علیؒ

(حصّہ اوّل)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات و وقائع زندگی، جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذاتی علم ومشاہدہ وتجربہ میں آئے، اور جن میں وہ اُن کے برابر کے شریک، و در معاون ومددگار رہے، اس حصہ میں ۱۹۱۲ء کے آغاز ملاقات سے ۱۹۲۷ء تک کے واقعات وحالات ہیں جس میں قید فرنگ، قید تنہائی، کانگریس کی صدارت گاندھی جی کی میزبانی، ہمدرد وکامریڈ کے اجراء، شریفی وسعودی جنگ، پیر ومرید کی آویزش، حج اور وفد خلافت قوم کی قدردانی اور بیزاری وغیرہ کے واقعات بڑی تفصیل کیسا تھ، ۲۲ ابواب اور ۴۲۰ صفحات میں آئے ہیں۔ یہ تو بظاہر یہ ذاتی ڈائری کے چند ورق لیکن انہی چند اوراق میں مولانا محمد علیؒ کے دور کی ہندوستان کی مکمل سیاسی وقومی تاریخ قلمبند ہوگئی ہے، قیمت :- ۵؎

حکیمُ الامّت

حکیمُ الامّت شیخ وقت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ۱۵ سالہ حصۂ زندگی کا ایک نرالا مرقع، فقہ وتفسیر، حدیث وسنت، سلوک وکلام، ادب وحکمت، صحافت وسیاست کے صدہا مضامین کا گلدستہ، قیمت : ۸؎

سفرِ حجاز

مولانا دریابادی کا سفر حجاز، عازمین حج کے لئے بہترین زاد راہ، اور بہترین مشیر ورہنما، ادب وانشاء کی خوبیاں اس پر مستزاد اور حواشی اور ضمیمون کے اضافہ کے ساتھ۔ قیمت :- صہ

(طابع وناشر صدیق احمد)